تحریر

علمی مجلس دلّی کا تماہی رسالہ

سالانہ : ۱۲ روپے
اس شمارہ کی قیمت : ۵ روپے

مرتّب
مالک رام

جلد ۲ ۱۹۶۸ء شمارہ ۱

فہرست

مالک رام :	ملاحظات	
مولانا ابوالکلام آزاد :	اعلان الحق	۱
امتیاز علی خاں عرشی :	اسلامیات کا مطالعہ	۲۱
نذیر احمد :	فارسی میں الفاظ کی تصحیح کا مسئلہ	۳۵
مالک رام :	مولانا ابوالکلام آزاد	۷۵
گوپی چند نارنگ :	مستشرقین کی بین الاقوامی کانگرس	۹۹
مالک رام :	وفیات	۱۱۷

ملاحظات

تحریر اپنی زندگی کے دوسرے سال میں قدم رکھ رہا ہے۔ ہم نے پارسال بہت جھجک جھجک کے اسے جاری کیا تھا۔ اندیشہ تھا کہ شاید ہمارا اردو داں طبقہ اس اقدام کو پسند نہ کرے، لیکن خوشی ہے کہ ہمارا اندیشہ غلط ثابت ہوا۔ جس گرمجوشی سے اس کا استقبال کیا گیا، وہ ہماری توقع سے کہیں زیادہ تھی۔ اس سے ہمیں یقین ہو گیا کہ ملک کے علمی حلقے نہ صرف اس قسم کے ایک سنجیدہ پرچے کی ضرورت محسوس کرتے ہیں، بلکہ انھوں نے ہماری جرأتِ رندانہ کو بھی بنظرِ استحسان دیکھا ہے:

حُدی را تیز تر می خواں، چو محمل را گراں بینی

افسوس کہ تا حال، پوری کوشش کے باوجود ہم کتابت و طباعت کا قابلِ اطمینان انتظام نہیں کر سکے۔ جن اصحاب کو اس طرح کے کاموں کا تجربہ ہے، وہ ہم سے ہمدردی کریں گے؛ لیکن دوسروں کے لیے اتنا لکھ دینا ضروری ہے کہ ہم اس پہلو سے غافل نہیں ہیں۔

ہماری خواہش اور کوشش ہے کہ تحریر کے مضامین کا معیار خوب سے خوب تر ہوتا چلا جائے۔ اس راہ کی مشکلات بھی ناظرین سے پوشیدہ نہیں۔ بدقسمتی سے ہمارے ہاں سنجیدہ علمی مذاق ہنوز بہت کم ہے۔ بہرحال ہمیں اس دشواری کا پورا احساس ہے؛ اور ہمیں یقین ہے کہ احباب کے تعاون سے ہم اس پر قابو پا لیں گے۔

یہ سالِ رواں کا پہلا شمارہ ہے، دوسرا بھی مکمل ہو چکا ہے؛ اور اس کے جلد بعد شائع ہو جائے گا۔

مالک رام

(ٹائٹل طبع اول)

باسمہٖ تعالیٰ

قُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا

رسالہ فیض مقالہ

اعلان الحق

جسے محض احقاق حق اور ابطال باطل کے لیے

خاکسار خادم الطلبا، ابوالکلام آزاد دہلوی نے تالیف کیا

جس میں

ہلال رمضان مبارک کے متعلق تین ضروری بحثیں نہایت تحقیق کیساتھ کی گئیں ہیں

۲۵ رمضان المبارک ۱۳۱۹ھ کو

عثمانی پریس کلکتہ میں چھپکر شائع ہوا

(باہتمام سید محمد عثمان مالک مطبع)

قیمت فی جلد ۲ ر

التماسِ مؤلّف

اس رسالے سے خاکسار آزاد کو کسی خاص شخص کا رد منظور نہیں ہے بلکہ صرف اہلِ انصاف کی آگاہی مقصود ہے۔ جناب مولانا خیر الدین صاحب کے متعلق مخالفین نے بڑے بڑے اتہام اپنی تحریروں میں زور وشور سے کیے ہیں۔ اور وہ وہ سخت الفاظ مولانا کی شان میں لکھے ہیں جو علماء کی شان سے بعید ہیں۔ شر الدین کے نام سے تو مولانا مخالفین میں یاد کیے جاتے ہیں۔ اور یہ بمقابلہ ان سب وشتم آمیز الفاظ کے جو رسالوں میں اور اشتہاروں میں لکھے ہیں کچھ حقیقت نہیں رکھتا لیکن ناظرین خود معلوم کر لیں گے کہ میں نے تمام تحریر میں کوئی ایک لفظ بھی کسی خاص شخص کا نام لیکر یا مجملاً یا کنایتاً نہیں لکھا ہے بلکہ ہر مقام میں تہذیب کو ملحوظ رکھا ہے۔ اور انشاء اللہ تعالیٰ کبھی میرے یا مولانا کی زبان سے کوئی جملہ سب وشتم آمیز مخالفین کی شان میں نہیں نکلے گا۔ مولانا کی تہذیب تو قابلِ ملاحظہ ہے۔ کہ مخالفین کی رد میں اور درج الدرر البہیہ کی تائید میں حفظ المتین لکھی تو معترض کا نام بھی نہیں لکھا کما لا یخفیٰ علی الناظر۔ اسکے سوا ذاتیات سے بحث جیسے خود ہمارے مخالف جماعت میں واقع ہوئی ہے۔ اس تحریر میں کہیں نہیں کی گئی۔ انشاء اللہ تعالےٰ اس سلسلہ اعلان الحق میں اور اعتراضات اور اتہامات کا رد جو مولانا پر کئے ہیں، شائع کیا جائیگا۔ اور دکھایا جائیگا کہ ہمارے معزز مخالفین نے کن کن پیچیدہ طریقوں سے اعتراضات کئے ہیں۔

خاکسار **آزاد** مؤلف رسالہ ہذا

اعلان: یہ کتاب جن صاحب کو درکار ہو وہ کلکتہ۔ ندریہ پٹی لور چیت پور روڈ دکان نمبر ۱۰۲ جناب منشی حسن الدین احمد صاحب سے آکر بالقیمت لیجائیں۔

اعلاء الحق

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حامداً ومصلیاً

اللّٰھم ارنا الحق حقاً وارزقنا اتباعہ وارنا الباطل باطلاً وارزقنا اجتنابہ

آجکل زمانہ میں عجیب عجیب پرآشوب فتنے اٹھا کرتے ہیں۔ طرح طرح کے شگوفے پھوٹتے ہیں مسائل کا اور عقائد فاسدہ کی اس قدر شہرت عام ہے کہ ہر خواندہ ناخواندہ مجتہد وقت اور امام ہے عجب دور ہے طرفہ طور ہے۔ نئے نئے گل پھولے ہیں۔ لوگ اپنی پرانی روش بھولے ہیں دین میں قسم قسم کے جھگڑے نکالتے ہیں اسلام میں فساد کے رخنے ڈالتے ہیں تعصب کی گھٹا چاروں طرف چھائی ہوئی ہے جہالت کا طوفان جوش زن ہے۔ ایک الکھانہ پڑھا فاضل مشہور ہے دوسرا دو حرفی لیاقت کے نشہ میں چور ہے۔ زبان اچھے کو برا برے کو اچھا بتاتا ہے۔ دوسرا نام آوری اور شہرت کو یہ مذہب پر چھری پھیرتا ہے۔ ایک نے تمام جہان کو مشرک بدعتی قرار دیا ہے دوسرے نے تمام کتب فقہیہ کو طاقِ نسیان پر رکھ کر نئی تحقیق اور نئے اجتہاد کا سبق یاد کیا ہے۔ ایک صاحب فقہا پر تبرے کی لیتے ہیں دوسرے صوفیہ کرام کو برا بھلا سناتے ہیں علماء نے ہٹ دھرمی اور شہرت اپنا اصول قرار دیا ہے۔ جہلاء نے ادھا دھند مع تقلید اور وہم تحقیق اپنا مذہب سمجھا ہے۔ اور بایں ہمہ لطف یہ کہ غیر مقلدین تو آئے دن علماء سے اختلاف کرتے ہی تھے۔ اب حضرات حنفیہ بھی اپنی نام آوری اور شہرت کے لیے ان مسائل سے جو عند الفقہاء مسلم ہیں اور جنکے ثبوت سے تمام فقہ کی کتابیں بھری پڑی ہیں اختلاف کرتے ہیں۔ اور جو کچھ جی میں آتا ہے لکھ کر شائع کر دیتے ہیں۔ گو یہ اہل حق سے

معقول ہوتے ہیں ذلیل ہوتے ہیں لیکن ہاں ان کے اس اختلاف کا اثر عوام پر بہت ہی برا پڑتا ہے۔
بہت سے بے علم جاہل لوگ ان پر اعتماد کر کے دامِ تزویر میں پھنس جاتے ہیں۔ اور نتیجہ اوس کا یہ ہوتا ہے کہ بیٹھے بٹھائے گمراہ ہو جاتے ہیں چنانچہ کلکتہ میں تقریباً بارہ سال سے حضرت مجمع الفضائل مولانا محمد خیر الدین صاحب مدفیضہ دہلوی مصنف نجم المبین لرجم الشیاطین عشر مجلدات وردح البھیۃ حفظ المتین وغیرہ کتب کثیرہ مطبوعہ وغیر مطبوعہ تشریف فرما ہیں۔ آپکے وجود سے ہزاروں مستفیض ہوئے سیکڑوں اپنی مرادوں میں کامیاب ہوئے کلکتہ کا کلکتہ اُمڈ آیا ہزاروں معتقد اور مرید ہو گئے تمام شہر میں مولانا کا طوطی بول اٹھا۔ یہ کیفیت دیکھکر حضرات علمائے کلکتہ بہ تحریک طبیعت ایک مخالفانہ پالیسی اختیار کرنے پر مجبور ہو گئے۔ اور مختلف ذرائع سے مولانا مدظلہ سے اختلاف کرنا شروع کر دیا کسی وقت دیکھئے تو ایک لمبا چوڑا فتوی جسپر کالی کالی مہریں جو مفتیوں کے سیاہی قلب پر دال ہیں گلی کوچہ میں گشت کر رہا ہے۔ ہیں! یہ کیا: "اجی ذکر شہادت کرنیوالا بدعتی مشرک ہے چونکہ مولانا نے ذکرِ شہادت بیان کیا ہے۔ لہذا یہ مشرک"؛ ہیں خیر کچھ دنوں بعد ایک رسالہ چار ورقی شائع ہو رہا مسجد وںکے دروازوں پر بٹ رہا ہے۔ یہ کیا؟ یعنی یہ کہ مولانا کافر ہیں۔ **الغرض** مختلف ذرائع سے مخالفت کی گئی۔
جب اس میں کامیابی نہ ہوئی تو پھر آٹھ نو سال سے (تقریباً) مولانا سے رویتِ ہلال ماہِ رمضان اور عید کے بارے میں اختلاف کر بیٹھے اور اپنی وہی بے پر کی باتیں معمول کے موافق چھاپ کر شائع کرنا شروع کر دیا۔ اب عوام بیچارے اونھیں حق بجانب سمجھ کر اونھیں کی تقلید کرنے لگے۔ اور عین عید کے دن کہ روزہ حرام ہے روزہ رکھنے لگے۔
یہ حالِ پر ملال دیکھکر یہ تو ممکن نہ تھا کہ جان بوجھ کر کھڈّے میں گرتے۔ ناچار علیحدہ قلعہ کے میدان میں نماز عیدین پڑھنی شروع کر دی۔ جہاں تک ممکن تھا پہلے سمجھایا بوجھایا جب دیکھا کہ پتھر پر جونک نہیں لگتی سکوت اختیار کیا۔ من عمل صالحاً فلنفسہ ومن اساء فعلیہا وما علینا الا البلاغ۔
مگر یہ عجیب بات ہے کہ ہمارے معزز مخالفین نے اپنے اشتہاروں میں اور رسالوں میں، اپنی

مختلف تقریروں میں چھاپنا چھاپنا شروع کر دیا کہ مولانا اپنے کشف اور نجوم اور رمل پر اعتبار کرتے ہیں اور حکم روزہ اور عید اسی حساب سے دیتے ہیں۔ غالباً اس کہنے سے یہ غرض ملحوظ ہے کہ دور و دراز کے علماء جو اصل واقعہ سے بیخبر ہیں مولانا سے بدگمان ہوجائیں، اس لیے میرا ارادہ تھا کہ اس بارے میں ایک رسالہ شائع کیا جائے جس میں اوّل تو اس دھوکہ کو رفع کیا جائے۔ اور پھر جن امور میں اختلاف ہے ان پر بحث کر کے دودھ کا دودھ پانی کا پانی باطل کو حق سے جدا کیا جائے۔ مگر آج تک اس کی نوبت نہ آئی۔ چونکہ گذشتہ سال مسجد ناخدا میں بالائے مدرسہ قبل العصر ایک عابد زاہد مولوی صاحب مکرم معظم سے اس بارے میں گفتگو ہوگئی ہے۔ اور ضیق وقت کی وجہ سے میں اپنے دلائل پیش نہیں کرسکا۔ بدیں وجہ یہ مختصر رسالہ جامع تحریر کر کے انصاف کا امیدوار ہوتا ہوں مجھے امید قوی ہے کہ ہمارے معزز مخالفین علماء کلکتہ چشم انصاف سے ملاحظہ فرما کر راہ حق کے جویان پویان ہونگے۔

وھھنا اشرح بالمقصود وما توفیقی الا باللہ الودود۔

"مخالفین کا یہ اعتراض کہ مولانا اپنے کشف اور نجوم کے اعتبار پر حکم عید و سیام فرماتے ہیں اس کا رد اور ثبوت میں ایک چشم دید حال کا واقعہ"

ناظرین! مولانا پر منجملہ اور اتہامات کے ایک اتہام یہ کیا جاتا ہے کہ یہ اپنے کشف اور نجوم کے اعتبار پر حکم عید و صیام فرمایا کرتے ہیں۔ حالانکہ یہ بات خلاف شرع ہے کیونکہ شرع کی تو نہیں نجوم اور کشف کو کیا دخل

پس یہ بات محض خلاف ہے

اور اکثر واقعات اُن کے خلاف صریح طور سے شہادت پیش کرتے ہیں۔

(۱) جب سے مولانا علیحدہ روزہ اور عید رکھنے اور کرنے لگے آج تک کبھی ایسا اتفاق نہیں ہوا کہ بلا کسی دلیل کے مولانا نے حکم صادر فرمایا ہو جب فرمایا تو متواتر خطوط اور تار اور گواہی وغیرہ معتبر دلائل پر اور اس سے تمام اہل کلکتہ واقف ہیں چنانچہ مولانا نے اکثر خطوط برسر منبر دکھائے ہیں اور گواہ شاہد پیش کیے ہیں جس سے کوئی اہل انصاف انکار نہیں کرسکتا۔

(۲) ایک سال کا واقعہ ہم درج کرتے ہیں جس سے یہ بات واضح طور سے متحقق ہوجائیگی وہ یہ ہے:

کہ ایک تار جناب حاجی عبدالرزاق صاحب کے پاس جو کلکتہ کے ایک معزز تاجر ہیں، آیا، جس میں صاف طور سے تو یہ نہیں لکھا تھا کہ یہاں چاند ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ دلیل شرعی ہوتی۔ ہاں یہ لکھا تھا کہ یہاں چاند ہوا یا یہاں عید ہو گئی۔ غرضکہ مبہم طور سے کہ دلیل معتبر نہیں ہو سکتی۔ اس کے سوا ایک میر صاحب بھی گواہ تھے۔ چونکہ بے حکم مولانا کے بعد میں عید ہو نہیں سکتی تھی، تار اور گواہ میر صاحب مولانا کے پاس آئے۔ مولانا نے فرمایا کہ گواہ کیا کہنا ہے۔ پہلے اس سے استماع کرنا چاہیے۔ میر صاحب نے ارشاد کیا کہ میں آج شام کو مرشد آباد سے آرہا تھا۔ ہوگلی کے نزدیک ہی ریل میں ایک بوڑھی غالباً گوالن بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ لگی کہنے کہ دیکھنا میر صاحب! یہ چاند نظر آرہا ہے۔ جناب میں نے جو نظر اٹھا کے دیکھا تو فی الواقع ناک کی سیدھ چاند دکھ رہا تھا۔ مولانا نے دریافت فرمایا کہ حضرت ابر بھی تھا کہنے لگے کہ نہیں صاحب مطلع صاف تھا۔ مولانا نے تعجب سے فرمایا کہ میر صاحب ہوگلی جو یہاں سے بہت ہی قریب ہے وہاں تو بالکل مطلع صاف ہو اور یہاں کلکتہ میں عصر سے ابر ہو۔ خیر جب تار کی نوبت آئی، تو اس پر مبہم طور سے لکھا تھا اس لئے اس پر شرعی عمل درآمد ہو نہیں سکتا تھا۔ الغرض مولانا نے حکم عید صادر نہیں فرمایا۔ اتفاقاً جناب عبدالقدوس عطار صاحب بھی تشریف فرما تھے۔ وہ میر صاحب سے فرمانے لگے کہ میر صاحب اس قدر کذب گوئی! ابھی تو آپ پانچ بجے میری دکان پر لکھنؤ کے خربزے خرید رہے تھے، اور پانچ سے چھ تک آپ مرشد آباد بھی چلے گئے اور وہاں سے ازراہ ہوگلی تشریف فرما بھی ہو گئے۔ اُسکت اُسکت یا ایھا الکذاب، اُسکت اُسکت یا ایھا الکذاب! میر صاحب تو وہاں سے چلتے ہوئے لیکن دوسرے دن جب معتبر گواہیاں آئیں مولانا نے حکم افطار عصر کے قریب فرمایا۔ اس واقعہ سے تمام حضرات واقف ہیں۔ اب جائے غور ہے کہ اگر مولانا کو اپنے کشف اور نجوم پر حکم صادر فرمانا ہوتا۔ تو نجوم کے حساب سے تو ضرور اس روز عید ہوئی تھی۔ تار اور گواہ میر صاحب کا بہانہ موجود تھا، فوراً حکم صادر فرما دیتے۔

مگر چونکہ ان کو محض شرعی اعتبار درکار تھا، اور عمل درآمد بھی ظاہری شرع پر تھا۔ ہرگز
حکم عید نہیں فرمایا۔ فاعتبروا یا اولی الالباب۔ ان ھذا لشیئ عجاب۔ ان دلائل
سے یہ مخالفین کا اعتراض کہ نجوم پر حکم فرماتے ہیں ھباءً منثورا ہو گیا۔ اب ہم اصل
بحث پر آتے ہیں،

کہ جناب مولانا اور حضرات مخالفین علماء کلکتہ میں جہاں تک غور کیا گیا۔ صرف ان امور میں
اختلاف ہے۔

(۱) مولانا فرماتے ہیں کہ اختلاف مطالع کا اعتبار نہیں۔ مشرق سے گواہی یا خبر معتبر چاند کی اگر
مغرب میں پہونچے تو مغرب والے اس پر اعتبار کریں۔ اور روزہ رکھیں، عید کریں۔
لیکن معزز مخالفین فرماتے ہیں کہ نہیں جب تک ہم اپنی دونوں آنکھوں سے کلکتہ میں
چاند نہیں دیکھیں گے۔ تب تک نہ روزہ رکھیں گے اور نہ عید۔ بس اعتبار گواہی و خبر متواترہ
نیست۔

(۲) مخالفین دلیل یہ پیش کرتے ہیں کہ حدیث شریف میں آیا ہے۔ صوموا لرؤیتہ وافطروا لرؤیتہ

(۳) بعض مخالف مجبوراً اختلاف مطالع کے نہ معتبر ہونے کے اگر قائل بھی ہو جاتے ہیں تو پھر یہ مشکل
پیش کرتے ہیں کہ عید کی خبر شب بھر میں کسی گواہ سے پہونچ نہیں سکتی سوائے تار کے
اور تار کا اعتبار نہیں ہے، کیونکہ یہ کفار کے ذریعہ سے آتا ہے۔

حضرات ناظرین! یہ تین بحثیں خصوصاً تار کی بحث ایک بڑی معرکۃ الآرا بحث ہے اور اس لائق ہے
کہ اس کو نہایت طوالت کے ساتھ ما لہ وما علیہ تفصیلاً لکھا جائے لیکن چونکہ مجھے سر دست
صرف اہل انصاف کی آگاہی کے لئے مختصر تحریر کرنا ہے، اس لئے نہایت مختصر طور سے پیش
کرتا ہوں۔ والعاقل تکفیہ الاشارہ۔

"پہلی بحث اختلاف مطالع کو معتبر ہونے نہ ہونیکی"

پہلا اختلاف مولانا و علماء کلکتہ کا یہ ہے کہ "اختلاف مطالع کے سبب سے اور ملکوں کے رویت کا اعتبار

نہیں ہے۔" اگرچہ یہ بحث طول طلب ہے۔ لیکن جہاں تک ہم سے ممکن ہوگا ہم اختصار کو ساتھ تحریر کریں گے۔ ناظرین ملاحظہ فرمائیں کہ علمار کلکتہ کا یہ انوکھا مسئلہ جس سے اور علماء کے کان نا آشنا ہوں گے۔ خدا جانے کس کتاب میں لکھا ہے۔ آج ہندوستان میں متون، حواشی، شروح، فتاویٰ ہر قسم کی کتابوں کا کافی سرمایہ مطبوعہ غیر مطبوعہ موجود ہے۔ کوئی شمس العلما صاحب ہم کو یہ انوکھا مسئلہ کہ بسبب اختلافِ مطالع اور ملکوں کا اعتبار نہیں، کسی کتاب معتبر میں دکھلا دیں۔ تمام کتب فقہیہ میں صاف طور سے مثالیں ذکر کر لکھا ہے "کہ اختلاف مطالع کا رمضان المبارک میں اعتبار نہیں ہے ہرگز نہیں ہے۔ اگر مغرب والوں نے یکشنبہ کے دن چاند دیکھا۔ اور مشرق والوں نے دوشنبہ کو تو جب شرقیوں کو غربیوں کے پاس سے یکشنبہ کی خبر ہو جائے۔ اور وہ خبر معتبر شرعی ہو۔ تو انھیں چاہیئے کہ روزہ قضا کریں۔ اور اگر یکشنبہ ہی کے دن خبر ہو جائے تو انھیں یعنی شرقیوں کو یکشنبہ ہی سے روزہ رکھنا چاہیئے۔ اور اسی کے حساب سے افطار کرنا چاہیئے۔"

الغرض۔ اختلافِ مطالع کا کچھ اعتبار نہیں ہے جس مقام پر گو بعد المشرقین ہو۔ پہلا روزہ ہوا اس کا اعتبار ہے۔ اور ایسا ہی تمام معتبر کتب فقہیہ میں بالتفصیل لکھا ہے۔

اب ہم دس معتبر فقہ کی کتابوں سے عبارتیں نقل کئے دیتے ہیں۔ جو فی زمانا معروف اور متداول ہیں۔ اور ہر جگہ میسر ہو سکتی ہیں۔ اور جن میں صاف طور سے یہ مسئلہ تحریر ہے۔ چشم انصاف سے ملاحظہ فرمائیں

(۱) (فیلزم اهل المشرق برویة اهل المغرب) اذا ثبت عندهم رویة اولئك بطریق موجب۔" (ردالمختار)

(۲) "یلزم اهل المشرق برویة اهل المغرب فی ظاهر المذهب وعلیه الفتوی کذا فی الخلاصة۔" (نهر الفائق)

(۳) "اذا ثبت الهلال فی بلدة لزم سائر الناس فی ظاهر الروایة وعلیه الفتوی وهو قول اکثر المشائخ۔" (مراقی الفلاح)

(۴) بلدة اذا رأة الهلال هل یلزم فی حق کل بلدة؟ (الی قوله) وفی الخانیة

لاعبرت باختلاف المطالع فی ظاهر الروایۃ ۔ وفی الظهیریه عن ابن عباسؓ انه کان یعتبر فی حق کل بلدۃ رویۃ اهلها۔ انتهی" (تاتارخانیه)

(۵) "لاعبرت لاختلاف المطالع وعلیه کثیرا من متون المعتبرۃ کصاحب الکنز۔ انتهی ۔" (در جواہر نغیہ شرح جواہر منیفہ)

(۶) "والصحیح من مذهب اصحابنا انه یلزم اذا استفاض الخبر فی البلدۃ الاخری وان لاعبرۃ لاتحاد المطالع واختلافها وهذا ظاهر الروایۃ۔ انتهی ۔" (جامع الرموز)

(۷) "قوله احوط۔ ای لعموم الخطاب فی قوله صلعم صوموا لرویة وافطر والرویة بمطلق الرویة وهی حاصلة برویة فلیثبت عموم الحکم احتیاطا ۔" (طحطاوی)

(۸) فی الشامی بعد ذکر مذهب الشافعیؒ "وظاهر الروایة الثانی وهو المعتمد عندنا (ای لاعبرۃ باختلاف المطالع)" (شامی)

(۹) "لاعبرۃ باختلاف المطالع ومعناه اذا رای الهلال اهل بلدۃ ولم رای اهل بلدۃ اخری یجب ان یصوموا برویۃ الخ"

(تبیین الحقائق)

(۱۰) "لاعبرۃ لاختلاف المطالع فی ظاهر الروایة وعلیه فتوی (الی قوله) لورای هلال رمضان اهل مغرب یجب الصوم اهل مشرق ۔" (عالمگیری)

(۱۱) صاحب در المختار نے تو صاف فیصلہ ہی کر دیا ہے۔ اور اس بارے میں اس نے ایک سا لکھا ہے کہ اختلاف المطالع کا کچھ اعتبار نہیں ہے۔ ہم علامہ ابن عابدین صاحب در المختار کی پوری عبارت چونکہ طول ہے نقل نہیں کر سکتے در المختار میں دیکھ لینا چاہیے (مطبوعہ مصر صفحہ ۱۵۴)

قوله علی ظاهر المذهب اعلم ان نفس اختلاف المطالع لا نزاع

فیہ بمعنی ان قد یکون بین البلد تاین بعد الخ "

اب ہم نے دس کتب معتبرہ فقہ سے جیسے۔ در المختار، مراقی الفلاح، جامع الرموز، طحطاوی، عالمگیری وغیرہ جن سے فی زمانا بڑھ کر اور کوئی معتبر کتاب موجود نہیں ہے عبارات نقل کر دی ہیں جن میں صاف طور سے لکھا ہے۔ لاعبرة لاختلاف المطالع فیلزم اھل المشرق برؤیة اھل المغرب۔ جن سے کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا اور اس کو سوا تمام متون شروح میں لکھا ہے کہ علیہ فتوٰی فی ظاھر الروایة۔ علیہ کثیرا من متون المعتابرة۔ اب اگر اس پر بھی کوئی نہ مانے۔ اور وہی مرغی کی ایک ٹانگ کہے جائے تو وہ تعصب اور تقلید ہوا نفس نہیں ہے تو کیا ہے ؟

الغرض

ان تمام عبارات بالا سے یہ بات متحقق ہو گئی کہ اختلاف مطالع کا اعتبار نہیں ہے۔ جہاں پہلے رویت ہو اُسی کا اعتبار ہے۔ اور اس پر تمام شہروں کو اعتبار اور عمل کرنا چاہئے، اگرچہ بعد المشرقین ہو۔

"دوسری بحث حدیث "صوموا الرویة وافطروا الرویة" پر اور

اس بات کا ثبوت کہ یہاں رویت سے مراد علم الیقین ہے۔ اور اس پر قرآنی دلائل"

اب ہم کو اس حدیث اور ہم معنی اور حدیثوں پر بحث کرنی باقی ہے کیونکہ جب علمائے کلکتہ اس صورت میں عاجز ہو جاتے ہیں، تو پھر مسلم کی یہ حدیث پیش کرتے ہیں کہ :

"صوموا الرویة وافطروا الرویة"

ترجمہ :- اے لوگو! روزہ رکھو چاند دیکھ کر، اور اسی طرح افطار کرو یعنی عید کرو چاند دیکھ کر" الحدیث "

پس۔ اس سے ہمارے مخالفین ثابت کرانا چاہتے ہیں۔ کہ "یہاں رویت کا لفظ آیا ہے جس کے معنی ہیں دیکھنے کے۔ تو پھر جب تک ہم اپنی دونوں آنکھوں سے ناک کی سیدھ چاند نہ دیکھیں روزہ اور افطار نہ کریں گے بس، اعتبار گواہی وخبر متواترہ نیست۔ لیکن افسوس ہے، اور سخت افسوس ہے کہ یہ حضرات علمائے کلکتہ کہ جن کی عمر کا ایک بہت بڑا حصہ پڑھنے پڑھانے میں صرف ہو چکا ہے، ایک

حدیث پر غور نہیں فرماتے اور ذرا فقہ کی کتابوں کو کھول کر نہ دیکھتے جن میں صاف طور سے لکھا ہے کہ

"یہاں رویت سے مراد علم الیقین ہے "

خیر تو اس حدیث کی علمائے دو طور سے تفسیر کی ہے. اول یہ کہ یہاں رویت کے معنی علم الیقین کے ہیں جب یقینی معلوم ہو جائے کہ فلاں مقام میں "رویت" ہوئی ہے. تو گویا اون کو رویت ہو گئی اور اب اون کو اوس پر عمل کرنا چاہئے. اور یہ عرب کا قاعدہ ہے کہ جس مقام پر "سامع" کو علم الیقین حاصل ہو جائے. تو اوس مقام پر رویت کا لفظ "قائل" استعمال کرتا ہے. اور ہم کلام عرب سے اوس کی دلیل پیش کرتے ہیں. مگر اس وقت تین ایسی دلیلیں تحریر کرتے ہیں کہ اوس سے انکار ہو ہی نہیں سکتا. یعنی ۔ قرآن شریف میں بھی تین موقعوں پر اللہ جل شانہ نے اسی طرح علم الیقین کے موقع پر رویت کا لفظ فرمایا ہے. اگر وہاں رویت کے معنی علم الیقین کے نہ لئے جائیں تو معنی خبط ہو جائیں. اور کسی مفسر نے یہ معنی یعنی دیکھنے کے نہیں لئے ہیں. اور کیسے لیں جبکہ معنی ہی خبط ہو جائیں. اب وہ آیتیں ملاحظہ فرمایئے.

(۱) سورہ والصٰفٰت کے دوسرے رکوع کو اول و آخر میں جہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی ہے کہ اے پروردگار ھب لی من الصالحین، یعنی مجھ کو ایک فرزند صالح عطا فرما. اللہ تعالیٰ جل جلالہ نے انھیں حضرت اسمٰعیل علیہ السلام عطا فرمایا. اور جب وہ جوان ہوئے ایک دن حضرت ابراہیم حضرت اسمٰعیل علیہ السلام سے فرماتے ہیں کہ "(قال یا بنی) انی اریٰ فی المنام ان اذبحک فانظر ماذا تریٰ" ترجمہ: . ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا کہ اے میرے بیٹے! میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ میں تجھ کو ذبح کر رہا ہوں بس تم بھی ذرا سوچو کہ تمہاری رائے میں کیا آتا ہے.

اب جائے غور ہے. کہ اس آیت میں "فانظر ماذا تریٰ" آیا ہے. اب اگر یہاں بقول علمائے کلکتہ رویت کے معنی "دیکھنے" کے لیے جائیں تو معنی خبط ہو نگے. کہ "پس دیکھ تو کہ کیا دیکھتا ہے تو" اور کسی مفسر نے نہیں لیے. اور لے تو کیونکر جبکہ معنی ہی سرے سے "خبط" ہو جاتا ہے. کیونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام تو حضرت اسمٰعیل علیہ السلام سے استصواب رائے فرماتے تھے. پھر اون کا کہنا کہ "پس دیکھ تو کہ کیا دیکھتا ہے تو" یعنی چہ؟ پس اس آیت میں بھی وہی "رویت" کے "مجازی"

معنی لئے گئے ہیں۔ فافہم۔

(۲) سورۂ "فجر" کے پہلے "رکوع" میں ہے۔

"اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِعَادٍ اِرَمَ ذَاتِ الْعِمَادِ الَّتِيْ لَمْ يُخْلَقْ مِثْلُهَا فِي الْبِلَادِ"

ترجمہ۔ اے میرے حبیب! کیا تو نے نہیں دیکھا تیرے پروردگار نے قوم "عاد" کو ساتھ۔ کیا کیا۔ (وہ) ارم صاحب ستونوں کو ایسے تھے کہ جن کے مانند کسی شہر میں ہم نے پیدا نہیں کیے۔

اس آیت میں بھی اللہ تعالیٰ نے علم الیقین کے موقعہ میں وہی "رؤیت" کا لفظ ارشاد فرمایا ہے کما مرّ

(۳) سورۂ "فیل" میں ارشاد ہوتا ہے۔

اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِاَصْحَابِ الْفِيْلِ ۝ اَلَمْ يَجْعَلْ كَيْدَهُمْ فِيْ تَضْلِيْلٍ وَّ اَرْسَلَ عَلَيْهِمْ طَيْرًا اَبَابِيْلَ ۝ تَرْمِيْهِمْ بِحِجَارَةٍ مِّنْ سِجِّيْلٍ فَجَعَلَهُمْ كَعَصْفٍ مَّاْكُوْلٍ

ترجمہ

اے میرے حبیب گنہگاروں کے طبیب! کیا تم کو یہ بات معلوم نہیں ہے کہ تمہارے پروردگار نے ہاتھی والوں کے ساتھ کیا سلوک کیا۔ کیا اس نے ان کے تمام فریب نہیں توڑے؟ نہیں بیشک توڑے اور ان پر غول درغول پرندے بھیجے۔ جو ان پر کنکریاں (ٹھیکرے والی) پھینکتے تھے۔ اور ان کو کھائے ہوئے بھس کی مانند کر دیا۔

ناظرین! ملاحظہ فرمائیں کہ اس سورہ میں بھی اللہ جل شانہ نے "رؤیت" ارشاد کیا ہے جس کے معنی یہ ہونا چاہیے کہ "کیا نہیں دیکھا تو نے" واقعہ اصحاب فیل کا۔ حالانکہ جناب رسول اکرم تو اس واقعہ کو دیکھ نہیں رہے تھے! اور نہ دیکھ سکتے تھے کیونکہ یہ واقعہ آپ کے کئی سال قبل مکہ معظمہ میں ہو چکا تھا۔ مگر جناب باری نے "تر" کا لفظ ارشاد فرمایا۔ اب ذرا ہمارے "مخاطبین" ارشاد فرمائیں کہ یہاں یہ "دیکھنا" کیوں ارشاد ہوا؟ بس یہاں وہی مجازی معنی "علم الیقین" کے ہیں کہ "کیا نہیں معلوم تم کو میرے حبیب" کیونکہ "قائل" جانتا ہے کہ مجھ پر "سامع" کو یقین کامل ہے۔ اس لئے وہ وہاں رؤیت حس کے معنی مجازی علم الیقین کے ہیں استعمال کرتا ہے۔ کما لا یخفیٰ علی المتامل فاعتبروا یا اولی الابصار۔

اب ان تینوں آیتوں سے یہ بات متحقق ہو گئی کہ بعض مقام میں "رویت" کا حصول علم الیقین پر بھی اطلاق ہوتا ہے۔ پس اس حدیث زیر بحث صوموا الرویۃ وافطروا الرویۃ میں رویت کے یہی معنی محققین نے لیے ہیں اور اس بنا پر صاف لکھ دیا کہ "لاعبرۃ لاختلاف المطالع وعلیہ الفتویٰ۔
اور یہ جو ہم نے لکھا ہے کچھ ہماری ذاتی رائے نہیں ہے۔ بلکہ اور محققین کی بھی یہی رائے ہے! اور اس کے یہی معنی لے ہیں۔ اگرچہ ہم کو کسی دلیل کی ضرورت ہی نہیں ہے جب کہ نفس بیان صحیح ہوا اور قرآن شریف سے بھی ثابت ہوتا ہے۔
لیکن مزید اطمینان کے لیے ہم لکھے دیتے ہیں

کہ کتاب "عیوز البصائر" جو ایک معتبر اور مشہور و معروف کتاب ہے۔ اس میں لکھا ہے کہ حدیث "صوموا الرویۃ وافطروا الرویۃ" میں 'رویت' سے مراد حصول علم بطریق غالب" ہے پھر مثال دی ہے۔ کہ "ایک شخص نے اپنی منکوحہ عورت کو بایں الفاظ طلاق دی کہ "ان رایت الھلال فانت طالق" یعنی اگر تو نے چاند دیکھا تو تجھ پر طلاق۔
اب جب چاند رات آئی، تو وہ عورت مکان میں چھپ رہی کہ میں چاند نہ دیکھنے پاؤں تاکہ "طلاق" نہ پڑ جائے کیونکہ طالق نے "رأیت الھلال" کی قید لگائی ہے۔ لیکن کسی شخص نے جا کر کہہ دیا کہ ہیں! یہ آپ کہاں بیٹھی ہیں! بی بی صاحب چاند ہو گیا۔ فقہ کہتی ہے کہ "طلاق پڑ گئی"، کیونکہ "طالق" نے "رأیت الھلال" کی قید لگائی ہے۔ اور جبکہ عورت کو علم الیقین ہو گیا۔ تو اس کے لیے "رویت" ہو گئی۔ انتہیٰ ملخصاً۔

(۲) دوسرا جواب علمائے محققین نے یہ دیا ہے کہ اس حدیث زیر بحث "صوموا الرویۃ الخ" میں بالعموم خطاب ہے۔ رویت شرط ہے۔ چاہے مشرق میں ہو یا مغرب میں ہو۔ جہاں پہلے ہو لوگ اس پر بشرط خبر معتبر شرعی تمام عمل کریں۔ ہاں اگر رسول اکرم روحی فداہ یوں ارشاد فرماتے کہ "صوموا الرویۃ بلدہ وافطروا الرویۃ بلدہ" یعنی روزہ رکھو تم اپنے شہر کا چاند دیکھ کر! اور اسی طرح افطار کرو تو اپنے شہر کا چاند دیکھ کر۔ تو بلا شک ہر ایک شہر کی رویت کو اپنے لیے تخصیص ہو جاتی جب علم طور پر ارشاد فرمایا ہو تو تخصیص کیونکر ہو سکتی ہے؟

الغرض حدیث زیر بحث میں رویت سے دیکھنے کے معنی ہرگز نہیں ہیں۔ اس کے معنی علم الیقین کے ہیں۔ یہ بات قرآن مجید سے ثابت ہے۔ اور اہل تحقیق کی بھی یہی رائے ہے بس۔
اس حدیث سے ہمارے مخالفین اپنے مسئلہ پر استدلال ہرگز نہیں کر سکتے۔ کیونکہ یہ ہمارے لئے دلیل قوی ہے اور ان کے مدعا کے مخالف ہے۔ فالحمد للہ۔

"تیسری بحث اس بارے میں کہ تار کی خبر معتبر ہے یا نہیں۔ اور اس بات کا ثبوت کہ کافر سے معاملات کے ضمن میں جو بات متعلق دینیات معلوم ہو وہ عند الفقہا معتبر ہے"

اب تیسری بحث "تار" کے متعلق ہے اور یہ ایک بڑی معرکۃ الآرا بحث ہے ہم کو چونکہ طول منظور نہیں ہے۔ اس لئے ہم نہایت اختصار کے ساتھ لکھیں گے۔ اس بارے میں ہم نے ایک خاص تحریر لکھی ہے۔ جو عنقریب شائع ہوگی۔ فمن شاء التحقیق فلیرجع الیہ
بات یہ ہے کہ آجکل "تار" نے وہ ترقی کی ہے کہ شاذ و نادر ہی کوئی شہر اور قصبہ اس "مفید محکمہ" سے محروم رہا ہو۔ ایک نہیں سیکڑوں "دینی" اور "دینوی" کام اس پر موقوف ہیں۔ یہ ایک ضروری البحث مسئلہ ہے۔ پس اگر اس کا اعتبار نہ کیا جائے (اور کیونکر کیا جائے) تو تمام کاروبار الٹ پلٹ ہو جائیں۔ اس لئے میں مختصر طور سے اسکے "معتبر ہونے کا" ثبوت پیش کرتا ہوں۔
آجکل بہتیرے ایسے مسئلے ہیں جو زمانے کی ترقی سے پیدا ہو گئے ہیں۔ اور سلف میں مطلقاً نہ تھے۔ اور اس لیے اس کو معتبر اور غیر معتبر ہونے کو بیان سے کتب سلف بالکل خالی ہیں۔ تو پھر اگر ان پر بحث کی جائے تو کیونکر؟ پس اس کی یہ صورت ہے کہ ان کو اور مسئلوں پر قیاس کر کے اصول فقہ سے چھان بین کر کے نکالا جائے۔ پس اسی طرح یہ تار کا مسئلہ ہے۔ کہ جسے ایجاد ہوئے تھوڑا عرصہ ہوا ہے۔ اس لیے کتب فقہ میں اس کی بحث بالکل نہیں ہے۔ تو اب اس کو کسی اور مسئلے پر قیاس کرنا چاہیے۔ وغیر ازیں چارہ نیست۔
اب اس کو ہم "عقل" اور "شرع" دونوں سے دیکھتے ہیں اور جانچتے ہیں۔
"عقل" تو اس بات کو مانتی ہی نہیں کہ تار میں جس پر آج تمام ہندوستان بلکہ دنیا کا دار مدار ہے

"غلطی" کا احتمال ہو، یا جعل کا خوف ہو کیونکہ اگر غلطی اور جعل کا احتمال ہو تو اتنا کاروبار اس کے اشارے پر کیونکر چلے. اگر "تار" میں لکھا ہو کہ فلاں مر گیا تو آپ اعتبار کر لیتے ہیں. کہ بیشک مر گیا. اگر اوس میں لکھا ہو کہ فلاں لڑکا پیدا ہوا تو آپ مان لیتے ہیں. اگر لکھا ہو کہ فلاں کی شادی ہوئی، چناں ہوا چنیں ہوا تو اس پر آپ عمل درآمد فرماتے ہیں. وقس علیٰ ھذا. پس جب ان تمام باتوں میں اعتبار کر لیا جاتا ہے، اور سر مو فرق نہیں ہوتا، تو پھر اس کی اور خبریں کیوں ناقابلِ اعتبار ہوں؟ اور کس طور سے اس پر غلطی کا احتمال ہو، جب کہ آج تک کبھی غلطی واقع نہیں ہوئی. تو عقل کے اقتضا سے تو انکار ہو ہی نہیں سکتا.

باقی رہی شرع، تو صرف اس پر یہی اعتراض کیا جا سکتا ہے. کہ خبر کفار کے ذریعہ سے آتی ہے. اور کفار کی ایسی خبر دینیں اعتبار نہیں ———— تو اس کا جواب باصواب یہ ہے کہ،

بیشک عبادات میں کفار کا قول معتبر نہیں لیکن معاملات میں معتبر ہے. اور یہ تمام کتب فقہ میں مذکور ہے پس اگر معاملات کی ضمن میں کوئی بات متعلقِ عبادات واقع ہو. تو وہ بلاشک معتبر ہے. یہ مسئلہ کسی قدر مثال طلب ہے اس لیے ہم ایک مثال پیش کرتے ہیں کہ اگر کسی مسلمان کا ایک نوکر کافر ہو اور چونکہ معاملات میں کافر کا قول معتبر ہے، اس مسلمان آقا نے اس نوکر کافر کو کچھ پیسے دیے کہ بازار سے گوشت لا دے. جب وہ گوشت خرید کر واپس آیا. تو اس نے اپنے مسلمان آقا سے کہا کہ "اشتریت من مسلم" یعنی یہ گوشت میں نے ایک مسلمان سے خریدا ہے اب یہ قول اس کا معاملات سے تعلق رکھتا ہے. اس لیے مسلمان نے معتبر سمجھا. لیکن اس کی ضمن میں یہ بات بھی ثابت ہو گئی. کہ اس نے جب مسلمان سے گوشت خریدا ہے تو لا محالہ اس نے بالتسمیہ ذبح کیا ہو گا. پس یہ بات جو ضمناً معلوم ہوئی ہے عبادات سے تعلق رکھتی ہے. مگر بوجہ ضمناً واقع ہونے کے معاملات میں داخل کر کے اس کو معتبر کیا گیا ہے اور شرع اجازت دیتی ہے کہ وہ گوشت خرید کردہ کافر مزے سے کھاؤ حلال اور طیب ہے.

اس مسئلے کی بنا پر ہم کہتے ہیں کہ "تار" معاملات سے تعلق رکھتی ہے.

اور اس لیے معتبر ہے. اور چونکہ اوس کے ضمن میں ہم کو یہ بات بھی معلوم ہو گئی کہ فلاں شہر یا قصبہ میں رویت ہو گئی ہے

تو اس کو ضرور بالضرور معتبر سمجھنا چاہیئے کیونکہ وہ معاملات کے ضمن میں واقع ہوئی ہے۔ فافہم۔

تتمہ

حضرات ناظرین!! ہمارے مخالفین علماء کلکتہ جو آج کل مخالفت کے ڈنکے بجا رہے ہیں۔ ہماری مخالفت کے قبل خود ہمارے موافق تھے۔ اور درالمختار عالمگیری وغیرہ کی بنا پر صاف اس بارے میں فتوا دے چکے ہیں۔ چونکہ صرف اون کو حضرت مولانا کی مخالفت منظور تھی۔ مخالفت کا اعلان کر بیٹھے چنانچہ سرگروہ مخالفین جناب قاضی حافظ عبدالشکور صاحب مرحبا ٹانڈوی اپنے رسالہ "تائید فرد المنن و طفیل سدل زمن" کے آخر میں جو غالباً جناب مولوی قادر علی صاحب کے رد میں لکھا گیا ہے ایک فتوی تحریر یہ فرماتے ہیں۔ جو بالکل ہمارے موافق ہے۔ اوسے دیکھکر تعجب آتا ہے۔ ہم اس فتوی فارسی کو یہاں پر مع ترجمہ درج کرتے ہیں۔ نقل کا الاصل۔

استفتا از رویت ہلال رمضان چہ میفرمایند علماء دین متین و مفتیان شرع مبین اندریں صورت مثلاً در کلکتہ بتاریخ بست ونہم شعبان المعظم رویت ہلال رمضان المکرم نگشت و در شہر دہلی شد پس لبعد از ادلہ شروط شہادت رویت ہلال از اصحاب دہلی برار باب کلکتہ روزہ واجب آید یا نہ چنانچہ مولوی قادر علی صاحب در وعظ خود فرمودہ اند کہ اگر ما بین فاصلہ شانزدہ فرسخ باشد کہ ہر فرسخ سہ کروہ انگریزی ست برار باب کلکتہ روزہ واجب نمیشود و اگر از ان اقل باشد واجب شود و عند الاستفسار تحقیق بتکرار تاریخ ہم چنین گفتند۔ بینوا توجروا۔ السائل شیخ کریم بخش۔

الجواب واعظ مذکور بالا دریں مسئلہ سراپا راہ خطا پیمودہ و تکرار بیجا نمودہ است و قید شانزدہ فرسخ محض بے اصل و بر خلاف کتب فقہ، بیان کردہ صحیح انیست کہ از رویت ہلال اہل مغرب لبعد از ادا شروط شہادت رویت ہلال برار باب مشرق روزہ واجب شود "کما جاء فی فتاوی درالمختار شرح تنویر الابصار ویلزم اھل المشرق برویۃ اھل المغرب" وھکذا فی فتاوی عالمگیریہ ولاعبرۃ لاختلاف المطالع فی ظاھر الروایۃ کما

فتاوی قاضی خان الخ انتہیٰ۔ ھکذا احکم الکتاب، واللہ اعلم بالصواب۔

هو المصوب

المجیب
محمد عبد الشکور مرحبا حنفی عفی عنہ

ما اجاب الفاضل الاریب والعالم اللبیب مدللا من الکتاب فهو صحیح بلا ارتیاب۔ من شك فیه، فقد خسر وخاب، واللہ اعلم بالصواب۔ کتبه العبد المذنب الربعی الی اللہ محمد المدعو بعبد اللہ غفرہ اللہ ووفقه بما یحب ویرضاہ الخ

بگویم من ترا این نکتہ بے عیب　　محمد کان عبد اللہ لا ریب

الحمد للہ رب العلمین والصلوٰۃ والسلام علی سیدنا محمد واٰله واصحابه والتابعین لهم باحسان یوم الدین۔ وبعد فانی وقفت علی ما اجاب الفاضل الادیب والعالم اللبیب ودلائله هذه من الکتاب صحیحة لا شك فیها ولا ریب فجزاہ اللہ عنا وعن سائر المسلمین خیر الجزاء ووفقنا وایاہ لاتباع سنة خیر الوری محمد صلعم۔ الراقم المذنب الفقیر المعترف بالذنوب والتقصیر محمد ابن جعفر علی المدنی عفی اللہ عنه۔

الجواب صحیح　الجواب صحیح　الجواب صحیح
والمجیب نجیح کتبنا محمد ہدایت اللہ مدرس۔　لا ریب فیه محمد عبد الرحمن عفی عنہ　کتبه محمد حسین علی عفی عنہ

الجواب صحیح　یہ جواب صحیح ہے
لا شك فیه محمد فتح علی عفی عنہ　محمد رمضان عفی عنہ

اس فارسی فتوی کا خلاصہ اردو میں درج ذیل ہے

ہلال رمضان کے بارے میں استفتار

علماء دین اور مفتیان شرع متین اس صورت میں کیا فرماتے ہیں کہ مثلاً ۲۹ شعبان المعظم کو رویت یہاں نہیں ہوئی مگر شہر دہلی میں ہوئی۔ پس جس وقت کہ شہادت معتبر شرعی پہونچ جاوے اس وقت اہل کلکتہ پر روزہ واجب ہوا یا نہیں کیونکہ ایک مولوی صاحب نے واعظ میں سولہ فرسخ کی قید لگا کر فرمایا ہے کہ اگر سولہ فرسخ سے فاصلہ کم ہو تو بیشک اہل کلکتہ پر روزہ واجب ہو سکتا ہے ورنہ واجب نہیں ہوتا اور اس پر ان کو بڑا زور ہے، آپ جواب بیان فرمائیے اللہ تعالیٰ آپ کو اجر عطا فرمائیگا۔

جواب یہ ہے کہ واعظ صاحب نے اس مسئلہ میں بالکل راہ خطا اختیار کی ہے سولہ فرسخ کی قید محض غلط اور خلاف فقہ ہے۔ بڑی سچی اور صحیح بات یہ ہے کہ مشرق والوں کے رویت ہلال سے مغرب والوں پر اگر شہادت کو

شہر والوں پر روزہ واجب ہو جاتا ہے جیسا کہ فتاویٰ در المختار میں جو تنویر الابصار کی شرح ہے لکھا ہے اہل مشرق پر اہل مغرب کی
رویت سے روزہ لازم ہو جاتا ہے اگر ان کی ثابت ہو جائے۔ اور اسی طرح فتاویٰ عالمگیری میں لکھا ہے کہ اختلاف
مطالع کا کچھ اعتبار نہیں ہے مغرب والے اگر چاند دیکھیں تو شہر والے شرعاً بخبر معتبر مشرق والوں پر روزہ واجب ہو جاتا
ہے۔ اور اسی قول پر فتویٰ ہے۔ المجیب (جواب دینے والا)
محمد عبد الشکور ہرا جالندھری عفی عنہ
جو جواب کہ جناب عالم فاضل مولوی عبد الشکور صاحب نے دیا ہے بالکل صحیح ہے اس میں کچھ شک نہیں جو اس میں شک
کرے فقد خسر و خاب۔ راقم بندہ گنہگار محمد عبد اللہ۔ بعد حمد و نعت واضح ہو کہ جو جواب کہ عالم فاضل مجیب نے
دیا ہے وہ بالکل صحیح اور حق ہے، اس میں کچھ شک نہیں اللہ تعالیٰ جواب دینے والے کو جزائے خیر عطا فرمائے راقم بندہ گنہگار
خطا وار، محمد ابن جعفر علی عفی اللہ عنہ، جواب صحیح اور حق ہے۔ جواب صحیح ہے۔ جواب صحیح ہے۔ جواب صحیح اور حق ہے
محمد عبد الرحمن عفی عنہ، محمد ہدایت اللہ عفی عنہ، محمد حسین علی عفی عنہ، محمد فتح علی عفی عنہ
یہ جواب صحیح ہے۔
محمد رمضان عفی عنہ
اب دیکھو کہ اس فتویٰ میں جناب مجیب صاحب نے صاف لکھ دیا ہے کہ قید شانزدہ منسوخ محض اور اصل
کمال خلاف کتب فقہ ہے اور یہی ہمارا قول ہے کہ مشرق کا مغرب پر اور مغرب کا مشرق پر اعتبار ہے مگر خدا جانے کیا سبب ہے کہ
یہی مولوی مجیب صاحب فی الحال ہمارے مخالف ہو گئے لیکن ہمیں امید قوی ہے کہ وہ جب غور سے ملاحظہ فرمائینگے تو ضرور اس انوکھے
مسئلے سے رجوع فرمائینگے جیسا کہ اہل حق کا طریقہ رہا ہے۔ اس صحیح مسئلے کے منکرین اور مخالفین کے لئے اگرچہ ہم نے
کچھ بھی نہیں لکھا اور سواد اعظم ہی اور نافہمی کے کچھ لکھ ہی نہیں سکتے لیکن مکرم مولوی محمد عبد اللہ صاحب اس
فتویٰ میں چونکہ تحریر کر چکے ہیں۔ اس لئے ہم نقلاً انہیں کی عبارت لکھ دیتے ہیں من شک فیہ فقد خسر و
خاب۔ اب ہم نے اختصار کے ساتھ تمام مسئلے کو اور بحث قول اختلاف المطالع کو غیر معتبر ہونے کو مسئلے کو نہایت عمدگی
سے ثابت کر دیا ہے جو لیکن منصف شخص کے لئے کافی اور شافی ہے۔ اگر ہمارے معزز مخالفین "چشم انصاف" سے ملاحظہ فرمائینگے
تو بلاشک اس مسئلے سے رجوع فرمائینگے اور ربنا ظلمنا انفسنا وان لم تغفر لنا وترحمنا" کا وظیفہ ورد زبان کرینگے۔
ورنہ تعصب نفسانیت اور ہٹ دھرمی کے لئے یہ چند سطور کیا حقیقت رکھتی ہیں دفتر کے دفتر ناکافی اور غیر شافی ہیں۔
اللہم اھدنا الصراط المستقیم صراط الذین انعمت علیہم غیر المغضوب علیہم ولا الضالین۔ آمین یا رب العلمین
راقم خادم الطلباء ابو الکلام آزاد۔ ثبتہ اللہ علی طریق السداد و دفع اللہ عنہ شر الاعتقاد۔ (دہلوی)

هدایۃ الرشید

کچھ دنوں سے کلکتہ میں "لعن یزید" کی بحث چھڑ گئی ہے۔ اور حضرات منکرین کی کچھ تحریریں بھی شائع ہوئی ہیں۔ اس لئے خاکسار آزاد نے یہ رسالہ جواز لعن میں نہایت کوشش سے لکھا ہے، اور منکرین کی جتنی دلائل ہیں مثل اقوالِ غزالی و ملا علی قاری و قصیدۂ امالی ان سب کا رد بطریقِ احسن کیا گیا ہے۔ اور کوئی دقیقہ راقم نے اٹھا نہیں رکھا ہے۔ زیادہ تعریف فضول۔ صرف اس قدر لکھنا کافی ہے کہ قدر ایں بادہ ندانی بخدا تا نچشی

یہ رسالہ عنقریب طبع ہو کر شائع ہوگا۔

المشتہر

ابوالکلام محی الدین احمد آزاد

اشتہار کتب مصنفہ مولانا خیر الدین صاحب

"الدرج الدرر البھیہ فی ایمان الآباء والامہات المصطفویہ"

ثبوتِ ایمان آباء و اجدادِ رسول کریم میں آج تک ایسی کوئی ضخیم کتاب جامع کسی زبان میں شائع نہیں ہوئی۔ متقدمین اور متاخرین مثل امام سیوطی، ابن حجر، عبد الحق وغیرہ کی تمام تصانیف کا مجموعہ ہے ضخامت پچاس جزو کاغذ اعلیٰ چھپائی لاجواب، اور لطائف میں وہابیہ کا رد بھی کیا گیا ہے۔ قابلِ دید۔ قیمت پختہ چھ روپیہ۔ **حفظ المتین عن لصوص الدین**۔ درج الدرر البھیہ کی تائید اور معترضین کا جواب مع تحقیق لفظ خدا و بیانِ شفاعتِ کبرا۔ و جواز استمداد وغیرہ۔ قیمت ۴؍ **خیر الامصار**۔ بمدینۃ الامصار۔ مدینہ مکرمہ کے فضائل اور شرف بسکہ معظم مع فوائد وغیرہ قیمت ۱۲؍ ۔ **اوراد خیوریہ** اس میں وہ دعائیں لکھی ہیں جو سینہ بسینہ مولانا تک پہنچیں ہیں۔ قیمت ۸؍

مسئلہ ضروریہ۔ اسمیں تصوف و عرفان اور چھ سوال کا جواب ہے نظم۔ قیمت ۸؍

اسباب السرور

اسمیں دو سو ایک باتیں ضروری لکھیں ہیں۔ آخر میں قصیدۂ عربی منظوم اسماء محبوب سبحانی مندرج ہے۔ قیمت عہ

یہ تمام کتابیں بہت کم رہ گئیں ہیں۔ جنکو ضرورت ہو مصنف علام سے نشان ذیل سے منگوالیں

کلکتہ محلہ امرتلہ لین نمبر مکان گیارہ ۱۱

اشتہار کتب نایاب

یہ کتابیں نایاب ہیں۔ انھیں طبع ہوتے آج پچاس ساٹھ برس ہو گئے۔ چند نسخے میرے پاس موجود ہیں جن صاحبوں کو درکار ہو خاکسار سے طلب فرمائیں۔

تاریخ ہندوستان فارسی۔ یہ انگریزی تاریخ کا فارسی ترجمہ ہے۔ جسے بحکم خاندان ٹیپو سلطان مولوی عبدالرحیم دہری گورکھپوری نے کیا تھا۔ نہایت خوب لکھائی اور چھپائی ایسی کہ آنکھوں میں نور آجائے ــــ قیمت ــ ہے۔ ضخامت تیس جزء۔

تاریخ نادری فارسی۔ اسمیں نادر شاہ کے تمام واقعات درج ہیں۔ آخر میں الفاظ مشکل کی ایک فرہنگ ہے تقطیع کلاں ضخامت پچیس جزء۔ قیمت ــ ہے۔

مآثر عالمگیری فارسی۔ اس میں عالمگیر کے تمام واقعات مجملاً و مفصلاً تشریح کے ساتھ مندرج ہیں۔ ابتدا میں پانچ چھ سو سے زیادہ ناموں کا جن میں علما شعرا اراکین سلطنت ہیں۔ ایک انڈکس ہے اور علاوہ بریں اسی طرح تیرہ سو قصبوں کے نام مندرج ہیں ضخامت چالیس جزء قیمت ـــ

نفحات الانس۔ یہ کتاب خوش خط نہایت تصحیح کیساتھ مع فہرست طبع ہوئی ہے۔ نولکشوری میں اغلاط کاغذ کی خرابی لکھائی بدنمائی ہے۔ یہ ان باتوں سے مبرا ہے اس میں چھ سات سو علما فقرا اولیا صوفیا شعرا عورات کے حالات ہیں۔ مؤلفہ حضرت جامی ــــ قیمت للعہ

المشتہر شمس الدین احمد۔ کلکتہ سندریا پٹی دکان نمبر ۱۰۲

امتیاز علی خاں عرشی

اسلامیات کا مطالعہ

خواتین و حضرات

رسم یہ رہی ہے کہ صدر اپنے خطبۂ صدارت میں اپنی ہیچمدانی اور کم ارزی کا ذکر کر کے انتخاب کرنے والے بزرگوں کا شکریہ ادا کرتا ہے۔

میں خطبہ لکھنے بیٹھا تو اسی رسم کو برتنے کا ارادہ تھا۔ لیکن آغاز کار ہی میں یہ خیال آیا کہ یہ تو انتخاب کنندہ جماعت کے فیصلے پر عدم اعتماد کا اظہار رہوا۔

نیز اپنے آپ کو ہیچمداں کہنا بھی "دعویٰ بزرگ" ہوا جو ابوشکور بلخی نے اس شعر میں کیا تھا کہ

تا بداں جا رسید دانش من   کہ بدانستہ ام کہ نادانم

اور جو بقولِ سقراط قابل احتراز ہے، لہٰذا میں یہ عرض کرتا ہوں کہ ــــ آپ نے اس بار کسی عالم کی جگہ ایک طالب علم کو آل انڈیا اسلامک اسٹڈیز کانفرنس کے پانچویں اجلاس کا صدر منتخب فرما کر صرف میری ہی نہیں مجھ جیسے ہزاروں طلبا کی جو عزت افزائی کی اس پر میں اپنی اور تمام طالبان علوم و فنون کی طرف سے آپ کا تہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔

---

* آل انڈیا اسلامک اسٹڈیز کانفرنس کے پانچویں اجلاس (۶ تا ۸ اکتوبر ۱۹۶۷ء) منعقدہ دہلی کا خطبۂ صدارت۔

اسلامیات کا مطالعہ

حضرات، میں طالب علم ہونے کے ساتھ کتابدار بھی ہوں، اور کتاب دار کا تعلق علمار سے اسی طرح کا ہوتا ہے، جیسا عطار کا طبیب سے، آپ جانتے ہیں کہ عطار طب کا باقاعدہ علم نہیں رکھتا، تاہم مختلف حاذق طبیبوں کے نسخے دیکھ دیکھ کر یہ ضرور پہچاننے لگتا ہے کہ زیرِ نظر نسخہ کس پایے کے طبیب کا مجوزہ ہے، اور مرض کے ازالے میں کس درجہ مددگار ثابت ہوگا۔ میں بھی تقریبًا ۲۵ سال تک مشرق و مغرب کے قدیم و جدید علمار و فضلار کی تصنیفات دیکھ کر جاننے لگا ہوں کہ کس کتاب کی تالیف و ترتیب، تدوین و تصحیح اور تحشیہ و تشریح محققانہ اور ماہرانہ ہے، اور کون سی کتاب کاروباری انداز پر مرتب ہوئی ہے۔

ہندوستان میں ایک سے زائد ادارے مشرقیات اور اسلامیات پر کام کر رہے ہیں۔ جہاں تک عربی، فارسی اور اُردو کے متون پر کام کرنے کا سوال ہے، ملک میں اس کا معیار خاصا بلند ہو چکا ہے۔ حیدر آباد، بمبئی، دہلی، علی گڑھ، رام پور اور پٹنہ سے شائع کردہ متون اس کا روشن ثبوت ہیں۔

اسلامیات پر مستقل کتابیں اور تحقیقاتی مقالے شائع کرنے میں دارالمصنفین اعظم گڑھ، ندوۃ المصنفین دہلی، اسلامک کلچر حیدر آباد اور جامعۂ ملیہ دہلی جیسے اداروں نے لائقِ ستائش خدمات انجام دی ہیں۔

ان کے علاوہ دہلی، علی گڑھ، لکھنؤ، پٹنہ، کلکتہ اور حیدر آباد کی یونیورسٹیاں بھی اس مہم میں ...... برابر ہاتھ بٹا رہی ہیں چنانچہ ان دانشگاہوں کے عربی، فارسی، اردو اور تاریخ کے شعبے، لسانیات و ادب اور تاریخ و تذکرہ پر طلبا سے ریسرچ کرا رہے ہیں، اور صورتِ حال یہ ہے کہ اگر صرف گذشتہ ۲۰، ۲۵ سال کے کاموں کا گوشوارہ مرتب کیا جائے تو ایم اے اور ڈاکٹریٹ کے لیے لکھے گئے مقالوں کا شمار سیکڑوں تک پہنچ چکا ہوگا۔ یہ صورت حال بڑی خوش آیند ہے۔

لیکن جہاں تک اسلامک اسٹڈیز کا تعلق ہے، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہمارے کام کرنے والوں کے ذہن میں اس کی حقیقت، غرض و غایت اور اس کے مالہ و ماعلیہ کا واضح تصور نہیں، اس لیے جو کام ہمارے یہاں ہوتا ہے، وہ لسانی، ادبی یا تاریخی زیادہ اور اسلامیاتی کم ہوتا ہے۔

اسلامیات کا مطالعہ

ہمیں سب سے پہلے یہ متعین کرنا چاہئے کہ اسلامک اسٹڈیز کا مفہوم کیا ہے۔ ایسا کیے بغیر یہ بات واضح نہیں ہو سکتی کہ کسی شخص، جماعت، ادارے، یا کسی تہذیب، ثقافت، فن، یا کسی عہد، خطے اور نسل کے عام مطالعے اور اسلامیاتی مطالعے میں بنیادی فرق کیا ہے۔ عربی زبان کا ایک تو عام مطالعہ ہے۔ اس میں لغت، اشتقاق، صرف، نحو، معانی، بیان، نثر اور نظم سب پر کام کیا گیا ہے، اور کیا جا رہا ہے۔ لیکن عربی ہی کا ایک مطالعہ اس نقطۂ نگاہ سے ہے کہ اسلامی تحریک شروع ہوئی تو عربی زبان کا کیا انداز تھا، اور اسلام نے اسے اپنے مقاصد کے لئے برتا تو اس میں کیا کیا انقلابات رونما ہوئے؛ علوم لسان میں سے کون کون سے علم اسلامی ضرورتوں کے تحت ایجاد کیے؛ اور کن فنون کو دوسری قوموں سے مستعار لے کر ان میں نئے اصول و ضوابط کا اضافہ کیا۔ اور ان سے کس حد تک اسلامی مقاصد اور ضرورتوں کی تکمیل ہوئی، یا وہ کس حد تک اسلامی ثقافت کے آئینہ دار ہیں۔ پھر اسلامی ثقافت کے زیر اثر عربی زبان نے ان زبانوں پر کیا اثر ڈالا، جن سے اسے سابقہ پڑتا رہا، اور خود ان زبانوں سے اس نے کیا کیا اثرات قبول کیے اور وہ اسلامی ثقافت کے لیے مفید ثابت ہوئے یا مضر۔ ظاہر ہے کہ ان دونوں اندازہای مطالعہ میں بین فرق ہے۔

اس کے بعد اسلامیاتی مطالعے کے مقصد کی تعیین و تحدید درکار ہے، تاکہ اس نصب العین کے پیش نظر زیادہ سے زیادہ مفید طریق بحث کی طرف رہنمائی ہو سکے۔ مقصد کی بلندی، وسعت اور اہمیت ہی طریق کار کی اصابت، افادیت اور مقبولیت کی ضامن ہوتی ہے۔ ہم کسی شخص سے بھی خدمت و فداکاری کا مطالبہ نہیں کر سکتے تا وقتیکہ پہلے یہ امر اس کے ذہن نشین نہ کر دیں کہ جس مقصد کے لیے قربانی درکار ہے، وہ بہر قیمت حاصل کرنے کا ہے۔

اس کے بعد اسلامیاتی مطالعے کے مبادی کی تحصیل کا مسئلہ سامنے آتا ہے۔ میری دانست میں اسلامیاتی مطالعہ کرنے والے کو سامی زبانوں میں سے عربی اور عربی کی پیشرو زبانوں میں سے عبرانی و آرامی کا علم ہونا چاہیے۔ آریائی زبانوں میں سے فارسی لازمی، اور پہلوی، ترکی اور پشتو استحسانی طور پر سیکھنا چاہیے، مغربی زبانوں میں انگریزی لازمی اور جرمن و فرانسیسی استحسانی حیثیت رکھتی ہیں۔ ان زبانوں کی تحصیل کے بغیر زیر بحث مطالعہ ناقص و ناتمام رہے گا، اور ہم عالمی برادری میں کوئی نمایاں مقام کبھی حاصل نہ کر سکیں گے۔

مبادی کے بعد اسلامیاتی مطالعے کے محور یعنی اسلام کا علم ضروری ہے یہ محور اس حیثیت سے زیر مطالعہ آئیگا کہ وہ عقائد و اعمال کا ایک منظم اور مربوط مجموعہ ہے۔ عقائد و اعمال کی بحث سے ذرائع علم کی بحث ابھرتی ہے، اور اس طرح ہم کتاب، سنت، اجماع، اور قیاس سے دوچار ہوتے ہیں ذرائع علم میں سے کتاب پر بحث کے ضمن میں عقائد و اعمال کے ساتھ ساتھ قصص و امثال، تاریخ و جغرافیا، اور لغت و قواعد زبان زیر بحث آتے ہیں۔

اس کے بعد یہ بحث سامنے آتی ہے کہ مذکورۂ بالا ذرائعِ علم کے مشتملات کے بارے میں اسلام کا دعویٰ کیا ہے۔ آیا یہ کلاً یا جزءً ا ابداع ہیں، یا امم سابقہ سے ماخوذ و مقتبس ہوئے ہیں۔ اس ضمن میں گرد و پیش کے دوسرے مذاہب کا تقابلی مطالعہ بھی لازم ہو جائیگا۔ اور یہیں یہودیت، نصرانیت، مجوسیت، صابئیت، بدھ مت اور ہند و مذہب کا براہِ راست علم بھی درکار ہوگا، تاکہ عدمِ علم یا کمیِ علم کی بنا پر غلط نتائج نکالنے کے مجرم نہ بنیں۔

کتاب و سنت کی تشریح و تفسیر میں جو اختلاف رونما ہوا، اس کے وجوہ و اسباب کیا تھے، اس سے بحث بھی بیحد ضروری ہے۔ یہ بحث مختلف کلامی و فقہی مذاہب اور اُن کے آرا و نظریات کی تحقیق و تفتیش تک پہنچاتی ہے، جس سے ہم یہ جان سکتے ہیں کہ ان اصولی و فروعی فرقوں کے تصادم آرا و نظریات کے کیا مذہبی و سیاسی نتائج نکلے۔ اسی ضمن میں یہ بحث بھی ہونا چاہیئے کہ اسلام کوئی نظریۂ حیات پیش کرتا ہے یا نہیں؟ اگر کرتا ہے، تو اُس نظریے کے حدود کیا ہیں، اور اس کی علمیت و افادیت پر زمان و مکان کے تغیر کا اثر پڑتا ہے یا نہیں! اگر پڑتا ہے، تو اس میں اس اثر کے قبول کرنے کی کس حد تک گنجائش ہے؟ نیز یہ کہ اس نظریۂ حیات نے دوسری قوموں پر زندگی کے مختلف میدانوں میں کیا اثر ڈالا۔ کوئی بھی نظریہ ہو، اس کی عملی افادیت پر غور کرتے وقت یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ جن لوگوں نے اس کی علمبرداری کی ہے، اُن کے اعمالِ زندگی کا اسلامیاتی نقطۂ نگاہ سے جائزہ لیا جائے۔ اس طرح ہم تاریخ و تذکرہ کی سرحد میں داخل ہو جاتے ہیں اور علما، صوفیا، اہلِ حرفہ، سلاطین، وزرا، اور امرا ہمارا موضوعِ بحث ہو جاتے ہیں۔ ان کی کتابِ زندگی کا مطالعہ ہمیں بتا سکتا ہے کہ اسلامی عقائد و اعمال نے خود آن طبقات پر اور ان کے توسط سے دوسرے انسانوں پر کیا مثبت اور منفی اثرات چھوڑے۔

چونکہ ادھر بیان کیے ہوئے تمام پہلوؤں پر بحث موضوعی اندازِ نظر سے بھی ہوتی ہے اور معروضی سے بھی۔ اس لیے انیسویں صدی کے نصفِ اول تک اسلامی علوم و فنون پر، یا اسلامی زاویۂ نگاہ سے غیر اسلامی علوم و فنون پر، موافقانہ یا مخالفانہ، جو کچھ کام ہوا ہے، وہ سب کا سب اسلام کا موضوعی مطالعہ قرار پاتا ہے، اور ہمارے لیے ضروری ہوجاتا ہے کہ اس سب کا تاریخی خاکہ مرتب کرکے اس کی عملی افادیت کا غیر جانبدارانہ جائزہ لیں۔

رہا اسلام کا معروضی مطالعہ۔ تو اس بارے میں غور و فکر کرنا ضروری ہے کہ مذہب کے معروضی مطالعے کے حدود کیا ہوں، اور کس قسم کے موضوعات میں کس حد تک اسے برتا جائے، اور کیا اسلام کا معروضی مطالعہ کیا بھی گیا ہے۔ اگر کیا گیا ہے، تو اُس مطالعے کا تاریخی خاکہ اور جائزہ کیا ہوگا۔

ایک عرصے سے ہندوستان میں تحصیلِ علم کا عمومی مقصد معاشی سہولتیں مہیّا کرنا ہے۔ ہر طالبِ علم یہ چاہتا ہے کہ ایسا علم حاصل کرے، جس کی جلد تحصیل ہوسکے۔ اور جو بآسانی ذریعۂ معاش بن جائے۔ چونکہ یہ نکتہ تحصیل کے آخری مرحلے تک پیشِ نظر رہتا ہے، اس لیے ڈاکٹریٹ کے لیے مقالے لکھنے والے بھی ایسا موضوع پسند کرتے ہیں، جس پر کم سے کم محنت میں اور تا بہ امکان کم ترین مدت کے اندر مقالہ مرتب ہوسکے، خواہ مقالہ داخل کردینے کے بعد یہ ہمیشہ کے لیے یونیورسٹی کے کسی تاریک کمرے ہی میں کیوں نہ پڑا سڑتا رہے۔

مزید برآں ہمارا ملک ابھی تک مختلف قسم کی ذہنی قید و بند میں جکڑا ہوا ہے۔ جب انسان کی عام رفتار میں خلل ڈالنے کے لیے معمولی سی بندش بھی کافی ہوتی ہے، تو جس کو مذہبی، سماجی، اور سیاسی قسم کی بہت سی بندشوں سے سابقہ ہو، اس کا ذہن آزادانہ غور و فکر کے لیے کیسے آمادہ ہوسکتا ہے، اور اگر کسی نہ کسی طرح یہ آمادگی بر روئے کار آبھی جائے، تو مسلمات قوم کے برخلاف نکل آنے والے نتائج کے اظہار کی ہمت کہاں! اور ہمت بھی قرض و ام کرلی جائے، تو قدر دان کون ہے جس کی ہمت افزائی سے کام کرنے والوں میں ولولہ پیدا ہو، اور ملک و قوم کو اعلیٰ صلاحیتوں کے محقق میسر آتے رہیں!

یورپ و امریکہ کے لوگ سالہا سال سے آزاد زندگی گزار رہے ہیں۔ اُن کی فکر بھی آزاد ہے، اور عمل بھی؛ پھر چونکہ ان کے اعلیٰ کاموں کے قدر دان موجود ہیں، حکومتیں بھی اور پبلک ادارے بھی، اس لیے انھیں کسی کام کے کرنے میں جو دشواریاں پیش ہوتی ہیں اُن کا حل بھی جلد یا بدیر نکل آتا

ہے۔ آزادی و قدر دانی نے اُن کے اندر جوش اور ہمت بھی پیدا کر دی ہے، اس لیے وہ ہمیشہ ع
تاکتے ہیں تو ثریا کی سنہری بوتل۔ یہ لوگ سچ مچ تارے توڑ رہے ہیں، اور مادی جسم کے ساتھ فلک
پیمائی پر قادر ہو چکے ہیں۔ چنانچہ ان کے اپنے جوش و ہمت اور ملک و قوم دونوں کی قدر دانی نے ہر میدان
میں انھیں کام کرنے کی بھرپور توفیق عطا کی ہے جس کی بدولت وہ مشرقیات پر زیادہ اور اسلامیات
پر بھی وہ کچھ کر گزر رہے ہیں جس کی ہم سے نقل بھی نہیں کی جاتی۔

آپ سب واقف ہیں کہ مستشرقین کئی کئی یورپین زبانوں کے ساتھ عربی و فارسی پر ہی نہیں، ان کی
پیشرو زبانیں، عبرانی، سریانی و آرامی اور پہلوی و اوستائی بھی جانتے ہیں۔ اس لیے جب وہ عربی یا
فارسی الفاظ کی ماہیت سے بحث کرتے ہیں تو ہم لوگ بجز آمنا و صدقنا یا کفرنا و کذبنا کے اور کچھ
نہیں کر سکتے۔ قرآن پاک نے اپنی زبان کے بارے میں "عربی مبین" ہونے کا دعوا کیا ہے، علماء
قرآنیات کی ایک جماعت اس کا مطلب یہ لیتی ہے کہ اس کتاب میں غیر عربی کوئی لفظ نہیں آیا، دیگر
علماء نے قرآن کے اندر معرب الفاظ کی تعیین کر کے اس کے خلاف رائے قائم کی ہے۔ بہر حال
یہ بزرگ زائد سے زائد یہ بتا سکے ہیں کہ فلاں لفظ اصلاً فارسی ہے یا نبطی یا سریانی وغیرہ۔ اُس کے
حسب و نسب سے تفصیلی بحث اس لیے نہ کر سکے کہ جن دوسری زبانوں کے الفاظ قرآن میں استعمال
ہوئے ہیں ان سے وہ بقدر ضرورت واقفیت نہیں رکھتے تھے۔ اس مبحث پر سیر حاصل بحث اگر کسی
نے کی تو وہ آرتھر جیفری (Arthur Jeffery) ایک انگریز مستشرق ہے۔ اس کی کتاب
(The Foreign Vocabulary of the Qur'an) پڑھ کر آپ کہیں کہیں
اختلاف تو کر سکتے ہیں، مگر اس کی محنت اور ژرف نگاہی کا اعتراف کیے بغیر نہیں رہ سکتے۔ کیونکہ
مولف نے اس کے لکھتے وقت وہ سب کتابیں اپنے سامنے رکھی ہیں جو مشرق و مغرب دونوں میں
اس موضوع پر لکھی جا چکی تھیں۔

چونکہ احادیث کے مجموعے مختلف انداز سے مرتب کیے گئے ہیں، اس لیے ان میں سے کسی خاص
حدیث کی تلاش اُس وقت تک آسان نہیں، جب تک تلاش والے کو ان مجامیع کے مشتملات پر کافی عبور نہ ہو
اس دشواری کو دور کرنے کے لیے علمائے اسلام نے مختلف انداز کے انڈکس مرتب کر کے غیر محدثین
یا کم حافظہ علما کے لیے سہولت پیدا کیں۔ تحفۃ الاشراف، الجامع الصغیر اور کنز العمال وغیرہ کتابیں

اس کوشش کا کامیاب نمونہ ہیں۔ لیکن جیسے جیسے حافظہ کمزور ہوتا جا رہا ہے اور مہارت گھٹ رہی ہے اس کی ضرورت بڑھتی جا رہی تھی کہ احادیث کے اندر مستعمل تمام الفاظ کا انڈکس مرتب کیا جائے، تاکہ ممکنہ آسانی کے ساتھ ہر حدیث تک رسائی ہو سکے۔ یہ کام بہت بڑا بھی تھا اور بیحد دشوار بھی، مگر مستشرقین کی ایک جماعت نے اس فولادی تلّے کو پانی کر کے بہا دیا "المعجم المفہرس لالفاظ الحدیث النبوی" کے نام سے ایک جامع کتاب مرتب کر کے چھاپنا شروع کر دی، جس کی ۴ جلدیں اب تک چھپ چکی ہیں۔ اس کتاب کی مدد سے آپ چند لمحوں میں صحاحِ ستہ، موطا امام مالک، مسند احمد بن حنبل اور سننِ دارمی کی کسی حدیث کے بارے میں معلوم کر سکتے ہیں کہ وہ کن کن کتابوں کے اندر کون کون سے ابواب میں مذکور ہے۔ اس کے مرتبین کی تعداد جلد اول میں ۳۸ اور جلد چہارم میں ۴۵ بتائی گئی ہے، ان میں صرف ۳ مسلمان نام، ڈاکٹر ہدایت حسین مرحوم، ڈاکٹر عبدالستار صدیقی مدظلہ اور اے، منصور نظر آتے ہیں، یہ محیر العقول کام ہالینڈ کے مستشرق ونسنک (A. G. Wensinck) کی قیادت میں ہوا ہے۔ تاریخ وسیرت وجغرافیا پر بھی ان حضرات کا کام قابلِ رشک ہے۔ سیرت ابن ہشام، طبقات ابن سعد، تاریخ طبری، تاریخ مسعودی، تاریخ یعقوبی، تاریخ بلاذری اور مغازی واقدی جیسی کتابیں انھیں کی تصحیح سے چھپی ہیں۔ یہی صورت حال ادبیات کی ہے کہ متقدمین کی بیشتر نادر و نایاب کتابیں انھیں کی تلاش و تحقیق کے زیرِ سایہ دوبارہ زندہ ہوئی ہیں۔ ان کی تصحیح و تحشیہ کے بعد کتنی نادر کتابیں شائع ہوئیں، یہ دیکھنا ہو تو نجیب العقیقی کی المستشرقون (عربی) یا ابو القاسم کی فرہنگ خاور شناسان ملاحظہ فرمائیے۔

ڈاکٹر بروکلمان (C. Brockelmann) نے تمام عالم کے عربی مخطوطات کی اور استاد اسٹوری (C. A. Storey) دنیا کے فارسی مخطوطات کی حیرت انگیز فہرستیں مرتب کر دی ہیں۔ جن حضرات کو انھیں استعمال کرنے کا موقع ملتا رہتا ہے، وہ ان کتابوں کی جامعیت اور افادیت سے کما حقہ واقف ہیں۔

یہی صورت حال پروفیسر براؤن (E. G. Browne) کی تاریخِ ادبیاتِ فارسی کی ہے کہ خود ایرانی علما بھی اس سے بہتر کتاب ابھی تک مرتب نہیں کر سکے۔ ادبیاتِ عرب کی تاریخ پر مصر و شام کے متعدد عالموں نے کتابیں لکھی ہیں، لیکن ڈاکٹر نکلسن کی کتاب تا ایندم اپنی جگہ پر ہے۔

غرض یہ ہے کہ اہلِ یورپ نے عربی و فارسی زبان کی جو کتابیں شائع کی ہیں، ندرت، قدامت، تصحیح، تہذیب اور صفا میں ان کا یہ عالم ہے کہ موجودہ عربوں کی ہمت اس سے قاصر ہوگئی کہ ان کا مثیل پیش کرسکیں؛ لہذا بعض عرب اداروں نے ان کے عکس چھاپ دینے کو اپنا کمالِ خدمت قرار دے لیا ہے۔

ان علما کے اتنے بڑے بڑے اور اتنے زیادہ کام کر لینے کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ جن زبانوں پر یہ لوگ کام کرتے ہیں، پہلے اپنے تمام پر ان کا بھرپور علم حاصل کرتے ہیں۔ بعدازاں متعلقہ ملک میں جاکر اپنی زباندانی کی تکمیل کرتے ہیں اور جب خود کام کرنے بیٹھتے ہیں، تو ان تھک کوشش اور انتہائی لگن اور خلوص سے اسے پایۂ تکمیل تک پہنچاتے ہیں۔ نتیجۃً ان کا کام پائدار بھی ہوتا ہے اور مفید بھی۔ میں یہ عرض نہیں کر رہا ہوں کہ ان کے کاموں میں غلطیاں نہیں ہوتیں، خود میں نے بہت سی غلطیوں کی گرفت کی ہے، اور دوسرے علما و فضلا کی بتائی ہوئی ان کی غلطیاں بھی میری نظر سے گزر چکی ہیں۔ ان میں صرف اختلاف نقطۂ نگاہ یا سہو سے پیدا ہونے والی کوتاہیاں ہی نہیں ہوتیں، ایسی لغزشیں بھی ہوتی ہیں جو غلط فہمی یا نتیجہ قرار پاتی ہیں۔ لیکن ان کا غلط ان کے صواب کے مقابلے میں ناقابلِ التفات ہے، اس لیے ہم مجبور ہیں کہ اپنے لب ان کی ستائش ہی میں کھولیں، اور ان کے احسانات کا برابر شکریہ ادا کرتے رہیں کیونکہ یہ لوگ مشرقیات پر عموماً اور اسلامیات پر خصوصاً اتنا کام نہ کر چکے ہوتے، تو آج ہم بہت کچھ محروم الارث ہوتے۔

ان کے بالمقابل ہم اولاً تو کام ہی کم کرتے ہیں، اور کرتے بھی ہیں، تو انتہائی سہل انگاری اور بیجا سیدلی کے ساتھ۔ گویا وہ کام ہم پر بار ہے۔ میری دانست میں اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ہم میں جو قدیم اندازِ فکر کے ہیں، وہ مغربی علوم اور زبانوں سے ناواقف ہیں، اور جن کی تعلیم جدید انداز پر ہوئی ہے، وہ نہ صرف عربی و فارسی علوم و فنون میں پس ماندہ ہوتے ہیں بلکہ خود زبانِ عربی و فارسی کا ضروری علم ہی نہیں رکھتے۔ چنانچہ بہت سے تاریخ ہندوستان کے مسلم عہد پر کام کرنے والے سرے سے فارسی نہیں جانتے، اس لیے یا کسی منشی سے معمولی معاوضے پر فارسی تاریخوں کا ترجمہ سن سن کر نتائج نکالتے ہیں، یا انگریزی تراجم پر اپنے کام کا مدار رکھتے ہیں۔ ایک اسکالر "ہندی شاعری پر اسلامی تصوف کے اثرات" کے عنوان پر ڈاکٹریٹ کے لیے مقالہ لکھ رہے تھے اور فارسی

ہی نہیں اُردو سے بھی ناواقف تھے۔

چوں کہ ہندوستان ہمیشہ سے علمی دنیا میں سربلند رہا ہے، پھر یہاں علمی ذخائر کی بھی فراوانی ہے، اب حکومت بھی تحقیقاتی مساعی میں فراخدلی سے امداد کرنے کو آمادہ رہتی ہے، لہٰذا یہاں کے اربابِ علم و دانش کو کوتاہ دستی سے کام نہیں لینا چاہیے، اور نہ صرف خود اعلیٰ علمی کام کرنا چاہیے، بلکہ اپنی تعلیمی و تدریسی رہنمائی سے ایسی نسل بھی تیار کر دینا چاہیے، جو دنیا کے علم میں عموماً اور اسلامیات میں خصوصاً ملک و قوم کے نمایاں نمایاں کام کرنے کی اہلیت رکھتی ہو۔ اگر اس طرف جلد توجہ نہ کی گئی، تو وہ وقت قریب ہی ہے کہ انگریزی دانشگاہوں میں عربی اور فارسی کے جاننے والے عنقا ہو جائینگے۔ کیونکہ دنیا سے علم و ہنر فی زمانہ بالخصوص انحطاط کی طرف بہت تیز رفتار ہے۔

آج یہ بات اور مزید قرآن کے مطالعہ کرنے والوں نے اس کی تعلیم کو حقیر ثابت کرنے کے لیے اس کے بیانات بدلتے ہیں۔ سائنس اور تاریخی اعتراضات کیے ہیں۔ مثلاً کبھی یہ کہتے ہیں کہ ان کے عقائد و اعمال قدیم مذہبی نوشتوں سے ماخوذ ہیں۔ کبھی فرماتے ہیں کہ اس کے فلاں فلاں قصے یا فلاں فلاں تذکرے کے مخصوص اجزاء بے سروپا ہیں کیونکہ تاریخوں میں ان کا ذکر نہیں ملتا، یا اس کے بیان کے خلاف ملتا ہے، کبھی ارشاد ہوتا ہے کہ آسمان و زمین وغیرہ کائناتی حقائق کا تذکرہ غیر عالمانہ ہے۔ موجودہ علم و تحقیق نے ثابت کر دیا ہے کہ آسمان صرف حدِ نظر ہے، زمین سورج کے گرد اور چاند زمین کے گرد گھوم رہا ہے، نیز زمین ایک ہے یا پھر ۹ وغیرہ۔

ہندوستان و مصر کے علمائے اسلام نے مذکورہ بالا علما کے مقابلے میں جو رویہ اختیار کیا، وہ نقل کو عقل کے مطابق ثابت کرنے کا تھا۔ آپ حضرات بخوبی واقف ہیں کہ مادی علم روز بروز ترقی کر رہا ہے، اور جو آج کی حقیقت ہے، وہ کل کا باطل بن رہی ہے۔ یہی حقیقت رہی ہے۔ میں اب یہ کوشش ختم کر دینی چاہیے اور قرآن پاک کے مشتملات کو جوں کا توں مان لینا چاہیے، کیونکہ اگر ہم اپنے پیشرو مفسروں اور متکلموں کی پیروی میں عقل و نقل کے تطابق کی ایسی ہی کوشش کرتے رہے تو جن لوگوں کی تسکینِ طبع کے لیے یہ کام کیا جاتا ہے، خود وہی یہ سمجھنے پر مجبور ہو جائینگے کہ قرآن میں سرے سے حقائق کا ذکر ہی نہیں، ورنہ اس کی حقیقتیں اتنی پائیدار نہ ہوتیں کہ مادی علم کے ہر دباؤ کے

ساتھ مڑ جائیں۔

علاوہ ازیں انھیں یہ خیال بھی پیدا ہو سکتا ہے کہ قرآن پاک جن پر پہلی بار نازل ہوا تھا، وہی اس کو نہ سمجھ سکے، اور نہ صرف یہ کہ وہی نہ سمجھے، بلکہ یہ سلسلہ تا ایندم جاری و ساری ہے، اور خدا جانے کب تک یہی صورت رہیگی۔ میرا دل ان دونوں باتوں کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔

بے شک قرآن میں ایسے حقائق بھی مذکور ہیں جن کی ماہیت فہم انسان سے بالا تر ہے اور رہیگی۔ مگر جن آیات میں یہ حقائق مذکور ہیں، قرآن نے انھیں متشابہات فرمایا، اور ان پر بحث وتجیص اور ان کی تاویل و تفسیر سے روکا ہے۔ قرآن کے الفاظ میں ان آیات پر غور وخوض کرنے والے دل کے مریض ہوتے ہیں۔ اہلِ ایمان کا کام یہ ہے کہ وہ انھیں برحق مانتے ہوئے ان پر بحث وتجیص سے احتراز کریں، کیونکہ وہ کسی طرح بھی ان آیات کے حقیقی مطلب کو نہ پا سکینگے اور نتیجۃً تفسیر بالرائے کے جرم کے مرتکب ہونگے۔

مولانا ابوالکلام مرحوم ومغفور نے ترجمان القرآن کے دیباچے میں تفسیر بالرائے کے بارے میں لکھا ہے:

"تفسیر بالرائے میں رائے بمعنی لغوی نہیں ہے، بلکہ رائے مصطلحۂ شارع ہے، اور اس سے مقصود ایسی تفسیر ہے جو اس لیے نہ کی جائے کہ قرآن کیا کہتا ہے، بلکہ اس لیے کی جائے کہ ہماری کوئی ٹھہرائی ہوئی رائے کیا چاہتی ہے، اور کس طرح قرآن کو کھینچ تان کر اُس کے مطابق کر دیا جا سکتا ہے۔ مثلاً قرآن کے طریق استدلال کو منطق جامہ پہنانا، یا جہاں کہیں آسمان اور کواکب و نجوم کے الفاظ آگئے ہیں، یونانی علم ہیئت کے مسائل چپکانے لگنا یقیناً تفسیر بالرائے ہے۔

"یا مثلاً آج کل ہندوستان اور مصر کے بعض دانش فروشوں نے یہ طریقہ اختیار کیا ہے کہ (انھیں کے لفظوں میں) زمانۂ حال کے اصولِ علم وترقی قرآن سے ثابت کیے جائیں، یا بقول ان کے فلسفہ وسائنس اس کی ہر آیت میں بھر دیا جائے۔ گویا قرآن صرف اس لیے نازل ہوا ہے کہ جو بات کوپرنیکس اور نیوٹن نے یا ڈارون اور

اور ولیس نے بغیر کسی الہامی کتاب کی فلسفہ اندیشیوں کے دریافت کرلی، آسے چند صدی پہلے سموں اور تجارتوں کی طرح دنیا کے کان میں پھونک دے، اور پھر وہ صدیوں تک دنیا کی سمجھ میں نہ آئیں، یہاں تک کہ موجودہ زمانے کے مفسر پیدا ہوئے، اور تیرہ سو برس پیشتر کے معنے حل فرمائیں۔ یقیناً یہ طریق تفسیر بھی ٹھیک تفسیر بالرائے ہے۔" (ترجمان القرآن ۱/۷۲)

سرسید علیہ الرحمۃ کی تفسیر بالرائے پر یہی اعتراض کیا گیا کہ یہ روز روز کی تاویلیں تو قرآن وکھلونا بنا دیںگی تو انھوں نے مقدمہ تفسیر القرآن (صد ۱۹) میں ارشاد فرمایا:

"ہم اس طعنے کو بطور ایک بشارت کے نہایت خوشی سے تسلیم کرتے ہیں، کیونکہ ہمارا یقین ہے کہ قرآن مجید حقیقتِ امور کے مطابق ہے، کیونکہ وہ ورڈ آف گاڈ ہے اور بالکل ورک آف گاڈ اس کے مطابق ہے۔ مگر اس میں بڑا معجزہ یہ ہے کہ ہمارے ہر درجۂ علم میں ان امور میں جن کی ہدایت کے لیے قرآن نازل ہوا ہے، یکساں ہدایت ہے۔ اس کے الفاظ ایسے اعجاز سے نازل ہوئے ہیں کہ جہاں تک ہمارے علوم کی ترقی ہوتی جائے گی، اور اس ترقی یافتہ علوم کے لحاظ سے ہم اس پر غور کرینگے، تو معلوم ہوگا کہ اس کے الفاظ اس لحاظ سے بھی مطابق حقیقت ہیں، اور ہم کو ثابت ہو جاویگا کہ جو معنی ہم نے پہلے قرار دیے تھے اور اب غلط ثابت ہوئے، وہ ہمارے علم کا قصور تھا، نہ الفاظِ قرآن کا۔ پس اگر ہمارے علوم کو آئندہ زمانے میں ایسی ترقی ہو جائے کہ اس وقت کے امورِ محققہ کی غلطی ثابت ہو، تو ہم پھر قرآن مجید پر رجوع کرینگے، اور اس کو ضرور مطابق حقیقت پا وینگے، اور ہم کو معلوم ہوگا کہ جو معنی ہم نے پہلے قرار دیے تھے، وہ ہمارے علم کا نقصان تھا، قرآن مجید ہر ایک نقصان سے بری تھا۔"

مجھے یقین ہے کہ میری طرح بہت سے اہل علم بھی اس جواب سے مطمئن نہیں ہونگے، اور وہ اس کا حل تلاش کرچکے ہونگے، یا تلاش کرنے میں مشغول و مصروف ہوں گے، بہرحال میں نے اپنی

مگر جو سوچا سمجھا اور طے کیا ہے، وہ پیش کرتا ہوں:

یہ ہم سب جانتے ہیں کہ قرآن عربی زبان میں قریش کے محاورہ پر نازل ہوا ہے۔ یہ بھی سب کا مسلمہ ہے کہ الفاظ قرآنیہ کبھی حقیقی معنی میں استعمال ہوئے ہیں اور کبھی مجازی میں۔ یہی وجہ ہے کہ خود قرآن پاک میں ذات باری کے لیے "لیس کمثلہ شئ" کی تصریح کے ساتھ ید اللہ فوق ایدیہم، اینما تولوا فثم وجہ اللہ، ثم استوی علی العرش اور وسع کرسیہ السموات والارض بھی موجود ہے۔ اگر ید وغیرہ کا استعمال مجازی معنی میں تسلیم نہ کیا جائے، تو ذاتِ باری کی تجسیم کا قائل ہونا پڑیگا جو جمہور اسلام کے خلاف ہے۔

علاوہ ازیں قرآنِ پاک میں انھیں پیغمبروں اور کتابوں کا ذکر ہے، جن سے اہل عرب آگاہ تھے؛ انھیں عقاید و رسوم کی تردید یا تائید ہے، جو عربوں یا اُن کے گرد و پیش کی امتوں میں پائے جاتے تھے؛ اور انھیں امتوں کے قصے مذکور ہوئے ہیں جو عربوں کی جانی پہچانی تھیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو مخالفین اولین پر وہ اخلاقی اثر نہ ہوتا، جو براہِ راست علم و معرفت کا نتیجہ ہوا کرتا ہے۔ نیز قرآن میں ایشیا، افریقہ اور یورپ کے دور دست ملکوں اور پیغمبروں اور امتوں کے قصے بیان کیے جاتے، تو عرب کے عام لوگ بھی اُسے من گھڑت اور خیالی قصے مان کر نظر انداز کر دیتے۔

یہی صورت حال انسان سے متعلق علم کی بھی ہے کہ قرآن میں وہی باتیں مذکور ہوئی ہیں جن سے اہل عرب آگاہ تھے۔ کوئی ایسی بات جو اس وقت کے علم کے خلاف ہو، بیان نہیں کی گئی، کیونکہ ایسا کیا جاتا تو بحث وتمحیص کا رخ اخلاق سے ہٹ کر علم تشریح الاعضا اور تشریح افعال الاعضا کی طرف ہو جاتا، جو قرآنِ پاک کا منشا نہ تھا۔ مثلاً قرآن پاک کی آیات خَتَمَ اللّٰہُ علیٰ قُلُوبِھِم، یا لَھُم قُلُوبٌ لَّا یَعقِلُونَ بِھَا، یا اَلَّا مَن اَتَی اللّٰہَ بِقَلبٍ سَلِیمٍ سے معلوم ہوتا ہے کہ علم و ادراک اور تمیز و اختیار اور رد و قبول کا سرچشمہ دل ہے، حالانکہ ہم سب واقف ہیں کہ مذکورۂ بالا خدمات دل سے نہیں، دماغ سے متعلق ہیں، اور دل کا کام پورے جسم میں خون پہنچاتے رہنا ہے اور بس۔ اس کی وجہ صرف یہی ہے کہ اس وقت کی دنیا ہر طرح کی حس و حرکت کا منبع دل کو مانتی تھی۔ عرب بھی اس سے مستثنیٰ نہ تھے۔ ایسی صورت

میں قرآن میں دل کی جگہ دماغ ہوتا، تو اہلِ عرب رسول اللہ صلعم کو روزمرہ کے عام علم سے بھی نا آگاہ سمجھتے، اور قبولِ اسلام کی راہ میں بہت سی اور دشواریاں پیدا ہو جاتیں۔

میری دانست میں قرآن کے اندر بروجِ آسمانی کا ذکر بھی اسی نوع کا ہے۔ اور یہی توجیہ سات آسمانوں اور سات زمینوں وغیرہ کی بھی ہے۔ اہلِ عرب اسی کے قائل تھے، لہٰذا قرآن میں ان کے ان جیسے مسلمات کی علمی تردید نہیں کی گئی، کیونکہ نزولِ قرآن کا یہ منشا ہی نہ تھا، بلکہ ان مسلمات کی پشت پر جو عقائدِ باطلہ کام کر رہے تھے، ان پر بھرپور حملہ کیا گیا، اور مختلف آیات میں یہ بتایا جاتا رہا کہ زمینوں، آسمانوں، سورج، چاند، زحل و مشتری وغیرہ تمام اجرامِ سماوی کا خالق، مالک اور مدبّر صرف اللہ ہے۔ خود ان میں کسی طرح کی ارادی قوت و طاقت نہیں کہ جس سے کام لے کر انسان کو نفع یا نقصان پہنچا سکیں، اسی لیے یہ معبود بننے کی صلاحیت سے بھی یکسر محروم ہیں۔

اسی پر دوسرے طبیعاتی امور کو قیاس فرمالیجیے کہ اُن کا مذکور بھی مخاطبینِ اوّلین کے علمی مسلمات کے مطابق کیا گیا ہے۔

رہے قصصِ قرآنی، تو وہ بھی وہی مذکور ہیں، اور اسی انداز پر مذکور ہیں، جن سے اہلِ عرب، یہودی، مسیحی، صابی اور مشرک واقف تھے۔ ہاں، جہاں کہیں ان لوگوں نے کوئی ایسی بات کسی ہستی سے منسوب کر رکھی تھی، جو تعلیماتِ اسلام کے خلاف تھی، اس کی تردید ضرور کر دی گئی ہے تاکہ بیانِ قصص سے جو فائدہ مطلوب ہے، وہ کسی طرح متاثر نہ ہو، جیسے حضرت عیسیٰ و مریم علیہما السلام کے واقعات کے بیان میں نظر آتا ہے۔

میں اپنے مدّعا کو مختصر مگر جامع الفاظ میں اس طرح ادا کر سکتا ہوں کہ قرآن پاک میں جو کچھ مذکور ہے، وہ تمام تر حقیقت ہے، مگر حقائقِ قرآنی کی دو قسمیں ہیں، حقائقِ نفس الامری اور حقائقِ مسلّمۂ قوم۔ ذات و صفاتِ باری، ملائکہ، جنت و دوزخ وغیرہ سے متعلق قرآن کا حصہ معنیً تو حقیقتِ نفس الامری ہے، مگر لفظاً حقیقتِ مسلمۂ قوم ہے۔ زمین، آسمان، بروجِ سماوی، سورج اور چاند وغیرہ کائناتی اشیا کا تذکرہ یا قصص و امثالِ قرآنی کا بیان انھیں دونوں قسموں کے اندر سما جاتا ہے۔

قرآن کے حقائقِ نفس الامریہ غیر متبدل ہیں۔ یہ ازل تا ابد ایک رہیں گے۔ رہے حقائقِ

مسلمہ قوم، تو آن میں علم کی ترقی کے ساتھ تغیر و تبدل ہوتا رہا ہے، اور آیندہ بھی ہوگا۔ لہٰذا ہمیں عقل و نقل کے تطابق کی مزید کوشش ترک کر دینا چاہیے، اور قرآن کو فلسفہ و حکمت کی جگہ تزکیۂ نفس، تدبیرِ منزل اور سیاستِ مدن کے میدانوں میں صراطِ مستقیم کی طرف رہنمائی کرنے والی کتاب مان کر اُس پر عمل پیرا ہونا چاہیے۔

نذیر احمد

فارسی میں الفاظ کی تصحیح کا مسئلہ

فارسی زبان میں الفاظ کی صحیح قرأت اور صحیح تلفظ کا مسئلہ نہایت دشوار مسئلہ ہے۔ قرأت کے سلسلے میں سب سے بڑا اشکال یہ ہے کہ اس زبان میں چھوٹے مصوتات کے داخل حرف نہ ہونے کی بنا پر اعراب کے اعتبار سے الفاظ کا تعین اکثر دشوار ہو جاتا ہے۔ یہ دشواری عربی الاصل اور فارسی الاصل دونوں قسم کے الفاظ میں یکساں طور پر محسوس کی جاتی ہے حالانکہ اول الذکر الفاظ جب اصل عربی میں مستعمل ہوتے ہیں، تو ان کی قرأت میں کوئی اشکال نہیں ہوتا، اس لیے کہ عربی زبان میں اعراب سے قواعدِ زبان کا کام لیا جاتا ہے۔ اعراب کے لحاظ سے الفاظ کی قرأت اور تلفظ کے تعین میں جو دشواری لاحق ہے، اس کے ساتھ ہی الفاظ کی صحیح ہیئت کی تعیین بھی فارسی زبان کا ایک پیچیدہ مسئلہ ہے۔ اس کے دو خاص سبب ہیں، اول یہ کہ ہماری زبان کے رسم خط کی بعض مخصوص خصوصیات کی بنا پر لفظ کے تعین میں دشواری ہوتی ہے، ذرا سی عدم توجہ سے لفظ کی مختلف شکلیں سامنے آجاتی ہیں، پھر غلط اور صحیح شکل میں امتیاز کرنا نہ صرف دشوار بلکہ بعض وقت ناممکن ہو جاتا ہے۔ اس کے نتیجے میں الفاظ کی تحریف و تصحیف میں زبردست اضافہ ہوتا رہتا ہے، دوسرا سبب یہ ہے کہ فارسی میں الفاظ کا "مادہ" معلوم کرنا دشوار ترین امر ہے، اس صورتِ حال کے پیشِ نظر لفظ کی صحیح شکل کا امتیاز اکثر محال ہوتا ہے، عربی زبان کا معاملہ اس کے برعکس ہے۔ اس زبان میں مادے میں تھوڑے سے تغیر و تبدل سے نئے الفاظ کی تشکیل ہوتی ہے، اس بنا پر ہر لفظ کا مادہ معلوم کر لینا آسان ہے اور اصل اور محرف شکلوں کی تعیین سے متعلق دشواری نہیں ہوتی۔

فارسی میں الفاظ کی تصحیح کا مسئلہ

لیکن اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ فارسی کے سارے الفاظ غیر متعین اور غیر متحقق ہیں، بلکہ صورت یہ ہے کہ جو الفاظ کثیر الاستعمال نہیں ہوتے، بلکہ اکثر قدیم متون میں آتے ہیں، ان کے تعین کا مسئلہ دشوار ہے ورنہ عام استعمال کے الفاظ میں جو تحریف ہوتی ہے، اس کا اندازہ بآسانی لگایا جا سکتا ہے۔

ہم نے جن امور کی طرف اشارہ کیا، ان سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ فارسی ایک دشوار زبان ہے، اور اس پر قدرت حاصل کرنا نہایت مشکل کام ہے۔ جب الفاظ کے صحیح تعین و تلفظ و صحیح قرأت کا مسئلہ الجھا ہوا ہو، تو زبان کے اور پیچیدہ مسائل کا ذکر ہی کیا ہے۔ حد یہ ہے کہ حروف کی مخصوص خصوصیات کی بنا پر بعض حالتوں میں لفظ کی ابتدا اور انتہا ہی مشکوک ہو جاتی ہے، یعنی یہ نہیں معلوم ہوتا کہ لفظ کہاں سے شروع اور کہاں پر ختم ہوتا ہے۔

جہاں تک الفاظ کے تعین اور ان کے تلفظ کا تعلق ہے، یہ فرہنگوں کے دائرۂ عمل میں شامل ہے (پہلا) فرہنگو میں جہاں الفاظ کے معنی اور محلِ استعمال بتائے جاتے ہیں، وہیں مقدم طور پر ان کی صحیح ہیئت اور صحیح تلفظ بھی درج ہوتا ہے، مگر افسوس کی بات ہے کہ فارسی فرہنگیں اس اعتبار سے حد درجہ ناقص اور نامکمل ہیں۔ ان میں لفظ کا صحیح تعین ہوا ہے، نہ ان کی قرأت ہی منضبط کی گئی ہے اور نہ الفاظ کے مادے اور "ریشے" سے بحث کی گئی ہے۔ اس بنا پر ان سے اکثر مسائل سلجھنے کے بجائے اور الجھ جاتے ہیں۔ اکثر ایسا دیکھا گیا ہے کہ فرہنگوں کے قلمی نسخوں میں الفاظ، معانی، سند کے اشعار وغیرہ سب ایک ہی سطر میں بغیر کسی حدِ فاصل کے لکھے گئے ہیں۔ ایسا بھی ہوا ہے کہ لفظ کا ایک جزا ایک سطر کے آخر میں اور دوسرا جز دوسری سطر کے اول میں ہے۔ اسی طرح اکثر ابیات کے کچھ ابتدائی الفاظ سطر کے آخر میں اور آخری الفاظ دوسری سطر میں درج ہوئے۔ اس بنا پر فضلا کے لیے یہ فیصلہ کرنا کہ لفظ کونسا اور معنی کونسا ہے، مشکل کام تھا اور یہ کام جب کم سواد کاتبوں کے ذریعے عمل میں آیا تو بآسانی قیاس ہو سکتا ہے کہ فارسی فرہنگیں کس حد تک قابلِ اعتبار رہ گئیں۔ جن سے غلط اور محرف الفاظ کی نشاندہی کی توقع تھی، وہی تصرفات و تحریفات میں اضافے کے موجب ہوئے۔ غرض اکثر فارسی فرہنگوں کا مطالعہ خصوصاً قدیم لغات کا۔ بڑا مایوس کن ثابت ہوتا ہے۔

ایک قابلِ توجہ امر یہ ہے کہ اکثر فارسی فرہنگ نویس اصولِ فرہنگ نویسی پر پوری طرح عمل کرنے سے قاصر رہے۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ فارسی میں فرہنگ نویسی کی طرف بہت دیر میں توجہ ہوئی۔ اس زبان

میں جو قدیم ترین فرہنگ دستیاب ہوئی ہے، وہ اسدی طوسی کی "لغتِ فرس" ہے۔ یہ پانچویں صدی ہجری کے وسط میں مرتب ہوئی۔ اس وقت فارسی ادب پر تقریباً دو سو سال کا زمانہ گذر چکا تھا۔ اتنی تاخیر سے لغت لکھنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ قدیم ایران کی زبانوں سے جن سے فارسی کے سارے الفاظ (باستثناء عربی الاصل) مستفاد تھے، لغات نویس کی مغایرت بڑھتی گئی جوں جوں زمانہ گذرتا گیا، فرہنگیں وجود میں آتی گئیں، لیکن ان میں کسی ایک میں بھی لفظ کے اصل و مادّے سے بحث نہیں ہوئی۔ نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ اگر کسی فارسی لفظ کی اصل آج معلوم کرنا ہو، تو صفحے کے صفحے سیاہ کرنا پڑینگے اور معاملہ پھر بھی ظن و تخمین سے آگے نہیں بڑھیگا۔ اور اب یہ کام اتنا دشوار ہوگیا ہے کہ اگر زبان شناس اس امر کی طرف توجہ کریں اور مدّتِ دراز تک لفظوں کی تحقیق و تدقیق ہوتی رہے پھر بھی خاطر خواہ کامیابی نہیں ہوسکتی، اس لیے کہ قدیم ایرانی زبانوں کا بیشتر سرمایہ ضائع ہوچکا ہے، ایسی صورتِ حال میں فارسی کے تمام الفاظ کی اصل اور ان کے مادّے کا دریافت کرنا ناممکن ہوگیا ہے۔ مشہور زبان شناس استاد ہننگ، جن کی عمر کا بیشتر حصہ قدیم ایران کی زبانوں کی تحقیق و تدقیق میں صرف ہوا، عرصے سے زبانِ فارسی کی فرہنگِ اشتقاقی کی ترتیب و تکمیل میں مصروف تھے، مگر ان کی دفعتہً موت سے یہ کام ناتمام رہ گیا۔ یہ معما کسی طرح حل نہ ہوسکا کہ اہلِ ایران جنھوں نے عربی زبان کی فرہنگ نویسی میں اس درجہ جدّتِ طبع دکھائی تھی، خود اپنی زبان کی فرہنگ مرتب کرنے سے کیوں غافل رہے اگر انھوں نے فرہنگ لکھی بھی تو نہایت ناقص اور ادھوری۔

ہم یہاں فارسی فرہنگوں کے بیان کی روشنی میں کچھ الفاظ کا مطالعہ اس غرض سے پیش کرتے ہیں تاکہ اندازہ ہوسکے کہ الفاظ کی تحقیق کا معاملہ کیسا پیچیدہ ہے۔ اگرچہ یہ موضوع جس وضاحت کا مستحق ہے، وہ اس وقت پیش نظر نہیں، اس کی تفصیلی بحث میں نے دوسری جگہ پیش کردی ہے، فی الحال چند مزید الفاظ فرہنگ نویسوں کے اصلی بیان کی روشنی میں جانچے جا رہے ہیں، اس سے اصل مسئلے کی نزاکت اور اہمیت کا اندازہ ہوسکیگا۔ جن فرہنگوں کا یہاں ذکر ہوا ہے، ان میں قدیم فرہنگوں میں صرف دو یعنی لغتِ فرس اسدی (تالیف قبل ۴۶۵ھ) اور صحاح الفرس (تالیف ۷۲۸ھ) تہران میں چھپ چکی ہیں؛ بقیہ سب قلمی ہیں۔ ہنوز فرہنگ قواس (تالیف قبل ۷۱۵ھ) اور دستور الافاضل (تالیف ۷۴۳ھ) کے صرف ایک ایک نسخے کا سراغ مل سکا ہے۔ زفان گویا کا ایک نسخہ پانچ سال قبل،

بانکی پور پٹنہ لائبریری کے لیے خرید لیا گیا تھا۔ اس کے ایک اور نسخے کے وجود کا پتا حال ہی میں لینن گراڈ میں چلا ہے۔ ادات الفضلا کے نسخے بھی کمیاب ہیں، شرفنامے کے نسخے اتنے کمیاب نہیں، لیکن قلمی شکل میں ہونے کی بنا پر اور نسخوں کی طرح یہ بھی لوگوں کی دسترس سے باہر ہے۔ مواد کی قلت کی وجہ سے کم لوگوں کو اس موضوع کی طرف توجہ کرنے کا موقع ملا، اور بعض لوگوں نے توجہ کی بھی تو قلتِ مواد ہی کی بنا پر وہ اصل مسئلے پر پوری طرح روشنی ڈالنے سے قاصر رہے۔ ان تمہیدی اشارات کے بعد اب چند الفاظ کی وضاحت ملاحظہ کیجیے:

اشتو۔ اشبو

فرہنگ قواس: اشتو انگشت

دستور الافاضل: اشتو، انگشت

ادات الفضلا: اشتو انگشت آتش وقیل اشنو بفتح ہمزہ

زفان گویا: انگشت؛ بعضی بفتح گویند

بحر الفضائل: اشتو، بفتح ہمزہ، انگشت

شرفنامہ: اشتو بالفتح، انگشت دان

مؤید الفضلا: اشتو، بمعنی انگشت وزغال است وجاے را نیز گویند کہ زغال دران ریزند، بعضی بر آنند کہ این لغت مترادفِ اشبو است وبعضی بر آنند کہ بای موحدہ بہ تحتانی تصحیف خوانی شدہ باشد واللہ اعلم، وبمعنی انگشت ہم بدیدہ آمدہ کہ بتازی ہبیخ خوانند وبضم اوّل بمعنی سبزہ ہم بنظر رسیدہ۔
اشبو، بالفتح انگشت دان کذا فی شرفنامہ ودر ادات الفضلا مذکور است بالضم وقیل بالفتح انگشت دان

مدار الافاضل: اشتو، در ابراہیمی است بفتح انگشت والا، ودر ادات بضم وقیل بفتح انگشت آتش ودر تحریست بوزنِ ابرو انگشتِ دست، اشتوا انگشت وانگشتوانہ

سروری: اشتو، انگشتدان بود در نسخۂ میرزا۔ آما در ادات الفضلا مسطور است کہ اشتو انگشت باشد کہ زگال نیز گویند ودر فرہنگ اشبو انگشتدان واشنو

و اشتوا و انگشتوانہ، و سبزہ باشد و زغال را نیز گویند۔ مثالِ معنی سبزہ این بیت منصور شیرازی آوردہ :

اگر ز قلزمِ لطفِ تو قطرۂ بچکد
درونِ کورۂ دوزخ لہب شود اشتو

جہانگیری : اشبو، انگشت دان باشد؛ اشتو و اشتوا باوّل مفتوح انگشتوانہ را گویند۔ باوّل و دوم مضموم دو معنی دارد، اول سبزہ باشد، منصور شیرازی فرماید: اگر ز قلزمِ الخ ۔ دوم انگشت را گویند و آنرا زغال نیز گویند۔

برہان : اشبو، جاے را گویند کہ زغال و انگشت دراں ریزند؛ اشتو بفتح اول بمعنی انگشت و زغال باشد و جاے را نیز گویند کہ زغال درانِ ریزند، ظاہرًا درایں معنی با اشبو تصحیف خوانی شدہ باشد، واللہ اعلم ۔ و بضم اوّل بمعنی سبزہ آمدہ است و بمعنی انگشت ہم نوشتہ اند کہ عربان اصبع می گویند۔ اشتوا بمعنی اشتو است کہ زغال و زغالدان باشد و بضم اوّل سبزہ را گویند۔

رشیدی : اشتو، بضم الف و تا، و قیل بفتح الف انگشت دان و در فرہنگ بفتح الف و ضم بای موحدہ انگشتدان و بضم الف و ضم تای مثنّاۃ انگشتوانہ و بضم الف و ضم تا سبزہ و زغال۔ منصور شیرازی گوید: اگر ز قلزمِ لطفِ تو قطرۂ الخ

ناصری : اشتو، انگشتوانہ

آنندراج : اشتو، انگشتوانہ را گویند نیز سبزہ باشد، منصور شیرازی فرماید: اگر ز قلزم لطفِ تو الخ

فرہنگ نظام : اشتو، زغال و انگشت منصور شیرازی: اگر ز قلزمِ لطفِ تو الخ با فتح ہمزہ انگشتانہ : اشتوا، انگشتانہ

لغت نامہ : اشبو[1] جاے را گویند کہ زغال و انگشت دراں ریزند۔ انگشت دان انبار

---

[1] در ادات الفضلا اشبو بالضم و قیل بالفتح

زغال وانگشت (برہان، ناصری، موید، آنندراج)

اشتوا انگشت وزغال؛ اگر زتلازم لطف تو قطرۂ بچکد بنقل از فرہنگ نظام

جاے را نیز گویند کہ زغال درآں ریزند، انگشدان، انگشتانہ (برہان، جہانگیری،

فرہنگ نظام) ظاہرا دریں معنی با اشبو تصحیف خوانی شدہ باشد واللہ اعلم (برہان)

اشتو سبزہ، انگشت کہ عربان اصبع گویند۔ اشتوا بمعنی اشتو کہ زغال وزغال

دان باشد۔ انگشتانہ؛ اشتوا، سبزہ

فرہنگ نفیسی: اشتو، زغال وزغالدان وانگشت واصبع؛ اشتوا: اشتو وزغال وزغال

دان، سبزہ

اس سلسلے میں فرہنگ نویسوں کے بیانات میں جو اختلاف ہے، اسے حسب ذیل طور پر بیان کرسکتے

ہیں:

(الف) اختلاف قرآت لفظ:

اشبو۔ اشتو۔ اشتوا

(ب) اختلاف معانی

(۱) انگشت زگال

(۲) انگشت دست

(۳) انگشت وان

(۴) انگشتوانہ

(۵) سبزہ

لفظ کی قرآت کے اختلاف کے سلسلے میں یہ عرض ہے کہ اصل لفظ اشتو ہے اور اشبو اس کی تصحیف

ہے۔ اس کے وجوہ حسب ذیل ہیں:

۱۔ پانچ قدیم نسخوں میں ایسا ہی ہے۔

۲۔ انھیں نسخوں کی تصحیف خوانی کی وجہ سے 'اشتو' 'اشبو' بن گیا ہے۔ غالباً موید الفضلا

سے اس کی ابتدا ہوئی۔ اس میں ادات الفضلا کے حوالے سے 'اشبو' لکھا ہے۔ مگر ادات کا حوالہ

غلط ہے۔ اس مؤلف کے سامنے ادات کا جو نسخہ تھا اس میں کتابت کی غلطی کی وجہ سے اشبو درج ہوگیا تھا۔ اس لیے کہ ہمارے پیش نظر ادات کا جو نسخہ ہے، اس میں 'اشتو' ہی ہے۔ ثانیاً ادات الفضلا کے مأخذ میں قواس اور دستور دونوں تھے۔ اور ان دونوں میں بھی اشتو ہی ہے، اشبو نہیں۔ ثالثاً ایک اور قرینہ یہ بھی ہے کہ صاحب مدار اور سروری نے ادات ہی کے حوالے سے اشتو لکھا ہے نہ کہ اشبو۔ رابعاً اشتو سے اشتوا آیا ہے، اشبوا نہیں۔

ان وجوہ کی بنا پر ہم یہ قیاس کرنے میں حق بجانب ہیں کہ اشبو اصل لفظ نہیں ہے۔

لفظ کی قرأت متعین ہونے کے بعد اس کے معنی کے سلسلے میں قابل غور بات یہ ہے کہ اس لفظ کا قدیم ترین ماخذ ہمارے سامنے فرہنگ قواس ہے۔ اس میں اس کے معنی صرف انگشت لکھے ہیں یہاں چونکہ یہ لفظ اندامِ آدمی کے ذیل میں نقل ہوا ہے اور نیز اس سے پہلے کا لفظ 'کدست' بمعنی 'بدست'، اور بعد کا 'بک'، بمعنی بندِ انگشت ہے، اس لیے واضح ہے کہ مؤلف نے اس سے انگشتِ دست ہی مراد لیے ہیں، انگشتِ زغال نہیں۔ لیکن ادات الفضلا نے اس کے معنی انگشتِ آتش قرار دیے ہیں جس سے اس کا اختلاف واضح ہو جاتا ہے، ورنہ دستور الافاضل اور بحر الفضائل کے انگشت سے کوئلہ اور انگلی دونوں پر استدلال ہو سکتا ہے۔ شرفنامہ بظاہر پہلا لغت ہے جس کے بیان سے ایک نئے اختلاف کا پتا چلتا ہے، یعنی انگشت کے بجائے اس میں انگشت دان درج ہے۔ میرے خیال میں اس میں تصحیف خوانی کا دخل ہے۔ دراصل اس کے ماخذ میں کسی جگہ انگشتِ دست رہا ہوگا، جو انگشت دان کی شکل میں مصحف ہوا۔ اس بنا پر میرے نزدیک انگشتدان کی کوئی اہمیت باقی نہیں رہ جاتی۔ چوتھے معنی انگشتدانہ دراصل انگشتدان کی تصحیف خوانی کا نتیجہ ہے۔ اس طرح اب اس لفظ کے تین معنوں کے درمیان کوئی فیصلہ کرنا ہے، یعنی انگشتِ دست، انگشتِ آتش اور سبزہ۔ بظاہر اس آخری معنی کے اضافے کا سہرا صاحب فرہنگ جہانگیری کے سر ہے اور سند میں منصور شیرازی کا شعر پیش کرنے کا مؤید الفضلا یا اور کسی قریبی ماخذ کے سر ہے۔ اس شعر کے معنی اس کے خیال میں یہ ہیں:

"اے ممدوح تو لطف کا بحر بے پایاں ہے، جس کے ایک قطرے کی تاثیر یہ ہے
کہ جہنم کے کورے کی لپٹ سبزہ ہو جاتی ہے۔"

یہ معنی حسبِ حال ہیں، لیکن لفظا اشتو قافیہ ہے، اس بنا پر جب تک قصیدے یا قطعے کے دو حرف اور قوافی دیکھ نہ لیے جائیں، اس کی قرأت قطعی طور پر متعین نہیں کی جا سکتی۔ بہرحال بحالتِ موجودہ اس بیت کی روشنی میں اس معنی کے ماننے بغیر کوئی چارۂ کار نہیں ہے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ سروری اور بعض دوسرے فرہنگوں میں اسی معنی کی توضیح میں یہی بیت نقل ہوئی ہے۔ لیکن اس کے بالکل برخلاف فرہنگ نظام اور لغت نامہ میں اسی بیت سے زغال و انگشت کے معنی پر استدلال ہوا ہے۔ اس صورت میں معنی یہ ہوں گے،

"اے ممدوح تیرے لطف بے پایاں کا ہر قطرہ کورۂ جہنم کی لپٹ کو کوئلے میں تبدیل کر سکتا ہے۔"

اس پر دو اعتراض وارد ہوتے ہیں: اولاً یہ کہ فرہنگِ نظام کے کسی ماخذ میں اس معنی کی توضیح میں یہ بیت نقل نہیں ہوئی ہے۔ (لغت نامہ میں فرہنگ نظام ہی سے یہ بیت نقل ہوئی ہے؛ نہ جانے کیوں اس میں اس سے قدیمتر حوالوں یعنی جہانگیری، سروری اور رشیدی کو حذف کر دیا گیا۔) جہانگیری اور سروری میں واضح طور پر سبزہ کی توضیح ملتی ہے اور رشیدی کے یہاں سبزہ اور زغال لکھ کر بغیر کسی تخصیص کے یہی بیت درج کی گئی ہے۔ گمان غالب یہی ہے کہ رشیدی ہی کے غیر توضیحی نوٹ سے صاحبِ فرہنگ نظام کو دھوکا ہوا اور انھوں نے اس بیت سے زگال کی توثیق کرنا چاہی ہے۔ یہ غلطی پھر لغت نامہ میں شامل ہو گئی۔
ثانیاً یہ کہ بیت میں 'لہب' کا 'اشتو' میں تبدیل ہونا بیان ہوا ہے۔ 'لہب' کے معنی زبانۂ آتش کے ہیں، زبانۂ آتش بمعنی لپٹ اور سبزہ میں تشبیہ کی مناسبت ہے، لیکن زبانۂ آتش کا کوئلہ ہونا کسی طرح ممکن نہیں۔ اس بیت سے واقعۂ ابراہیم کی یاد تازہ ہوتی ہے۔ غالباً شاعر کے ذہن میں بھی نارِ نمرود کی گلزار میں تبدیلی رہی ہو۔ بہرحال پوری طرح واضح ہے کہ اشتو سے سبزہ مراد لینا زیادہ شاعرانہ کیفیت کا حامل ہے۔
غرض میرے نزدیک زیرِ بحث بیت میں اشتو بمعنی سبزہ زیادہ قرینِ قیاس ہے، اس سے زگال کے معنی پر استدلال نہ صرف کمزور بلکہ غلط معلوم ہوتا ہے۔ اس لیے اب دو معنوں یعنی انگشتِ دست اور انگشتِ آتش کے درمیان فیصلہ باقی رہا۔ چونکہ معنی اول کے لیے یہ قوی قرینہ

موجود ہے کہ لفظ اشتو فرہنگ قواس میں " اندامِ آدمی " کے ذیل میں درج ہے، اس بنا پر اس قدیم ماخذ کے اعتبار سے اس کے معنی متعین ہیں۔ تحفتہ میں یہی معنی درج تھے۔ شرفنامہ کی غلط فہمی و تصحیف خوانی کو ختم کرنے کے بعد ہم اسی نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ اس سے بھی انگشتِ دست ہی کی ایک گونہ تائید ہوتی ہے۔ دستور الافاضل اور بحر الفضائل سے اس کی نہ واضح طور تردید ہوتی ہے، نہ تائید۔ صرف ادات الفضلا کا معاملہ رہ جاتا ہے، لیکن چونکہ اس کی تائید میں کوئی اور قرینہ سوائے بعد کے فرہنگ نگاروں کی کورانہ نقل کے، موجود نہیں ہے۔ اس وجہ سے اس کے بیان کردہ معنی کو قواس کی بیان پر ترجیح نہیں دی جا سکتی جب کہ قواس نہ صرف ادات الفضلا ہی کا بلکہ لفظ اشتو کا قدیم ترین ماخذ بھی ہے۔ اس بنا پر بحالتِ موجودہ ہم اشتو کے دو معنی قرار دیتے ہیں، اوّل انگشتِ دست، دوم سبزہ، لیکن یہ آخری معنی مشروط ہے، اس لیے کہ اس کے اور دوسرے قوانی سے اس کی تطبیق کرنا ہے اور یہ دیکھنا ہے کہ کہیں منصور شیرازی نے اشتو کی توضیح کے لیے ہی تو یہ بیت اسی انداز میں وضع نہیں کر لی ہے جیسے شمس فخری نے معیارِ رحمانی میں کیا ہے۔

تفصیلاتِ بالا سے متاخر فرہنگ نویسوں کی عدم توجہی پوری طرح نمایاں ہو جاتی ہے، خصوصاً لغت نامے سے جائز طور پر یہ توقع تھی کہ اس طرح کے الجھے ہوئے مسائل کا حل اس سے نکل آئیگا، لیکن حل پیش کرنا در کنار، اس سے تو مسائل اور الجھ گئے۔

ابیشہ، البستہ، الیشہ"

لغتِ فرس، ابیشہ، جاسوس بود۔ شہید گوید

در کوے تو ابیشہ ہمی گردم اے نگار!
وز دیدہ تا مگر ت ببینم ہبام بر

صحاح، ابیشہ، جاسوس بود۔ شہید گوید:

در کوے تو ابیشہ الخ

قواس، البستہ، جاسوس کردار بود۔ شہید گوید:

در کوے البستہ ہمی گردم اے نگار! وز دیدہ تا ببینم مگرت ببام بر

دستور: ایشہ، چاپلوس

ادات: ایشہ، جاسوس کردار و چاپلوس ۔ زفان گویا، ایشہ جاسوس کردار و دلہ فردوس است ۔

بحرالفضائل: ایشہ، چاپلوس

شرفنامہ: البستہ وایشہ، جاسوس کردار و چاپلوس

مدار: ایشہ، بر وزنِ شیشہ، جاسوس کردار و چاپلوس است و آنرا البستہ و لبستہ نیز گویند، و در موید ایشہ بوزنِ شیشہ بدیں معنی گفتہ است:

در کوے تو چو ایشہ ہمی گردم اے نگار! الخ

موید: ایشہ، بوزنِ شیشہ، جاسوس کردار و چاپلوس است، کذا فی الادات و شرفنامہ و لسان الشعرا

سروری: انیشہ،

در شرفنامہ البستہ آمدہ و ایشہ نیز گویند و در فرہنگ ایشتنہ و ایشنہ و ایشہ آمدہ

جہانگیری: ایشہ، دو معنی دارد، اول جاسوس باشد، شہید نظم نمودہ،

در کوے تو چو ایشہ ہمی گردمی نگاہ

دز دیدہ تا مگرت ببینم ببام در

رشیدی: انیشہ، بوزنِ ہمیشہ جاسوس باشد، شہید گوید: ع

در کوے تو انیشہ ہمی گردم اے نگار!

و صحیح ایشہ است

برہان: البستہ، بفتحِ اول، بمعنی جاسوس و چاپلوس باشد۔ انیشہ بر وزن ہمیشہ جاسوس و چاپلوس را گویند۔ ایشہ بر وزن و معنی بیشہ و جنگل باشد و جاسوس و چاپلوس را نیز گفتہ اند۔

حاشیۂ رشیدی (محمد عباسی) بنا بگفتۂ صاحب سراج، دیگران آلبستہ بمد والیتہ بکسر

وآیشتنہ وایشنہ وآیشہ، بمعنی جاسوس وبمعنی چاپلوس نوشتہ۔ نزد
صاحبِ سراج اکثرے از اینہا خطا است درلفظ ومعنی، ولفظ آبشتنہ است
کسیکہ پنہاں بود از آبشتن پنہان شدن واز یں جہت جاسوس را گفتہ اند و
آبشنہ وآبشہ وبغیرِ مد نیز درست است۔

فرہنگ نظام، ابیشہ، جاسوس؛ شہید، درکوے تو ابیشہ ہمی گردم الخ
ایشہ، بیشہ وجنگل، جاسوس، درکوے تو چو ایشہ ہمی گردے انگاہ الخ

لغت نامۂ دہخدا، آبشت، نہفتہ، پنہاں، جاسوس۔ البستہ، جاسوس وچاپلوس، منہی،
کارآگاہ۔ ایں کلمہ را در فرہنگہا انیشہ وایشہ ودر فرہنگ اسدی ابیشہ
نیز بہمیں معنی ضبط کردہ اند۔ شاہدے برائے ہیچ یک نیاوردہ اند، تنہا در
فرہنگ اسدی آمدہ است ابیشہ ...... بنام برم وظاہراً صورِ دیگر
مصحفِ ایں صورتِ اخیر یعنی اپیشہ است (حاشیہ در برہان وبعض فرہنگہاے
دیگر ہر جا کلمۂ جاسوس می آید، چاپلوس را چوں عطفِ بیان وتفسیرے در
دنبال می آورند، از جملہ در معنی کلمۂ البستہ۔ لیکن جاسوس مرادف چاپلوس
نیست وہر یک را معنی دیگر است۔ دریں بیت معنی جاسوس وہم چاپلوس
برائے کلمہ مناسب نمی نماید وظاہراً اصل اپیشہ بودہ است، کلمۂ مرکب
از "آ" علامتِ سلب ونفی، و"پیشہ" بمعنی حرفت وشغل، ومجموع مرکب
بمعنی عاطل وبیکار؛

درکوے تو اپیشہ ہمی گردم، اے نگار! الخ

اگرچہ فرہنگوں کی تصریح کے مطابق زیرِ بحث لفظ کی عام شکلیں مندرجہ ذیل ہیں:
ابیشہ، البستہ، ایشہ، آبشہ، انیشہ۔ لیکن صاحبِ بدیع نے اس کی متعدد
شکلیں بیان کرکے ان کی تعداد ایک درجن سے زیادہ کر دی ہے؛ اور ان سب میں اس
کے نزدیک "آبشتنہ" صحیح ہے جس کے معنی پنہاں ہونے والے کے ہیں۔ اس کے بقول یہ
لفظ آبشتن (بمعنی پنہاں شدن) مصدر سے بنا ہے، اور اسی وجہ سے اس کے معنی

جاسوس کے ہیں، آبشنہ و آبشہ، ابشنہ و ابشہ بھی درست شکلیں ہیں۔ میرے خیال میں صاحبِ سراج کا قیاس حسبِ ذیل امور کی بنا پر زیادہ قابلِ توجہ نہیں رہ جاتا۔

(۱) کسی فرہنگ میں ان کی بتائی ہوئی صورتیں یعنی آبشتنہ، آبشنہ، آبشہ، ابشتنہ، ابشتہ، ابشہ نہیں پائی جاتی ہیں۔

(۲) شعرِ شاہد میں آبشتنہ و ابشتنہ ٹھیک طرح سے پیوست نہیں ہوتا۔

(۳) آبشتن مصدر سے آبشتنہ اسم فاعل کی شکل نہیں ہوتی، البتہ اگر آبشتن سے یہ لفظ ماخوذ ہو تو آبشتہ اسم مفعول کی صورت زیادہ مناسب ہوگی، اور جیسا کہ صاحب لغت نامہ نے لکھا ہے آبشتہ کے اصلی معنی نہفتہ، پنہاں کے ہیں اور دوسرے معنی جاسوس کے۔ لغت نامے کے اس بیان میں زیادہ وزن ہے اور اسی وجہ سے قیاس کیا جاسکتا ہے کہ فرہنگِ قواس کے البستہ میں شین قرشت زیادہ مناسب ہوگا، اگرچہ حقیقت یہ ہے کہ کسی فرہنگ نگار نے یہ صورت نہیں لکھی ہے۔

صاحبِ لغت نامہ نے اپنے اس قیاس کو زیادہ اہمیت نہیں دی ہے۔ ان کے نزدیک ابیشہ ہی صحیح ہے، جس کے معنی ان کے نزدیک بیکار اور معطل کے ہیں۔ ان کا ایک اعتراض یہ ہے کہ شعرِ سند سے جاسوس کے معنی نہیں نکلتے، مجھے ان کی رائے سے اتفاق ہے، لیکن قدیم فرہنگ نگاروں نے اس کے معنی جاسوس کے بجائے جاسوس کردار کے لیے ہیں اور یہ معنی شعرِ سند میں پوری طرح منطبق ہوجاتے ہیں۔ لیکن جن لوگوں نے یہ معنی مراد لیے ہیں، ان کے یہاں لفظ کی صورت ابیشہ نہیں بلکہ البستہ یا ابشہ ہے۔ اس سے تو انکار ممکن نہیں کہ یہ سب ایک ہی لفظ کی مختلف محرّف شکلیں ہیں۔ بہرحال چونکہ صاحبِ لغت نامہ کے سامنے جاسوس کے بجائے جاسوس کردار نہ تھا اس بنا پر انہوں نے ابیشہ کے معنی معطل قرار دیے اور اس میں شبہہ نہیں کہ یہ معنی بھی شعر میں پوری طرح منطبق ہوجاتے ہیں، لیکن اسی طرح جاسوس کردار بھی ٹھیک اترتے ہیں۔ تو پھر جاسوس کردار پر دوسرے معنی کو ترجیح دینے کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ ہاں، اگر یہ کہا جائے کہ چونکہ شعر کے پیشِ نظر فرہنگ نویسوں نے اس کے معنی مقرر کیے، اور چونکہ قدیمی لفظ ابیشہ اپنی اصل کے لحاظ سے معطل

کے معنی سے زیادہ قریب ہے، اس لیے اس کے آخر الذکر معنی ٹھیک سمجھے جانا چاہییں۔ لیکن اگر لفظ آبشتہ یا ابشتہ ہے تو اپنے مصدری معنی کے لحاظ سے اس کے معنی جاسوس یا جاسوسی کردار کے زیادہ مناسب ہوتے ہیں۔

اس گفتگو کا خلاصہ یہ ہے کہ اصل لفظ یا تو ابیشہ ہے یا ابشتہ، باقی سب صورتیں مصحف ہیں اور اسی بنا پر ساقط الاعتبار۔ ابیشہ کا قدیم ترین ماخذ دستور الافاضل ہے اور ظاہر ہے کہ صاحبِ دستور کے پیشِ نظر فرہنگِ قواس تھی، اور اس میں واضح طور پر ابستہ ہے جو متاخر فرہنگوں میں بھی برابر نقل ہوتا رہا ہے۔ اس بنا پر ہم یہ سمجھنے میں حق بجانب ہیں کہ دستور کا ابیشہ یقیناً فرہنگِ قواس کے ابستہ یا ابشتہ کی غلط خوانی کا نتیجہ ہے۔ جب لفظ کی یہ محرف صورت سامنے آئی جو ابیشہ یا ابستہ کے ہم وزن نہ ہونے کی بنا پر شعرِ سند میں پرانی قرأت کے اعتبار سے ساقط الوزن ہوتا تھا، اس لیے خود شعر کے پہلے مصرعے میں بہت مناسب تبدیلی عمل میں آئی، یعنی 'در کوے تو ابیشہ ہمی گردم اے نگارا' کی جگہ 'در کوے تو چو ابیشہ ہمی گردمی نگاہ'۔ لیکن شعر میں یہ تحریف دستور کے زمانے کے بہت بعد یعنی گیارھویں صدی میں فرہنگِ جہانگیری اور دوسری فرہنگوں میں ملتی ہے۔ ظاہر ہے کہ دستور، بحر الفضائل در ادات الفضلا میں شعری شواہد موجود نہیں، اس لیے ان میں سے یہ بیت خارج ہے لیکن واضح ہے کہ ان کے مولفین کے سامنے یہ شعر ضرور رہا ہوگا اور انھوں نے حسبِ ضرورت شعر میں تبدیلی کر لی ہوگی جس کی کوئی عملی شکل ہمارے سامنے نہیں ہے۔ البتہ صاحبِ جہانگیری نے سی عہد کی کسی روایت کی بنا پر یہ تبدیلی جائز قرار دے دی۔

نیشہ، ابیشہ سے محرّف ہے، اور اسی بنا پر درخورِ اعتنا نہیں، لیکن ہمیں یہ تصحیف بہت بعد کو ملتی ہے یعنی سروری کے یہاں۔ بعد کو رشیدی اور برہان قاطع نے بھی یہ محرّف صورت درج کی ہے۔ رشیدی انیشہ کو درج کرنے کے بعد لکھتا ہے کہ لفظ کی اصل صورت یشہ ہے؛ وہاں مولف امثلہ لانے کا وعدہ کرتا ہے؛ لیکن اسے نہ لفظ ایشہ کو الگ داخل کرنے کا موقع ملا، نہ وہ اس کے لیے سند لا سکا۔

یہاں تک تو لفظ کے اصل کی بحث تھی؛ اب اس کے معنی کی سنیے:

لغت فرس اور صحاح میں جاسوس اور قواس کے یہاں جاسوس کردار ہے۔ دستور نے غالباً فرس کی پیروی میں جاسوس لکھا حالانکہ جیسا کہ لکھا جا چکا ہے، اس کے پیش نظر قواس ہے اور قواس میں جاسوس کردار ہے، (اور اسی سے ادات اور شرفنامہ میں جاسوس کے بجائے جاسوس کردار ملتا ہے)۔ غالباً ادات الفضلا سب سے قدیم ماخذ ہے جس میں جاسوس کردار کے ساتھ چاپلوس درج ہے، جو یقیناً جاسوس کی غلط خوانی کا نتیجہ ہے لیکن غلط خوانی کی حالت میں صرف چاپلوس درج کرنا چاہیے، جاسوس نہیں۔ بظاہر اس میں مزید کسی اور غلط فہمی کا ہاتھ ہے۔ مثلاً کسی نسخہ میں جاسوس رہا ہوگا اور کسی میں چاپلوس دونوں سے جو نسخہ مرتب ہوا اس میں جاسوس اور چاپلوس دونوں درج ہو گئے۔ چاپلوس کے جاسوس کی غلط خوانی یا تصحیف ہونے کا سب سے مضبوط قرینہ بحر الفضائل کا بیان ہے جس میں جاسوس کے بجائے چاپلوس درج ہے۔ اور چونکہ بحر الفضائل بیشتر دستور الافاضل سے ماخوذ ہے، اس لیے قیاس غالب یہ ہے کہ اس کے یہاں دستور ہی سے یہ غلط فہمی پیدا ہوئی۔

ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ بعد کے فرہنگ نگاروں نے اس کے معنی میں بیشہ اور جنگل کا اضافہ کر لیا ہے۔ ہمارے ماخذ میں قدیم ترین ذکر اس معنی کا جہانگیری میں ملتا ہے، پھر برہان اور فرہنگ نظام وغیرہ میں بھی یہ شامل ہے۔ مگر ان آخری دونوں کتابوں میں اس لفظ کی مخصوص صورت ابیشہ کے لیے یہ معنی مختص کیے گئے ہیں۔ ہمارے ماخذ کے اعتبار سے یہ تخصیص پہلے برہان کے یہاں ملتی ہے۔ اس میں اس لفظ کی تین شکلیں درج ہیں، یعنی البستہ، ابیشہ اور الیشہ؛ پہلے دونوں کے معنی جاسوس و چاپلوس اور تیسرے کے تین بیشہ و جنگل، جاسوس و چاپلوس۔ بظاہر بیشہ بھی کسی غلط خوانی کی بنا پر جزو معنی قرار پایا۔ فرہنگ نظام نے ابیشہ، الیشہ دونوں کے لیے ایک ہی سند درج کی ہے: ابیشہ کے ذیل میں شعر کی وہ روایت جو قدیم فرہنگ نگاروں کے یہاں ملتی ہے، اور الیشہ کے تحت جہانگیری وغیرہ کی روایت، ظاہر ہے کہ ان دونوں میں سے ایک ہی صورت ٹھیک ہو سکتی ہے، مگر صاحب فرہنگ نظام بغیر کسی دلیل کے معاملے کو بالکل تشنہ اور الجھا ہوا چھوڑ کر آگے

بڑھ گئے ہیں۔

آزغ ، وازغ

لغتِ فرس : آژغ ، شاخِ درخت باشد، بوشکور گوید ،

سوے آسماں کردش آں مرد روے
بگفت اے خدا! این تنِ من بشوے
ازین آژغان پاک کن مر مرا
ہمہ آفرین ز آفرینش ترا

فرہنگ قواس ، وازغ ، آنچہ از درخت ببرند

دستور ، ازغ ، آنچہ از درخت خرما ببرند

موید ؛ ارغ و آروغ ... ممدود آنچہ از درختِ خرما ببرند و قیل کلاہما بازاے فارسی۔ وازغ بدانچہ زرباف بندند و در فرہنگ فخر قواس وازغ با زاے ہوز آنچہ از درختِ خرما ببرند۔

مدار ، آزغ و آزوغ ، بزاے معجمہ در سکندری و موید و ہیچ بخشی است، آنچہ از درختِ خرما ببرند۔ و در ادات در محلِ غین میں مہملہ آوردہ است

جہانگیری ، آژغ و آژوغ ، لیفِ خرما باشد ، و شاخہاے زیادتی را گویند کہ از درختِ تاک ببرند

برہان ، آزغ ، آنچہ از شاخہاے درختِ خرما و تاکِ انگور و درختانِ دیگر ببرند و آنرا بعربی جلمہ خوانند

آژغ بروزن و معنی آزغ درختِ بریدہ باشد ولیفِ خرما را نیز گویند

ازغ ، آنچہ از شاخہائے درخت ببرند و پیرایش دہند و آنرا بعربی جلمہ گویند

وازغ ، آنچہ از درخت خرما ببرند و باین معنی بازاے ہوز ہم گفتہ اند و آنچہ بداں تاکِ انگور را بندند و باین معنی باراے قرشت ہم بنظر آمدہ است۔

رشیدی : آژغ و آژدغ ، در فرہنگ بمعنی لیفِ خرما باشد و شاخہائے زیادتی کہ از تاک ببرند۔

دارغ ، آنچہ تاک را بداں بندند و در موید برائے معجمہ آنچہ از درخت ببرند و در فرہنگ ہندی کہ دریپیش الخ

فرہنگِ نظام : آزغ ، مخفف آزدغ و آزدغ مبدل آردغ (بمعنی بادے کہ از گلو با صدا بیروں آید)

آژدغ : (۱) لیف خرما (۲) شاخہائے زیادی الخ (جہانگیری)

ازغ ، شاخ و برگہائے کہ از درخت در پیرایش برند

لغت نامۂ دہخدا : آزغ ، آنچہ از شاخہائے درختِ خرما و انگور و دیگر درختاں ببرند (برہان)

آزغ ، آزدغ ، آژدغ ، ازغ : عمل پیراستن و بریدن شاخہا و برگہا

حاشیہ برہان از دکتر معین : (داژغ) 'د' جزو کلمہ نیست ، اصل آژغ = آزغ است ۔

درک : اژغ ، ازغ ، در لغتِ فرس آمدہ "آژغ ، شاخ درخت باشد ۔ بوشکور گوید : سوے آسماں گردش ...... ازیں آژغاں پاک کن مر مرا .... و در حاشیہ نوشتہ اند ایں لغت فقط در ن ۔ در ن آژغہا تصحیح متن قیاسی است ؛ علامہ دہخدا نوشتہ اند "تصحیح قیاس صحیح نیست ، کلمۂ اژغ است بفتح ہمزہ و سکونِ ژے و "اژغہا" جمع آں نا ممکن است ، داژغ = آژغ باشد (قس ، دارن = آرن ، دارنج آرنج) ولے محتاج بشاہد است ۔

زیرِ بحث لغت کی قدیم ترین شکل 'اژغ' ہے جو لغتِ فرس میں ملتی ہے ، اگرچہ ڈاکٹر اقبال آشتیانی نے اسے آژغ پڑھا ہے لیکن شعرِ سند اس کے بجائے 'اژغ بفتح' کی تائید ہوتی ہے ۔ چونکہ شعر میں یہ لفظ بشکل جمع (اژغہا) آیا تھا اور اسے بمد پڑھنے سے مصرع وزن سے ساقط ہو جاتا تھا ، اس لیے موصوف نے اسے 'آژغاں' میں تبدیل کر لیا ۔ لیکن اتنی زحمت کے بجائے اگر اژغ کو فتحہ سے پڑھ لیا جاتا تو معاملہ صاف ہو جاتا

ں قیاس علامہ دہخدا کا بھی ہے جس کا ذکر ڈاکٹر معین نے برہان قاطع کے حاشیے میں کر دیا ہے۔
غ کی اور صورتیں یعنی آژغ ، آزغ ، ازغ ، آژدغ ، سمجھ میں آتی ہیں۔ لیکن 'ز' کی تبدیلی
ے مہملہ میں سہوِ کتابت ہے ، اصل سے اس کا کوئی تعلق نہیں اور اسی بنا پر ہم مؤیدالفضلا
، بیان کو در خورِ توجہ نہیں سمجھتے ، جس نے آرغ اور آروغ کو ڈکار اور آنچہ از درخت خرما
ے معنی میں لکھا ہے۔ گو اس میں آخری معنی کا اضافہ بھی ہے کہ آخری معنی میں آزغ و آزدغ بھی ہے
رہنگِ نظام میں آزغ اور آزدغ کو آرغ 'در آروغ کا مترادف قرار دیتے ہوئے اس کے
نی صرف ڈکار کے لیے ہیں۔ گویا وہ اس لحاظ سے مؤیدالفضلا سے کئی قدم آگے ہے۔ مؤید میں
رغ و آروغ کے دونوں معنی دیے تھے اور یہ بھی لکھا تھا کہ آزغ و آزدغ بھی اس آخری
نی میں آیا ہے۔ لیکن یہ ساری باتیں فرہنگِ نظام میں حذف ہو گئی ہیں۔ اس بنا پر آخرالذکر
بیان قابلِ توجہ نہیں رہ جاتا۔ البتہ آژدغ کے دو معنی بحوالۂ جہانگیری اور ازغ کے صرف
ے معنی درج کیے ہیں۔

فرہنگ قواس میں ازغ کے بجائے دازغ ملتا ہے ، جو بعد کو مؤیدالفضلا ، رشیدی اور
ہان میں داخل ہو گیا ہے۔ دازغ کے معنی عام طور پر وہی ہیں، جو ازغ وغیرہ کے بیان ہوتے
ں۔ مؤیدالفضلا نے فرہنگ قواس کی اس قرأت کو اسی کے حوالے سے درج کیا ہے لیکن میرے
یشِ نظر جو نسخہ قواس ہے، اس میں 'د' اور 'ازغ' کے درمیان کچھ زیادہ فاصلہ ہے جو
بہہ پیدا کرتا ہے۔ اس کے انداز سے پورے یقین کے ساتھ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ کم از
م کاتب کے نزدیک 'د' جزوِ کلمہ نہیں ہے۔ اتفاق کی بات یہ ہے کہ اس کلمے کی تصحیح بھی
سی نے بعد کو کی، لیکن اس کے باوجود 'د' کا اصل کلمے سے فصل برقرار رہا (و - ازغ) چونکہ
ہاں عام طور پر واو عاطفہ کا موقع نہیں تھا، صاحب مؤیدالفضلا نے واو کو اصل کلمے
ے ملا دیا۔ لیکن اگر دیکھا جائے، تو ہم اس واو کو دو کلموں کے درمیان نہیں بلکہ دو
ملوں کے درمیان واو عاطفہ قرار دے سکتے ہیں۔ گو فرہنگ قواس کی یہ عام خصوصیت
ہیں۔ بہرحال اس شبہہ کو تقویت اس وجہ سے ہے کہ اس کلمے کی اصل مسلم طور پر ازغ (یا آزغ)
ہے اور یہ کلمہ مع شعرِ سند کے موجود ہے۔ اس بنا پر اگر فرہنگِ قواس میں درج کیے ہوئے 'د' کو

واوِ عطف قرار دیں یا غلط کہہ دیں تو کچھ ایسا بعید از قیاس نہ ہوگا۔ ظاہر ہے کہ برہان اور رشیدی کے لفظ 'وازغ' کی اس وجہ سے کوئی اہمیت نہیں ہے کہ انھوں نے اسے مویدالفضلا سے لیا ہوگا اور خود ان کے سامنے تو اس کے نسخے نہیں رہے ہوں گے جس سے اس بات پر استدلال کیا جا سکے کہ تو اس کے تمام نسخوں میں وازغ ہی ہے۔

ڈاکٹر معین کا قیاس ہے کہ چونکہ 'آ' کی 'وا' میں تبدیلی ہوتی ہے، جیسے آرنج، وارنج؛ آرن، وارن۔ اس سے آزغ سے وازغ بننے پر بھی استدلال ہو سکتا ہے۔ لیکن بہرحال اس کے لیے سند درکار ہے۔ اس سلسلے میں یہ بھی قابلِ غور ہے کہ فرس اور صحاح میں وارنج نہیں ملتا، صرف آرنج ہے، اور فرس میں صرف وارن، آرن نہیں ہے اور صحاح میں دونوں؛ لیکن دونوں کے لیے بیت سند وہی ایک ہے، جو فرس میں بھی وارن کے لیے آئی ہے۔ چونکہ دونوں صورتیں یعنی آرن اور وارن کی ہم وزن اور ہم قافیہ ہیں اس لیے ان کی تبدیلی بغیر کسی دقت کے عمل میں آجاتی ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ دراصل وارن اور آرن، وارنج اور آرنج کا مسئلہ اس طرح سے حل نہیں ہوا ہے کہ اسے بطور سند کے پیش کیا جا سکے۔ اگرچہ بعد کے فرہنگوں میں چاروں شکلیں موجود ہیں، لیکن قدیم فرہنگوں میں ان کی عدمِ موجودگی سے معاملہ کچھ مشتبہ ضرور ہو جاتا ہے۔ ان سب باتوں کے باوجود چونکہ وازغ کے لیے کوئی سند نہیں، اس بنا پر اسے بخوبی تصحیف قرار دیا جا سکتا ہے۔

اس کلمے کے معنی میں بھی تھوڑا سا اختلاف ہے۔ لغتِ فرس میں بغیر کسی قید کے اس کے معنی شاخِ درخت کے قرار دیے ہیں، قواس کے یہاں "آنچہ از درخت (یا درختِ خرما) ببرند"؛ یہی معنی بعد کی اکثر فرہنگوں میں نقل ہو گئے ہیں۔ ہمارے ماخذ کے لحاظ سے جہانگیری پہلا لغت ہے، جس میں ان معنوں میں تھوڑی سی تبدیلی کی گئی، یعنی انگور کی بڑھی ہوئی بیل جو کاٹنے کے قابل ہے۔ گویا اس میں دو اعتبار سے فرق آیا، اوّل یہ کہ قدیم فرہنگوں میں اس کے معنی چھانٹنا اور تراشنا یا عملِ پیرایش تھے۔ دوسرے یہ کہ اس میں خرما کے بجائے انگور کی قید لگا دی گئی، علاوہ بریں اس میں ایک اور معنی "لیفِ خرما" بڑھا دیے گئے جو بعد کی بعض فرہنگوں میں بھی شامل ہوا (مثلاً برہان، رشیدی، فرہنگِ نظام وغیرہ) برہان میں بڑی افراتفری ہے۔

زغ اور ازغ کے معنی عام درختوں کی پیرایش ؛ آزغ ، درختِ پیراستہ اور لیفِ خرما ؛ واشغ
ازغ ، درختِ خرما کی پیرایش اور جس پر تاکِ انگور لٹکاتے ہیں ؛ اس معنی میں لفظ وارغ
بھی آتا ہے لیکن اس سلسلے میں صاحبِ برہان سے سہو ہوا ہے ۔ دراصل جس پر انگور کی بیل
لٹکائی جاتی ہے ، وہ واذیج یا وادیج ہے ، جو لغت فرس اور فرہنگ قواس وغیرہ میں مع
بیتِ ذیل کے آیا ہے ؛

همه واذیج پُر انگور و همه جاے عصیر
زانچه برزیار کنول بر بخورد برزگرا

یا وازنج[۵] ، جیسا کہ صحاح الفرس میں ہے (اور جہاں بیتِ سند یہی ہے مگر واذیج کی جگہ
وازنج درج ہے) اس کو وازغ سے کوئی تعلق نہیں ۔ صاحبِ رشیدی کا بھی بیان وازغ کے
سلسلے میں بالکل غیر واضح اور مبہم ہے ۔ مختصر یہ کہ اس لفظ کے قابلِ وثوق معنی وہی ہیں جو قدیم
فرہنگوں کے بیان کی روشنی میں لغت نامہ میں مندرج ہیں ، انہیں کو صحیح سمجھنا چاہیے ؛ باقی
سب قابلِ ترک اور بے بنیاد ہیں ۔

نسر ، نصر ، نصران ، نسیرم

فرس ؛ نسر ، سایہ گاہ باشد ۔ رودگی گوید ؛

دور ماند از سراے خویش و تبار
نسرے ساخت بر سرِ کہسار

قواس ؛ نسر ، سایہ بان باشد ۔ رودکی گوید ؛

دور ماند ...... نسرے ساخت بر سرِ کہسار

---

۵ آقا فردزانفر 'آرنج' (آزنگ) کو بہتر سمجھتے ہیں (دیکھیے صحاح ذیل وارنج) لیکن اگر یہ آزنج ہے تو پھر فرہنگ نویسوں کی غلط فہمی کی کوئی حد نہیں رہتی کہ انہوں نے آژنگ الگ بیان کیا ہے اور وازنج الگ ، آزنگ اور آزنج ایک ہی ساتھ بیان ہونا چاہیے ۔ دستور الافاضل میں واذیج کو واد کے ذیل میں بیان کیا ہے اور فرس کی پیروی میں اس کے پہلے ونگ اور اونگ بھی اسی معنی میں بیان کیا گیا ہے فرس اور صحاح میں بھی آونگ اور واذیج (وازنج) الگ الگ بیان ہوئے ہیں ۔

نسیرم ۔ آنجا کہ آفتاب نیفتد

صحاح : نسر، سایہ گاہ بود ۔ رودکی گفت :
دور ماند .... نسرے ساخت . الخ

دستور الافاضل : نصر، سایہ گاہ
نصران ، آنجا کہ آفتاب نیفتد

بحر الفضائل : نصران ، آنجا کہ شعاع آفتاب نیفتد

ادات : نسر، سایہ گاہ
نسیرم ، آنجا کہ آفتاب برآں افتد

شرفنامہ : نشر (بفتح اول) ونشر (بفتحتین) سایۂ کلاہ (موید میں بحوالہ شرفنامہ نسر)
نسیرم ، آنجا کہ آفتاب[ف] نیفتد

معیار جمالی : نسر، سایہ بانے باشد بر سرِ کوہ از چوب وخاشاک :
ملک در تاب آفتابِ ستم
سازد از عدل تو ہمیشہ نسر

موید : نسر، سایۂ کلاہ ، کذا فی فرہنگ فخر قواس ؛
نسیرم ، آنجا کہ آفتاب نیفتد کذا فی شرفنامہ ودر فرہنگ فخر قواس بدیں معنی نسرم است بمعنی آنجا کہ براں آفتاب نیفتد

سروری : نسر ، (۱) سایبانے باشد کہ بر سرِ کوہ از چوب وخاشاک سازند، مثالش شمس فخری گوید : ملک در تاب الخ
واستاد رودکی نیز گوید : دور ماند الخ
(۲) وبمعنی مطلق سایہ نیز بنظر رسیدہ (۳) وبعضے بمعنی موضعے از کوہ وغیرہ کہ آفتاب براں نتابد آوردہ اند ۔ نسار نیز گویند و نسا بحذفِ را

ف ودر فرہنگ قواس بدیں معنی نسیرم است (یعنی سوم ب است) ودر ادات آنجا کہ آفتاب نیفتد (...) آنجا کہ براں آفتاب افتد

نیز آمدہ و گذشت ۔ نسا در فرہنگ بمعنی موضعے باشد از کوہ وغیرہ کہ آفتاب
براں نتابد و نسر نیز گویند ۔
نسیرم ، از نسخہ میرزا و موید بمعنی جاے باشد کہ آفتاب براں نیفتد (کذا
فی الفرہنگ) و در سامی نسرم بنظر رسیدہ

جہانگیری : نسر ، باول و ثانی مفتوح جاے راگویند کہ مانند کوہستان وجز آں بود و
ہرگز آفتاب در آنجا نتابد و آنرا نسا و نسار و نسیرم نیز نامند ، و صاحب
فرہنگاں آوردہ اند کہ سایبانے باشد بر سر کوہ کہ از چوب و خس و خاشاک
ترتیب دہند (پس از آں بیت شمس فخری و رودکی (مدون) ذکر نامہ شاہ
آمدہ) نسا موضعی را گویند کہ از کوہ وجز آں کہ در انجا آفتاب ہرگز نتابد
یا کمتر تابد و آنرا نسیر نیز نامند ۔
نسیرم ، جاے راگویند کہ آفتاب در انجا نتابد ۔

رشیدی : نسا ، بالفتح موضعے از کوہ وجز آں کہ برو آفتاب نتابد ۔
نسر ، ہماں نسا یعنی (۱) جاے کہ آفتاب برو نتابد ، فخری گوید ؛
ملک در تاب . . . . الخ
و صاحب فرہنگاں بمعنی (۲) سایبانے کہ بر سر کوہ از چوب و خاشاک
ترتیب دہند ، آوردہ اند ۔ رودکی گوید ؛ دور ماند ، الخ . . . .
و دریں مثال تأمل است ۔
نسیرم ، ہماں نسا یعنی جاے کہ آفتاب برو نتابد . . . و در فرہنگ سروری
نسرم نیز بمعنی اول آوردہ و از سامی نقل کردہ ۔ نش سایہ ، و در
موید سایۂ کلاہ ۔

برہان : نسا ، موضعے راگویند از کوہ و غیر آں کہ در آنجا آفتاب ہرگز نتابد یا
کمتر رسد ۔
نسار ، موضعے باشد کہ آفتاب کمتر براں تابد و سایبانے را نیز گویند کہ

از چوب و خاشاک سازند، و بمعنی سایہ ہم آمدہ۔

نسر، بمعنی نسار، و آں جاے باشد از کوہستان وغیرہ کہ آفتاب کمتر دراں تابد، و سایباے نے کہ بر سر کوہ از چوب و علف سازند، و مطلق سایہ را گویند عموماً و سایۂ کوہ را خصوصاً۔ و بمعنی سایۂ کلاہ ہم بنظر آمدہ۔ و بمعنی سائیبان ہم گفتہ اند۔

نسیرم بمعنی نسر است و آں جاے باشد۔ . . و بعضے گویند نسیرم جاے است کہ پیوستہ آفتاب برآں تابد۔ نش بمعنی سایہ و سایہ گاہ باشد کہ جاے سایہ است و بمعنی سایۂ کلاہ ہم بنظر آمدہ۔

انجمن آرائے ناصری: نسا، موضعے را گویند از کوہ وغیرآں کہ برآں آفتاب نتابد یعند بتو کہ جاے آفتاب تاب است۔ و آنرا باضافۂ 'را' نسار گفتہ اند۔ نسر بمعنی نسا و نسار است یعنی جاے کہ آفتاب نتابد۔ شمس فخری گفتہ:

ملک در آفتاب الخ۔ و بمعنی سایبان کہ بر سرِ کوہ از چوب و خاشاک سازند نیز آمدہ۔ رودکی گفتہ: دور ماند الخ۔ . . . .

نش، سایہ و در موید سایۂ کلاہ است۔

فرہنگِ نظام: نسا، جاے کہ برآں آفتاب نتابد، یا در بعضے اوقاتِ سال بتابد۔ نسار، جاے کہ برآں تمام سال آفتاب نتابد، یا در بعضے از اوقاتِ سال بتابد۔ در سنسکرت 'نسُور' (नसूर) بمعنی بے آفتاب است؛ و نسا و نسر مخففِ آنست۔ نسر زمینے کہ برآں آفتاب نتابد یا بسیار کم تابد۔ در تکلمِ خراسان ایں لفظ ہست و بمعنی سرما خوردن از زیاد نشستن در سایہ ہم ہست۔ جہانگیری گوید: بسیارے از فرہنگ نویسہاے پیش از جہانگیری معنیِ دوم نسر را سایۂ کلاہ نوشتہ اند و جہانگیری تشریحِ معنی سایۂ کلاہ را نسبت بآنہا دادہ۔ صحاح الفرس شاعر را رودکی نوشتہ و مصرع دوم را طورے دیگر نقل کردہ و شعر را شاہد براے نسر بمعنی کرگس عربی قرار دادہ۔ عبارتش اینست: "نسر سایہ باشد

ونسر بلغتِ عرب کرگس باشد۔ رودکی گفت :

دور گشت از دیارِ خویش وتبار

نسر می ساخت بر سرِ کہسار

یعنی آں شخص مانند کرگس بود کہ باکوہسارے ساخت … نسیرم : (در نسخۂ میرزا (فرہنگِ ابراہیمی) و موید الفضلا، جائے باشد کہ آفتاب برآں نیفتد سروری شاہد بدست نیامد۔

تفصیلاتِ بالا سے معلوم ہوا کہ بظنِ قوی اصل لفظ نسر اور نسیرم ہیں لیکن اس کی دوسری شکلیں یعنی نصر، نصران، نسپرم اور نسرم تصحیفات ہیں۔ نصر صرف دستور الافاضل میں ہے جس کی تصدیق کسی اور ماخذ سے نہیں ہوتی ؛ نصران بھی اس میں ہے، لیکن اس کی تائید بحر الفضائل سے سے ہوجاتی ہے۔ اس سے بخوبی واضح ہے کہ خود مؤلفِ دستور کے نزدیک اس لفظ کی یہی قرأت درست تھی۔ یہ بھی یاد رہے کہ اس لفظ کے وہی معنی ہیں جو نسیرم کے ہیں اور نسیرم دستور اور بحر الفضائل دونوں سے خارج ہے، قواس کے کسی نسخے کی بنا پر شرفنامہ کے حاشیے میں ہے کہ فرہنگ قواس میں نسیرم کے بجائے نسپرم ہے، یعنی حرف سوم کو بائے فارسی قرار دیا گیا ہے لیکن بہرحال یہ قرأت فرہنگ قواس کی غلط کتابت کی وجہ سے فرض کی گئی ہے، اس لیے کہ آخر الذکر کے موجودہ نسخے میں نسیرم ہی ہے۔ نسرم کی قرأت جو موید میں قواس کے حوالے سے ہے، اسے سروری نے سامی کے حوالے سے لکھا ہے۔ ظاہر ہے کہ کسی سند کے بغیر محض ایک روایت کی بنا پر نسیرم پر جو فرہنگوں میں ہے، نسپرم یا نسرم کو ترجیح نہیں دی جا سکتی۔

اب آیئے ان کے معانی کی طرف ، نسر کے معنی قدیم فرہنگوں میں سایہ گاہ یا سایہ بان کے ملتے ہیں۔ اور اس کی شہادت رودکی کے ایک شعر سے دی گئی ہے، جو فرس، قواس، صحاح، جہانگیری، سروری، رشیدی اور ناصری میں نقل ہوا ہے۔ اس سلسلے میں سروری، جہانگیری، رشیدی اور ناصری میں اس معنی پر اتنا اضافہ ہے : "سایبانے کہ بر سرِ کوہ از خس وخاشاک سازند۔" اس اضافے کی ذمہ داری شمس فخری پر ہے ؛ لیکن اس نے جو بیت سند میں نقل کی ہے اس سے اس اضافے کی توثیق مطلق نہیں ہوتی۔ جہانگیری کے پیشِ نظر معیارِ جمالی تھی اس بنا پر

اسے واضح طور پر لکھنا چاہیے تھا کہ اس کا اضافہ شمس فخری کی طرف سے ہوا ہے، لیکن اس میں اس اضافے کی طرف مطلق توجہ نہیں کی گئی۔ اس معنی کا اکثر فرہنگوں میں ذکر ہوا ہے۔ صاحب رشیدی رودکی کا شعر نقل کرنے کے بعد لکھتا ہے کہ اسے اس معنی میں تامل ہے۔ صاحبِ فرہنگ نظام اس معنی کے لیے رودکی کے شعر کو غلط قرار دیتا ہے۔ اس نے صحاح الفرس کا سہارا لیا، جس کے قلمی نسخے میں دو معنی اسی ترتیب سے تھے: (۱) سایہ گاہ (۲) کرگس ـــــ اور اس کے بعد رودکی کی بیت درج تھی۔ مولف فرہنگ نظام کا خیال ہے کہ محمد بن ہندوشاہ مولفِ صحاح نے یہ بیت کرگس کے معنی کی توثیق میں درج کی ہے۔ چنانچہ مولفِ فرہنگ کے نزدیک اس بیت کے معنی یہ ہوتے: "وہ شخص کرگس کی طرح تھا جو کوہسار کے ساتھ ساز گاری پیدا کرتا تھا" مولفِ فرہنگ نظام کے قول پر بوجوہ اعتراض وارد ہوتا ہے:-
اوّلاً یہ کہ جب صحاح الفرس میں دو معنی دیے ہیں تو بیتِ سناہ کو معنی دوم کا شاہد بغیر کسی قرینہ کے کیوں سمجھا گیا۔ دوم صحاح الفرس کے سامنے لغتِ فرس ہے اور اس میں رودکی کی بیت بمعنی اوّل یعنی سایہ گاہ یا سایہ بان شاہد کے طور پر نقل ہوئی ہے۔ سوم، فرہنگ قواس میں بھی یہ بیت اسی معنی کی شاہد ہے۔ چہارم، "نسر می ساخت بر سر کہسار" میں مولفِ فرہنگِ نظام کے معنی کے لحاظ سے 'بر' کے بجائے 'با' ہونا چاہیے، جو کسی نسخے میں نہیں ہے (مولف مذکور کے معنی پر بھی اعتراض ہے، لیکن اس سے نسر کے معنی پر کسی قسم کی روشنی نہیں پڑتی اس لیے اس کا اعادہ غیر ضروری ہے) مختصر یہ کہ میرے خیال میں صحاح الفرس میں لغتِ فرس کی پیروی میں رودکی کی بیت کو نسر بمعنی سایہ بان کا شاہد سمجھا گیا ہے نہ کہ دوسرے معنی کا۔

اس سلسلے میں ایک اور امر کی طرف بھی اشارہ ضروری ہے۔ شمس فخری کی بیت جو نسر بمعنی سایہ بان کی توضیح کے لیے درج ہوئی تھی، اسے رشیدی میں نسر بمعنی جائے کہ آفتاب بدو نتابد، کی وضاحت کے لیے بتایا گیا ہے جو غلط ہے۔ رشیدی نے جہانگیری سے استفادہ کیا، مگر وجہ نہ معلوم ہوئی کہ آخر اس نے اپنے ماخذ سے انحراف کیوں کیا۔ مزید براں خود ناظم بیت یعنی شمس فخری نے یہ بیت نسر بمعنی سایبان کی توضیح کے لیے لیا تھا۔ اس کی تصدیق نہ صرف اس فرہنگ کے تمام نسخوں سے ہوتی ہے، بلکہ بعد کی فرہنگوں میں بھی اس بات کا برابر اعادہ کیا گیا

ہے۔ اس کے باوجود اگر صاحب رشیدی بیت کو کسی دوسرے معنی کی سند سمجھیں تو اس کا کوئی علاج نہیں۔ رشیدی کی پیروی میں رضا قلی ہدایت نے بھی شمس فخری کی بیت کو "جائے کہ آفتاب نتابد" کی وضاحت کے لیے سمجھا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ قول سراسر غلط اور قابلِ ترک ہے۔
یہاں تک "نُسر" کے سند کے شعر کا معاملہ تھا۔ اب اس کے مختلف معانی کی حقیقت ملاحظہ ہو۔ فرہنگوں میں اس کے حسب ذیل معانی بیان ہوئے ہیں:

۱ - سایبان
۲ - سایہ گاہ
۳ - سایۂ کلاہ
۴ - سایہ
۵ - سایبان، جو پہاڑ پر خس وخاشاک سے بنایا جائے
۶ - پہاڑ وغیرہ پر وہ جگہ جہاں آفتاب کا عکس نہ پڑتا ہو۔

سایہ بان اور سایہ گاہ ایک ہی ہے۔ قدیم فرہنگوں میں اکثر سایہ گاہ ہے۔ صرف فرہنگِ قواس میں سایہ بان ہے (اگرچہ اس کے ایک نسخے میں سایہ گاہ بھی ہے، جسے بعض فرہنگ نویسوں نے سایۂ کلاہ پڑھا) شمس فخری میں پہاڑ پر چھپر کا سایبان قرار دیا گیا ہے، حالانکہ یہ قید بیکار ہے نہ اس کے اپنے نظم کیے ہوئے شعر سے اس کی توثیق ہوتی ہے اور نہ رودکی کی بیت ہی سے یہ معنی نکلتے ہیں لیکن چونکہ رودکی کی بیت میں "سر کہسار" ہے، اس لیے شمس فخری کے معنی میں بھی اس کی قید ہے جس کا بعد کے فرہنگوں میں برابر اعادہ ہوتا رہا۔ واضح رہے کہ یہ اضافہ بالکل غیر ضروری ہے اصل بیت سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ تعجب اس بات کا ہے کہ خود شمس فخری اس قید کے اضافے کا بانی ہے (بظاہر بیتِ رودکی میں "سر کہسار" کی بنا پر) لیکن خود اپنی بیت میں اس طرح کی کوئی پابندی عائد نہیں کرتا۔ وہ کہتا ہے کہ آفتابِ ستم سے بچنے کے لیے ملک ہمیشہ تیرے عدل کے وسیلے سے "نسر" تیار کرتا ہے۔ اس میں نسر کے معنی سوائے سایہ گاہ یا سایہ بان کے اور کیا ہیں؟ اس لیے سمجھ میں نہیں آتا کہ پھر اس بیت کے ناظم نے یہ غیر ضروری قید کیوں لگائی۔ سایۂ کلاہ سایہ گاہ کی تصحیف، اور اس لیے درخورِ اعتنا نہیں ہے۔ موید میں یہ

معنی فرہنگِ قواس کے حوالے سے درج ہوئے ہیں۔ فرہنگ مذکور کے موجودہ نسخے میں سایبان ہے۔ لیکن سایۂ کلاہ کے ذکر سے یہ قیاس ہوتا ہے کہ کسی نسخے میں شاید سایہ گاہ رہا ہو جو غلطی سے سایۂ کلاہ پڑھا گیا۔ اس کا بھی امکان ہے کہ صاحبِ موید نے حوالہ غلط نقل کر دیا ہو، اس لیے کہ صاحبِ موید کے پیشِ نظر فرہنگ قواس کا کوئی نسخہ نہیں تھا، اس نے قواس کے اقوال کسی دوسرے ماخذ سے نقل کیے ہیں۔ اس قیاس کی تائید اس سے ہوتی ہے کہ موید میں نسرُ عربی کے ذیل میں شرفنامہ کے حوالے سے سایۂ کلاہ معنی بھی ملتے ہیں۔ ممکن ہے کسی وجہ سے شرفنامہ کے بجائے قواس کا نام درج ہو گیا ہو۔ شرفنامہ کے نسخۂ علیگڑھ میں بھی نشر (با شین قرشت) سایۂ کلاہ کے معنی میں آیا ہے۔ پھر نش کے معنی مختلف متاخر نسخوں میں سایۂ کلاہ کے ملتے ہیں۔ ایسا خیال ہوتا ہے کہ اس تصحیف کی ذمہ داری صاحبِ شرفنامہ کے سر ہے، حالانکہ اس کے قبل کی کسی معلوم فرہنگ میں یہ معنی نہیں ملتے۔ اسی لیے ہم اسے غلط اور قابلِ ترک ٹھہراتے ہیں۔ صاحبِ شرفنامہ کے پیشِ نظر جو فرہنگیں تھیں ان میں سایہ گاہ ہے، اس بنا پر کوئی وجہ نہیں کہ ہم سایۂ کلاہ کو سایہ گاہ کی تحریف نہ سمجھیں۔

مطلق سایہ کے معنی سروری اور برہان میں بیان ہوئے ہیں۔ لیکن کسی قدیم فرہنگ سے اس کی باقاعدہ تائید نہیں ہوئی، البتہ بعض نسخوں میں سایہ گاہ کی جگہ صرف سایہ درج ہو گیا ہے (مثلاً دیکھیے صحاح، ۲/۱: ص ۱۱۷) شاید اسی وجہ سے نسر کے یہ معنی تجویز ہوئے ہیں — مختصر یہ کہ نہ کسی اہم ماخذ میں یہ معنی موجود ہے، نہ اس کے لیے کوئی سند ہی پائی جاتی ہے۔ اس بنا پر یہ معنی بھی درخورِ توجہ نہیں۔

رہے نسر کے یہ معنی، پہاڑ کی وہ جگہ جہاں آفتاب کا عکس نہ پڑتا ہو۔ یہی معنی نسبرم کے ہیں اور اسے نسر کا مترادف قرار دے کر آخر الذکر کے لیے یہ معنی ٹھہرا لیے گئے ہیں۔ اس معنی کا قدیم ترین ماخذ بحالتِ موجودہ فرہنگِ جہانگیری ہے اور وہیں سے بعد کی فرہنگوں میں یہ نقل ہوتے ہیں، لیکن اس معنی کے سلسلے سے نہ نسبرم کے لیے کوئی سند موجود ہے اور نہ نسر کے لیے۔ اسی لیے نسبرم اور نسر کے ہم معنی ہونے کا معاملہ قابلِ اطمینان حد تک حل نہیں ہو سکتا ہے۔

نسیرم کے معنی کے سلسلے میں کوئی خاص اختلاف نہیں۔ اس لفظ کا قدیم ترین ماخذ فرہنگ قواس ہے جس میں نسیرم کے معنی دیے ہیں ، وہ مقام جہاں آفتاب کا سایہ نہ پڑتا ہو۔ اکثر فرہنگوں میں بالکل یہی معنی نقل ہوئے ہیں۔ بعض میں پہاڑ کی جگہ کی قید لگا دی گئی ہے، اور یہ اس لیے کہ نسیر کو اس کا مترادف ٹھہرایا اور چونکہ نسہ کے معنی میں پہاڑ کی تخصیص تھی، اس لیے بعد کے فرہنگ نویسوں میں سے بعض کے یہاں نسیرم کے معنی میں پہاڑ کی جگہ کی تخصیص ملتی ہے۔ واضح رہے کہ یہ قید دونوں حالتوں میں متاخر فرہنگ نویسوں کی ایجاد ہے، اور چونکہ اس کی تائید میں کوئی سند نہیں ہے، ہم اسے بھی قابلِ توجہ قرار نہیں دے سکتے۔

ادات الفضلا کے نسخۂ علی گڑھ میں ذرا اختلاف ہے۔ اس میں نیفتد کی جگہ 'افتد' ہے۔ شرفنامہ کے حاشیے میں موید کے حوالے سے مزید یہ لکھا ہے : در ادات آنجا کہ آفتاب نیفتد، د آنجا کہ بر آں آفتاب (یا آفتاب بر آں) افتد"۔ اس سے ظاہر ہے کہ ادات کے مختلف نسخوں میں اختلاف ہے۔ اسی وجہ سے برہان میں بغیر حوالہ کے درج ہے کہ 'و بعضی گویند نسیرم جائے است کہ پیوستہ آفتاب برآں تابد۔' چونکہ ادات کے بعض نسخوں میں 'نتابد' ہے اور یہی قدیم اور متاخر سبھی فرہنگوں میں ہے، اس لیے ہم 'بتابد' کتابت کی غلطی قرار دیتے ہیں۔

'نسر' کے وجود کے سلسلے میں دو گواہیاں ملتی ہیں۔ فرہنگ نظام میں ہے کہ خراسان میں گفتگو میں یہ لفظ موجود ہے اور سایے میں زیادہ بیٹھنے کی وجہ سے سردی لگ جانے کے معنی میں مستعمل ہے۔ آقای فرد زانفر سے روایت ہے کہ بشرویہ (خراسان) میں نسر جائے سرد کو کہتے ہیں اور تابستانی ایوان جس کا رخ شمال کی طرف ہو، نسار کہلاتا ہے اور محاورہ میں استعمال کرتے ہیں 'جانسر کی طرف' یعنی شمال کی طرف۔

ذرک صحاح الفرس، ۱۱۷ ح

فرہنگ نظام کے مولف نے نسر کو سنسکرت کلمہ نسُور (न सूर) سے ماخوذ بتایا ہے جو حرف نفی 'نہ' اور 'سور' بمعنی سورج سے بنا ہے جس کے معنی بے سورج کے ہیں۔ یہ بات قرینِ قیاس معلوم ہوتی ہے۔ لیکن ایران کی قدیم زبانوں میں بھی اس لفظ کی اصل کی تلاش ضروری تھی۔

بلنج ، ملنج

قواس : بلنج ، ریوند

دستور : ملنج ، ریوند

ادات : بلنج ، باجیم فارسی زاکِ سیاہ کہ بداں خضاب کنند و عرب آنزا راج گویند

موید : بلنج ، زاکِ سیاہ کہ بداں خضاب کنند ، بتازیش راج گویند

ملنج ، گیاہی است کہ چرندگاں راستی آرد ۔

مدار : بلنج ، زاکِ سیاہ کہ بداں خضاب کنند ۔

جہانگیری : ملنج ، سنگ فلاخن بود

ملنج ، گیاہے باشد کہ چوں حیوانات بخورند ، مست شوند

برہان : بلنج ، زاکِ سیاہ را گویند

ملنج ، سنگے را گویند کہ در فلاخن گذارند

ملنج ، گیاہے باشد کہ چوں چہار پایاں خورند ، مست گردند ۔

رشیدی : ملنج ، گیاہے است ، چوں حیوانات خورند مست شوند ؛ و در فرہنگ مخلج
بتقدیم خائے نیز آوردہ

فرہنگ نظام : ملنج ، گیاہے بود کہ چوں الخ

تفصیلاتِ بالا سے واضح ہوتا ہے کہ بظاہر 'بلنج' اور 'ملنج' دو الگ لفظ ہیں ۔ اول الذکر کے معنی زاکِ سیاہ کے ہیں جس سے خضاب کرتے ہیں ۔ یہ معنی ادات ، موید ، مدار ، برہان اور سروری میں پائے جاتے ہیں ۔ لفظ بلنج جہانگیری ، رشیدی اور فرہنگِ نظام سے خارج ہے ۔ لیکن اس اخراج سے زیادہ قابلِ غور بات قواس میں درج شدہ لفظ 'بلنج' کی ہے ، جس کے معنی ریوند کے ہیں ۔ یہی معنی دستور میں 'ملنج' کے بتائے گئے ہیں ۔ اور ریوند کے معنی موید (۱ : ۲۸۲) میں یہ درج ہیں : " گیاہے است کہ چرندگاں راستی آرد " اس سے واضح ہے کہ دستور میں مندرجہ معنی اور بعد کے فرہنگ نگاروں کے بیان کردہ معنی میں کوئی فرق نہیں ہے ۔ اس سے مزید یہ بھی ظاہر ہے کہ قواس کے نزدیک بلنج کے معنی زاکِ سیاہ کے

نہیں[۵]، بلکہ ریوند کے ہیں۔ اس لحاظ سے بلنج اور ملنج میں ایک صحیح اور دوسری محرّف صورت ہے۔ فرہنگ قواس کا محض ایک نسخہ موجود ہے اور وہ بھی غلطیوں سے پُر ہے، پھر وہ حرفِ تہجی کے قاعدے سے مرتب نہیں۔ اس بنا پر حرف اول کتابت کی غلطی پر بآسانی محمول ہو سکتا ہے۔ البتہ دستور، موید، مدار، جہانگیری، برہان، رشیدی، نظام سب میں ملنج ہے اور چونکہ یہ سب حروفِ تہجی کے اعتبار سے مرتب ہیں اس لیے حرف اول ان کے یہاں متعین یعنی میم ہے۔ اس لحاظ سے ان آخری فرہنگ نگاروں کے بیان کو ترجیح حاصل ہے، اور بلنج کو جو فرہنگِ قواس میں آیا ہے، ہم کتابت کی غلطی سمجھتے ہیں؛ در اصل ریوند کے لیے ملنج ہوگا، بلنج نہیں ہوگا۔

جہانگیری میں ملنج کے ایک اور معنی سنگِ فلاخن کے بھی ملتے ہیں، جو بعدًا برہان میں نقل ہوا ہے بظاہر اس لفظ کی یہ قرأت درست نہیں، صحیح لفظ ملیج ہے اگرچہ برہان کے مطبوعہ نسخے میں ملنج ہی ملتا ہے، لیکن اسے چھاپے کی غلطی پر محمول کرنا چاہیے، اس لیے کہ رشیدی میں جہانگیری کی اس قرأت کا ذکر ہوا ہے، دوم برہان کے معینی ایڈیشن میں ملنج کے بجائے ملیج ہی درج ہے اور یہ اطلاع فرہنگِ جہانگیری سے ماخوذ ہے۔ اس بنا پر صاحبِ جہانگیری کے نزدیک صحیح لفظ ملیج ہی ہے، جس کے معنی سنگ فلاخن کے ہیں۔ صاحبِ رشیدی نے جہانگیری کی اس قرأت کا ذکر تو کیا ہے، لیکن اس کے معنی نہیں بتائے بلکہ سیاق و سباق سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس کے نزدیک ملیج اور ملنج میں کوئی فرق معنی کے اعتبار سے نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ رشیدی کا یہ قیاس بے بنیاد ہے۔

مختصر یہ کہ یہ تین لفظ ہم شکل ہیں، لیکن تینوں کی الگ الگ صورتیں ہیں اور ان کے معنی بھی مختلف ہیں:-

(۱) بلنج، بمعنی زاکِ سیاہ

(۲) ملنج، بمعنی ریوند یعنی گیاہے کہ مستی آرد

---

۵ فرہنگ قواس میں نباتات کے ذیل میں بلنج نقل ہوا ہے، اس سے یہ بات بالکل واضح ہے کہ فخر قواس بلنج کو نباتات ہی کی قسم گردانتا ہے۔

(۳) ملیج بمعنی سنگِ فلاخن۔

کانا، کاناز

لغتِ فرس: کاناز، بُنِ خوشۂ رطب باشد، رودکی گوید:

من بداں آدم بخدمتِ تو
کہ برآید رطب ز کانازم

قواس: کانا، چوبِ بُنِ خوشۂ خرما بود۔ رودکی گوید:

من بداں آدم بخدمتِ تو
تا برآید رطب ز کانا ام

صحاح الفرس: کاناز، بُنِ خوشۂ رطب باشد۔ رودکی گفت:

من بداں آدم الخ.........

دستور: کاما (صحیح کانا) چوبِ بُنِ خوشۂ خرما
کاناز، چوبِ بنِ خوشۂ خرما

بحرالفضائل: کانا، چوبِ بنِ خوشہ خرما

موید: کانا، ابلہ و نادان و چوبِ بُنِ خوشۂ خرما، و گویند کانا پارۂ از خوشۂ خرما و انگور است کذا فی الادات

معیار جمالی: کاناز، بُنِ خوشۂ رطب باشد:

عجب نباشد اگر از نحوستِ طالع
مخالفان ورا زہر روید از کاناز

جہانگیری: کاناز، بُنِ خوشۂ خرما را گویند۔ رودکی گوید: من بداں الخ....
شمس فخری گفتہ: عجب نباشد الخ....

رشیدی: کاناز، بُنِ خوشۂ رطب۔ رودکی گوید: من بداں الخ...

برہان: کانا، بمعنی نادان واحمق، و چوبِ بن خوشۂ انگور و خرما، و پارۂ از خوشۂ انگور و خرما۔

کاناز، چوبِ بُنِ خوشۂ خرما را گویند یعنی جائے کہ نخل چسپیدہ باشد۔
کُانا کے معنی احمق اور نادان کے ہیں، جو لغتِ فرس، صحاح، معیارِ جمالی، جہانگیری، رشیدی میں درج ہیں، اس کے صرف ایک معنی چوبِ بُنِ خوشۂ خرما کے قواس اور بحرالفضائل میں ملتے ہیں جبکہ اس کے حسبِ ذیل تین معانی: ۱۔ ابلہ و نادان، ۲۔ چوب بُنِ خوشۂ خرما؛ ۳۔ پارۂ از خوشۂ خرما و انگور، مویدالفضلا اور برہان میں پائے جاتے ہیں۔ آخرالذکر میں دوسرے معنی میں خرما کے ساتھ انگور کا بھی اضافہ ہوا ہے۔ دستور میں کانا اور کاناز ہم معنی ہیں، اور دونوں کے ایک ہی معنی ہیں یعنی چوبِ بُنِ خرما۔ اس کے مقابلے میں لغتِ فرس، صحاح الفرس، معیارِ جمالی، جہانگیری اور رشیدی میں کانا اور کاناز کے الگ الگ معانی بیان ہوئے ہیں: کانا بمعنی احمق اور کاناز بمعنی بُنِ خوشۂ خرما۔ اس تفصیل سے واضح ہے کہ دراصل فرہنگ قواس کے اصل نسخوں میں کاناز کے بجائے کانا لکھا ہوا تھا۔ اگرچہ اس غلطی کو خود فخر قواس یعنی مولف فرہنگنامہ کی غلطی قرار دینے میں یہ امر مانع ہے کہ اس کے پیشِ نظر لغتِ فرس تھی اور اس لغت میں کانا اور کاناز اتنے دور آئے ہیں کہ ان میں التباس کا موقع ہی نہیں: کانا حرف الف کے ذیل میں اور کاناز حرف ز کے ذیل میں درج ہوئے ہیں۔ لغتِ فرس میں کاناز کی بیتِ تشریح وہی ہے جو فرہنگ قواس میں کانا کی ہے۔ اس بنا پر ہم یہ قیاس کرنے میں حق بجانب ہونگے کہ دراصل فرہنگنامۂ قواس میں کاناز ہی کو کانا سمجھا گیا ہے، احمق والے کانا سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ بیتِ سند میں اس لغت میں کانازم کی جگہ کانام درج ہو گیا۔ اس سے یہ بیت بجائے کاناز کے شاہد کے کانا کی سند سمجھی گئی جو بہر حال غلط ہے۔ اس سے فرہنگنامہ اور بحرالفضائل میں مندرج کانا کی حقیقت باطل ہو جاتی ہے۔ اصلی کلمہ کاناز ہے کانا غلط ہے اور ممکن ہے کہ یہ کاتب ہی کی غلطی ہو، مصنف کی نہ ہو۔ بہرحال دستورالافاضل کے سامنے قواس میں مندرج کانا ضرور ہے، ممکن ہے قواس کے کسی دوسرے نسخے سے یا کسی اور فرہنگ سے صاحبِ دستور کو کاناز بھی مل گیا ہو، اور اس نے دونوں الفاظ کو درج کر کے غلط لفظ کانا کے جواز کی صورت اور بعد کے فرہنگوں میں درج ہونے

کا موقع فراہم کیا۔ دراصل 'کاناز' کے معنی صرف 'بُنِ خوشۂ خرما' تھے، مگر قواس میں 'چوبِ بنِ خوشہ' الخ' لکھا گیا۔ یہی اضافہ اور فرہنگوں میں بھی ملتا ہے۔ لیکن جن فرہنگوں نے صرف 'کاناز' ہی کو صحیح سمجھا ہے، ان کے یہاں بالکل درست معنی دیے ہیں۔ ادات الفضلا میں قواس اور لغتِ فرس کے معنی میں دوسری طرح کا اضافہ ہوا، یعنی 'پارۂ از خوشۂ خرما وانگور'۔ اس میں اصل سے دو طرح کا تجاوز ہے، (۱) 'بُنِ خوشۂ خرما' کی جگہ 'پارۂ خوشہ' آیا ہے، (۲) 'خرما' کے ساتھ 'انگور' کا اضافہ ہے حالانکہ بیتِ سند میں رطب ہے، انگور نہیں۔ اس سلسلے کا سب سے دلچسپ بیان برہانِ قاطع کا ہے جس میں وہ سارے معنی جو مختلف فرہنگوں میں درج ہیں، قطع نظر اس کے کہ وہ غلط ہیں یا صحیح درج کر دیے گئے ہیں؛ اس فرہنگ کی یہ مابہ الامتیاز خصوصیت اکثر الفاظ اور معانی کے سلسلے میں پائی جاتی ہے۔

خلاصۂ گفتگو یہ کہ اصل لفظ 'کاناز' ہے جس کے معنی 'بنِ خوشۂ خرما' ہیں۔ 'کانا' بمعنی احمق ہے، یہ لفظ 'کاناز' کا مترادف نہیں۔ 'کاناز' کے معنی میں 'چوبِ بن' یا 'پارۂ از خوشہ' یا 'خوشۂ خرما وانگور' کا اضافہ غلط معلوم ہوتا ہے۔

باسک ، وباسک

اس لفظ کی دو قرأتیں ہیں؛ 'باسک' اور 'وباسک' اور دونوں کے معنی فاژہ یعنی جماہی کے ہیں۔ اس لفظ کا قدیم ترین ماخذ قواس ہے جس میں یہ لفظ صرف 'باسک' کی شکل میں آیا ہے۔ دستور الافاضل اور معیار جمالی میں یہ لفظ شامل نہیں، جبکہ ادات الفضلا میں اس کی دونوں صورتیں 'پاسک' اور 'واسک' مذکور ہیں۔ پاسک حرف 'پ' (با فارسی) کے ذیل میں اس معنی کے ساتھ، 'پاسک' بضم و فتح سین با بار فارسی از ہم باز شدنِ دہن از کاہلی یا از آمدنِ خواب و فاژہ نیز گویند و عرب آنرا ثوبا و اہلِ ہند جنبھائی خوانند؛ حرف واو کے ذیل میں؛ 'وباسک' فاژۂ آنکہ دہن از ہم باز شود از کاہلی یا از آمدنِ خواب. و عرب آنرا ثوبار گویند؛ جہانگیری، رشیدی اور فرہنگِ نظام میں 'باسک' اسی معنی میں حسبِ ذیل بیتِ شاہد کے ساتھ نقل ہوا ہے،

چو باسک کند ماہ من از خمار
قرار از مہ نو نماید فرار (راجی)
اے برادر! بیار کاسۂ مے
چند باسک زنم زخواب وخمار (طپاں مرغزی)

ادات کی طرح مدار میں 'پاسک' اور ناصری میں 'باسک' بغیر بیت شاہد کے آیا ہے۔ سروری میں باسک اور وباسک دونوں ہیں، باسک کے سلسلے میں راجی کی مندرجہ صدر بیت بھی نقل ہوئی ہے، مگر وباسک کی کوئی سند نہیں دی ہے[5]۔ موید الفضلا اور برہان قاطع ہر دو میں باسک اور وباسک دونوں معنی مذکور کے لیے آتے ہیں۔ مگر واضح رہے کہ وباسک مصحف ومحرّف شکل ہے؛ اصل لفظ باسک ہے، کسی وجہ سے واو عاطفہ اس لفظ میں شامل ہوکر 'وباسک' کی تشکیل کا سبب ہوگیا۔ اس کے قراین یہ ہیں:

۱۔ جب باسک لفظ موجود ہے تو وباسک کو تصحیف کے علاوہ کچھ نہیں سمجھا جاسکتا۔ اتفاق سے 'وباسک' جس کا قدیم ترین ماخذ ادات الفضلا ہے، اس میں باسک بھی موجود ہے۔

۲۔ طپاں مرغزی اور راجی کے ابیات سے بھی باسک ہی کے اصل ہونے کا استدلال کیا جاسکتا ہے، جبکہ 'وباسک' کے لیے کوئی سند نہیں ملتی۔

۳۔ اکثر لغات میں وباسک نظر انداز ہوا ہے، یہاں تک کہ فرہنگ قواس جو باسک کا قدیم ترین ماخذ ہے، اس میں بھی وباسک نہیں ہے۔

۴۔ برہان قاطع کے حاشیے میں بھی وباسک کو مصحف بتلاتے ہوئے صراحت سے لکھا گیا ہے کہ اس میں واو عطف ہے۔

خلاصۂ کلام یہ کہ صاحب ادات الفضلا نے 'وباسک' کو اپنی فرہنگ میں نقل کرکے بعد کے فرہنگ نگاروں کے لیے ایک مسئلہ پیدا کردیا۔ یہ بھی قرار واقعی نہیں معلوم کہ آیا اسے خود دونوں لفظ کے وجود کا قطعی احساس تھا بھی یا نہیں؛ کیونکہ نہ باسک کے ذیل میں وباسک

---

[5] رشیدی میں دونوں اور جہانگیری اور ناصری میں صرف دوسری بیت نقل ہوئی ہے۔

کا ذکر ہے اور نہ و یاسک کی تشریح کے موقع پر وہ یاسک سے متعلق کوئی اشارہ کرتا ہے ایسی واضح بات سے صرف نظر محض دوسرے لفظ کے وجود سے عدم واقفیت کی بنا ہی پر ممکن ہے۔

زنج ، زنج بلور:

ادات ، زنج بلور ، جیم و واو ہر دو فارسی، چیزیست کہ اہل ہند آنرا پھٹکری خوانند

زفان گویا : زنج بلور کہ بہندوی پھٹکری گویند

بحر الفضائل ، زنج ، داروے ، پھٹکری

مؤید ، زنج ، ہماں زنج گذشتہ (اما در جائی زنج یافتہ نمی شود) و بالفتح نام موضعے کذا فی شرفنامہ و در زفان گویا زنج بالفتح بلور و بمعنی پھٹکری نیز و بالکسر شکرہ است معروف، کہ بر کبوتر افتد۔

زنج بلور ، زاک است کہ آنرا بتازی زاج نامند و ہند پھٹکری خوانند۔ و در ادات ہمچنیں مرقوم است یعنی متصل یا کاف۔

برہان : زنج مطلق زاج را گویند ، ایں لغت معرب زماست وزمہ زاج سفید باشد یعنی مطلق زاج . . . . دبعضے گویند مرغیست شکاری الخ۔

زنج ، بمعنی زاج است مطلقاً چہ زاج سفید را زنج بلور میگویند و نام موضعے ہم ہست . . . و بعضے گویند شکرہ است و آں پرندہ باشد شکاری کو جنگتر از باشہ۔

زنج بلور زاج سفید را گویند۔

زمجگور ، ایں لغت را سروری در لغت خود از مؤید الفضلا بروزن گردی دور آوردہ است الخ

انجمن آرائے ناصری : زنج در برہان گوید زاج است و زاج سفید را زنج بلور گویند و نام موضعے است الخ۔

۵۔ زفان میں ج اور چ الگ الگ بیان ہوئے ہیں

زمجی کور، با جیم پارسی وکاف، ایں لغت را سروری در فرہنگ خود از مؤید الفضلا بروزن گردی دور، آورده است بمعنی زمج بلور کہ زاج سفید است۔ واین لغت را کہ زمج بلور باشد متصل نوشتہ بودند دیاران زمجبلور را زمجیکور خواندہ اند و ازیں گونہ تصحیفات بسیار شدہ است۔

ان تینوں لغات کے سلسلے میں یہ بات تو واضح ہے کہ زمجی کور، زمج بلور کی تصحیف ہے جیسا کہ صاحبِ برہان نے صراحت کر دی ہے اور جسے انجمن آرائے ناصری میں بغیر حوالہ کے ہو بہو نقل کر لیا گیا ہے۔ البتہ اس سلسلے میں یہ عرض ہے کہ فرہنگ سروری کے مطبوعہ نسخے میں زمجیگور کوئی لغت نہیں آیا ہے۔ ظاہر ہے کہ صاحبِ برہان نے کسی قلمی نسخے سے یہ لفظ اخذ کیا ہوگا: معلوم ہوتا ہے کہ سروری کی قدیم روایت میں یہ لفظ تھا اور چونکہ اس نے فرہنگ جہانگیری سے استفادے کے بعد اس پر نظرِ ثانی کی تھی ممکن ہے اس وقت یہ مصحّف لغت بھی ترک کر دیا ہو۔ البتہ زمج اور زمج بلور کے سلسلے میں بعض باتیں تشریح طلب ہیں۔ زفان گویا میں یہ لغت بخش اول میں شامل ہے جس میں سارے لفظ مفرد ہیں، یعنی دو لفظوں سے مرکب نہیں؛ دوسرے بخش میں ایسے لغات شامل ہیں جو دو لفظوں سے بنے ہیں۔ اس سے واضح ہے کہ صاحبِ زفان گویا زمج بلور کو ایک لفظ نہیں قرار دیتا۔ اس کے نزدیک اصل لغت زمج، اور بلور اس کا معنی ہے دوسرے وہ اس لفظ کو حرفِ جیم کے ذیل میں نقل کرتا ہے۔ اگر وہ بلور کو بھی اس کا جزء سمجھتا، تو صاحبِ ادات کی طرح اسے حرف 'رے' کے تحت نقل کرتا — تیسرے صاحبِ مؤید نے اسی کے حوالے سے زمج کے دو معنی لکھے ہیں یعنی بلور اور پھٹکری۔ اسی سلسلے میں اس بات کی طرف اشارہ ضروری ہے کہ مؤید میں 'زنج' غلط ہے، زمج ہونا چاہیے۔ اس لیے کہ جو کچھ اس میں زنج کے ذیل میں ہے، وہی زفان گویا میں زمج کے تحت آیا ہے۔ مزید زفان میں زمج کے ایک معنی شکرہ کے درج ہیں، وہی مؤید میں زنج کی طرف منسوب ہے۔ اس تفصیل سے واضح ہے کہ صاحبِ زفان گویا کو ادات کے

مطالب کے سمجھنے میں غلطی ہوئی، اس نے ادات میں مذکور بلور کو الگ لفظ سمجھ لیا، حالانکہ ادات میں زمج بلور کے 'ج' اور 'واد' دونوں کو فارسی بتایا ہے۔ ظاہر ہے کہ واو سے بلور کی واو کی طرف اشارہ ہے۔ اس واضح دلیل کے بعد زمج بلور کو دو لفظ گردانے کی کوئی صورت بھی نہیں ہو سکتی۔

اب سوال یہ ہے کہ زمج الگ کوئی لفظ پھٹکری کے معنی میں ہے یا نہیں؛ اس سلسلے میں ہمارے پاس صرف بحر الفضایل کی ایک قدیم شہادت ہے جس میں زمج کے یہی معنی درج ہیں۔ لیکن بحر الفضایل ہی کے ایک دوسرے نسخے سے جس کے ہندی عناصر شیرانی مرحوم نے رسالہ مخزن مارچ، اپریل ۱۹۲۹ء میں شائع کیے تھے، یہ لفظ بظاہر خارج ہے۔ بہرحال اس شہادت کے علاوہ بظاہر اس وقت اور کوئی شہادت موجود نہیں ہے جس سے زمج کے الگ وجود پر استدلال کیا جا سکے۔ متاخر فرہنگ نویسوں کا بیان انہی قدیم فرہنگوں کے بیان پر مبنی ہے، اس لیے وہ زیادہ قابلِ توجہ نہیں۔ اسی ضمن میں مویدہ کا ایک اور بیان قابل ذکر ہے،

'ذاج زاک کذا فی التاج ودر زفان گویاست زاج ہماں زمج یعنی پھٹکری واجناسِ آں'؛

اور زفان میں ذاج کے معنی اس طور پر درج ہیں:

'ذاج، زاک یعنی پھٹکری واجناسِ آں'؛

اور زاک کے ذیل میں صرف زاج لکھا ہے، پھٹکری نہیں آیا۔

اس سے ظاہر ہے کہ مویدالفضلا نے حوالہ جات کے سلسلے میں وہ احتیاط ملحوظ نہیں رکھی، جو فرہنگ نویسی کے لیے لازمی ہے۔ صاحبِ موید کی عدم توجہی کی وجہ سے جو مسائل الجھ گئے ہیں اس کی تفصیلی بحث میں نے اپنے مضمون "فارسی فرہنگوں میں ہندستانی عناصر" میں کی ہے۔

اس گفتگو کا خلاصہ یہ ہے کہ زمج کے الگ وجود کا مسئلہ پوری طرح واضح نہیں، زفان گویا کی توضیح غلط ہے، اس سے اس پر استدلال نہیں ہو سکتا؛ اور غالباً اسی کے بیان کی وجہ سے

یہ مسئلہ اتنا الجھ گیا۔ زیج بلور البتہ ایک سا مرکب لفظ ہے جس کے معنی پوری طرح واضح ہیں۔

نخچیرگان، نخچیرگاو

نظامی کی خسرو شیریں ذیل سی لحن باربدی (ص ۱۹۳) میں ہے:

نخچیرگان:

چو بر نخچیرگاں تدبیر کردی ... بسے چوں زہرہ را نخچیر کردی

دستو الافاضل: نخچیرگاو، نام نوا

بحر الفضایل: نخچیرگاو، نام نواست

ادات، زفانگویا —— (دونوں خاموش ہیں)

موید الفضلا (۲: ۲۳۶) نخچیرگان، نام نوائے است و لحنے

ایضاً (۲: ۲۳۹) نخچیرگاو، نام نوائے است

مجمع الفرس سروری (۲: ۸۰۷) نخچیرگان، ذیل سی لحن باربدی

ایضاً (۳: ۱۴۴۳) نخچیرگان، نام نوایست و لحنے از جملہ سی لحن باربد —
شیخ نظامی فرماید در تعریف باربد: چو بر نخچیرگان الخ

برہان قاطع (ص ۲۱۲۲) نخچیرگان، نام لحن آخر است از جملہ سی لحن باربدی و آنرا
نخچیرگانی ہم خوانند و نام نوائے ہم ہست از موسیقی۔

برہان قاطع (ص ۲۱۲۲) نخچیرگاو، نام نوائے است از موسیقی

فرہنگ رشیدی (ص ۱۳۹۳) نخچیرگان، لحنے است از سی لحن باربد

انجمن آرائے ناصری (ص ۸۰۷) ذیل کلمۂ نخچیر:

دیگر نام نوائے است از موسیقی کہ آنرا نخچیرگان گویند چنانچہ نظامی گفتہ:

چو بر نخچیرگان الخ

فرہنگ نظام (۴: ۳۲۴) نخچیرگان و نخچیرگانی، نام لحنے است از سی لحن ساختۂ
باربد۔ نظامی:

جو بر نخچیرگان الخ

تفصیلاتِ بالا سے واضح ہے کہ زیرِ بحث لفظ کے معنی میں کوئی خاص اختلاف نہیں ہے۔ البتہ اس کی قرأت مختلف فیہ ہے۔ دستور الافاضل میں اس کی قرأت نخچیر گاو درج ہے، جو بآسانی کتابت کی غلطی پر محمول ہو سکتی تھی۔ لیکن اس کی تصدیق بحر الفضائل سے ہوتی ہے۔ چونکہ آخرالذکر نے دستور سے کافی استفادہ کیا۔ اس بنا پر اس قرأت کا انتخاب بھی دستور ہی کی بنیاد پر ہوا ہے۔ آگے چل کر موید الفضلا اور برہانِ قاطع میں بھی یہی قرأت موجود ہے۔ لیکن ان دونوں کتابوں میں نخچیر گاو کے ساتھ نخچیرگان بھی ہے اور دونوں نے محض دونوں قرأتوں کے نقل کر دینے پر اکتفا کیا ہے، اور اس سلسلے میں کسی قسم کی تنقید حسبِ عادت غیر ضروری سمجھ کر نظرانداز کر دی ہے۔ رشیدی، انجمن آرائے ناصری اور فرہنگ نظام میں بھی نخچیر گاو کے ذکر سے مطلق صرفِ نظر کیا گیا ہے۔ موجودہ دور کے فاضلوں میں سب سے پہلے جمال زادہ نے مجلۂ موسیقی میں 'آوازہائے قدیمی ایران' کے ذیل میں اس لفظ کی قرأتِ صحیح نخچیرگان بتائی ہے اور نخچیر گاو کو تصحیف قرار دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ ان کی بنیاد نظامی کا مندرجہ صدر شعر ہے جس میں نخچیرگان آیا ہے، نخچیر گاو سے مصرع ساقط الوزن ہو جاتا ہے۔ آقائے ڈاکٹر معین نے بھی جمال زادہ کے قول کی تائید کی ہے اور نخچیر گاو کو مصحف قرار دیا ہے۔ انھوں نے برہان کے اس قول سے متعلق کہ نخچیرگان الحانِ باربدی میں سب سے آخر ہے۔ ٹھیک کہا ہے کہ یہ ۲۷ واں لحن ہے، لحن آخر نہیں (برہان حاشیہ)۔ لیکن یہ حضرات اس غلط قرأت کے ماخذ کی نشاندہی نہ کر سکے۔ دستور الافاضل اور بحر الفضایل کے بیان کے سامنے آجانے سے یہ حقیقت روشن ہو گئی کہ سب سے قدیم مصنف جس نے نخچیر گاو کی مصحف صورت کو اصل قرار دیا ہے، وہ حاجب خیرات ہے۔ یہ غلطی بحر الفضایل میں بعینہٖ درج ہو گئی، جو موید الفضلا اور برہان قاطع میں بھی صحیح قرأت نخچیرگان کے دوش بدوش ملتی ہے۔ لیکن نخچیر گاو کے غلط ہونے میں کوئی شبہہ نہیں، اس لیے کہ نوائے باربدی کے فارسی ادب میں مخصوص ترتیب کے ساتھ پیش کرنے کا سہرا نظامی گنجوی کے سر ہے۔ اور اس کے یہاں جو شعر اس لوا کے لیے مخصوص ہے، اس میں نخچیرگان ہے۔ اگر اس کی جگہ نخچیر گاو لکھ دیا جائے تو مصرع

ساقط الوزن ہوجائیگا۔ اس سے ظاہر ہے کہ یہ شکل یقیناً لفظ کی غلط قرأت کا نتیجہ ہے۔ اگر دستور الا فاضل میں شواہد بھی درج ہوتے تو یقیناً صاحبِ دستور سے ایسی غلطی نہ ہوتی اور ایک مصحّف اور محرّف لفظ کی بنا نہ پڑتی۔ جیسا کہ اوپر ذکر ہو چکا ہے، یہ کتابت کی غلطی کا نتیجہ نہیں ہے، کیونکہ یہی غلطی بعض قدیم فرہنگوں میں بھی بعینہٖ موجود ہے، جس سے ان کے مآخذ کی غلطی کی پوری طرح توثیق ہو جاتی ہے۔ ایک تیسری شکل نخچیر گانی کا ذکر برہان قاطع میں ہے، جو بعد کی فرہنگوں میں بھی مل جاتا ہے۔ لیکن جس اصول پر نخچیر گاد غلط ہے، اسی اصول پر نخچیر گانی بھی غلط ٹھہرایا جاسکتا ہے اس لیے کہ اس قرأت سے بھی نظامی کا مصرع وزن سے ساقط ہو جاتا ہے۔ برہان قاطع میں اشعار سے قرأتوں اور معنوں کی توثیق نہیں ہوتی ہے لیکن تعجب ہے صاحبِ فرہنگِ نظام پر کہ انھوں نے برہان کی تین قرأتوں میں سے ایک یعنی نخچیر گاد کو تو نظر انداز کر دیا، اور باقی دو کو صحیح سمجھ کر اپنے لغت میں جگہ دی، مگر شعری سند میں وہی نظامی کی مشہور بیت نقل کر دی جس سے صرف نخچیر گان کی تصدیق ہوتی ہے، نخچیر گانی کی نہیں۔ ڈاکٹر معین نے بھی اس سلسلے میں کچھ نہیں لکھا۔ بہرحال جب تک نخچیر گانی کے لیے کوئی شعری سند نہیں ملتی اس وقت تک یہ قرأت اسی طرح قابلِ رد ہے جیسے کہ نخچیر گاد کی۔

اس گذارش سے جو ایک مفصل گفتگو کی دوسری قسط ہے۔ نہ کہ اس کا تتمہ و تکملہ، فارسی الفاظ کے تعیّن و تلفظ اور ان کے معانی کے سلسلے میں جو پیچیدگیاں رہی ہیں، ان کا کسی قدر اندازہ ہو سکیگا۔ یہ اہم موضوع جس توجہ کا محتاج تھا، اب تک یہ اس توجہ سے محروم رہا ہے۔ یہ گفتگو فضلا کو دعوتِ مطالعہ دیتی ہے۔ لیکن واضح رہے کہ جب تک یہ قیمتی مواد جو بیشتر قلمی صورت میں ہے مطبوعہ شکل میں سامنے نہیں آجاتا اس وقت تک مطالعے کی دشواریاں حل نہیں ہونگی۔ یہ مواد اکثر و بیشتر لغات کی شکل میں ہے، اور یہ لغات اکثر ہندستان میں مرتب ہوئیں، اس بنا پر ان کی تصحیح و ترتیب کی ذمہ داری بھی اہلِ ہند پر ہے۔ اہلِ ایران کو نسبتہً دشواری ہے، کیونکہ ان میں جو ہندستانی عناصر ہیں ان کا

تعیّن ان کے لیے محال ہے۔ اس لحاظ سے ہم لوگوں پر لغات کی تصحیح کی دوہری ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ امید کی جاتی ہے کہ ہم اس ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کی صورت نکالینگے۔

مالک رام

مولانا ابوالکلام آزاد

(پہلے بیس سال)

مولانا ابوالکلام آزاد کے بزرگ ہرات کے رہنے والے تھے۔ یہاں سے وہ بابر کے زمانے (۱۵۲۶ء - ۱۵۳۰ء) میں ہندستان آئے۔ شروع میں وہ دارالخلافہ آگرہ میں رہے، اور بعد کو غالباً اکبر کے عہد میں نقل مکان کرکے دلّی چلے آئے[۱]۔

یہاں ہمیں ان کے بزرگوں میں سب سے پہلا نام مولانا جمال الدین عرف شیخ بہلول دہلوی کا ملتا ہے۔ جن حضرات نے مولانا آزاد کی کتاب تذکرہ کا مطالعہ کیا ہے، انھیں معلوم ہوگا کہ دراصل یہ پوری کتاب انھیں مولانا جمال الدین کی سوانحِ عمری ہے۔ مولانا جمال الدین اکبر کے ہمعصر تھے اور انھوں نے اس کی مذہبی بدعتوں اور اصلاحوں کی مخالفت کی تھی۔ ان کے حالات اس عہد کے بعض تذکروں میں ملتے ہیں[۲]۔

مولانا جمال الدین کے بیٹے شیخ محمد حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی کے مرید تھے۔ حضرت مجدد مدتوں جہانگیر کے معتوب رہے تھے۔ اس کے باوجود شیخ محمد کا ان سے میل جول رکھنا اور بادشاہِ وقت کی سیاست کی پرواہ نہ کرنا ظاہر کرتا ہے کہ وہ آزادہ رَو اور دین کے معاملے میں بےخوف تھے۔

بعض لوگوں نے مولانا آزاد کے بزرگوں کا وطن قصور (ضلع لاہور) ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔

---

۱ - انڈیا ونس فریڈم (انگریزی)، ۱

۲ - مثلاً منتخب التواریخ، ۳، ۱۱۳؛ اخبار الاخیار۔

یہ ٹھیک نہیں ہے۔ قصور سے ان کا صرف اتنا تعلق تھا کہ مولانا آزاد کی دادی کے والد مولانا منور الدین غالباً قصور میں پیدا ہوئے اور ان کی زندگی کا ابتدائی زمانہ بھی یہیں بسر ہوا تھا۔ مولانا منور الدین کے والد مولانا رشید الدین بھی دراصل ہرات ہی کے خاندانِ قضات میں سے تھے۔ اور مولانا رشید الدّین کے والد بزرگوار مولانا صدر الدین ہرات[؟] شیخ طریقت کی حیثیت سے معروف تھے۔ گمان غالب ہے کہ مولانا آزاد کے بزرگوں اور مولانا رشید الدّین کے خاندان کو آپس میں ہرات میں بھی تعلقات رہے ہوں گے۔ قاضی رشید الدین احمد شاہ ابدالی کے ساتھ پنجاب آئے اور یہاں انھوں نے قصور میں سکونت اختیار کر لی۔ احمد شاہ نے انہیں صوبۂ لاہور کا قاضی القضاۃ اور اپنے نائب السلطنت نور الدین کا مشیر مقرر کر دیا تھا۔[۳] ان کے بیٹے منور الدین اپنی ابتدائی تعلیم لاہور میں ختم کرنے کے بعد سولہ سترہ سال کی عمر میں حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کی شہرت سن کر دلّی آئے اور یہاں ان کے حلقۂ درس میں شامل ہو گئے۔ مولانا آزاد نے خود لکھا ہے کہ مولانا منور الدّین نے قصور سے دلّی تک کا یہ سفر بیشتر پیدل طے کیا تھا، بالخصوص سرہند سے دلّی تک کی مسافت۔[۴] یہ اس لیے کہ اس زمانے میں پنجاب کی سیاسی حالت بہت مخدوش تھی، ہر طرف طوائف الملوکی کا دور دورہ تھا۔ ایسے میں سواری کا انتظام کہاں ہو سکتا تھا۔ قرائن ایسے ہیں کہ یہ ۱۸۰۰ – ۱۸۰۱ کا زمانہ ہوگا، جب پنجاب میں سکھوں کی عملداری اور دلّی کے نواح میں انگریزوں اور مرہٹوں کی باہمی آویزش کے باعث افراتفری پھیلی ہوئی تھی۔

مولانا منور الدّین دلّی آئے تو پھر چھ برس تک تعلیم کے سوا اور کسی چیز سے سروکار نہیں رکھا۔ اسی اثنا میں ان کے والد قاضی رشید الدّین کا قصور میں انتقال ہو گیا۔ جب انھیں اس کی اطلاع ہوئی تو وہ قصور گئے اور خاندان کے بقیہ افراد کو ساتھ لے آئے اور اب مستقل طور پر یہاں دلّی میں سکونت اختیار کر لی۔ اس کے بعد انھوں نے حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کے مشورے سے یہیں دلّی میں شادی کی۔ ان کی اولاد میں صرف دو لڑکیاں ہوئیں۔ بڑی کی شادی انھوں نے

۳ - تذکرہ، ۲۷۔ آزاد کی کہانی (صفحہ ۳۷) میں ملیح آبادی نے مولانا منور الدین کے والد کا نام سراج الدین لکھا ہے۔ یہ سہو ہوگا۔ تذکرہ کا نام ہی صحیح اور معتبر ہے۔
۴ - غالب، ۲۸۱؛ نقش آزاد، ۳۱۱ – ۳۱۲؛ آزاد کی کہانی، ۱۴۱ – ۴۲
۵ - آزاد کی کہانی، ۴۲

مولانا جمال الدین کے خاندان کے نام لیوا شیخ محمد ہادی سے کردی یہی شیخ محمد ہادی مولانا آزاد کے جدِ امجد تھے[6]۔

غرض شجرۂ نسب یوں ہے ۔ مولانا ابوالکلام آزاد بن مولانا خیرالدین بن مولانا محمد ہادی بن شاہ محمد افضل[7] بن مولانا محمد محسن[8]۔ یہ سب بزرگ یہیں دلّی کے رہنے والے تھے ۔ پس جب وہ اپنے نام کے ساتھ دہلوی لکھتے ہیں یا کہتے ہیں کہ " آبائی وطن دہلی مرحوم ہے" تو اس میں حق بجانب ہیں ۔

یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ مولانا جمال الدین عرف شیخ بہلول دہلوی جن کا ذکر اوپر ہوا انھیں مولانا آزاد کے پردادا شاہ محمد افضل کے ننہالی سلسلے کے بزرگ تھے [9]

مولانا منورالدین نے کرنے کو تو حکومتِ وقت کی ملازمت بھی اختیار کر لی ، لیکن ملک کی عام طور پر اور شاہی خاندان کی خاص طور پر جو حالت ـــــ سیاسی اور اخلاقی اس وقت تھی ، وہ اس سے سخت دل برداشتہ تھے ۔ بالآخر انھوں نے غالباً ۱۸۵۵ء میں یہاں سے ہجرت کرکے حجاز چلے جانے کا فیصلہ کر لیا ۔ وہ بھوپال کے راستے سے بمبئی کے لیے روانہ ہو گئے ۔ ارادہ یہ تھا کہ وہاں سے جہاز پر سوار ہوں گے ۔ بھوپال میں ان دنوں نواب سکندر بیگم حکمراں تھیں ۔ وہ مولانا منورالدین کے وعظ اور پند و نصائح سے بہت متاثر ہوئیں ۔ ہنوز یہ بھوپال ہی میں تھے ، جب ۱۸۵۷ء کا مشہور ہنگامہ (غدر) ہوا ہے ۔ شورش فرو ہو جانے کے بعد یہ بمبئی پہنچے ، لیکن آگے جانا نصیب نہ ہوا ۔ پہلے علالت کی وجہ سے سفر جاری نہ رکھ سکے ، بعد کو مریدوں نے جوشِ عقیدت میں روک رکھا غرض اسی حیص بیص میں دو سال نکل گئے اور بالآخر ان کا انتقال ہو گیا ۔ یہ ۱۸۵۸ ـ ۱۸۵۹ء کا زمانہ سمجھنا چاہیے [10]

---

۶ ـ تذکرہ ، ۲۵ ۷ ـ تذکرہ ۳۱ ۸ ـ ایضاً ، نیز ص ۲۸۹

۹ ـ ایضاً ، ۳۱ ۱۰ ـ انڈیا ونس فریڈم (انگریزی) ، ۱

اس کے برخلاف " آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی " میں مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی نے لکھا ہے کہ مولانا منورالدین کا " بمبئی میں دو سال قیام رہا ، تیسرے سال مکہ معظمہ پہنچے اور پانچ سال میں حج کرکے وہیں انتقال کیا ۔ اسی سال ہندستان میں غدر ہوا " (ص ۴۳) اس میں اور انڈیا ونس فریڈم کے بیان میں متعدد نمایاں اختلافات ہیں جب ذاتی طور پر دوسری کتاب کو زیادہ معتبر

مولانا آزاد کے جد امجد شیخ محمد ہادی نے بہت کم عمری (غالباً ۱۲۴۰ھ ۔ ۱۸۲۵ء) میں وفات پائی۔ اس وقت مولانا آزاد کے والد بزرگوار مولانا خیر الدین صرف تین یا چار سال کے تھے؛ ان کا سال ولادت ۱۸۳۱ء ہے۔ والد کی وفات کے بعد ان کی پرورش اور تعلیم و تربیت اپنے نانا مولانا منور الدین کی نگرانی میں ہوئی۔

جب مولانا منور الدین دلی سے حج کے لیے روانہ ہوئے ہیں، تو یہ بھی نانا کے ساتھ تھے۔ ان کے بمبئی میں انتقال کر جانے کے بعد یہ حجاز گئے۔ چونکہ تعلیم ہندوستان میں مکمل کر چکے تھے اس لیے حجاز میں انھوں نے بعض علماء سے صرف اسناد کی تجدید کی۔ اسی سلسلے میں یہاں ان کی اس زمانے کے دو مشہور عالموں سے ملاقات ہوئی۔ شیخ عبداللہ سراج مکے میں اور شیخ محمد ظاہر وتری مدینے میں حدیث و فقہ کے درس و تدریس میں مسلّم الثبوت استاد مانے جاتے تھے۔ مولانا خیر الدین ان اصحاب کی خدمت میں حاضری دینے لگے اور انھوں نے ان سے بہت استفادہ کیا۔

مولانا خیر الدین نے حجاز پہنچنے کے کوئی دس سال بعد یعنی (۱۸۷۰ ۔ ۱۸۷۱ء) میں وہیں مدینے میں شادی کی[۱۳]۔ یہ خاتون جن کا اسم گرامی عالیہ تھا[۱۴]، ان کے استاد شیخ محمد ظاہر وتری کی بھانجی تھیں۔ یہی مولانا آزاد کی والدہ ماجدہ ہیں۔ ان سے متعلق مختلف ذرائع سے کچھ مزید معلومات حاصل ہوئی ہیں۔

مدینے میں پوچھ گچھ سے پتہ چلا کہ ان کا خاندان دراصل مراکش کا رہنے والا اور مدتوں سے علم و ارشاد کا مرکز تھا۔ ان کے بزرگ ہجرت کر کے مدینے میں آ بسے تھے۔ یہ خود یہیں مدینے میں پیدا ہوئی تھیں۔ مولانا آزاد نے ان سے متعلق لکھا ہے کہ انھیں اپنے گھر کے علمی ماحول کے باعث

خیال کرتا ہوں میرے خیال میں ملیح آبادی صاحب سے سہو ہوا نیز اس سلسلے میں دیکھیے نقش آزاد ، ۷۷۔

۱۱۔ آزاد کی کہانی ، ۶۵ ۱۲۔ آزاد کی کہانی ، ۲۷

۱۳۔ میرے سامنے مولانا مرحوم کی ایک غیر مطبوعہ تحریر ہے؛ اس میں انھوں نے جناب عبدالشاہد خاں شیروانی (علی گڈھ) کے استفسار پر اپنے اور اپنے خاندان سے متعلق کچھ معلومات مہیا کی تھیں۔ کئی تاریخوں اور ناموں کی تعیین اسی سے ہوئی اس کا حوالہ جابجا 'غیر مطبوعہ تحریر' کے نشان سے دیا گیا ہے۔ یہ نام بھی وہیں ملا (ص ۵)

۱۴۔ غیر مطبوعہ تحریر ، ۵ ۔ ۶

تعلیم کا غیر معمولی موقع ملا۔ فنونِ عربیہ اور دینیات میں متوسط درجے تک کی قابلیت ضرور تھی۔ لیکن اردو اچھی طرح نہیں جانتی یا بول سکتی تھیں۔ حج کے موقع پر جو ہندستانی عورتیں ان کی ملاقات کو آتیں، ان سے بات چیت کرنے کے لیے انھیں مترجم کی ضرورت محسوس ہوتی تھی۔ مولانا آزاد نے ان کی دینی مسائل سے واقفیت کے ایک واقعے کا ذکر کیا ہے، لکھتے ہیں[15]:

ایک مرتبہ ایک عورت نے جو ملتان سے آئی تھی، فرائض یعنی تقسیم ورثہ کا ایک نہایت پیچیدہ سوال کیا۔ انھوں نے ایک منٹ کے اندر غور کر کے اس کا جواب دے دیا۔ وہ جواب مجھے یاد ہے اور میں محسوس کرتا ہوں کہ آج مجھ سے کوئی اس نوعیت کا سوال کرے تو میں بغیر کاغذ پر حساب کرنے کے اس کا جواب نہیں دے سکتا۔

مولانا خیر الدین کے ان خاتون سے پانچ بچے ہوئے: تین لڑکیاں اور دو لڑکے۔ لڑکیاں، زینب، فاطمہ اور حنیفہ (عرف محمودہ) تھیں، اور لڑکے ابو النصر غلام یسین اور ابو الکلام غلام محی الدین احمد یعنی ہمارے مولانا آزاد۔

میرا خیال ہے کہ ان دونوں بھائیوں کی کنیت۔ ابوالنصر اور ابوالکلام ان کے نام کے ساتھ ہی ان کے والدین نے رکھی ہوگی۔ آج بھی عرب ممالک میں یہ عام رواج ہے کہ چھوٹے بچے کی کنیت کا بچپن ہی میں اعلان کر دیتے ہیں۔

حنیفہ سب سے چھوٹی کا تخلص آبرو تھا اور فاطمہ کا آرزو۔ سب سے بڑی زینب قسطنطنیہ میں پیدا ہوئی تھیں۔ آبرو بیگم کا ذکر انھوں نے بہت جگہ کیا ہے۔ یہ ان کی بڑی ہمدرد اور غمگسار تھیں۔ ان کی شادی کلکتہ کے ایک صاحب احمد ابراہیم سے ہوئی تھی جو بعد کو خاندان کے پرانے تعلقات کے پیش نظر بھوپال میں ایک معقول عہدے پر فائز ہو کر مستقلاً وہیں مقیم ہو گئے تھے۔ آبرو بیگم کا جون ۱۹۴۳ء میں بھوپال ہی میں انتقال ہوا[16]۔ آرزو بیگم کا بھی ۱۳ اپریل ۱۹۶۶ء کو ۸۲ سال کی عمر میں بھوپال میں انتقال ہو گیا[17]۔

مولانا خیر الدین اپنی مذہبی اور دینی حیثیت کے باعث اپنے گھر اور اپنے مریدوں کے حلقے میں حضرت کے عرف سے مشہور تھے[18]۔ قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد کو ان کے بچپن میں یہ لوگ

۱۵۔ ایضاً، ۱۶   ۱۶۔ انڈیا ونس فریڈم، ۲
۱۷۔ ہندوستان ٹائمز، دلی، ۱۴ اپریل ۱۹۶۶ء: ۴
۱۸۔ آزاد کی کہانی، ۳۵۴   ۱۹۔ غبار خاطر، ۹۹

چھوٹے حضرت کہ کیریکٹر تے سقے[19]

مولانا آزاد نے اپنی والدہ ماجدہ جناب عالیہ کی فیاضی اور سیرچشمی کا ایک دلکش واقعہ لکھا ہے ۔ فرماتے ہیں :

ان کی اخلاقی اور روحانی سیرت پر اب میں جس قدر غور کرتا ہوں، مجھے محسوس ہوتا ہے کہ وہ ہر اعتبار سے بلند درجہ کی تھی ۔ وہ نہایت فیاض اور سیرچشم تھیں، مفلس اور مصیبت زدہ آدمیوں کی تکلیف ان سے دیکھی نہیں جاتی تھی ۔ والد مرحوم نے ایک مرتبہ نہایت قیمتی دوشالہ ان کے لیے منگوایا۔ جس دن انھوں نے اسے اوڑھا اسی دن اتفاق سے ان سے ملنے کے لیے آئی یہ ایک غریب بیوہ تھی، جو ہمارے گھر سے قریب رہتی تھی، اس نے ایسا قیمتی دوشالہ کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس کا پلہ ہاتھ میں لے کر نہایت طامع نگاہوں سے اسے دیکھنے لگی اور بار بار کہنے لگی کہ ایسی چیز ہم غریبوں کو کہاں نصیب ہو سکتی ہے۔ والدہ نے فوراً دوشالہ کاندھے سے اٹھایا اور ان کے کاندھے پر ڈال دیا۔

انسان کی سیرت بچپن میں بنتی ہے ۔ وہ چھوٹی چھوٹی وقتی باتیں اور کام جو انسان کم سنی میں کرتا ہے، یہی وہ بنیادیں ہیں جن پر اس کے مستقل کردار کی عمارت تعمیر ہوتی ہے ۔ اگر گھر کے بزرگ شروع ہی میں بچوں کی غلطیوں کی نگرانی نہ کریں ۔ تو یہی باتیں بار بار کرنے سے عادت راسخہ بن کر بالآخر شخصیت کا روپ اختیار کر لیتی ہیں ۔ دیکھا گیا ہے کہ شروع میں بڑے بوڑھے چھوٹے بچوں کی شرارتوں اور بدعنوانیوں کو لاڈ پیار کے باعث انگیز کر لیتے ہیں، اور جب پانی سر سے گذر جاتا ہے، تو اب شکایت کرتے ہیں، حالانکہ اصلاح کا جو اصلی موقع تھا، وہ گنوا دیا، اب پچھتانے سے کیا ہوتا ہے ۔

مولانا آزاد نے اپنے بچپن کا ایک واقعہ لکھا ہے، جس سے ان کی والدہ کے اخلاق کی بلندی اور پاکیزگی ظاہر ہوتی ہے ۔ لکھتے ہیں[21]:

ایک شخص حافظ مبارک بخاری ہمارے یہاں رہتے تھے؛ وہ بہت اچھے خوشنویس تھے اسی لیے والد مرحوم نے انھیں اپنی مصنفات کی تبییض کے لیے گھر میں رکھ لیا تھا۔ چونکہ انھیں اپنے کپڑوں کی صفائی کا زیادہ خیال نہیں رہتا تھا، اس لیے میں نے

۱۹ ۔ غبار خاطر : ۹ ۔ ۲۰ ۔ غیر مطبوعہ تحریر : ۶ ۔ ۲۱ ۔ ایضاً : ۶ ۔ ۷

ایک دن کہہ دیا کہ وہ بڑے گندے آدمی ہیں۔ والدہ نے جیسے ہی سنا سخت برہم ہوئیں۔ اس وقت تک ان کی باریک آواز میرے کانوں میں گونج رہی ہے۔

یا عینی لا تقل ھٰکذا۔ رُبّما ھو اکرم عند اللّٰہ منا و منا۔

(یعنی) میری جان، ایسا نہ کہو۔ ہو سکتا ہے کہ خدا کی نظر میں وہ تم سے اور ہم سے عزیز تر ہو)۔

اسی طرح کا ایک واقعہ مولانا حالی نے سرسید کے بچپن سے متعلق لکھا ہے[۲۲]

ایک اور جگہ انھوں نے اپنی والدہ کی فصاحت اور غیر معمولی قوت بیانیہ کی لڑکی لڑکے کی عورتوں کے ان کے پاس عقیدت اور استفادے کی غرض سے آنے کا بھی ذکر کیا ہے[۲۳]

مولانا آزاد کے اپنے بیان کے مطابق وہ ذوالحجہ ۱۳۰۵ھ میں مکے میں پیدا ہوئے[۲۴] ۱۳۰۵ھ کا ذوالحجہ ۹ اگست سے ۷ ستمبر ۱۸۸۸ء تک تھا۔ لہٰذا ہم کہینگے کہ وہ اگست یا ستمبر ۱۸۸۸ء میں پیدا ہوئے۔ چونکہ ذوالحجہ کی ٹھیک تاریخ معلوم نہیں، اس لیے عیسوی مہینے کی تاریخ کا تعین بھی ممکن نہیں[۲۵]۔

تعجب ہوتا ہے کہ پروفیسر ہمایوں کبیر نے ان کی ولادت ۱۱ نومبر ۱۸۸۸ء لکھ دی ہے[۲۶] اور حکومت ہند کی طرف سے بھی جو تقریبات مولانا آزاد کی پیدائش کے سلسلے میں ہوتی ہیں، ان کے لیے ۱۱ نومبر ہی کی تاریخ مقرر کر دی گئی ہے حالانکہ نومبر کی صورت میں ہجری سال ۱۳۰۵ کی بجائے ۱۳۰۶ ہو جاتا ہے۔ میرے علم میں خود مولانا آزاد نے اپنی تاریخ ولادت تذکرہ کے سوائے اور کہیں نہیں لکھی اور وہاں انھوں نے صراحت سے ذوالحجہ ۱۳۰۵ھ ہی لکھا ہے، جو اگست، ستمبر ۱۸۸۸ء کے مطابق ہے! پس ۱۱ نومبر ۱۸۸۸ء کی تاریخ کسی طرح درست نہیں۔

مولانا آزاد کے والد نے مدینے میں شادی کر لینے کے بعد مکہ میں اپنا ذاتی مکان تعمیر کر لیا تھا۔ چونکہ دولتِ عثمانیہ کے قانون کے تحت کوئی غیر ملکی غیر منقول جائداد کا مالک نہیں ہو سکتا تھا، اس لیے انھوں نے عثمانی جنسیت (نیشنلٹی) اختیار کر لی تھی۔ یہ مکان جس قطعۂ زمین میں بنا تھا، وہ دراصل مولانا!

۲۲- حیاتِ جاوید، ۱۵ ۲۳- آزاد کی کہانی، ۲۲۵-۲۲۶ ۲۴- تذکرہ، ۲۸۰

۲۵- مولانا غلام رسول مہر فرماتے ہیں کہ "خود مجھے مولانا سے جو معلوم ہوا، اس کی بنا پر میں نے تاریخ ولادت ۹ ذی الحجہ ۱۳۰۵ھ یعنی ۱۷ اگست ۱۸۸۸ء طے کی تھی" (صحیفہ، ارچ ۱۹۶۷ء، ص ۱۰)

۲۶- انڈیا ونس فریڈم (دیباچہ): ۸

عبداللہ سراج کی ملکیت تھا۔ مولانا خیر الدین نے ان سے یہ ٹکڑا خرید ا اور اس پر مکان بنا لیا۔ یہ مکہ کے محلہ قدوہ میں باب السلام کے متصل تھا[27] اس کے کوٹھے کی کھڑکیوں سے حرم مکہ کے مناروں کی قندیلیں صاف نظر آتی تھیں۔ اور وہاں سے اذان کی آواز اتنی صاف اور بلند سنائی دیتی تھی کہ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی اس مکان کی چھت پر سے اذان دے رہا ہو[28] اسی مکان میں مولانا آزاد پیدا ہوئے[29] یہ مکان بلدیہ مکہ کی تعمیری اور توسیعی سرگرمیوں کی نذر ہو گیا۔ اب یہاں ایک بڑی کشادہ سڑک ہے بعض لوگوں نے کہا ہے کہ مولانا آزاد غالباً ہندستان میں یا رامپور میں پیدا ہوئے۔ یہ بے بنیاد ہے۔

مولانا آزاد کے بھائی ابوالنصر غلام یٰسین ان سے دو برس بڑے تھے[30] گویا وہ ۱۸۸۶ء میں پیدا ہوئے دو کوئی پانچ برس کے رہے ہونگے، جب کہ ان کی تسمیہ خوانی ہوئی۔ اگرچہ مولانا آزاد اس وقت بہت کم عمر تھے یعنی کوئی چار ایک سال کی عمر ہوگی، لیکن جیسا کہ ایسی تقریبوں میں چھوٹے بچے بالعموم کرتے ہیں یہ بھی شوقیہ اس موقع پر بڑے بھائی کے ساتھ بیٹھ گئے[31] اس کے بعد دونوں بھائیوں کی تعلیم ایک ساتھ ہونے لگی۔ بلکہ ایک زمانہ تک ان کی تینوں بہنیں بھی ان کے ساتھ درس میں شامل رہیں، خاص کر فارسی میں۔

تعلیم متعدد اساتذہ سے حاصل کی۔ فارسی بیشتر اپنے والد مولانا خیر الدین سے پڑھی۔ بقیہ علوم ان کے علاوہ دوسروں سے بھی۔ خود لکھتے ہیں[32] کہ ابتدائی تعلیم مکے میں شیخ محمد عمر اور شیخ حسن اساتذہ حرم سے پائی۔ حجاز میں تحقیقات سے معلوم ہوا کہ بچپن میں یعنی خاندان کے ساتھ ہندستان آنے سے پہلے وہ مدرسہ صولتیہ کے کسی استاد سے بھی پڑھتے رہے تھے۔ یہ مدرسہ مکہ میں مولانا محمد رحمت اللہ کیرانوی نے ۱۲۹۱ھ/۱۸۷۴ء۔۱۸۷۵ء میں قائم کیا تھا ممکن ہے یہ دونوں استاد یا ان میں سے کوئی ایک اسی مدرسہ سے وابستہ رہے ہوں۔ قرآن انھوں نے یہیں ختم کیا۔ اس وقت ان کی عمر نو سال سے زیادہ نہیں تھی۔ یہ بات موجودہ صدر مدرس صولتیہ مولانا سلیم سے ان لوگوں نے بیان کی تھی جو مولانا کو بچپن میں جانتے تھے۔ ہندستان آنے کے بعد مختلف اوقات میں انھوں نے مولانا محمد یعقوب دہلوی[33] مولانا محمد ابراہیم[34] شمس العلما مولانا سعادت حسین[35] مولانا محمد شاہ محدث رامپوری[36] سے مختلف

۲۷۔ آزاد کی کہانی۔ ۱۷ ۲۸۔ غبار خاطر، ۲۷۱ ۲۹۔ تذکرہ۔ ۲۶۹
۳۰۔ غیر مطبوعہ تحریر: ۲ ۳۱۔ آزاد کی کہانی، ۳۲ ۳۲۔ غیر مطبوعہ تحریر، ۳
۳۳۔ آزاد کی کہانی، ۱۹۰ ۳۴۔ ایضاً، ۱۹۲، ۲۱۰، ۳۷۵
۳۵۔ ایضاً، ۱۹۳ ۳۶۔ ایضاً، ۲۱۵۔۲۱۶

علوم میں نصاب کی کتابیں پڑھیں، اور یا آخر معقولات وغیرہ کی تکمیل مولوی نظیر الحسن امیٹھوی سے کی[۳۷] جو مولانا عبدالحق خیر آبادی کے ارشد تلامذہ میں سے تھے۔ مولانا خیرالدین ذاتھیں کلکتہ بلا کے ان دونوں بھائیوں کی تعلیم پر مقرر کر دیا۔ یہاں وہ تین برس تک رہے تھے۔[۳۸]
مولانا خیرالدین ایک مرتبہ حجاز گئے تو پھر انھیں وطن واپس آنے کا موقع نہیں ملا۔ وہ غالباً پہلی مرتبہ اپنے بعض گجراتی مریدوں کی درخواست پر ترویج کے لیے گئے تھے۔ ۱۸۸۰ء میں حجاز سے بمبئی آئے اور پھر اس کے بعد وقتاً فوقتاً آتے رہے۔ جہاں تک کھوج نکال سکا ہوں، آخری مرتبہ وہ ۱۸۹۸ء میں ہندستان آئے تھے۔[۳۹] اس مرتبہ آنے کی وجہ یہ ہوئی کہ مکہ میں ایک حادثے میں ان کی الٹی ران کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ وہاں کوئی تسلی بخش علاج نہ ہو سکا۔ اور انھیں مجبوراً ہندستان آنا پڑا، کلکتہ میں علاج کروایا گیا۔ اس سے وہ ٹھیک تو ہو گئے لیکن بائیں ٹانگ چھوٹی رہ گئی جس سے لنگ پیدا ہو گیا اور چلنے میں لکڑی کا سہارا لینا پڑتا تھا۔
ہندستان پہنچ کر دوسرا حادثہ پیش آیا کہ ۱۸۹۹ء میں ان کی بیوی (یعنی مولانا آزاد کی والدہ) کا انتقال ہو گیا۔ وہ مانک تلہ (کلکتہ) کے قبرستان میں دفن ہوئیں۔[۴۱] مولانا خیرالدین نے ان کی قبر پر ایک خاص قسم کی سنگِ مرمر کی عمارت تعمیر کروا دی، اور اسی کے پہلو میں اپنی قبر کے لیے بھی جگہ رکھی۔[۴۲] بعد کو خاندان کے متعدد دوسرے افراد بھی یہیں دفن ہوئے۔
آزاد بھی والدین کے ساتھ آئے تھے۔ ان کی تعلیم مکے میں شروع ہو چکی تھی، اب یہاں کے اساتذہ سے اس کی تکمیل کا انتظام کیا گیا۔ وہ ۱۹۰۳ء میں یعنی جب ان کی عمر صرف پندرہ برس کی تھی، درسِ نظامی سے فارغ ہوئے۔ فاتحہ فراغ کی مجلس ہی میں سات طالب علم ان کے حوالے کر دیے گئے کہ انھیں پڑھائیں۔ ان کو قیام اور ضروریات کا انتظام مولانا خیرالدین نے کر دیا تھا۔ بعد کو ان کی تعداد بڑھ کر بیس تک

۳۷۔ ایضاً، ۱۹۱ نیز غیر مطبوعہ تحریر۔ ۲ (ملیح آبادی نے نام نذیر الحسن لکھا ہے یہ ٹھیک نہیں۔ مولانا نے خود نظیر الحسن لکھا ہے)

۳۸۔ آزاد کی کہانی، ۱۹۲

۳۹۔ مولانا آزاد (نہاد لودھیانی)، ۱۱
ایضاً نیز غیر مطبوعہ تحریر، ۱
غیر مطبوعہ تحریر، ۱ ۴۲۔ آزاد کی کہانی، ۱۴۸

پہنچ گئی ہے۔[۴۳]

ابھی تعلیم ختم نہیں ہوئی تھی کہ ۱۸۹۸ء ۱۸۹۹ء میں یعنی دس گیارہ برس کے سن میں انہیں شعر کہنے کا شوق پیدا ہوا۔ ابتدا یوں ہوئی کہ ان کے گھر میں سینے پرونے اور اوپر کے کام پر ایک منلانی علیمہ نام کی ملازم تھی۔ وہ سہسرام کی رہنے والی تھی۔ اس کا عرف غالباً آمّی تھا۔ غبارِ خاطر کے ایک خط میں اسی نام سے اس کا ذکر آیا ہے۔[۴۴] علیمہ کا بھائی عبدالواحد خان کبھی کبھی اس سے ملنے آیا کرتا تھا۔ یہ صاحب مولانا محمد فاروق چریاکوٹی کے شاگرد اور اچھے خاصے تعلیم یافتہ تھے۔[۴۵] شعر بھی کہتے اور ادیب تخلص کرتے تھے۔[۴۶] انھیں کی باتوں سے مولانا آزاد کو شعر گوئی کی ترغیب ہوئی۔ آزاد تخلص بھی عبدالواحد خان ہی نے تجویز کیا تھا۔ اس سے غرض یہ تھی کہ چونکہ گلدستوں میں شعرا کا نام ان کے تخلص کی ابتدائی ردیف سے چھپتا تھا، اس لیے ان کا نام بالکل آغاز میں چھپا کرے گا۔ مولانا آزاد کی سب سے پہلی غزل بمبئی کے ایک گلدستے ارمغانِ فرخ میں چھپی تھی۔ طرح تھی: پوچھی زمین کی، تو کہی آسمان کی۔ مولانا نے اس پر گرہ لگا کر اسے مقطع کر دیا:

آزاد بےخودی کے نشیب و فراز دیکھ
پوچھی زمین کی، تو کہی آسمان کی!

مولانا آزاد نے شروع میں دو غزلیں اصلاح کے لیے منشی امیر مینائی کی خدمت میں بھیجیں،[۴۷] لیکن ان کی اصلاح انھیں کچھ پسند نہیں آئی۔ اس پر انھوں نے دوسرے استاد وقت داغ دہلوی سے رجوع کیا، یہ سلسلہ بھی زیادہ دن تک نہ چل سکا۔[۴۸] یوں معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بعد انھوں نے امداد حسین ظہور میرٹھی سے بھی کچھ مشورہ کیا کیونکہ ان کی ایک نعت جو بمبئی کے رسالے سفینۂ نجات کے اپریل ۱۹۰۰ء کے شمارے میں شامل ہے، اس کے عنوان میں ان کے نام کے ساتھ "شاگرد مولانا امداد حسین ظہور میرٹھی" لکھا ملتا ہے۔[۴۹] اس کے بعد ان کی نظر مولانا ظہیر احسن شوق نیموی پر پڑی جو علم اور واقفیتِ فن کے لحاظ سے اپنے معاصرین پر بدرجہا فوقیت رکھتے تھے۔ ان سے یہ پورے طور پر متعلق

۴۳۔ غیر مطبوعہ تحریر، ۴ ۴۴۔ ایضاً، ۱۲ ۴۵۔ غبار خاطر، ۲۵۰
۴۶۔ آزاد کی کہانی، ۲۴۷ ۴۷۔ غیر مطبوعہ تحریر، ۱۲
۴۸۔ آزاد کی کہانی، ۲۳۹ ۴۹۔ ایضاً، ۴۳۱
۵۰۔ غیر مطبوعہ تحریر، ۱۳ ۵۱۔ اردو (کراچی)، اکتوبر ۱۹۷۶ء: ۵۰

ہے، اور پھر جتنے دن شاعری کی، اصلاح انھیں سے لی[۵۰]۔ اس اثنا میں کبھی کبھی فارسی میں بھی
ہنے کا شوق رہا۔
یل تذکرہ یہ بھی قابلِ ذکر ہے کہ ان کی دیکھا دیکھی ان کے بڑے بھائی ابو النصر غلام یٰسین نے آہ
لص اختیار کیا۔ وہ داغ ہی سے اصلاح لیتے رہے۔ مقامی شاعروں میں شرکت کے علاوہ ان کا
م بھی گلدستوں میں چھپنے لگا تھا۔ انھوں نے نثر میں بھی کچھ مضامین اور ایک کتابیں بھی لکھیں[۵۱]
حال مولانا آزاد کی شاعری کی مدت یہی دو تین برس کے قریب ہے۔ اس کے بعد دوسری سرگرمیوں اور
شغلوں کے مقابلے میں یہ شوق ترک ہو گیا۔ ان کا اردو اور فارسی منظوم کلام جو ملتا ہے۔ وہ ڈھائی
ہے سے زیادہ نہیں ہو گا۔
یکن تعجب کی بات یہ ہے کہ اتنی قلیل مدت کی شاعری، اور اتنی کم سنی میں بھی انھوں
نے اتنی شہرت حاصل کر لی تھی کہ ۱۹۰۱ء میں انھوں نے مولوی عبدالرحیم عظیم آبادی کی
تاب "تذکرۂ صادقہ یعنی الدر المنثور فی تراجم اہل صادق پور" کے لیے جو تقریظ لکھی ناشر نے اس
ے عنوان میں لکھا تھا[۵۲]:

ریویو بر کتاب مستطاب تذکرۂ صادقہ از مجمع فضائل و محاسن شاعر باکمال
سخنور بے مثال مولوی ابوالکلام محی الدین احمد صاحب آزاد دہلوی مقیم کلکتہ
صَانَهُ اللهُ مِنْ شَرِّ الْحُسَّادِ۔

رہے کہ اس وقت ان کی عمر کسی طرح ۱۳ سال سے زیادہ نہیں تھی۔
شاعری تو چھوٹ گئی لیکن اس کا شاخسانہ صحافت کی شکل میں نمودار ہوا۔ جس نے آگے مستقل حیثیت اختیار
کر لی۔ ہوا یہ کہ انھیں خیال ہوا کہ ایک ماہانہ گلدستہ نکالا جائے۔ یہ گویا اپنی شاعری کی تکمیل کا ایک ذریعہ
صور کیا گیا۔ چنانچہ مقامی اور بیرونی شعرا سے غزلیں جمع کی گئیں۔ اس گلدستے کا نام نیرنگِ عالم تھا،
ہادی پریس کلکتہ میں چھپتا تھا۔ یہ پرچہ ۱۸۹۹ء کے آغاز میں نکلا اور سال کے اندر ہی بند بھی،

۵۰۔ آزاد کی کہانی، ۲۴۴
۵۱۔ ان کے حالات اور کلام کے لیے دیکھیے آزاد کی کہانی، ۱۷۸ ـ ۱۸۵؛ خم خانۂ جاوید،
۱۰۰ ـ ۱۱۴؛ نیز آجکل (دہلی) اپریل ۱۹۶۲ء، ۳ ـ ۷
۵۲۔ اردو ادب (آزاد نمبر)، ۴۳ ـ ۴۴

ہو گیا، صرف آٹھ مہینے جاری رہا۔[55]

اس کے بعد انھوں نے ایک شخص محمد موسیٰ سے بات چیت کر کے ہفتہ وار المصباح جاری کیا۔ اس کا پہلا پرچہ ان کے بقول[56] ٹھیک عید الفطر کے دن شائع ہوا۔ اس میں انھوں نے اداریہ عید کے عنوان سے لکھا تھا۔ یہ اداریہ غالباً بعض دوسرے اخباروں میں بھی نقل ہوا تھا، پیسہ اخبار لاہور کا نام تو خود مولانا ہی نے لکھا ہے۔ اگرچہ انھوں نے المصباح کی اشاعت کی تاریخ اواخر سال ۱۹۰۰ء لکھی ہے، لیکن یہ سہو ہے۔ اس لیے کہ رمضان کی پہلی ٹھیک ۲۳ دسمبر ۱۹۰۰ء کو تھی، لیکن عید الفطر منگل کے دن ۲۲ جنوری ۱۹۰۱ء کو ہوئی تھی۔ اس لیے المصباح کا پہلا شمارہ بھی اسی موقع پر شائع ہوا ہوگا۔ نیرنگ عالم گلدستہ تھا، اس میں ایڈیٹر کا کام برائے نام تھا یعنی باہر سے آئی ہوئی غزلوں کو جمع کر کے شائع کر دینا۔ پہلا پرچہ جو مولانا آزاد نے ٹھیک طور پر مرتب کیا، وہ یہی المصباح تھا۔ یہ اخبار بھی تین چار مہینے سے زیادہ نہیں چلا۔[57]

اس وقت تک مولانا آزاد کی سب سے قدیم کتابی شکل میں شائع شدہ تصنیف جو میری نظر سے گذری ہے،* اس کا عنوان ہے "اعلان الحق"۔ اس میں انھوں نے اپنے والد مولانا خیر الدین کے مخالفوں کو ایک مسئلہ سے متعلق جواب دیا ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ مولانا خیر الدین نے رویت ہلال رمضان اور عید کے بارے میں یہ فتویٰ دیا تھا کہ اگر مشرق میں کسی جگہ چاند دکھائی دے اور شرعی شروط پوری ہو جائیں، تو وہاں سے تار وغیرہ کے ذریعے سے رویت کی اطلاع ملنے پر مغرب والوں پر لازم ہے کہ اس کے مطابق روزہ رکھیں یا عید کریں۔ مخالف علما نے اس پر نہ صرف اعتراض کیا، بلکہ اس کی آڑ میں مولانا خیر الدین کی مخالفت شروع کر دی۔ مولانا آزاد نے اس رسالے میں انھیں مخالفوں کے دلائل کا رد کیا ہے۔ یہ مختصر رسالہ ۵ رمضان ۱۳۱۹ھ یعنی ۶ جنوری ۱۹۰۲ء کو شائع ہوا تھا۔ اس وقت ان کی عمر تیرہ برس اور چار پانچ مہینے کے قریب تھی۔

* اسی رسالے کے آخر میں ان کے ایک دوسرے رسالے "ہدایت الرشید" کا اشتہار بھی ہے۔ (یہ رسالہ اعلان الحق اسی شمارے میں جوں کا توں اشاعتِ اوّل کے مطابق شائع کیا جا رہا ہے)
خیر یہ تو جملہ معترضہ تھا۔

۵۵۔ آزاد کی کہانی، ۲۴۲   ۵۶۔ ایضاً، ۲۴۵   ۵۷۔ ایضاً

کہہ چکا ہوں کہ تین چار مہینے جاری رہ کر المصباح بھی اپریل/مئی ۱۹۰۲ء میں بند ہو گیا۔ اب اس کے بعد ان کا اپنا کوئی پرچہ نہیں رہا۔ لیکن یہ خون منہ کو لگ چکا تھا، اس سے چھٹکارا بھی مشکل تھا۔ چنانچہ انھوں نے مختلف رسالوں اور پرچوں میں مضامین لکھنا شروع کیے۔ ان میں مخزن لاہور، احسن الاخبار کلکتہ، تحفۂ احمدیہ کلکتہ، مرقعِ عالم ہردوئی وغیرہ کے نام ہمیں معلوم ہیں۔ اسی دور کا ایک مشہور ماہنامہ خدنگِ نظر تھا، جسے ۱۸۹۷ء سے منشی نوبت رائے نظر نکالتے تھے۔ اس میں نظم و نثر دونوں [illegible]۔ مولانا آزاد نے نظر کو لکھا کہ آپ اس میں نثر کا حصہ بڑھا دیجیے اور اس کی ترتیب [illegible]۔ چنانچہ یہ انتظام نظر نے قبول کر لیا، اور کچھ مدت تک حصۂ نثر کی ترتیب و تدوین آزاد کے ذمے رہی۔ اس رسالے میں خود مولانا آزاد کا کلام اور نثری مضامین بھی چھپتے رہے۔ انھی میں ایک مضمون عکس ریزی کے موضوع پر تھا، جسے دیکھ کر مولانا شبلی نے [illegible] کہ [illegible] الندوہ کے ہر شمارے کے لیے لکھ دیا کیجیے۔[58] بالآخر یہی چیز ان کے الندوہ کے نائب مدیر بننے کی بھی سامان ہوئی۔

۱۹۰۰–۱۹۰۱ء میں ان کی شادی کر دی گئی تھی۔ ان کے دادا کے ایک بہت مخلص مرید مولوی آفتاب الدین صاحب تھے۔ وہ [illegible] کلکتہ میں [illegible] آفس میں ملازم تھے۔ انھوں نے طویل ملازمت کے بعد اسی دفتر سے پنشن پائی۔ ان کے پانچ لڑکیاں تھیں۔[59] ان میں سے ایک کا نکاح انھوں نے ابو النصر غلام یٰسین سے اور دوسری کا مولانا آزاد سے کر دیا۔[60] آزاد کی اس وقت ان کی عمر بھی ۱۲–۱۳ سال کے لگ بھگ تھی، اور ان کی بیوی کی سات آٹھ سال کی۔[61] مولانا آزاد کی بیوی بہنوں میں سب سے چھوٹی تھیں۔ ان کا نام زلیخا تھا۔[62] انھوں نے اردو فارسی کی تعلیم پوری طرح حاصل کی تھی اور عربی کی مبادیات سے آشنا تھیں؛ مطالعہ کا بہت شوق تھا۔[63] اولاد میں صرف ایک لڑکا پیدا ہوا جس کا چار برس کی عمر میں انتقال ہو گیا۔ چونکہ وہ بہت خوبصورت تھا، اس لیے اس کا نام حسین رکھا تھا۔[64] بیگم آزاد کا تپ دق سے ۹ اپریل ۱۹۴۳ء کو کلکتہ میں انتقال ہوا۔[65]

۵۸۔ ایضاً، ۶۰

۵۹۔ ابوالکلام آزاد، ۲۰۳

۶۰۔ ذکرِ آزاد، ۴۲۵–۴۲۶

۶۱۔ آجکل ستمبر ۱۹۵۹ء، ۱۵

۶۲۔ غبارِ خاطر، ۲۳۵

۶۳۔ غیر مطبوعہ تحریر: ۷

۶۴۔ ایضاً، ″

۶۵۔ غبارِ خاطر: ۲۴۰؛ ذکرِ آزاد (ص ۴۲۹–۴۳۰) میں تاریخ وفات ۱۹ اپریل چھپی ہے۔ یہ سہوِ کتابت ہے؛ صحیح ۹ اپریل ہے۔

لکھ چکا ہوں کہ ۱۹۰۳ء میں تو وہ تعلیم سے فارغ ہو گئے جو زندگی کا بہت بڑا مرحلہ ہے۔ ۱۹۰۳ء ہی کا دوسرا اہم واقعہ لسان الصدق کا اجرا ہے۔

مولانا آزاد دس سال کی عمر سے نظم و نثر لکھ رہے تھے۔ ان کی تحریریں کلکتہ وغیرہ کے رسائل و جرائد میں شائع ہو رہی تھیں اور اس سے ان کی شہرت میں بھی روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا تھا لیکن اس کے باوجود یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ان کی یہ شہرت کل ہندی تھی یا وہ لوگ جن کی رائے کی واقعی کوئی وقعت یا اہمیت تھی، ان تک بھی یہ تحریریں پہنچ رہی تھیں۔ یہ کام لسان الصدق نے کیا۔ یہ واقعہ ہے کہ اس کی اشاعت کے بعد ملک کے علمی و ادبی حلقوں کو معلوم ہوا کہ صحافت کے افق پر ایک نیا ستارہ ابھرا ہے۔ اور ستارہ بھی کیسا کہ دیکھتے دیکھتے اس کی تیز روشنی سے آنکھیں چکا چوند ہو گئیں۔

ستارۂ بدرخشید و ماہِ مجلس شد

لسان الصدق کا پہلا شمارہ ۲۰ نومبر ۱۹۰۳ء کو شائع ہوا۔ یہ پرچہ ایسا مقبول ہوا کہ اس کی دھوم مچ گئی۔ ملک کے مشہور جرائد مثلاً "وکیل امرتسر"، "پیسہ اخبار" لاہور وغیرہ میں اس پر بہت اچھے تبصرے شائع ہوئے۔ مضمونوں کا معیار اتنا بلند اور طرزِ تحریر اتنا دلکش تھا کہ لوگوں نے اس کے مدیر کو کوئی معمر عالم خیال کیا۔

بیجا نہ ہوگا اگر لسان الصدق کے چار مقاصد جو اس کے پہلے شمارے میں چھپے تھے، یہاں بیان کر دیے جائیں۔

۱۔ سوشل ریفارم یعنی مسلمانوں کی معاشرت اور رسومات کی اصلاح کرنا
۲۔ ترقی اردو یعنی اردو زبان کے علمی لٹریچر کے دائرہ کو وسیع کرنا
۳۔ علمی مذاق کی اشاعت بالخصوص بنگال میں۔
۴۔ تنقید یعنی اردو مصنفات پر منصفانہ ریویو کرنا

ذرا مدیرِ اعلیٰ کی عمر کا خیال کیجیے اور ان بلند بانگ مقاصد کا! انگریزی کی مثل ہے کہ آنے والے واقعات کی پرچھائیاں پہلے سے دکھائی دینے لگتی ہے، اس کی اس سے بہتر مثال نہیں مل سکتی۔

اسی رسالے کی شہرت نے انھیں انجمن حمایت السلام لاہور کے اجلاس ۱۹۰۴ء میں شرکت کی ترغیب دی۔ یہ اجلاس یکم اپریل سے ۳ اپریل تک لاہور میں ہوا تھا۔ اسی موقع پر مولانا آزاد کی پہلی مرتبہ

مولانا حالی سے ملاقات ہوئی۔ جو جلسے میں شرکت کے لیے آئے ہوئے تھے۔ مولانا آزاد یہاں پہلے مولانا وحیدالدین سلیم پانی پتی سے ملے۔ سلیم کو جب معلوم ہوا کہ یہی لسان الصدق کے مدیر ہیں، تو انھوں نے تعجب کیا۔ وہ ایک عجوبہ کے طور پر انھیں مولانا حالی سے ملانے کو لے گئے۔ وہاں پہنچے تو سلیم نے ان کی طرف اشارہ کر کے مولانا حالی سے پوچھا کہ آپ کے خیال میں ان کی کیا عمر ہو گی؟ حالی نے اپنے محتاط اور سنجیدہ انداز میں تامل سے فرمایا: ابھی بہت کم سن ہیں۔ لیکن جب سلیم نے اصرار ہی کیا کہ نہیں بتلائیے: کیا عمر ہے؟ تو کہا کہ کوئی پندرہ سولہ سال کی ہو گی۔ جب سلیم نے بتلایا کہ لسان الصدق کے مدیر یہی ہیں، تو بہت تعجب کیا۔ پھر اس دن جو تعلقات قائم ہوئے ہیں، زمانے کے ساتھ ساتھ وہ استوار ہوتے چلے گئے۔[66]

لسان الصدق کے ایک اعلان سے معلوم ہوتا ہے[67] کہ مولانا آزاد لاہور سے بمبئی گئے تھے۔ یہی وہ زمانہ ہے، جب ان کی آغا حشر کاشمیری اور علی خان سے ملاقات ہوئی، جن کے ساتھ مل کر انھوں نے اسلام کی مدافعت میں آریہ سماج کے پرچارکوں اور عیسائی مشنریوں سے مناظرے کیے۔[68] اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انھیں مختلف مذاہب اور ان کی کتب مقدسہ سے متعلق وسیع واقفیت حاصل ہو گئی، جو بعد کے زمانے میں بہت کام آئی۔ بمبئی میں وہ کافی زمانہ رہے۔ لسان الصدق کے کچھ شمارے انھوں نے مرتب کر کے وہیں سے شائع کیے تھے۔

لسان الصدق بھی اپنے پیشروؤں (نیرنگِ عالم اور المصباح) سے زیادہ دن تک نہ چل سکا، اگرچہ ان کی بہ نسبت یہ زیادہ سخت جان ثابت ہوا۔ نومبر ۱۹۰۳ء میں اس کا پہلا شمارہ شائع ہوا تھا اور اگلے مہینے دسمبر میں دوسرا۔ پہلی جلد میں بس یہی دو پرچے نکلے۔ نومبر و دسمبر ۱۹۰۳ء۔ جنوری ۱۹۰۴ء سے دوسری جلد کا آغاز ہوا۔ لیکن سال بھر میں صرف نو شمارے شائع ہو سکے۔ اس جلد کا آخری پرچہ اگست ستمبر کا مشترکہ شمارہ (نمبر ۸-۹) ہے۔ اس کے بعد ۱۹۰۴ء میں کوئی پرچہ شائع نہیں ہوا۔

۶۶۔ اس واقعے کی پوری تفصیل کے لیے دیکھیے، آزاد کی کہانی: ۳۰۸ - ۳۱۰۔ البتہ کہانی میں سال غلطی سے ۱۹۰۳ء لکھا گیا ہے حالانکہ یہ واقعہ ۱۹۰۴ء کا ہے۔

۶۷۔ شمارہ جون، جولائی ۱۹۰۴ء یہاں بمبئی میں ان کا پتہ تھا: ۱۳۱ بلاسس روڈ بائی کلا

۶۸۔ آزاد کی کہانی: ۳۳۴ - ۳۳۵

بلکہ ۱۹۰۵ء کی پہلی سہ ماہی بھی خالی گئی۔ اپریل مئی ۱۹۰۵ء کے مشترکہ شمارے پر جلد ۳ کا نمبر ۱ و ۲ ثبت ہے۔[71] یہ پرچہ آگرے کے مشہور مفید عام پریس میں چھپا تھا۔

اواخر دسمبر ۱۹۰۵ء میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس لکھنؤ میں ہوا تھا۔ دراصل اس سال جلسہ پٹنے میں کرنے کا فیصلہ ہو چکا تھا، لیکن اجلاس کے ایام میں وہاں طاعون پھیل گیا، اس لیے پٹنے کی بجائے لکھنؤ میں کیا گیا۔[69] پرنسپل دار العلوم مسٹر تھیوڈور ماریسن اس اجلاس کے صدر تھے۔[70] مولانا آزاد اور ان کے برادر بزرگ مولانا ابو النصر آہ دونوں اس اجلاس میں شریک ہوئے تھے۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ اس کانفرنس کے ساتھ ہی مسلم پریس کانفرنس کا دوسرا سالانہ جلسہ بھی ۳۰ دسمبر ۱۹۰۵ء کو منعقد ہوا تھا۔ ایک اردو پریس کانفرنس کے قیام کا خیال مشہور پیسہ اخبار والے منشی محبوب عالم کو ۱۸۹۵ء میں آیا تھا۔ انھوں نے اپنے دوستوں سے مشورہ کیا اور بالآخر ایک عام کانفرنس کا دعوت نامہ ملک بھر کے صحافیوں اور اخبار نویسوں کو بھیجا گیا۔ مئی ۱۸۹۶ء میں یہ جلسہ ہوا، بدقسمتی سے لاہور سے باہر کے لوگوں نے پورا تعاون نہ کیا، صرف دو ایڈیٹر جلسے میں شرکت کے لیے پہنچے۔ اس پر منشی محبوب عالم مایوس ہو کر خاموش ہو گئے۔ یہ بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ مولانا آزاد ۱۹۰۲ء میں عارضی طور پر ایڈورڈ گزٹ شاہجہاں پور کے ایڈیٹر بھی رہے تھے۔ اسی زمانے میں انھوں نے ایک شذرہ اس پریس کانفرنس سے متعلق اپنے اخبار میں لکھا۔ اس میں انھوں نے منشی محبوب عالم کو توجہ دلائی کہ ان کی پریس کانفرنس سے متعلق تجویز بہت مفید اور وقت کی ضرورت تھی، انھیں چاہیے کہ اس کانفرنس کو پھر سے زندہ کر کے اسے فعال جماعت بنائیں۔ منشی محبوب عالم نے یہ شذرہ اپنے اخبار میں نقل کیا اور اسی کا نتیجہ تھا کہ جب اس سال یعنی ۱۹۰۳ء کے اواخر میں ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس بمبئی میں ہوا، تو اسی کے ساتھ "محمڈن پریس ایسوسی ایشن" کا بھی جلسہ ہوا۔ کانفرنس کے سلسلے میں ملک بھر کے مسلمان ایڈیٹر اور تعلیم یافتہ طبقے کے حیثیت اصحاب تو موجود ہی تھے، جلسہ کرنے میں کون سی مشکل تھی، لیکن جلسے کے بعد کی بے رنگی بھی دیکھنے کی چیز تھی۔

اب کے جو لکھنؤ میں کانفرنس کا اجلاس ہونے والا تھا، تو علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں پھر آواز اٹھائی گئی۔ منشی محبوب عالم صاحب سے مطالبہ کیا گیا کہ وہ پریس ایسوسی ایشن کے سلسلے میں بھی کوئی قدم اٹھائیں۔

۶۹۔ مرقع کانفرنس، ۱۰۱

۷۰۔ خطبۂ صدارت کے لیے دیکھیے خطبات عالیہ (۱)، ۲۴۱ - ۲۵۸

۷۱۔ لسان الصدق، اپریل مئی ۱۹۰۵ء، ۲۴

لیکن صدائے برنخاست۔ بلکہ منشی محبوب عالم صاحب لکھنؤ کانفرنس میں شرکت تک کے لیے نہیں آئے۔
تو یہ تھا پس منظر اس مسلم پریس کانفرنس جس کا بھی ذکر کیا گیا۔ اس کے روح رواں حاجی ریاض الدین
بریلوی ایڈیٹر الریاض تھے۔

اس جلسے میں متعدد اخبار و رسائل کے ایڈیٹروں کے علاوہ کوئی ۵۰ کے قریب معززین نے بھی حصہ لیا۔
اس موقع پر مسلم پریس کانفرنس کو مستقل ادارہ بنانے کی ضرورت اور اس کی اہمیت پر بہت تفصیلی اور گرما
گرم بحث ہوئی۔ اس بحث میں حصہ لینے والوں میں خواجہ غلام الثقلین، ایڈیٹر عصر جدید، میرٹھ؛
مولوی بشیر الدین، ایڈیٹر البشیر (اٹاوہ)؛ منشی جمال احمد، ایڈیٹر ہمدرد و کٹرا (الہ آباد)؛ حاجی ریاض الدین احمد
بریلوی، ایڈیٹر الریاض وغیرہ کے ساتھ مولوی ابوالکلام آزاد، ایڈیٹر لسان الصدق کلکتہ کا نام بھی بہت
نمایاں ہے۔[72]

اس مسلم پریس کانفرنس کے انعقاد کے بعد مولانا آزاد نے جو خیالات ظاہر کیے تھے، شاید وہ دلچسپی سے
سنے جائیں گے۔ لکھتے ہیں[73]:

> اب رہی یہ بحث کہ پریس کانفرنس کا یہ دوبارہ قیام کہاں تک کامیاب ہوگا۔ تو اس کا
> جواب یہ ہے کہ نہ ہم کو اس کی پہلی کارروائی پر اطمینان ہے، اور نہ صرف ہم کو بلکہ کسی ذی فہم
> شخص کو ان جلسوں پر جو بلا مبالغہ بچوں کا کھیل ہے۔ اطمینان ہو سکتا ہے۔ لیکن چونکہ ایسی
> حالت میں کوشش اور امید سے دست بردار ہونا نتیجۂ موہوم کا گمان بھی مٹا دینا ہے۔
> اس لیے سر دست ہم اس کی متعلق کوئی رائے نہیں دیتے۔ سوا اس کے کہ آئندہ کارروائیوں کا
> انتظار کریں اور دیکھیں کہ جدید سکریٹری کی کوشش کیا نتائج پیدا کرتی ہے۔

اس مختصر سی تحریر میں جو خود اعتمادی، معاملہ فہمی اور دور بینی لفظوں کا پردہ چاک کر کے جھانک رہی ہے،
کیا یہ ایک سولہ سالہ نوجوان کے قلم سے باعثِ استعجاب ہے یا نہیں؟ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ مولانا
آزاد کا اندیشہ درست ثابت ہوا۔ مسلم پریس کانفرنس اس ابتدائی جلسے کے بعد ابدی نیند سو گئی، جیسا کہ
کبھی کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔

۷۲۔ یہ تمام تفصیلات لسان الصدق اپریل مئی ۱۹۰۵ء (ص ۲۲۔۲۶) سے لی گئی ہیں۔

۷۳۔ ایضاً: ص ۲۴۔۲۵

جہاں تک میں معلوم کر سکا ہوں، اپریل مئی ۱۹۰۵ء کے مشترکہ شمارے کے بعد لسان الصدق کا اور کوئی پرچہ شائع نہیں ہوا۔ اس کے فوراً ہی بعد وہ عراق کے سفر پر روانہ ہو گئے۔[۷۴] پورا واقعہ کچھ یوں معلوم ہوتا ہے۔

ایک صاحب تھے حافظ عبدالرحمن امرتسری، بڑے جہانیاں جہانگرد، اسی باعث وہ سیاح ممالک اسلامیہ کے لقب سے مشہور تھے ان کی ملاقات کہیں مولانا آزاد کے بڑے بھائی مولانا ابوالنصر آہ سے ہو گئی۔ آہ کو اسلامی ممالک کی سیر و سیاحت کا بہت شوق تھا۔ آہ نے حافظ عبدالرحمن کے ساتھ عراق جانے کا منصوبہ بنایا، مولانا آزاد بھی ساتھ ہو لیے۔ چنانچہ یہ قافلہ بغداد پہنچا۔ مولانا آزاد یہاں پہنچتے ہی بہت بیمار پڑ گئے، اور بالآخر واپس بمبئی چلے آئے۔[۷۵] آہ اور حافظ عبدالرحمن آگے بڑھے اور موصل اور دیار بکر اور شام تک گئے۔ یہیں شدید سردی کے باعث آہ کے پھیپھڑوں پر حملہ ہوا۔ مولانا آزاد شاکی ہیں کہ ان کے رفیق سفر حافظ عبدالرحمن امرتسری صاحب نے بھی کچھ زیادہ توجہ نہیں کی۔ اسی بیماری کی حالت میں وہ واپس بغداد آئے۔ یہاں ان دنوں برطانوی قنصل خانے میں منجملہ اور اصحاب کے اردو کے مشہور مصنف (بلکہ ہمارے ہاں رومانی تحریک کے بانیوں میں سے) سید سجاد حیدر یلدرم بھی ملازم تھے۔ انھوں نے بہت مدد کی۔ قصہ کوتاہ آہ بہت زار و نحیف حالت میں واپس بمبئی پہنچے۔ یہاں ان کی حالت روز بروز بد سے بدتر ہوتی گئی مولانا خیر الدین انھیں علاج کے لیے کلکتہ لے گئے، لیکن بے سود۔ کو میں ۱۹۰۶ء میں ان کا انتقال ہو گیا۔[۷۶] مانک تلہ کے خاندانی حصۂ قبرستان میں مدفون ہیں۔

۱۹۰۵ء کے شروع میں مولانا شبلی بمبئی آئے۔ وہ ان ایام میں حیدر آباد میں ناظم سررشتۂ علوم و فنون کے عہدے پر فائز تھے۔ مولانا آزاد کی ان سے تین چار برس سے خط و کتابت تھی، لیکن ملاقات پہلی مرتبہ یہیں بمبئی میں ہوئی اور دونوں ایک دوسرے کے مقام شناس ہو گئے۔ دارالعلوم ندوۃ العلما

۷۴۔ آزاد کی کہانی، ص ۳۱۱ یہاں اس سفر کی تاریخ ۱۹۰۴ء درج ہے، یہ غلط معلوم ہوتی ہے، صحیح ۱۹۰۵ء ہوگی اور وہ بھی اپریل کے بعد۔

۷۵۔ ایضاً، ۱۷۹

۷۶۔ ایضاً، ۱۸۰ میں سال وفات ۱۹۰۰ء لکھا ہے۔ یہ ٹھیک نہیں۔ ان کا انتقال دسمبر ۱۹۰۶ء میں ہوا۔ ان کی وفات پر مقبول حسین وصل بلگرامی نے اپنے پرچے عالمگیر کے اکتوبر ۱۹۰۶ء میں ایک شذرہ بھی لکھا تھا۔

لکھنؤ کا مشہور رسالہ "الندوہ" جاری ہو چکا تھا اور مولانا شبلی ہی اسکے ایڈیٹر تھے۔ انھوں نے مولانا آزاد سے کہا کہ اگر آپ اسکو تو "الندوہ" کی ترتیب و اشاعت اپنے ہاتھ میں لے لو لیکن اس وقت مولانا آزاد کسی باعث یہ پیشکش قبول نہ کر سکے۔

مولانا شبلی چند دن کے قیام کے بعد حیدر آباد چلے گئے۔ دراصل انھوں نے حیدر آباد کی ملازمت سے استعفیٰ دے دیا تھا اور اگرچہ مدار المہام یعنی وزیر اعظم نے اسے منظور کر لیا تھا، ہنوز اعلیٰ حضرت نظام کی طرف سے اس کی تصدیق نہیں ہوئی تھی جب یہ حیدر آباد پہنچے، تو یہ تصدیق بھی مل گئی۔ اور وہ فروری ۱۹۰۵ء کے آغاز میں حیدر آباد سے پہلے اپنے وطن اعظم گڈھ اور وہاں سے لکھنؤ آگئے۔[۷۷] یہاں سے انھوں نے مولانا آزاد کو دوبارہ دعوت دی کہ آیئے اور الندوہ کو سنبھال لیجیے۔ اب کے انھوں نے اسے منظور کر لیا۔ اور لکھنؤ چلے گئے۔ یہاں ان کا قیام مولانا شبلی ہی کے ساتھ رہا۔ دن رات کا ایک ساتھ اٹھنا بیٹھنا رہا۔ شبلی بھی اپنے سطالعے اور وسعت نظر اور ترقی پسندانہ خیالات میں ایک فرد تھے۔ مولانا آزاد نے یقیناً ان کی صحبت سے بہت فائدہ اٹھایا۔ وہ اکتوبر ۱۹۰۵ء سے مارچ ۱۹۰۶ء تک چھ مہینے الندوہ کے ادارۂ تحریر میں منسلک رہے۔ یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ انھوں نے الندوہ سے کیوں قطع تعلق کیا۔ خود انھوں نے لکھا ہے کہ "بمبئی میں ایک ایسا واقعہ پیش آیا کہ میں لکھنؤ چھوڑنے پر مجبور ہوا اور بمبئی چلا آیا۔" یہ واقعہ کیا تھا اور بمبئی کا ان سے کیا تعلق تھا، ہمیں اس کی کوئی اطلاع نہیں۔ بہرحال وہ مارچ ۱۹۰۶ء میں الندوہ سے قطع تعلق کر کے بمبئی چلے گئے۔ انجمن حمایت اسلام کے جلسوں کے دوران میں ان کا تعارف وکیل امرتسر کے مالک شیخ غلام محمد سے ہو چکا تھا، جو اپنے زمانے کا مشہور اخبار تھا۔ یہ ہفتے میں تین مرتبہ شائع ہوتا تھا اور ملک میں اس کی رائے اور پالیسی کی بہت قدر تھی۔ لاہور سے واپسی کے بعد وہ وکیل کے لیے مضمون بھی لکھنے لگے تھے۔ اب جو الندوہ کا تعلق باقی نہ رہا، تو شیخ غلام محمد نے انھیں لکھا کہ اگر آپ چاہیں تو یہاں آجایئے اور وکیل کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے لیجیے۔ چنانچہ یہ بمبئی سے پہلے لاہور اور پھر وہاں سے اپریل ۱۹۰۶ء میں امرتسر پہنچ گئے۔ یہاں آنے کے کچھ مدت بعد ان کے بڑے بھائی مولانا غلام یٰسین آہ کا انتقال ہو گیا جنھیں ان کے والد دراصل اپنی جانشینی کے لیے تیار کر رہے تھے اور جیسا کہ مولانا آزاد نے لکھا ہے، "وہ بھی مذہبی عقائد میں وعظ و تذکیر کے طور طریقے، چال ڈھال، وضع و کردار غرض تمام باتوں میں اپنے والد کے

۷۷۔ حیاتِ شبلی: ۴۰۸۔ ۴۰۹   ۷۸۔ آزاد کی کہانی۔ ۳۱۷

قدم بقدم تھے ۷۹۔ ان کی جوان مرگی کا مولانا خیرالدین کو صدمہ ہونا ہی چاہیے تھا۔ اب ان کی امیدوں کا سہارا لے دے کے مولانا آزاد کی ذات رہ گئی۔ بھائی کے انتقال کی خبر سن کر یہ پہلے ہی دل برداشتہ ہو رہے تھے۔ والد نے خط لکھا اور پھر انھیں لاڑکو آدمی امرتسر بھیج دیا، چنانچہ یہ نومبر ۱۹۰۶ء میں وکیل سے قطع تعلق کر کے کلکتہ چلے گئے۔ یوں گویا یہاں تقریباً سات مہینے وکیل کے ایڈیٹر رہے ۸۰۔ گمان غالب ہے کہ والد نے ضرور انھیں اپنے مسلک پر ڈھالنے کی کوشش کی ہوگی لیکن یہ بہت پہلے سے کچھ تو کے محمد و اور تقلید سے پسند انہ ماحول کی وجہ سے، اور کچھ سرسید احمد خان کی تصنیفات کے اثر سے بالکل آزاد خیال ہو چکے تھے۔ اس لیے یہ کسی طرح ان کی منشا پر پورے نہیں اتر سکتے تھے۔ یہاں کلکتہ میں وہ چند ایک ہفتہ وار اخبار "دارالسلطنت" کے ادارۂ تحریر سے متعلق رہے، لیکن ان کی اس کے مالکوں سے نبھ نہ سکی۔ وہ کچھ نیم سرکاری قسم کے لوگ تھے، قدم پھونک پھونک کر رکھنے والے اور سرکار و دولتمند کی چشم و ابرو کے اشاروں کی رعایت کرنے والے۔ ادھر مولانا آزاد وکیل کے زمانۂ ادارت میں ہندوستان تو الگ رہا، دنیا جہان کی سیاست اور عالم اسلامی کے معاملات پر رائے زنی کرتے رہے تھے۔ وہ بھلا کسی پابندی سے کیونکر خوش رہ سکتے تھے، غرض کہ یہ دارالسلطنت سے الگ ہو گئے۔ چونکہ امرتسر سے علیٰحدگی کسی اختلاف کی بنا پر نہیں ہوئی تھی، وہ تو خانگی حالات کی مجبوری کا نتیجہ تھی۔ اس لیے یہ اگلے ہی برس یعنی اگست ستمبر ۱۹۰۷ء میں امرتسر چلے گئے ۸۱۔ اب کے انھوں نے اخبار میں یہ تبدیلی کی کہ اسے ہفتہ میں تین مرتبہ چھاپنے کی بجائے سہ روزہ کر دیا یعنی ہفتہ میں دوبار۔

یہاں ایک بات قابل ذکر ہے کہ اس زمانے میں مولانا عبداللہ العمادی بھی ان کے ساتھ وکیل میں کام کرتے رہے ۸۲۔ مولانا عمادی بڑے فاضل اور خوبیوں کے مالک تھے۔ وہ اپنا نام "خدا بندہ" لکھا کرتے تھے، جو عبداللہ کا ترجمہ ہے۔ مولانا آزاد اور مولانا عمادی کی خوب گاڑھی چھنتی۔ یہ انھیں تعلقات کا نتیجہ تھا کہ بعد کو جب مولانا آزاد نے الہلال جاری کیا تو مولانا عمادی بھی اس کے ادارہ تحریر

۷۹۔ ایضاً، ۱۸۱   ۸۰۔ ایضاً ۳۱۹

۸۱۔ ایضاً، ۳۲۳ یہاں وکیل سے دونوں تعلقات کے درمیان آٹھ مہینے کا فاصلہ لکھا ہے۔

۸۲۔ اردو ادب (آزاد نمبر) ۱۹۵۹ء، ۲۷۸

میں شامل ہو گئے۔ ان کا میں انتقال ہوا[۸۳]

وکیل سے یہ دوسری مرتبہ کا تعلق بھی نو دس مہینے سے زیادہ نہیں رہا۔ وہ وسط ۱۹۰۸ء کے بعد (تقریباً جولائی، اگست میں) وکیل سے مستعفی ہو گئے۔ امرتسر سے پہلے بھوپال گئے اور وہاں اپنی ہمشیرہ آبرو بیگم سے ملتے ہوئے بمبئی کے راستے پونا چلے گئے۔ پنجاب میں گرمی کا موسم بہت تکلیف دہ ہوتا ہے۔ اس سال برسات بھی بہت کم ہوئی تھی۔ اس لیے یہ امرتسر کے قیام کے زمانے میں بیمار ہو گئے، چنانچہ بحالیِ صحت کے لیے پونا کا موسم بہت اچھا رہا[۸۴]

یہیں پونا میں تھے کہ کلکتے سے والد کی شدید علالت کا تار ملا۔ یہ والد کے پرانے خادم حافظ ولی اللہ بنارسی کے ساتھ کلکتہ روانہ ہو گئے۔ ۵ اگست کی صبح کو وہاں پہنچے۔ اگرچہ یہ ان کا مرض الموت تھا لیکن ہوش و حواس آخر تک قائم رہے۔ آتے جاتے کو پہچانتے تھے، خود مولانا آزاد سے وفات سے آدھ گھنٹہ پہلے تک باتیں کرتے اور مختلف قسم کی ہدایتیں اور وصیتیں کرتے رہے۔ حافظ ولی اللہ نے جب حالت غیر دیکھی تو سورۂ یٰسین کی تلاوت شروع کر دی۔ انھیں اشارے سے منع کر دیا اور خود سورۂ یٰسین پڑھنے لگے۔ دس پندرہ منٹ بعد جان، جان آفریں کے سپرد کر دی[۸۵] انا للہ وانا الیہ راجعون ۔

جب ان کی بیوی کا ۱۸۹۹ء میں انتقال ہوا ہے تو انھوں نے مانک تلہ کے قبرستان میں ان کی قبر پر ایک مختصر سا گنبد نما مقبرہ بنوا دیا تھا، اور اسی کے پہلو میں اپنے لیے بھی جگہ چھوڑ دی تھی۔ وہیں دفن ہوئے ان کے مرید ہر سال ۷ رجب کو یہاں عرس کیا کرتے تھے، بوجوہ ۱۹۷۰ء کے بعد یہ نہ ہو سکا۔ سننے میں آیا ہے کہ اب پھر اس کی تجدید ہونے والی ہے۔

اب یہ گویا ہر طرح آزاد ہو گئے۔ تہ غم زدے نے عزم کالا۔ انھوں نے ہندستان سے باہر جانے کا پروگرام بنایا، چنانچہ عراق، لبنان، مصر کی سیر کرتے ہوئے فرانس تک پہنچے۔

---

۸۳ -

۸۴ . آزاد کی کہانی، ۳۲۴، ۳۲۵   ۸۵ - آزاد کی کہانی، ۱۴۶، ۱۴۷ - ۱۴۷

کتابیات

۱۔ آزادی کی کہانی خود آزاد کی زبانی — مرتبہ عبدالرزاق ملیح آبادی — (دہلی، اپریل ۱۹۵۸ء)

۲۔ مولانا ابوالکلام آزاد (انگریزی) — مرتبہ ہمایوں کبیر — (بمبئی ، ۱۹۵۹ء)

۳۔ اخبار الاخیار — از شیخ عبدالحق محدث دہلوی — (دہلی ، ۱۳۳۲ھ)

۴۔ انڈیا ونس فریڈم (انگریزی) — مرتبہ ہمایوں کبیر — (کلکتہ ، ۱۹۵۹ء)

۵۔ تذکرہ — از ابوالکلام آزاد — مرتبہ فضل الدین احمد مرزا — (طبع ثانی دلّی، ۱۹۶۸ء)

۶۔ حیاتِ جاوید — از الطاف حسین حالی — (علی گڑھ ، ۱۹۲۶ء)

۷۔ حیاتِ شبلی — از سید سلیمان ندوی — (اعظم گڑھ ، ۱۹۴۳ء)

۸۔ خطباتِ عالیہ (۱) — مرتبہ حاجی انوار احمد مارہروی — (علی گڑھ ، ۱۹۲۸ء)

۹۔ خمخانۂ جاوید (۱) — از لالہ سری رام — (لاہور ۱۹۰۸ء)

۱۰۔ ذکرِ آزاد — از عبدالرزاق ملیح آبادی — (کلکتہ ، ۱۹۶۰ء)

۱۱۔ غالب — از غلام رسول مہر — (لاہور ، ۱۹۴۶ء)

۱۲۔ غبارِ خاطر — از مولانا ابوالکلام آزاد مرتبہ مالک رام — (دلّی ، ۱۹۶۷ء)

۱۳۔ غیر مطبوعہ تحریریں (قلمی) از مولانا ابوالکلام آزاد

۱۴۔ مرقع کانفرنس — مرتبہ حاجی انوار احمد مارہروی — (علی گڑھ ، ۱۹۳۵ء)

۱۵۔ منتخب التواریخ (۳) از عبدالقادر بدایونی — (کلکتہ ، ۱۸۶۹ء)

۱۶۔ مولانا آزاد (انگریزی) از مہادیو ڈیسائی — (راج ہنس پریس دہلی)

۱۷۔ نقشِ آزاد — مرتبہ غلام رسول مہر — (لاہور ، ۱۹۵۸ء)

رسائل وغیرہ

۱۸۔ آجکل (ماہنامہ) دلّی — ستمبر ۱۹۵۹ء ؛ اپریل ۱۹۶۲ء

۱۹۔ اردو سہ ماہی کراچی — اکتوبر ۱۹۶۶ء

۲۰۔ اردو ادب (آزاد نمبر) علی گڑھ — ۱۹۵۹ء

۲۱۔ صبح (ماہنامہ) دلی، مارچ ۱۹۶۷ء
۲۲۔ عالمگیر (ماہنامہ) لکھنؤ، اکتوبر ۱۹۰۶ء
۲۳۔ لسان الصدق (ماہنامہ) کلکتہ، جون / جولائی ۱۹۰۴ء ؛ اپریل/مئی ۱۹۰۵ء
۲۴۔ ہندستان ٹائمز (روزنامہ انگریزی) دلی ۱۴ اپریل ۱۹۶۶ء

علمی مجلس کی نئی پیشکش

علمی مجلس نے پچھلی سہ ماہی میں دو نئی کتابیں شائع کی ہیں :

(۱) کلّیاتِ میر (حصۂ اول) مرتبہ ظلّ عبّاس عبّاسی

اس حصے میں میر کے چھ دیوانوں کی غزلیات شامل ہیں۔ یہ نسخہ اس کی زندگی کے کلکتہ ایڈیشن (۱۸۱۱ء) پر مبنی ہے۔ اس کے شروع میں تعارف از رشید احمد صدیقی؛ میر کے حالات از قاضی عبدالودود؛ میر کے مطالعہ کی اہمیت از آل احمد سرور اور میر کی عالمگیر مقبولیت از فراق گورکھپوری —— چار نثری مضامین شامل ہیں۔ ان کے علاوہ ایک فصل میں میر کے حالات سے متعلق جو کچھ مختلف تذکروں میں ملتا ہے، یکجا کر دیا گیا ہے۔

پہلی مرتبہ میر کا کلیات اس اہتمام اور صحت سے شائع ہوا ہے۔ صفحات : ۸۴۰

قیمت مضبوط کپڑے کی جلد : ۲۵ روپیہ ۔ غیر مجلد : ۲۰ روپیہ

(۲) کلّیاتِ مصحفی مرتبہ نثار احمد فاروقی

یہ مصحفی کا دوسرا دیوان ہے، جو پہلی مرتبہ شائع ہوا ہے۔ اس کا متن اس قلمی نسخے پر مبنی ہے، جو کسی زمانے میں شور لکھنوی اور بعد کو جعفر علی خاں اثر لکھنوی کے کتابخانے میں رہا۔ اس کی ترتیب میں رام پور اور حیدرآباد کے خطی نسخوں سے مدد لی گئی ہے۔

شروع میں مالک رام کا پیش لفظ ہے۔

علمی مجلس کے منصوبے میں مصحفی کے تمام دواوین کی اشاعت شامل ہے۔

صفحات : ۲۵۶ قیمت مجلّد : ۷.۵۰ روپیہ غیر مجلد : ۶ روپیہ

علمی مجلس ۱۴۲۹ چھتہ نواب صاحب، فراشخانہ دلّی ۶

گوپی چند نارنگ

مستشرقین کی بین الاقوامی کانگرس

(ستائیسواں اجلاس)

مستشرقین کی بین الاقوامی کانگرس دنیا میں محققین کی سب سے بڑی جماعت ہے۔ اس کے اجلاس ۱۸۷۳ء سے لے کر اب تک باقاعدگی سے مختلف ملکوں میں ہوتے رہے ہیں۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد اس کے اجلاس کیمبرج (۱۹۵۴ء)، میونخ (۱۹۵۷ء) اور ماسکو (۱۹۶۰ء) میں ہو چکے ہیں۔ ۱۹۶۴ء میں کانگرس کو ہندستان میں مدعو کیا گیا تھا اور اس کے اجلاس دلّی یونیورسٹی میں ہوئے تھے۔ اسی موقع پر آئندہ کانگرس کے لیے ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی طرف سے دعوت دی گئی تھی، جو منظور کر لی گئی۔ طے پایا تھا کہ ۱۴ سے ۲۰ اگست ۱۹۶۷ء تک اس کے اجلاس آن آربر میشی گن یونیورسٹی میں ہوں گے۔ پروفیسر نارمن براؤن جو امریکہ میں ہندیات کے سربراہ ہیں، اس کے صدر اور میشی گن یونیورسٹی کے پروفیسر رشل نفیلڈ سکریٹری جنرل مقرر کیے گئے تھے۔ حکومتِ ہند نے اپنے وفد کی تیاری تقریباً ایک سال پہلے شروع کر دی تھی، لیکن زرِ مبادلہ کی قلّت کی وجہ سے آخری وقت تک کچھ یقین نہیں تھا کہ وفد جا سکے گا یا نہیں۔ کانگرس کی طرف سے دو خاص چارٹر جہاز ۱۲ اگست اور ۱۳ اگست کو بالترتیب فرنیک فرٹ اور پیرس سے روانہ ہونے تھے۔ مجھے مطلع کیا گیا کہ میری جگہ پیرس کے جہاز میں محفوظ کر دی گئی ہے اور مجھے ۱۳ اگست سے پہلے پہلے وہاں پہنچ جانا چاہیے۔ چنانچہ میں ۱۲ اگست کی صبح کو ایئر انڈیا کا مِٹ جیٹ سے پیرس کے لیے روانہ ہوا۔ پیرس پہنچتے پہنچتے شام ہو گئی۔

رات پیرس ہلٹن میں ایرانڈیا کا مہمان رہا۔ دوسرے دن پین امریکن کے چارٹر بوئنگ سے امریکہ کے لیے روانگی تھی۔ یہیں اورلی پر ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی، ڈاکٹر محمد حمید اللہ، ڈاکٹر اپادھیاے اور لندن کے پروفیسر برٹن پیج اور آر جی بالڈ ٹکر، لائیڈن کے پروفیسر گوتم اور جنیوا کے پروفیسر مکرجی اور کئی دوسرے احباب سے ملاقات ہوگئی۔ جہاز پر دونوں دروازوں کے قریب مستشرقین کی بین الاقوامی کانگرس اور مشی گن یونیورسٹی کا نام جلی حروف میں لکھا ہوا تھا۔ سوار ہوتے ہی پائلٹ کی طرف سے مندوبین کا خیر مقدم کیا گیا۔ پیرس سے ڈی ٹرائٹ مشی گن تک کا سفر جس کا زیادہ تر حصہ بحر اوقیانوس کے اوپر پرواز تھی، تقریباً نو گھنٹے میں طے ہوا۔ پیرس اور مشی گن میں پانچ گھنٹوں کا فرق ہے، چنانچہ جب ہم ڈی ٹرائٹ پہنچے تو ابھی رات کے ساڑھے بارہ بجے تھے۔ مشی گن کیمپس وہاں سے تقریباً تیس میل دور ہے۔ کانگرس کی طرف سے لبسوں کا نہایت عمدہ انتظام تھا۔ یونیورسٹی کے طلبہ اور طالبات "مددگار" اور "میزبان" کے بلّے لگائے استقبال کے لیے موجود تھے۔

دوسرے دن صبح آٹھ بجے سے اجلاس شروع تھے۔ میرا مشی گن یونیورسٹی میں آنے کا یہ دوسرا اتفاق تھا۔ پچھلی بار ۱۹۶۴ء میں سخت سردیوں میں یہاں پہنچا تھا، جب ہر طرف برف ہی برف تھی۔ اب عالم ہی دوسرا تھا۔ جاتی گرمیوں کی ہلکی ہلکی دھوپ میں عمارتیں، سڑکیں، سبزہ ہر چیز خوشنما معلوم ہوتی تھی۔ جگہ جگہ یونیورسٹی کے ڈیڑھ سو سالہ جشن کے بورڈ لگے ہوئے تھے۔ مستشرقین کی کانگرس کی میزبانی بھی انہیں تقریبات کے سلسلے کی ایک کڑی تھی۔ چند ماہ پہلے صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر ذاکر حسین انہیں تقریبات کا افتتاح کرنے اور جلسہ تقسیم اسناد کا خطبہ پڑھنے کے لیے یہاں تشریف لائے تھے۔ کیمپس کے بیچوں بیچ نہایت وسیع اور خوشنما سبزہ زار ہیں۔ جا بجا برچ اور ایلم کے درخت ہیں۔ پیدل چلنے کے راستے ضرب کی صورت میں کاٹے گئے ہیں اور دونوں طرف پھولوں کے تختے بچھے ہوئے ہیں۔ اِدھر اُدھر یونیورسٹی کی عمارتیں پھیلی ہوئی ہیں۔ سامنے اسٹیٹ اسٹریٹ ہے جس پر طلبہ کے رستوران اور قہوہ خانے ہیں، کتابوں کی دکانیں،

بینی اسٹور اور بعض دوسری ضروری دکانیں بھی اسی سڑک پر ہیں۔ مندوبین کے ٹھہرنے کا انتظام جنوبی اور شمالی رہائشگاہوں میں تھا۔ کھانے کے کمرے بھی وہیں تھے۔ زیادہ رونق جنوبی رہائشگاہ میں رہی۔ یہاں بیٹھنے کے کمرے بہت عمدہ تھے؛ لوگ مقالوں سے نمٹ کر بالعموم یہیں پہنچ جاتے تھے اور رات گئے تک ملاقاتوں اور تبادلۂ خیال کا سلسلہ جاری رہتا۔ مرکزی دفتر ایکم ہال میں تھا۔ سفر کے ٹکٹ، ڈاک، قیام وطعام کے انتظامات کے شعبے سب یہیں تھے۔ اوپر کے کمرے اور ایمپی تھیٹر "جدید جنوبی ایشیا" کے جلسوں کے لیے وقف کر دیے گئے تھے۔ "قدیم ایشیا" کے جلسوں کا انتظام اینگلز اور میسن ہال میں تھا۔ یونین اور مشی گن کی عمارتیں مصریات اور اسلامیات کے جلسوں کے لیے محفوظ تھیں۔ اگرچہ مندوبین کو کیمپس کے نقشے دے دیے گئے تھے، پھر بھی مختلف عمارتوں کو جانے والے راستوں پر مختلف رنگوں سے تیر کے نشان بنا کر چپکا دیے گئے تھے۔ جس سے ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے آنے میں بڑی سہولت ہو گئی۔

مشی گن کی کانگرس اب تک کی کانگرسوں میں سب سے بڑی تھی۔ تقریباً اسّی ملکوں سے ڈھائی ہزار مندوبین نے شرکت کی۔ اس میں حسب ذیل دس شعبے تھے:

۱۔ قدیم مشرق قریب ۲۔ مشرق قریب اور اسلامی دنیا
۳۔ قدیم اور کلاسیکی جنوبی ایشیا ۴۔ جدید جنوبی ایشیا
۵۔ جنوب مشرقی ایشیا ۶۔ قدیم چین
۷۔ جدید چین ۸۔ جاپان
۹۔ کوریا ۱۰۔ وسط ایشیا

ان شعبوں کے علاوہ مندرجہ ذیل چھ خصوصی موضوعات سے متعلق مباحثوں کا انتظام تھا:-

۱ - ایشیا میں آبادی کے مسائل۔
۲ - مشرقی تھیٹر میں موسیقی
۳ - ایشیائی ممالک کے قوانین میں تبدیلیاں۔

۴ - لسانیات اور مشرقی زبانیں
۵ - افسانوی ادب کا روایتی ڈھانچہ اور جدید ادبی تحریکیں۔
۶ - ایشیائی آرٹ میں روایت اور اجتہاد۔

پاکستان سے جناب رضی واسطی اور ڈاکٹر محمود الحسن تشریف لائے تھے۔ ڈاکٹر محمد باقر جو ان دنوں یورپ میں لکچر دینے کے لیے آئے ہوئے تھے، کانگرس میں دعوتِ خاص پر شریک ہوئے تھے۔ ان کا مقالہ "قدیم ہند و ایران کے تعلقات اور فارسی کے اثرات" کے موضوع پر تھا۔ پاکستان میں تیمور گرگٹھ کے مقام پر جو اثری مسالا حال ہی میں دستیاب ہوا ہے، ڈاکٹر محمد باقر نے اس کے حوالے سے بتایا کہ فارسی زبان کشان حکمرانوں کے زمانے ہی میں ہندستان پہنچ چکی تھی۔ انہوں نے ان کتبوں کا بھی حوالہ دیا جو سرخ کوتل (بغلان) میں دستیاب ہوئے ہیں اور جن میں دری اور فارسی کے الفاظ شامل ہیں۔ انھوں نے مزید بتایا کہ فارسی کی پہلی نثری کتاب چندرگپت کے وزیر چانکیہ کی زہر کے اثرات سے متعلق سنسکرت تصنیف کا ترجمہ تھی۔ اسے آٹھویں صدی عیسوی میں ایک ہندستانی طبیب مانک نامی نے خلیفہ ہارون الرشید کے وزیر یحییٰ بن خالد برمکی کے لیے فارسی میں ترجمہ کیا تھا۔ یہ کتاب اب دستیاب نہیں ہوتی، ورنہ فارسی نثر کا قدیم ترین نمونہ قرار پاتی۔ ڈاکٹر محمد باقر نے فارسی اثرات کی اس داستان کو دسویں صدی عیسوی تک پہنچایا اور بتایا کہ مسلمانوں کے باقاعدہ ہندستان میں آنے سے بہت پہلے شمال مغربی ہندستان میں فارسی کے لیے زمین ہموار ہو چکی تھی۔

ہندستانی مسلمانوں کی لسانیات سے متعلق آٹھ دس مقالے پڑھے گئے۔ ان میں سے دو ہندی اور اردو افعال کے بارے میں، ایک ایک بنگالی اور گڑھوالی کے، اور باقی دراوڑی زبانوں کے بارے میں تھے۔ پروفیسر کرشنا مورتی نے جو جامعہ عثمانیہ میں تلگو کے شعبے کے صدر ہیں، اپنے مقالے میں دراوڑی زبانوں کی روایتی تقسیم کو نظرثانی کا محتاج قرار دیا، اور ان کی نئی درجہ بندی کا خاکہ پیش کیا۔ دراوڑی زبانوں کے چوٹی کے ماہر پروفیسر امانوف نے اپنی صدارتی تقریر میں نئی تقسیم کی بنیادی باتوں سے اتفاق کیا۔ ڈاکٹر سینتی کمار

چٹرجی نے ہندستان اور حبش کے قدیم تعلقات پر روشنی ڈالی اور حوالوں اور مثالوں میں ایشیائی زبانوں پر اپنی دسترس کا حیرت انگیز ثبوت دیا۔ ہمایوں کبیر صاحب نے کوئی مقالہ نہیں پڑھا، لیکن بعض بحثوں میں گرم جوشی سے حصہ لیا۔ ایسی ایک بحث پروفیسر فوزی نظر کے مقالے "اسلام اور سوشلزم" پر ہوئی۔ مقالہ نگار نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی تھی کہ اسلام اور سوشلزم میں گہری ہم آہنگی ہے، اور اس میں سوشلزم کے عناصر شروع سے ملتے ہیں۔ ہمایوں کبیر صاحب نے وضاحت کی کہ سوشلزم سے مراد صرف سماجی عدل یا مساوات نہیں، اس کی ایک اقتصادی معنویت بھی ہے اور اسلام میں اسے تلاش کرنا مناسب نہ ہوگا۔

جدید ہندستانی ادبیات پر مقالوں کی تعداد کُل ملا کر پندرہ سے زیادہ نہیں ہوگی۔ اردو کے بارے میں تین مقالے تھے، اور اس لحاظ سے یہ زبان خاصی نمایاں رہی۔ چیکوسلواکیہ کے یان ماریک بھی اردو سے متعلق مقالہ پڑھنے والے تھے لیکن وہ کمیونسٹ بلاک کے بائیکاٹ کی وجہ سے شریک نہیں ہو سکے۔ پڑھے جانے والے مقالوں میں ایک ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی کا، ایک شکاگو یونیورسٹی کے چودھری نعیم کا اور تیسرا میرا تھا۔ خواجہ صاحب نے وہابی تحریک کے اردو مآخذ پر ایک جامع مقالہ پڑھا اور غیر معروف مآخذ کی وضاحتی کتابیات بھی پیش کی گئی جسے پسند کیا گیا۔ چودھری محمد نعیم نے اپنے مقالے میں اردو زبان و ادب پر ہند و پاک کی حالیہ جنگ کے اثرات کا جائزہ لیا۔ انہوں نے دونوں طرف کے ادیبوں اور شاعروں کی تخلیقات کا تقابلی مطالعہ پیش کیا اور بتایا کہ اس سے باہمی یگانگت اور رواداری کے قدیم رشتوں کو نقصان پہنچا ہے۔ پاکستان کے ادیبوں نے اس سے نسبتہً زیادہ اثر لیا ہے، لیکن عام طور پر دونوں طرف ہنگامی اور وقتی چیزیں ہی سامنے آئی ہیں۔

میں نے اپنے مقالے میں اردو افسانے کے بنیادی رجحانات کا ذکر کیا تھا۔ میرے نزدیک پہلا رجحان پریم چند کا، دوسرا جمالیاتی افسانہ نگاروں کا اور تیسرا سماجیاتی اور جنسی افسانے کا تھا جو ترقی پسند تحریک کے ساتھ سامنے آیا۔ آزادی کے بعد فسادات

کے افسانوں کو چوتھے رجحان کی ذیل میں رکھا گیا۔ خواتین افسانہ نگار اور عورت کے نقطۂ نظر سے لکھے گئے گھریلو اور جنسی افسانوں پر بھی الگ سے روشنی ڈالی گئی۔ چھٹا بنیادی رجحان تقسیم کے المیے کو تہذیبی سطح پر پیش کرنے کا تھا۔ پاکستان کو ہجرت کرنے والے اتر پردیش کے مسلمان متوسط طبقے کی تہذیبی اقدار کا ماتم، مشترک ہندستانی تہذیب کے ایک موڑ پر پہنچ کر سوالیہ نشان بن جانے کا احساس اور صدیوں سے لکھی جانے والی ایک مشترک داستان کے یکلخت ختم ہو جانے کا افسوس، اس قسم کے افسانوں میں موجِ تہ نشیں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ آخری بنیادی رجحان عام انسان اور اس کے داخلی مسائل سے متعلق غیر سماجیاتی افسانے کا ہے جو نئی نسل کے ذریعے سامنے آرہا ہے۔ اس سے بحث کرتے ہوئے اس بات پر خاص طور سے توجہ دلائی گئی کہ وجودیت کے خیالات مغرب میں تقریباً تین دہائیوں سے مقبول ہو رہے ہیں، لیکن ہمارے ہاں ان کا اثر پچھلے چند برس میں قبول کیا گیا ہے۔ اس لیے نہیں کہ ہم نے یکلخت صنعتی منزلیں ترقی کی بہت سی طے کر لی ہیں اور ہمیں بھی انھیں مسائل کا سامنا ہے جو مغرب میں صنعتی تہذیب کی حشر سامانی سے پیدا ہوئے ہیں۔ بخلاف اس کے ہم ابھی تک قدیم و جدید کی کشمکش میں گرفتار ہیں، لیکن موجودہ دور خوابوں کی شکست کا دور ہے۔ حکمراں طبقے کی بدعنوانیوں اور قول و فعل کے تضاد سے ملک میں بددلی اور مایوسی کی ایک ایسی فضا پیدا ہو گئی ہے جس نے ادب کی سطح پر سماج سے بے تعلقی اور غیریت کے احساس کو عام کر دیا ہے اور وجودیت کے اثرات کے لیے راہ کھول دی ہے۔ اردو کے حقوق کی پامالی نے شکست خوردگی کے جذبات کو اور ہوا دی ہے۔ اگرچہ ایک غیر ترقی یافتہ ملک میں ادیب اپنی سماجی ذمہ داری سے یکسر غافل نہیں رہ سکتا، لیکن سماجی بے تعلقی کے موجودہ رجحان کا تعلق روحِ عصر کے تقاضوں سے بھی ہے۔ نیز مقصدیت کی حد سے بڑھی ہوئی لے کے ردِ عمل کا زور بھی ابھی باقی ہے۔ نئی نسل کی کوششوں کو اسی لیے ہمدردی سے دیکھنے کی ضرورت ہے۔

ڈاکٹر ششر کمار داس نے جو لندن یونیورسٹی کے تعلیم یافتہ ہیں اور آج کل کارنیل یونیورسٹی

(نیویارک) میں کام کر رہے ہیں، بنگالی ادب کی تاریخ کے مسائل پر روشنی ڈالی اور ایک نئی جامع تاریخ کی ضرورت پر زور دیا۔ انہوں نے اپنے مقالے میں ان کوششوں کا ذکر کیا جو بنگالی ادب کی تاریخ کے سلسلے میں انیسویں صدی کے وسط سے اب تک ہوئی ہیں انہوں نے بتایا کہ ادبی تاریخ کا تصور بنگال میں وقت کے ساتھ ساتھ تبدیل ہوتا رہا ہے شروع میں جب ہندستان کی تاریخ میں دلچسپی لی جانے لگی تو ادبی تاریخ پر بھی توجہ ہوئی چنانچہ اس میں بھی وہی اصول اور طریقے مدنظر رکھے جاتے تھے جو سیاسی یا سماجی تاریخ کے لیے کارآمد ہوتے ہیں۔ بعد میں مخطوطات کی دریافت اور لوک ادب کے نئے ذخیروں کے دستیاب ہونے سے زمانے اور مصنف کے تعین اور متن کی تنقید کے مسائل سامنے آئے اور ادبی تاریخ کو منفرد قسم کی تاریخ سمجھنے کا شعور پیدا ہوا۔ ڈاکٹر داس نے داس گپتا اور سین کی ضخیم بنگالی تاریخوں کا جائزہ لیتے ہوئے بتایا کہ ادبی تاریخ، ادبی سوانح نگاری یا ادبی تنقید سے الگ ضابطہ رکھتی ہے۔ اس لحاظ سے بنگال میں اب تک ادبی تاریخ کا ڈھانچہ تو پیش کر دیا ہے، لیکن ایک جامع تاریخ کی ضرورت اب بھی باقی ہے۔

پروگرام میں ہندستان سے متوقع محققین میں جناب مالک رام "اسلام میں رجم یعنی سنگ ساری"، پروفیسر آصف علی اصغر فیضی "قاضی نعمان"، پروفیسر خلیق احمد نظامی "اسلام ایشیا میں"، ڈاکٹر مختار الدین احمد "عربی شاعری کا ایک نایاب تذکرہ" اور سید اوصاف علی "فارسی کا ایک غیر معروف لغت" پر مقالے پڑھنے والے تھے۔ لیکن یہ حضرات بوجوہ تشریف نہیں لا سکے اور ان کی کمی برابر محسوس کی گئی۔ روس سے نہ آنے والوں میں اے۔ ایم مرزائوف کو "رودکی سے منسوب الحاقی کلام"، کے۔ ایس عینی کو "سام نامہ کا اصل مصنف"، ایس۔ ایس جکیبہ کو "سولہویں صدی کی ترکی دستاویزیں" اور یون گر دلیوین کو "وسط ایشیا میں نو دریافت شدہ سنسکرت تحریریں" پر مقالے پیش کرنا تھے۔ پروفیسر عزیز احمد اپنا مقالہ "اٹھارہویں صدی کا نظریۂ خلافت" پیش کرنے کے لیے ٹورنٹو یونیورسٹی کنیڈا سے تشریف لائے تھے لیکن طبیعت کی ناسازی کی وجہ سے جلد ہی واپس چلے گئے۔

مشرق قدیم کے شعبہ میں ایک دلچسپ مقالہ لندن یونیورسٹی کے اسکول آف اورینٹل اینڈ افریقن اسٹڈیز کے پروفیسر آرچی بالڈ ٹکیر کا تھا۔ انہوں نے شمال مشرقی یوگنڈا میں ایک ایسی قبائلی نسل کا پتہ چلایا ہے جس کی زبان مسیح سے پہلے کی مصری زبان سے مشابہت رکھتی ہے۔ اس سے قدیم مصری آبادی کے یوگنڈا کو ہجرت کرنے کا ناقابل تردید ثبوت فراہم ہوگیا ہے۔ پروفیسر ٹیکر نے بتایا کہ مصری سلطنت کے زوال کے بعد یہاں کے لوگ حملہ آوروں کے ڈر سے مشرقی افریقہ کی طرف چلے گئے تھے۔ ۷۰۰ ق م میں مصریوں نے خرطوم سے شمال میں اپنا دارالخلافہ نپاطہ کو بنایا۔ پروفیسر ٹیکر نے (E K) ایک قبیلے کی زبان سے مثالیں پیش کرکے بتایا کہ اس کی لفظیات اور نحو کا گہرا تعلق قدیم مصری زبان سے ہے جو مسیح سے دو ہزار سال پہلے بولی جاتی تھی اور جو بعد میں وادیٔ نیل کی زبان کی حیثیت سے لکھی جانے لگی اور مسیح کے زمانے تک ختم ہوگئی۔ کانگرس کے حلقوں میں عام خیال تھا کہ پروفیسر ٹیکر کی دریافت سے قدیم مصری تاریخ کی ایک گم شدہ کڑی مل گئی ہے اور اس سے مشرقی افریقہ کی قبائلی زبانوں کے بارے میں تحقیق کی نئی راہ کھل جائیگی اور قدیم مصری زبان کے ساتھ ان کے لسانی خاندانوں کی تشکیل کی جاسکیگی۔

ایک اور بحث انگیز مقالہ مشی گن کے پروفیسر آئی۔ جے۔ گیلب نے پڑھا۔ انہوں نے بتایا کہ پچھلے چھ سال سے وہ قدیم مشرقی تہذیب کا مطالعہ کر رہے ہیں اور ڈھائی ہزار سال قبل مسیح کا عراق (میسوپوٹامیہ) ان کا موضوع رہا ہے۔ اپنے تحقیقی کام سے وہ اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ مارکس کا دو طبقاتی سماج کا نظریہ یعنی حکمران اور غلام میں افراد کی تقسیم ناقابل تردید نہیں ـــــ میسوپوٹامیہ کے سرحدی مشرقی پہاڑوں میں جنگی قید سے بھاگنے والے صدیوں تک پناہ لیتے رہے ہیں اور ان کی حیثیت ہمیشہ ایک اہم سماجی طبقے کی رہی ہے جس کا تعلق اس نیم ترقی یافتہ سماج میں نہ آزاد طبقے سے تھا نہ غلام سے۔ پروفیسر گیلب نے تاریخی حقائق کی روشنی میں بتایا کہ یہ جنگی قیدی غلام نہیں سمجھے جاتے تھے۔ ان کی حیثیت نیم آزاد افراد کی تھی۔ یہ ریاست اور بادشاہ سے متعلق تھے، مذہبی عبادتگاہوں کو استعمال کرتے تھے اور ملک کے اندر ایک اہم سماجی

اور اقتصادی قوت کی حیثیت رکھتے تھے۔ ان قیدیوں کو غیر غلاموں کا مرتبہ حاصل تھا اور وہ عموماً بادشاہ کے محافظ دستے میں شامل کر لیے جاتے تھے؛ اور انہیں باقی آبادی کی بہ نسبت زیادہ وفادار سمجھا جاتا تھا۔ ایک طرف یہ لوگ بادشاہ کو امرار کے طبقے کے ناجائز دباؤ سے بچاتے تھے تو دوسری طرف سماج کے مظلوم طبقے کی بغاوت وغیرہ کو بھی دبانے کا کام کرتے تھے۔ پروفیسر گیلب نے چار ہزار سال پہلے کے کتبوں کی تصویریں پیش کیں اور ان کا ترجمہ کرتے ہوئے بتایا کہ ہر تیسرے مہینے ان مفرور جنگی قیدیوں کو بادشاہ کی طرف سے تحفے تحائف و وظائف دیے جاتے تھے۔

مشرقِ قدیم کے ایک خاص جلسے میں ڈاکٹر وینڈر فلپ نے (جو مشہور ماہر آثار قدیمہ ہیں اور شاہِ اردن کے مشیر خاص بھی) مشرقِ وسطیٰ سے متعلق اپنی تحقیقات پر مبنی ایک فلم دکھائی۔ انہیں کی کوششوں سے عمان میں تیل کے ان ذخیروں کا پتا چلا ہے جن کی بدولت چند ہی برس میں عمان دنیا کی دولت مند ترین قوموں کی صف میں شامل ہو گیا ہے۔ ڈاکٹر فلپ نے بتایا کہ آج کل وہ یمن میں مآرب کے مقام پر کھدائی کے کام میں مصروف ہیں جو ملکۂ شیبا کا دارالحکومت تھا۔ اب تک کے برآمد شدہ مسالے سے اس بات کی تصدیق ہوتی ہے کہ شیبا ایک تاریخی شخصیت کا نام ہے اور اس نے واقعی ۹۵۰ ق۔م میں شاہ سلیمان سے ملاقات کے لیے سفر کیا تھا اور اُس کے تجارتی قافلے میں تقریباً پندرہ ہزار لوگ شریک تھے۔

یہاں کانگرس کے تمام مقالوں کی تفصیل پیش کرنا تقریباً ناممکن ہے۔ اس لیے بعض شعبوں کے خاص خاص مقالوں کی فہرست ذیل میں پیش کی جاتی ہے:

"مشرقِ قریب اور اسلامی دنیا" کے شعبے میں چالیس ذیلی شعبے تھے جن میں سے بعض یہ ہیں:

مشرقِ وسطیٰ کے سماجی اور تہذیبی مسائل۔ اسلامی فلسفہ۔ فارسی ادبیات۔ عربی ادب۔ مشرقی ملکوں کی تاریخ۔ اسلام میں اقدار کا مسئلہ۔ تاریخی جغرافیہ۔ ترکی ادب۔ سماج اور نظم و نسق۔ اسلامی آرٹ اور

آثارِ قدیمہ ۔ اسلامی فقہ ۔ اسلامی تاریخ نویسی ۔ روس اور ترکی ۔
مشرقی تہذیب سے متعلق تحقیقی مواد ۔ اسلامی تاریخ کے مآخذ ۔
ان تمام ذیلی شعبوں میں تقریباً ڈھائی سو مقالے پڑھے گئے جس میں سے خاص خاص کے نام یہ ہیں :

اسلام میں اقرار کا مسئلہ :	سید حسین نصر (تہران) محسن مہدی (شکاگو)
جمال الدین افغانی اور اسلامی دنیا :	نکی ، کیڈی (کیلی فورنیا)
ابن عربی کی وحدانیت پر سرہندی کی تنقید :	مرزا قدیر بیگ (ٹورنٹو)
ہندوستان، پاکستان اور مصر میں قدیم اسلام کا مطالعہ :	محمد عشاق (ہیم برگ)
مسئلۂ ابد اور شکوکِ رازی :	مہدی محاغیف (میک گل)
فارابی کا نظریۂ علم ،	ایم پلیسز (یروشلم)
مشرق اور مغرب میں ابن خلدون پر تحقیقی کام کا جائزہ اور آئندہ کے لیے تجاویز :	والٹر جے فشل (برکلے)
مذہبِ حنبلی اور تصوف :	جارج مقدسی (ہارورڈ)
ہجری اور گریگوری سنین کی نئی تقویم کی ضرورت :	محمد حمید اللہ (پیرس)
مصر میں کتاب سازی ؛	اے سرووج (قاہرہ)
اسلامی دینیات میں جبر و قدر کے مسائل ،	ظفر عشاق انصاری (پرنسٹن)
حاتم بن ابراہیم الحمیدی کی تحفۃ القلوب :	عباس ہمدانی (قاہرہ)
چند نو دریافت شدہ ساسانی یادگاریں ،	علی اصغر بختیار (شیراز)
اسلامی تصوف کا اثر جدید نفسیات پر :	رضا آراستہ (واشنگٹن)
تاریخ قطبی پر نئی نظر ؛	سید مجاہد حسین زیدی (ہانڈبرگ)
فتح پور سیکری کی طرزِ تعمیر کے مآخذ ؛	جے برٹن پیج (لندن)

موضوع	مقالہ نگار
سندھ میں اسماعیلیوں کے کارنامے اور ان کے اثرات ،	محمود الحسن صدیقی (میکسیکو)
کویت انیسویں صدی کے پہلے پندرہ برس میں ،	ابو حکیم (اردن)
ابو سلیمان السجستانی کی تین غیر مطبوعہ فلسفیانہ تصانیف ؛	جوئل ایل، کریمر (ییل)
عربی بولیوں میں بنیادی اعداد	اری یل بلاخ (برکلے)
جدید عربی ادب میں روایت اور ترقی	سدماضی یوسف (بون)
عربی کی فلسفیانہ اصطلاحات (یونانی تراجم کی روشنی میں) ؛	گرہارشارین ڈرلیس (فرنیک فرٹ)
نجدی عربی کا نظامِ افعال ؛	پیٹر عبود (ٹیکساس)
عربی معنویات ،	انجی ایل روڈیل (ٹیوبنگن)
اوستا کے تین ادوار :	علی جعفری (ایران)
زرتشت کا تصورِ کائنات :	بی شلے رتھ (فرنیک فرٹ)
ایرانی اساطیر میں شر کا تصور ،	صابری تبریزی (ایڈنبرا)
ایران میں سماجیاتی تحقیق ؛	احسن ناراگی (تہران)
شہاب الدین سہروردی کی فارسی تصانیف :	سید حسین نصر (تہران)
شاہنامہ کی تصحیحِ متن کے چند اصول ؛	چارلس ایم پیس (ٹیوبنگن)
ایران میں شیعیت ،	اے طاہری (ہارینڈن)
تعزیہ خوانی میں سازوں کی اہمیت ؛	ہرمز فرحت (لاس انجلز)
فارسی گرامر میں عربی عناصر :	محمد علی الجزائری (ٹیکساس)
جدید ایرانی میں حرف "کہ"	گرنت ایل ونڈفوہر (مشی گن)
فارسی زبان اور رسم الخط (پانچویں صدی ہجری میں) ؛	جلال متینی (مشہد)

قدیم جنوبی ایشیا سیکشن کے ۲۵ ذیلی شعبے اور جدید جنوبی ایشیا کے ۱۷ ذیلی شعبے تھے۔ ان دونوں میں کُل ملا کر تقریباً دو سو مقالے پڑھے گئے۔ خاص خاص ذیلی شعبوں کے نام یہ ہیں :

جنوبی ایشیا اور جارحیت۔ تاریخ اور سیاسیات۔ بین الاقوامی تعلقات۔ اقتصادی تاریخ۔ پاکستان۔ ہندوستانی ادبیات۔ جدید ایشیا کے مورخین۔ سماجیات۔

یہاں جو مقالے پڑھے گئے، اُن میں سے بعض کے عنوانات یہ ہیں :

قدیم جنوبی ایشیا :-

عنوان	مقالہ نگار
سنسکرت ڈرامہ کے مآخذ :	ایف۔ بی۔ جے۔ کوپر (لائیڈن)
ہڑپہ کلچر میں لوتھول کی اہمیت :	لوز بینز۔ ایس۔ لیشنک (ہائیڈبرگ)
ہندوستانی فلسفے میں تصوریت کے اصول :	آرنلڈ کنسٹ (لندن)
سنسکرت کے الحاقی حروف :	مُری امانوف (برکلے)
پانِنی کا تصورِ افعال :	جارج کاردونا (پن سل وے نیا)
سنسکرت متن کی جانچ کے لیے کمپیوٹروں کا استعمال :	تھامس ٹرومن (لندن)
سام وید میں لفظ اپنشد کا استعمال کالے جادو کے معنی میں :	سمرانند ناتھ بسواس (کلکتہ)
اپنشد فلسفے کا اثر چینی تاؤیت پر :	ٹی۔ اے۔ بین (آکسفورڈ)
ہندو معنویات کے بعض پہلو :	اشوک اجلوجکر (کیمبرج)
دھیان ولاس کا ایک مصور نسخہ :	ارنسٹ بنڈر (پن سل وے نیا)
ہندوستانی شعریات کے نظریۂ رس پر نئی نظر :	موتی لال گپتا (جودھپور)
پرانوں میں دیوتاؤں اور رشیوں کے انساب کے بعض مشکوک پہلو :	ایس۔ کے۔ بکسینہ (ہوائی)

بودھی تانتروں کے بارے میں مستشرقین کی غلط فہمیاں :	اے۔ وے من (کولمبیا)
ہندستانی ادب میں کام دیو کی پرستش ،	ایم۔ جارج (کیرل)
جدید ہندستانی ناولوں کے پلاٹ :	الفونز و کارکلا (نیویارک)
جدید تامل افسانوی ادب :	مری لاگو (مزوری)
کھاسیوں کے لسانی ماخذ :	بیگم لبیشم (کین برا)
منو اور مارکس ،	ایم۔ جی۔ خزانچی (احمد آباد)

جدید جنوبی ایشیا :

جنوبی ایشیا میں جدیدیت کے مسائل ،	برنارڈ کوہن (شکاگو)
پاکستانی اسلام اور سرمایہ داری ،	حفیظ ملک (ولا نووا)
انگریز اور ہندستان کا زمینداری نظام :	ڈیٹمر روتھرمنڈ (ہائیڈلبرگ)
۱۸۵۷ء کے بعد انگریزوں کی پالیسی (نئے دستاویزات کی روشنی میں) :	رضی واسطی (کراچی)
انگریزوں کے دورِ حکومت میں نیپال کی بین الاقوامی حیثیت :	سید اسد حسنین (کنساس)
اٹھارہویں صدی انگریز تعلیم یافتہ طبقہ اور علوم شرقیہ میں ان کی دلچسپی ،	ڈیوڈ کوف (مینی سوٹا)
لنکا کی سیاست میں بودھ مت اور اشتراکیت :	کے۔ این۔ جیوتی لیکھے (لنکا)
جدید ہندستانی مذاہب اور سیکولرازم ،	ہانس کلی مکیٹ (بون)
ہندپاک سیاست میں چین کا کردار :	فلپ فینز (ولزلی)
روحانی فرد پرستی اور گاندھی جی کے سیاسی نظریات ،	اندرا رودرمنڈ (ہائیڈلبرگ)
ہندستانی قومی تحریک میں ہندوؤں کا کردار ،	توشی کازموری (ٹوکیو)

گاندھی جی کے ابتدائی خیالات پر مبنی اثرات :	سٹیفن ہے	(کیلی فورنیا)
ہندستان کی قومی تاریخ اور بھاریہ اتہاس پریشد کی کوششیں ، ایک تنقیدی جائزہ :	جونسن ایچ ووگٹ	(آکسفورڈ)
پاکستانی ادب کی مختلف اصناف پر امریکی اثرات :	مظہرالاسلام	(راجشاہی)
بنگالی تعلیم یافتہ طبقے کی ذہنی بے عملی (۱۸۶۰ - ۱۸۸۰) :	شیونرائن رے	(ملبورن)
زرعی بغاوت اور ہندستانی غدر :	ارک اسکوکز	(کیمبرج)
جدید ہندستان میں مرکزیت اور جمہوریت :	جی ڈوکر	(برلن)
جدید ہندستان میں سماجی طور پر جلاوطن انسان :	آشا کانت نمبارک	(ٹرائے)
ہندستانی فلسفے کا اثر امریکی فکر پر :	ڈیل ریپ	(نیویارک)
ہندستان میں طبقاتی تعلقات اور سماجی تبدیلی :	جوزف دی بون	(بروک لین)

اگرچہ روس نے سرکاری طور پر کانگرس کا بائیکاٹ کیا تھا، لیکن تاس کا نمائندہ خصوصی واہن مکرچین (Vahan Mkrtchian) دعوتِ خاص پر شریک ہوا اور شروع سے آخر تک موجود رہا۔ آخری دن وائس آف امریکہ والوں نے دو انٹرویو ریکارڈ کیے۔ ایک پاکستان کے لیے تھا جس میں میرے علاوہ اور لوگ بھی شریک تھے۔ دوسرے کی نوعیت انفرادی تھی، اس میں ہندستانی ادب کے متعلق پڑھے گئے مقالوں سے متعلق سوالات کیے گئے اور یہ انٹرویو ہندستانی سروس میں نشر کیا گیا۔

کانگرس کے موقع پر کئی نمائشوں کا انتظام تھا۔ علومِ مشرقیہ کی کتابوں کی نمائش مشی گن لیگ کے بال روم میں ہوئی۔ دنیا کے کونے کونے سے ناشرین نے اپنے اپنے اسٹال یہاں سجائے تھے۔ مخطوطات کی نمائش کا انتظام مشی گن یونیورسٹی لائبریری کی طرف سے

کیا گیا تھا۔ مشی گن میں تقریباً دس ہزار مخطوطات محفوظ ہیں، جن میں بڑی تعداد ادبی، ادب، مذہب، قانون، ریاضی اور فلکیات سے متعلق کتابوں کی ہے۔ چند مخطوطات عربی، فارسی اور ترکی کے بھی ہیں۔ نمائش میں دیوانِ خاقانی کا ایک نسخہ ۱۶۳۳ء کا کتابت کیا ہوا اور دیوان صائب کا ۱۶۹۲ء کا بھی شامل تھے۔ علاوہ ازیں خمسۂ نظامی، مثنوی مولانا روم، یوسف زلیخا جامی، اور دیوان طالب کے نہایت خوشخط اور قیمتی نسخے بھی رکھے تھے۔ بعض نسخے خطاطی، مصوری یا جلدسازی کے نمونوں کے طور پر پیش کیے گئے۔ نستعلیق کے نمونوں میں سعد اللہ آفندی کے شاگرد عمری کی ۱۷۴۷ء کی لکھی ہوئی ایک وصلی تھی۔ سترہویں اور اٹھارہویں صدی میں لکھے ہوئے کئی قرآن شریف تھے۔ ان میں نہایت چھوٹے سائز کے بعض وہ نسخے بھی تھے جو عرب اور ترکی سلاطین اور امرا کی فرمائش پر تیار ہوئے تھے۔ اودھی مخطوطات میں تانترک فلسفے کا ایک نسخہ تاڑ کے پتوں پر لکھا ہوا تھا۔ یونیورسٹی کے آرٹ میوزیم کی طرف سے بھی دو نمائشوں کا انتظام تھا۔ ایک ایران کے ساسانیوں کے تیسری سے چھٹی صدی عیسوی تک کے زیورات اور ظروف سے متعلق تھی۔ دوسری، سترہویں صدی کے مشہور چینی مصور اور شاعر تاوچی (Tao Chi) کی تصویروں پر مشتمل تھی۔

مقالوں کی نشستوں کے بعد شام میں کئی استقبالیوں کا انتظام تھا۔ پہلے دن گالف میدان میں این آربر کے شہریوں کی طرف سے نہایت پُرتکلف دعوت دی گئی۔ دوسرے دن رات کے کھانے کے بعد جنوبی ایشیا کے تقریباً تین سو مستشرقین کو شمالی کیمپ کے بڑے کمرے (Commons) میں استقبالیہ دیا گیا۔ اسی طرح چینی، جاپانی اور اسلامی مستشرقین کے لیے الگ الگ استقبالیوں کا انتظام بھی تھا تاکہ ایک موضوع سے متعلق کام کرنے والے علما بے تکلف ایک دوسرے سے مل سکیں۔ ایسے اجتماعوں سے ایک مقصد یہ بھی ہوتا ہے کہ بہت سے لوگوں سے ملاقات ہو جاتی ہے۔ ان کے کام کے بارے میں معلوم ہوتا ہے، اور ذاتی طور پر تبادلۂ خیال کا موقع ملتا ہے۔ ملاقاتوں کا یہ سلسلہ جلسہ گاہ کے علاوہ کھانے کے ہال اور آرام کے کمروں میں بھی جاری رہتا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس سے

آئندہ کام کرنے میں بہت سہولت رہتی ہے ۔

شام کو موسیقی کے کانسرٹوں کا انتظام تھا۔ پہلے دن ہل آڈیٹوریم میں موزارٹ کی دھنیں پیش کی گئیں۔ دوسری شام کو جاپانی اور جنوب ایشیائی موسیقی کا پروگرام تھا۔ آخری شام کو اکیم ہال میں پیانو اور امریکی عوامی دھنیں بجائی گئیں ۔

تیسرے دن دوپہر کے کھانے کے بعد مندوبین کو گرین فیلڈ ویلج اور ہنری فورڈ میوزیم کی سیر کرائی گئی ۔ یہ دونوں مقامات آن آربر سے زیادہ دور نہیں ہیں ۔ چودہ ایکڑ میں بنائے ہوئے ہنری فورڈ میوزیم میں امریکہ کے ماضی کو محفوظ کر دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ ایک حصہ پرانے زمانے کی دکانوں کے لیے وقف ہے ۔ اس میں بڑھئی، ٹین ساز، لوہار، وائلن ساز، کمہار وغیرہ وہ سب پیشہ ور کام کرتے ہوئے دکھائے گئے ہیں، جو صنعتی ترقی کی وجہ سے امریکی زندگی سے ناپید ہو چکے ہیں ۔ مشینی حصے کی نمائش میں زراعت کے قدیم اوزاروں سے لے کر جدید دور کے صدا شکن جٹ جہازوں تک ہر چیز کے نمونے رکھے گئے ہیں ۔ گرین فیلڈ گاؤں کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ ملک کے مختلف حصوں سے تاریخی عمارتوں کو یہاں لا کر محفوظ کر دیا گیا ہے ۔ لیکن، ولبسٹر، رابرٹ فراسٹ اور رائٹ برادران کے پورے کے پورے مکان یہاں منتقل کر دیے گئے ہیں ۔ اور تو اور وہ چھپر بھی جوں کا توں موجود ہے جہاں رائٹ برادران نے پہلا ہوائی جہاز بنایا تھا ۔ اسی طرح وہ عمارت بھی دیکھی جا سکتی ہے، جہاں پہلی فورڈ موٹر گاڑی بنائی گئی تھی ۔ ایڈیسن کی وہ تجربہ گاہ بھی یہاں ہے، جہاں اس نے اپنی زیادہ تر ایجادوں کو مکمل کیا ۔ آرٹ گیلریوں کو نہایت سلیقے سے سجایا گیا ہے ۔ باخ اور پرسل کی موسیقی دھیمے سُروں میں بجائی جاتی ہے ہنری فورڈ کا ذاتی میوزیم دوسری منزل پر ہے ۔ یہاں اس کا نجی سامان محفوظ کرا دیا گیا ہے اور اس کی آواز کے ریکارڈ سنانے کا انتظام بھی ہے ۔

مستشرقین کی یہ بین الاقوامی کانگرس ایک غیر سرکاری ادارہ ہے اور اس کا تعلق کسی ملک کی

حکومت سے نہیں ہے۔ چنانچہ موجودہ اجلاس کے اخراجات بھی صرف امریکی حکومت کی طرف سے ادا نہیں کیے گئے۔ بلکہ مشی گن یونیورسٹی اور کولمبیا یونیورسٹی کے ادارۂ علوم مشرقیہ کے علاوہ تقریباً بیس فونڈیشنوں (اوقاف) نے عطیات دیے جن میں فورڈ، راک فیلر، امریکی اورینٹل سوسائٹی اور ایشیائی علوم کی ایسوسی ایشن خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

کانگرس باضابطہ طور پر ۲۰ اگست کو ختم ہوگئی تھی۔ اس کے بعد مندوبین کو نیویارک اور واشنگٹن کی سیر کرانے کا پروگرام تھا۔ تقریباً ایک ہزار اسکالر بیس ڈی لکس بسوں میں روانہ ہوئے۔ یہ مقامات چونکہ میرے دیکھے ہوئے تھے، میں آن آربر سے میڈسن وسکانسن چلا گیا۔ یہاں پرانے دوستوں سے ملا۔ پھر امریکہ سے یورپ آیا، اور یہاں پیرس، لندن، برسلز وغیرہ کی سیر کرتا اور مصر اور لبنان میں رکتا ہوا ڈیڑھ مہینے کی غیر حاضری کے بعد ۲۴ ستمبر کو دلّی پہنچا۔

حیف در چشم زدن صحبتِ یار آخر شد۔

تذکرہ

گلشنِ ہند

از سید حیدر بخش حیدری

مرتبہ

ڈاکٹر مختار الدین احمد

قیمت مجلد: ——— ۵ روپے

علمی مجلس دلی

مالک رام

وفیات

پچھلے چند مہینوں میں اردو کے بعض مایۂ ناز مصنف اور ادیب ہم سے جدا ہو گئے لیکن ن کی خدمات تاریخ ادب میں بھلا دینے والی چیز نہیں؛ وہ ہماری آنکھوں سے اوجھل ہو گئے ں، دل سے دور نہیں ہوئے :

نذر سجاد حیدر

نذر سجاد حیدر جنھیں اردو کی جین آسٹن کہا گیا ہے، یو۔ پی کے ایک قدیم زمیندار گھرانے کی نام لیوا تھیں۔ ان کے پردادا میر معصوم علی (مصنف انشائے معصوم) سلطنت اودھ میں ناظم اور چکلہ دار تھے۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے بعد انگریزوں نے پنجاب کا نظم و نسق چلانے کے لیے جن اصحاب کا یو پی سے انتخاب کیا تھا، ان میں میر معصوم علی کے صاحبزادے خان بہادر میر قائم علی بھی تھے۔ انھوں نے پنجاب کے قانون آراضی کی تشکیل اور تنظیم میں نمایاں حصہ لیا۔ میر قائم علی کے پوتے اور میر مظہر علی کے بیٹے خان بہادر میر نذر الباقر مدتوں فوج کے سپلائی کے محکمے میں ایجنٹ کی حیثیت سے صوبۂ سرحد میں تعینات رہے۔ یہیں ان کے ہاں ۱۸۹۴ء میں ایک بیٹی پیدا ہوئی، جس کا نام انھوں نے نذر زہرا بیگم رکھا۔

یہ لڑکی اپنے خاندانی ماحول کے اثرات کے تحت بہت جلد لکھنے پڑھنے کی طرف مائل ہو گئی؛ اور اس کے مضمون بنت نذر الباقر کے قلمی نام سے سید ممتاز علی مرحوم کے ماہانہ رسالے تہذیب نسواں میں چھپنے لگے۔ ۱۹۰۸ء میں جب اس کی عمر مشکل سے ۱۴ سال کی ہو گی، اس کا پہلا ناول "اختر النسا بیگم" دار الاشاعت، لاہور کی طرف سے شائع ہوا۔

وفیات

تہذیب نسواں کے علاوہ ان کے مضمون بچوں کے ہفتہ وار "پھول" اور دوسرے رسائل میں بھی شائع ہوتے تھے۔ ان کا معیار اتنا اچھا تھا کہ مصنفہ کی دھوم مچ گئی۔ شدہ شدہ اس کی اطلاع نواب بیگم بھوپال تک پہنچی اور انھوں نے انھیں اپنا سکتر مقرر کرنے کی دعوت دی لیکن میر نذرالباقر نے اپنی ساری روشن خیالی کے باوجود بیٹی کو یہ ملازمت قبول کرنے کی اجازت نہ دی۔ میر نذرالباقر عورتوں کے پردے کے قائل نہیں تھے؛ لہٰذا ان کے گھر میں بھی اس کا رواج نہیں تھا۔ اس کے باوجود انھوں نے اپنی بچیوں کو بھی اعلیٰ تعلیم سے بہرہ ور ہونے کا موقع دیا۔ لیکن وہ یہ پسند نہیں کرتے تھے کہ لڑکیاں شرم و حیا کو بالائے طاق رکھ کر جہاں چاہیں اکیلی پھرتی رہیں۔

۱۹۱۲ء میں نذر زہرا بیگم کی شادی سید سجاد حیدر یلدرم سے ہوگئی، جو اردو ادب میں رومانی افسانے اور مضمون نگاری کے بانیوں میں سے ہیں۔ یلدرم انگریزی ملازمت کے سلسلے میں بہت دن تک قسطنطنیہ اور بغداد میں مقیم رہے تھے اور وہاں سے واپسی پر امیر کابل کے نائب پولیٹیکل ایجنٹ مقرر ہو کر مسوری میں رہنے لگے تھے۔ جب علی گڈھ مسلم یونیورسٹی قائم ہوئی تو وہ ۱۹۲۰ء میں اس کے پہلے رجسٹرار (مسجّل) مقرر ہوئے۔ شادی کے بعد نذر زہرا بیگم نے اپنا قلمی نام بدل کر نذر سجاد حیدر رکھ لیا۔ انھوں نے ہر طرح یلدرم کا ہاتھ بٹایا۔ یونیورسٹی فنڈ میں چندہ جمع کرنے کی تحریک میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا؛ بلکہ وہ اس کی یوپی کی صوبائی شاخ کی سکتر بھی رہیں۔ پھر کھدر پرچار میں پوری گرمجوشی کا مظاہرہ کیا۔ اسلامی ملکوں کی سیاحت بھی کی تھی۔ اس کے ساتھ لکھنے پڑھنے کا مشغلہ بھی جاری رہا۔ انھوں نے اختر النسا بیگم کے علاوہ اور بھی متعدد ناول لکھے، جن میں سے حرماں نصیب، آہِ مظلوماں، نجمہ، جانباز، ثریا، مذہب اور عشق وغیرہ نے خاصی شہرت حاصل کی۔

انھیں ۲۰-۲۵ برس سے ضغطِ دم (ہائی بلڈ پریشر) کا عارضہ تھا؛ ۱۹۶۱ء میں علاج کے لیے لندن بھی گئی تھیں۔ عمر کے ساتھ کچھ اور پیچیدگیاں بھی پیدا ہوگئیں۔ آخر ۱۹ر اکتوبر ۱۹۶۷ء کو بمبئی میں انتقال ہوگیا۔ اثنا عشری آرامگاہ، رحمت آباد (بمبئی) میں دفن ہوئیں

س سلسلے میں دو ایک اور باتوں کا ذکر دلچسپی کا باعث ہوگا :
نذر سجاد حیدر کے دادا میر مظہر علی سیالکوٹ میں تحصیلدار تھے۔ علامہ اقبال کے والد شیخ نور محمد (عرف میاں نتھو) ان کے گھر پر بیٹھ کر کپڑے سینے اور رفو کرنے کا کام کیا کرتے تھے۔ اقبال اپنی طالب علمی کے زمانے میں میر مظہر علی کے تینوں بیٹوں کے ساتھ اسکول جایا کرتے تھے۔ یہی باعث ہے کہ اقبال اپنے خطوں میں نذر سجاد حیدر کو 'آغا زادی' کے لقب سے خطاب کیا کرتے تھے۔
اردو کے ایک مصنف میر افضل علی ہوئے ہیں۔ ان کی کتاب "تخیلات" اپنے زمانے میں بہت مشہور ہوئی۔ وہ کسی زمانے میں پنجاب میں انکم ٹیکس کے محکمے میں ملازم تھے۔ نسبتہً جوان عمری میں ان کا ۱۹۳۷ء میں انتقال ہوا۔ وفات کے وقت وہ غالباً لاہور میں اڈیشنل انکم ٹیکس کمشنر تھے۔ عقیدے کے لحاظ سے وہ احمدی تھے۔ تو خیر، میر افضل علی، مرحومہ کے ماموں زاد (اور پھوپھی زاد) بھائی تھے؛ ان کی والدہ اکبری بیگم، ان کی پھوپھی تھیں۔ میر افضل علی کی شادی ثروت آرا بیگم، نذر سجاد حیدر کی چھوٹی بہن سے ہوئی تھی۔ خود اکبری بیگم کا مشہور ناول 'گودڑ کا لال' غالباً ۱۹۰۷ء میں شائع ہوا تھا۔
قرۃ العین حیدر جنھیں امسال افسانوں کے مجموعے 'پت جھڑ کی آواز' پر ساہتیہ اکاڈمی کا انعام ملا ہے، نذر سجاد حیدر کی صاحبزادی ہیں۔

مہاشہ سدرشن

منشی پریم چند کی افسانہ نگاری نے بہت لوگوں کو متاثر کیا، لیکن غالباً ان میں مہاشہ سدرشن اور اعظم کریوی کے نام سب سے نمایاں ہیں۔ اعظم کریوی کو ہم سے جدا ہوئے بہت دن ہوئے۔ مہاشہ سدرشن کا بھی ۱۶ دسمبر ۱۹۶۷ء کو بمبئی کے ہری کشن داس ہسپتال میں انتقال ہوگیا۔

مہاشہ سدرشن کا اصلی نام بدری ناتھ تھا۔ وہ ۱۸۹۶ء میں ضلع سیالکوٹ کے ایک برہمن خاندان میں پیدا ہوئے۔ شروع سے طبیعت افسانہ نگاری کی طرف مائل تھی۔ کہتے ہیں کہ جب ان کا پہلا افسانہ چھپا ہے، وہ ہنوز آٹھویں درجے کے طالب علم تھے۔ تعلیم بی اے تک پائی۔

اس کے بعد انھوں نے دو چیزوں کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیا : آریہ سماج تحریک اور افسانہ نویسی ؛ اور بعد کو یہ محض افسانہ نویسی تک محدود ہو کر رہ گیا۔ اس آخری شوق کی تکمیل کے لیے انھوں نے ماہنامہ چندن جاری کیا، جس میں صرف افسانے چھپتے تھے۔
ان کی شہرت میں اب روز افزوں ترقی ہونے لگی۔ چنانچہ فیلکس کمپنی والوں نے پبلسٹی کے لیے ان کی خدمات حاصل کر لیں؛ یہاں وہ چار سو مشاہرہ پاتے تھے۔ اس کے بعد انھوں نے فلم کے لیے کہانیاں لکھنے کی طرف توجہ کی۔ اس سلسلے میں وہ چندے بھارت لکشمی پکچرز (کلکتہ) اور نیو تھیٹر (کلکتہ) سے وابستہ رہے۔ آخر الذکر کی فلم 'دھوپ چھاؤں' کی کہانی کے علاوہ گانے بھی انھیں نے لکھے تھے۔ اس کے گیت، 'دنیا رنگ رنگیلی بابا' اور 'تیری گٹھڑی میں لاگا چور' بہت مقبول ہوئے۔ یہاں تک کہ گاندھی جی بھی انھیں اپنی مجلسوں میں سنا کرتے تھے۔ ہر دلعزیز گلوکار سہگل کا ایک گیت، 'اب میں کیا کروں، کت جاؤں' بہت مشہور رہے ؛ یہ بھی سدرشن نے لکھا تھا۔ انھوں نے تقریباً ۴۵ فلموں کی کہانیاں' گیت اور مکالمے لکھے۔ ان میں دھوپ چھاؤں، پتھروں کا سوداگر، دشمن، گراموفون سنگر، پردیسی، سکندر، پڑوسی، چندر لیکھا وغیرہ نے بہت کامیابی حاصل کی۔
سدرشن نے اپنی تصنیفی زندگی اردو سے شروع کی تھی، لیکن بعد کو وہ ہندی میں بھی لکھنے لگے؛ اور رفتہ رفتہ صرف ہندی کے ہو کر رہ گئے۔ لیکن اردو افسانے کے ارتقا میں ان کا حصہ فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ اردو میں ان کی کہانیوں کے چار مجموعے شائع ہوئے : سدا بہار پھول، چندن، بہارستان اور سولہ سنگھار۔ اس کے علاوہ انھوں نے مشہور بنگالی ناول نویس بنکم چندر چٹرجی کے دو ناول 'نادیانے' اور 'زہریلا آب حیات' کے نام سے اردو میں منتقل کیے تھے۔ ایک اور ناول 'عورت کی محبت' بھی بنگالی سے ترجمہ تھا۔ 'بیگناہ مجرم'، بعض بنگالی اور فرانسیسی ناولوں پر مبنی تھا۔ ہندی میں ان کی تقریباً بیس کتابیں ہیں۔

سراج لکھنوی

سراج الحسن سراج کہنے کو تو لکھنوی شاعر تھے، لیکن ہے یہ کہ ان کے ہاں لکھنؤ کی خارجیت سے

زیادہ دلی کی داخلیت ملتی ہے۔ انھوں نے پیارے صاحب رشید اور ان کے چھوٹے بھائی باقر رضا حمید۔ دونوں سے اصلاح لی اور خود استادی کا درجہ حاصل کیا۔ لکھنؤ میں ان کے بہت شاگرد ہیں۔

سراج کا خاندان قدیمی کٹرہ مانکپور کا رہنے والا تھا، جہاں سے ان کے والد شیخ نورالحسن نقلِ مکان کر کے لکھنؤ میں آ بسے تھے۔ یہیں ۱۸۹۴ء میں یہ پیدا ہوئے۔ انگریزی میں دسویں درجے تک تعلیم چرچ مشن ہائی اسکول لکھنؤ میں پائی، اور اس کے بعد محکمۂ امداد باہمی (کوآپریٹو سوسائٹیز) میں ملازم ہو گئے۔ ساری عمر اسی محکمے میں گذری اور یہیں سے ۱۹۴۶ء میں پنشن پائی۔ کنبہ خاصا بڑا تھا۔ تنخواہ بھی قلیل رہی، اور پنشن تو ظاہر ہے کہ قلیل تر ہونا ہی چاہیے تھی۔ اس لیے عسیرالحالی میں بسر ہوئی، کبھی خوشحالی کا منہ دیکھنا نصیب نہ ہوا۔

انھوں نے ۱۹۰۸ء میں شعر کہنا شروع کیا۔ اردو کا یہ مشہور شعر انھیں کا ہے :

آپ کے پانو کے نیچے دل ہے	اک ذرا آپ کو زحمت ہو گی

کلام میں غزلیات کا انتخاب 'شعلۂ آواز' کے عنوان سے ۱۹۶۰ء کے قریب شائع ہوا تھا۔ بہت سارا کلام غیر مطبوعہ رہ گیا۔ کسی زمانے میں وہ لکھنؤ کی ادبی انجمن 'معراج الادب' سے وابستہ رہے؛ بلکہ اس کے سکتر تھے؛ صدر حکیم آشفتہ تھے۔ لیکن بعد کو جب اس کے اراکین میں باہمی شدید اختلافات پیدا ہو گئے، تو سراج اس سے الگ ہو گئے اور بہار لکھنوی کی قائم کردہ انجمن 'بہار ادب' میں شامل ہو گئے۔ وہ مدتوں اس کے بھی سرگرم رکن رہے۔ بہت خاموش اور مرنجاں مرنج طبیعت پائی تھی؛ جذبات کی رو میں نہیں بہ جاتے تھے۔ جس زمانے میں پورا لکھنؤ یاس یگانہ کے خلاف تھا اور کسی کی جرأت نہیں تھی کہ عزیز اور ان کے دوستوں کو ناراض کر کے یگانہ کے حق میں کلمۂ خیر کہے، سراج نے یگانہ کا ساتھ نہیں چھوڑا۔

تندرستی کبھی تسلی بخش نہیں رہی، ضغطۂ دم کے دائمی مریض تھے۔ بالآخر اسی سے ۲۳ جنوری ۱۹۶۸ء کی صبح کو ساڑھے آٹھ بجے جاں بحق ہوئے۔ عیش باغ کے قبرستان میں آخری آرامگاہ بنی۔

آفتاب پانی پتی، انوپ چند

۱۳ اپریل ۱۸۹۶ء کو بیساکھی کے موسمی تیوہار کے دن پانی پت کے ایک کھاتے پیتے جین خاندان میں پیدا ہوئے۔ تعلیم ختم کی تو یہ وہ زمانہ تھا جب ملک میں چکبست اور سرور کی قومی شاعری کا غلغلہ ہر طرف بلند ہو رہا تھا۔ اس سے انھیں بھی شعرگوئی کی طرف توجہ ہوئی۔ اتفاق سے انھیں ایام میں مولانا وحیدالدین سلیم پانی پتی روزنامہ زمیندار (لاہور) کی ملازمت ترک کرکے اپنے وطن واپس آگئے۔ آفتاب نے ان سے اصلاح کی درخواست کی جو قبول ہوئی۔ یہ سلسلہ سلیم کی وفات (۱۹۲۷ء) تک جاری رہا۔

آفتاب کو غزل سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی؛ انھوں نے زیادہ تر نظمیں کہی ہیں، اور وہ بھی بیشتر قومی اور سیاسی۔ ان کے منظومات کے چھ مجموعے چھپ چکے ہیں؛ جلوۂ آفتاب، آفتابِ وطن، جذباتِ وطن، جذبات کی دنیا، حبِ وطن، شمشیرِ وطن ـــ زبان سلیس اور بیان جذبات سے مملو ہے۔ منظومات کے علاوہ انھوں نے بعض ڈرامے بھی تصنیف کیے تھے۔ ان میں سے، من موہنی، شریمتی انجنا دیوی، ہندوستانی سورما، ویر چھترانی وغیرہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

ان کی قومی و ادبی خدمات کے پیشِ نظر حکومتِ ہریانہ نے ۲۸ مارچ ۱۹۶۷ء کو انھیں 'راج کوی' کا اعزاز دیا تھا۔

۹ فروری ۱۹۶۸ء کو اچانک حرکتِ قلب بند ہو جانے سے پانی پت ہی میں انتقال ہوگیا۔

محمد عبدالباقی

اردو کے ممتاز صحافی مولانا محمد عبدالباقی کا بروز جمعہ ۲۳ فروری ۱۹۶۸ء کو ساڑھے پانچ بجے شام دلی میں انتقال ہوگیا۔ وہ ایک زمانے سے اختلاجِ قلب کے مریض تھے۔ ۲۱ر فروری کو مرض کا شدید حملہ ہوا۔ اس پر انھیں ہمدرد نرسنگ ہوم (دلی) میں داخل

کیا گیا، جہاں دو دن بعد حرکتِ قلب بند ہوجانے سے رہ گرائے عالمِ جاودانی ہوئے۔ اگلے دن ۲۴ فروری کو جنازہ اٹھا۔ نمازِ جنازہ قاضی زین العابدین سجاد استادِ جامعہ ملیہ اسلامیہ نے پڑھائی اور انھیں جامعہ نگر کے قبرستان میں سپردِ خاک کیا گیا۔

مولانا محمد عبد الباقی کوانتھ ضلع شاہ آباد (بہار) کے ایک پٹھان خاندان میں ۱۸۹۳ء میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد عبد السلام صاحب فوج میں ڈاکٹر تھے۔ یہ جگہ شیر شاہ سوری کی جائے ولادت سہسرام سے کوئی دس بارہ میل دور پٹھانوں کی مشہور بستی ہے۔ دسویں درجے تک تعلیم آرہ میں ہوئی اور جامعہ ملیہ اسلامیہ سے بی اے کی سند لی۔ شروع سے صحافت کا چسکا تھا۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد لاہور پہنچے اور مولانا ظفر علی خان کے روزنامہ زمیندار کے ادارۂ تحریر میں شامل ہوگئے۔ یہاں سے الگ ہوئے تو صدیق حبیب اور محفوظ الحق (جامعی) کے تعاون سے روزنامہ آزاد نکالا۔ یہ حقیقت ہے کہ اردو میں اس شان اور اہتمام سے کوئی روزنامہ آج تک نہیں چھپا۔ افسوس کہ یہ چشمِ حوادث کا شکار ہوگیا۔ اس معیار کے اخبار کے اخراجات کے لیے جس قارون کے خزانے کی ضرورت تھی، وہ باقی صاحب اور ان کے دوستوں کے پاس تھا نہیں؛ چنانچہ چند ماہ بعد پرچہ بند ہوگیا۔

اس کے بعد وہ بہار چلے گئے اور پٹنے سے استقلال جاری کیا جو ہفتے میں دو بار چھپتا تھا۔ جب ۱۹۳۶ء میں کانگریس نے سری کرشن سنہا کی قیادت میں پہلی بار بہار میں وزارت بنائی، تو باقی صاحب اس میں مفصلات کے لیے پبلسٹی افسر مقرر ہوئے۔ اس زمانے میں جمیل مظہری اور رام دھاری سنگھ دنکر بھی اسی محکمے میں ملازم تھے۔ جب سری کرشن سنہا کی وزارت مستعفی ہوئی، تو یہ لاہور پہنچے۔ اتحاد پارٹی کے اکابر سے ان کے تعلقات بہت خوشگوار تھے۔ خضر حیات خاں ٹوانہ نے انھیں اپنے پبلسٹی ڈپارٹمنٹ کا ڈپٹی ڈائرکٹر مقرر کر دیا (ڈائرکٹر نور احمد صاحب تھے)

آزادی اور تقسیم ملک کے بعد وہ دلی آئے اور 'پیامِ وطن' کے نام سے اپنا روزنامہ شائع کرنے لگے۔ یہ پرچہ کوئی تین چار برس جاری رہا۔ اس کے بند ہوجانے پر وہ ریاست

کشمیر میں ملازم ہو گئے لیکن یہاں کی فضا راس نہ آئی اور انھیں دلی واپس آنا پڑا۔ یہاں مختلف رسائل و جرائد میں مضمون لکھ کر بسر اوقات کے لیے کچھ پیدا کر لیتے تھے۔ آخری ایام میں اپنا ایک ہفت روزہ "کاروانِ وطن" شائع کرتے تھے اور اس کے علاوہ متعدد دوسرے پرچوں میں بھی اجرت پر مضمون لکھتے تھے۔

اس میں شبہہ نہیں کہ وہ بلند پایہ صحافی تھے — وسیع معلومات، زورِ قلم، قوتِ استدلال ان کی تحریر کا طرۂ امتیاز تھے۔ لیکن افسوس کہ عدمِ استقلال اور مزاج کے لاابالی پن نے کہیں جم کر کام نہ کرنے دیا۔ اسی لیے بیشتر زمانہ افلاس و تکلیف میں بسر ہوا۔

ظل عباس عباسی پرنٹر، پبلشر نے کوہ نور پریس، دلّی میں چھپوا کر
دفتر علمی مجلس ۱۴۲۹ چھتہ نواب، فراشخانہ، دلّی ۶ سے شائع کیا۔
(ایڈیٹر: مالک رام)

تحریر

علمی مجلس دلی کا تماہی رسالہ

۱۲ روپے		مرتب
ے کی قیمت ۱۵ روپے		مالک رام



جلد ۲ ۱۹۶۸ء شمارہ ۲

فہرست

مصنف	عنوان	صفحہ
مالک رام	ملاحظات	۱۲۶
مالک رام	ابو النصر غلام یٰسین آہ	۱۲۷
علی جواد زیدی	اردو کا طویل ترین قصیدہ	۱۶۹
محمد اکبر الدین صدیقی	کتبۂ امین درگاہ، بیجاپور	۱۷۹
سید امیر حسن عابدی	عہد ہمایون و اکبر کی دو اردو غزلیں	۱۹۵
بیرم خان خانخاناں	ریختہ	۲۱۰
سید اوصاف علی	شاہ عبد العزیز دہلوی رح	۲۱۱
شاہ عبد العزیز دہلوی رح	در مدح دہلی	۲۲۰
محمد اسلم خان	ظفر خان احسن	۲۲۱
اکبر علی ترمذی	رضا کون تھا ؟	۲۳۱
مالک رام	وفیات ــــــــ	۲۳۷

حافظ علی بہادر خاں؛ صولت ٹونکی
پریم شنکر فرحت ؛ پرویز شا

ملاحظات

سالِ رواں کا دوسرا شمارہ حاضر ہے۔ جیسا کہ آپ دیکھینگے، اس کے موضوعات میں کافی تنوع ہے، اور ان میں سے ہر ایک اپنی جگہ مفید بھی ہے۔ ہمیں توقع ہے کہ احباب کے تعاون سے ہم اس پہلو سے معیار کو نہ صرف قائم رکھ سکینگے، بلکہ بتدریج اسے خوب سے خوب تر بنانے میں کامیاب ہونگے۔

ابوالنصر غلام یٰسین آہ مرحوم کا کلام شروع میں خاص طور پر جلی اور کتابی شکل میں لکھوایا گیا ہے۔ اس سے مقصود یہ ہو کہ اگر آپ ان اوراق کو الگ کر کے مجلد کروانا چاہیں، تو اس میں دقت نہ ہو۔ قراین سے معلوم ہوتا ہے کہ آہ بہت لکھنے والے تھے۔ اس لیے ہمیں یقین ہے کہ ان کا اور کلام بھی ہوگا جو ہماری دسترس سے باہر رہ گیا۔ اگر کسی کے پاس کچھ ایسا کلام ہو، تو وہ براہ کرم ہمیں اس کی نقل مہیا کر دیں، تاکہ یہ محفوظ ہو جائے۔

فروری ۱۹۶۹ء میں غالب کی سو سالہ برسی ہے۔ ملک کے مختلف ادارے — کچھ حکومت کی امداد سے اور کچھ اس کے بغیر — اس تقریب کو غالب کی شایانِ شان طریقے پر منانے کا پروگرام بنا رہے ہیں۔ ہمارا ارادہ ہے کہ اس مناسبت سے تحریر کا ۱۹۶۹ء کا پہلا شمارہ غالبیات کے لیے وقف کر دیا جائے۔ لیکن یہ بیل منڈھے نہیں چڑھ سکتی، جب تک ہمیں لکھنے والے دوستوں کا پورا تعاون حاصل نہ ہو۔ اس سلسلے میں ہمیں مشورے کی بھی ضرورت ہے۔ احباب ان دونوں باتوں پر فوری توجہ فرمائیں تاکہ ہم کوئی فیصلہ کر سکیں۔

نئی دلی

۱۵ جون ۱۹۶۹ء

مالک رام

۵

ابوالنصر غلام یٰسین آہ

دنیا میں کئی ایسے شخص پیدا ہوئے جنھوں نے 'ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات' کے مصداق کم عمری ہی میں غیر معمولی دماغی اور ذہنی صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا۔ اگر انھیں موقع ملتا، تو وہ یقیناً ترقی کرتے، علم و فن کے خدمتگزار ثابت ہوتے، بنی نوعِ انسان کے علم میں اضافہ کرتے، اور ملک و قوم کی نیکنامی و ناموری کا باعث قرار دیے جاتے۔ لیکن موت نے انھیں فرصت نہ دی؛ ان کا پیمانۂ حیات قبل از وقت لبریز ہوگیا اور وہ اپنی تمام معنوی خوبیاں ساتھ لیے یہاں سے چل بسے۔

ایسی ہی ایک شخصیت مولانا ابوالنصر غلام یٰسین آہ کی بھی ہے۔ ان کا نام اتنا مشہور نہیں ہوا جتنا ان کے چھوٹے بھائی مولانا ابوالکلام غلام محی الدین احمد آزاد کا۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ ان کا عین عنفوانِ شباب میں انتقال ہوگیا، جس سے انھیں اپنی ذہنی صلاحیتوں اور اکتسابی قابلیتوں کے اظہار کا پورا موقع نہ ملا۔ وفات کے وقت ان کی عمر بھی ۲۰۔ ۲۱ سال کی رہی ہوگی۔

ان کے والد مولانا محمد خیر الدین ہندستان سے ہجرت کرکے مکے میں جا بسے تھے[1]۔ انھوں نے وہاں پہنچ کر شیخ ابراہیم کردی المدنی کے خاندان کے نام لیوا ایک عالم شیخ محمد ظاہر وتری مدنی کی بھانجی عالیہ سے شادی کی، جس سے ان کے پانچ اولادیں ہوئیں ـــ تین بیٹیاں: زینب، فاطمہ عرف آرزو بیگم اور حنیفہ عرف محمودہ (آبرو بیگم) اور دو بیٹے: ابوالنصر غلام یٰسین اور ابوالکلام غلام محی الدین[2]۔ مولانا آزاد نے لکھا[3] ہے کہ میرے بھائی عمر میں مجھ سے دو برس (دوسری جگہ[4] دو تین برس) بڑے تھے۔ چونکہ خود مولانا آزاد ذی الحجہ ۱۳۰۵ھ/اگست ستمبر ۱۸۸۸ء میں پیدا ہوئے تھے[5]، اس سے نتیجہ نکلتا ہے کہ غلام یٰسین کا سالِ ولادت ۱۸۸۵ء/۱۸۸۶ء ہوگا۔

ان کی تعلیم مکے میں شروع ہوئی۔ وہ چھ سات سال کے ہونگے، جب ان کی بسم اللہ کی رسم حرمِ کعبہ میں شیخ عبداللہ مرداد کے ہاتھوں عمل میں آئی۔ اس کی حسب ذیل تفصیل مولانا بلیح آبادی کی مرتبہ کتاب میں ملتی ہے، جو ان کے قول کے مطابق خود مولانا آزاد کے لفظوں میں ہے۔ لکھتے ہیں[6]،

> مجھے وہ دن اچھی طرح یاد ہے، جب حرم شریف میں بسم اللہ کی تقریب کرائی گئی۔ اس وقت میری عمر پانچ برس کی تھی، عصر کا وقت تھا اور حرم

۱۔ ان کے مفصل حالات کے لیے دیکھیے آزاد کی کہانی: ۶۶-۱۷۷؛ نیز غبار خاطر (حواشی)، ۳۰۲

۲۔ غیر مطبوعہ تحریر، ۲

۳۔ غبار خاطر: ۹۸؛ نیز غیر مطبوعہ تحریر: ۲

۴۔ آزاد کی کہانی: ۱۷۸ (دہلی، ۱۹۵۸)

۵۔ تذکرہ: ۳۱۰ (ساہتیہ اکادمی ایڈیشن، دہلی، ۱۹۶۸ء)

۶۔ آزاد کی کہانی: ۱۸۷

شیخ عبداللہ مرادہے والد مرحوم نے یہ رسم ادا کرائی تھی۔ انھوں نے مجھ سے تین مرتبہ یا فتاح کہلوایا اور رَبِّ یَسِّرْ وَلَا تُعَسِّرْ کہلوایا اور اسکے بعد الف سے شین تک حروف شناخت کرائے... میٹھے سموسے قاب میں بھرے ہوئے ہمارے ہاں سے آئے تھے، جو وہاں تقسیم کیے گئے۔ میں للچائی ہوئی نظروں سے انھیں دیکھ رہا تھا اور حافظ صاحب[7] انھیں تقسیم کر رہے تھے۔ لیکن شیخ عبداللہ نے اس قاب سے، جو ان کے سامنے پڑی تھی، ایک سموسہ اٹھا کے مجھے دیا، اور جب میں اسے لینے لگا تو انھوں نے نہیں دیا، اور اپنے ہاتھ سے میرے منہ میں رکھ دیا۔ دراصل یہ تقریب بھائی مرحوم کی تھی اور مجھے بھی بٹھلا دیا گیا تھا۔

گویا مولانا آزاد بھی ان کے ساتھ طفلانہ تفنن کے طور پر بٹھا دیے گئے تھے۔ اور ان کی بسم اللہ بھی اسی موقع پر ہوگئی، حالانکہ ان کی عمر بمشکل پانچ ایک سال رہی ہوگی۔ اس کے بعد ان دونوں کی تعلیم گھر پر ہونے لگی۔ بیشتر انھیں ان کی خالہ پڑھاتی تھیں، اگرچہ باہر کے بعض اساتذہ سے بھی ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ یہاں انھوں نے تقریباً تین برس میں قرآن ختم کرلیا اور اس کے بعض حصے مثلاً یٰس، قاف وغیرہ حفظ بھی کرلیے تھے۔ اس کے ساتھ ہی عربی صرف و نحو میں اجرومیہ بن مالک بھی شروع کردی[8]۔

۱۸۹۸ء میں ان کے والد مولانا محمد خیرالدین حجاز سے ہندستان چلے آئے[9] اور بالآخر انھوں نے یہاں پہنچ کر کلکتے میں مستقل سکونت اختیار کرلی۔ یہاں ان دونوں

۷۔ اس سے حافظ ولی اللہ بنارسی مراد ہیں، جو مولانا خیرالدین کے قدیم اور معتمد علیہ خادم تھے۔

۸۔ ایضاً، ۱۸۸۔ ۱۸۹

۹۔ غیر مطبوعہ تحریر: ۱

بھائیوں کی تعلیم درسِ نظامیہ کے نصاب کے مطابق ہونے لگی۔ اس کے ساتھ ہی اردو اور فارسی کی ابتدائی کتابیں بھی درس میں شامل ہو گئیں۔ یہ تمام تعلیم فطری طور پر ان علما سے حاصل کی گئی جو عقائد میں ان کے والد مولانا محمد خیرالدین کے معیار کے مطابق ٹھیک مسلمان تھے۔ یعنی جن اصحاب کو جدید خیالات و تصورات کی جنھیں وہ وہابیت کہتے تھے، ہوا تک نہ لگی ہو۔

ابوالنصر غلام یٰسین نے علوم درسیہ کے علاوہ طب میں بھی اچھی واقفیت حاصل کی تھی۔ انھوں نے شیخ الرئیس کی قانون کے تینوں مباحث کی تکمیل کی تھی۔[10] وہ عربی اور فارسی کے علاوہ ترکی بھی جانتے تھے، جو انھوں نے ایک ترک طاہر بک سے پڑھی تھی۔

طاہر بک قوم کے ترک تھے اور یمن و شام میں مختلف سرکاری عہدوں پر متمکن رہ چکے تھے۔ قسطنطنیہ میں وہ ایک پرچے "ترجمانِ حقیقت" کے مدیر رہے۔ وہ متعدد زبان جانتے تھے، فرانسیسی اور فارسی اور عربی بھی اتنی ہی روانی سے بولتے تھے، جتنی اپنی مادری زبان ترکی۔ وہ بڑی پریشان حالی میں پھرتے پھراتے کلکتے پہنچے تھے۔ مولانا آزاد سے ملاقات ہوئی تو یہ انھیں مکان پر لے آئے اور والد کی اجازت سے ان سے ترکی پڑھنا شروع کی۔ مولانا آزاد تو تعلیم جاری نہ رکھ سکے، لیکن آہ پوری مستعدی سے پڑھتے رہے۔[11]

ان کے گھر کا ماحول سراسر علمی تھا۔ ان کے والد بلاشبہہ پرانے رنگ کے عالم و فاضل بزرگ تھے۔ اس پر طریقت کی چاشنی مستزاد۔ ظاہر ہے کہ ان کے ملنے والے بھی یا تو علومِ دین کے ماہر بزرگ ہوں گے، یا اصحاب تصوف میں سے۔

۱۰۔ آزاد کی کہانی: ۲۰۰

۱۱۔ ایضاً: ۲۲۵-۲۲۶

ایسے گردوپیش میں اولاد کا علم و تعلم اور تصنیف و تالیف کی طرف مائل ہو جانا چنداں تعجب کی بات نہیں۔ چنانچہ یہ دونوں بھائی بہت کم عمری ہی میں نظم و نثر لکھنے لگے۔ فرق صرف اتنا تھا کہ مولانا ابوالکلام کی طبیعت کا رجحان شروع سے صحافت اور اخبار نویسی کی طرف زیادہ رہا؛ اس کے مقابلے میں غلام یٰسین نے صرف نظم و نثر پر قناعت کی۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے کوئی دس سال کی عمر میں شعر کہنا شروع کیا تھا۔ بڑے بھائی نے ان سے پیچھے رہنے میں ہیٹی محسوس کی اور آہ تخلص اختیار کیا۔ دونوں داغ کے شاگرد ہوئے۔ آزاد تو جلد ہی انھیں چھوڑ گئے، لیکن آہ نے استواری اور استقامت کا مظاہرہ کیا اور داغ کے انتقال تک انھیں کو اپنا کلام دکھاتے رہے۔ داغ کا فروری ۱۹۰۵ء میں انتقال ہوا ہے۔ اس وقت آہ کی عمر بمشکل ۱۹۔۲۰ سال کی ہوگی۔ اس کم عمری میں اور لے دے کے پانچ چھ برس کی شاعری کے باوجود ان کا داغ کے ممتاز شاگردوں میں شمار ہونے لگا تھا۔ مولانا احسن مارہروی نے استاد کی زندگی ہی میں ان کے حالات پر مشتمل ایک کتاب 'جلوۂ داغ' کے نام سے شائع کی تھی (۱۳۲۰ھ/۱۹۰۳ء)؛ یہی ان کی سب سے پہلی سوانح عمری ہے۔ اس میں انھوں نے داغ کے بیشتر ممتاز شاگردوں کا ذکر بھی کیا ہے۔ لیکن اس فہرست میں آہ کا نام نہیں ملتا۔ آہ نے اس کتاب سے متعلق ایک تعریفی مضمون احسن الاخبار، کلکتہ میں لکھا تھا، فصیح الملک مرزا داغ دہلوی کا قابلِ قدر ہدایت نامہ۔ اسی مضمون کے آخر میں انھوں نے احسن مارہروی کا ایک خط بھی نقل کیا ہے، جو انھوں نے آہ کے نام لکھا تھا۔ احسن لکھتے ہیں[۱۲]:

مجھ سے جلوۂ داغ میں ایک غلطی ہو گئی ہے، اس کا اعتراف ضروری ہے۔۔

۱۲۔ اس تمام تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو مولانا ابوالکلام آزاد از عابد رضا بیدار: ۸۰ (دہلی، ۱۹۶۸ء)

وہ یہ کہ جہاں ممتاز تلامذہ کے نام لکھے ہیں ان میں آہ کا نام نامی سہواً رہ گیا ہے ؛ یہ محض بشریت ہے۔ انشاء اللہ دوسرے ایڈیشن میں اس کی صحت ہو جائیگی۔

اس پر کسی حاشیے کی ضرورت نہیں۔

نظم کے علاوہ وہ آغاز ہی سے نثر بھی لکھنے لگے تھے۔ چنانچہ اسی احسن الاخبار میں انھوں نے ایک سلسلہ مضامین 'الخیام' کے عنوان سے لکھا، جو بعد کو اسی نام سے کتابی شکل میں مطبع آصفی، لکھنؤ میں چھپ کر شائع ہوا۔ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رح کے حالات میں ایک عربی رسالہ 'غبطۃ الناظر' ہے؛ آہ نے اس کا اردو میں ترجمہ کیا تھا۔ ترکی زبان کی صرف و نحو بھی اردو میں قلم بند کی تھی؛ یہ بھی چھپ چکی ہے۔

منشی نوبت رائے نظر نے ۱۸۹۷ء میں ماہنامہ خدنگ نظر جاری کیا تھا۔ شروع میں یہ محض گلدستہ تھا؛ اس نوع کے دوسرے پرچوں کی مانند اس میں بھی 'طرح' کا اعلان ہوتا اور اس پر شعرا کی غزلیں شائع ہوتی تھیں۔ مولانا آزاد نے نظر کو لکھا کہ اگر آپ اس میں نثری مضامین کا اضافہ کر دیں، تو میں ان کی ترتیب کا ذمہ لیتا ہوں؛ چنانچہ اس کے بعد 'خدنگ نظر' میں مقالات بھی چھپنے لگے۔ آہ بھی اس رسالے میں لکھا کرتے تھے۔ ان کا کلام نظم و نثر اس کے متعدد شماروں میں ملتا ہے۔ نہ صرف یہی بلکہ وہ اس پرچے کی اور کئی طریقوں سے بھی مدد کرتے رہتے تھے۔ مثلاً اس کی اشاعت بڑھانے کے لیے خریدار مہیا کرنا، مالی امداد کرنا، وغیرہ۔ جو لوگ پرچے کے خاص ہمدرد اور سرپرست تھے نظر ان کے نام کے ساتھ 'معاونِ خدنگ نظر' کے الفاظ لکھا کرتے تھے۔[۱۳]

۱۳۔ مثلاً جنوری ۱۹۰۰ء کے شمارے میں آہ کے علاوہ مندرجہ ذیل اصحاب کے ناموں کے ساتھ بھی (باقی اگلے صفحہ پر)

متعدد شماروں میں آہ کے نام کے ساتھ 'معاونِ خدنگِ نظر' کے لفظ ملتے ہیں بلکہ اپریل ۱۹ء کے پرچے میں شکریہ کے عنوان کے تحت ان "معززین اور عالی حوصلہ حضرات کے نام نامی" شائع ہوئے ہیں، جنھوں نے خدنگ نظر کے "سر سہ حصوں کی خریداری منظور فرما کر پیشگی قیمت عنایت فرمائی" . . "ایسے حضرات بہت زیادہ شکرگزاری کے مستوجب ہیں' جنھوں نے قیمتِ مقررہ سے زیادہ عنایت فرمائی "۔ اسی آخری زمرے میں ایک نام 'عالی جناب مولوی غلام یسین صاحب آہ دہلوی از کلکتہ' کا بھی ہے۔ انھوں نے آٹھ روپے ادا کیے تھے؛ اصلی چندہ صرف تین روپیہ سالانہ تھا۔

دورانِ مطالعہ میں مختلف پرچوں میں ان کے مندرجہ ذیل نثری مضامین میری نظر سے گذرے ہیں:

مشک	مخزن	جون	۱۹۰۲ء
اہلِ ختا کے مذاہب (۱)	مخزن	اکتوبر	۱۹۰۲ء
اہلِ ختا کے مذاہب (۲)	مخزن	فروری	۱۹۰۳ء
قطراتِ موسیقی (علیہ شفیقہ کے ترکی مضمون کا اردو ترجمہ)	خاتون	جنوری	۱۹۰۶ء
تحریر	خدنگ نظر	اپریل	۱۹۰۲ء
عالمِ اجسام (۱)	خدنگِ نظر	اگست	۱۹۰۲ء
عالمِ اجسام (۲)	خدنگِ نظر	ستمبر	۱۹۰۲ء

(بقیہ حاشیہ نمبر ۱۳)

الفاظ ملتے ہیں، (۱) حاجی سید تحمل حسین صاحب تحمل جلالپوری؛ (۲) سید مراد حسن صاحب مراد تاجر کتب کلکتہ؛ (۳) حاجی حافظ محمد حسن صاحب نصرت از بمبئی۔ اسی بمبئی کے شمارے میں ایک اور صاحب حسن علی صاحب ابن شجاع الدین صاحب سوداگر بمبئی کے نام کے ساتھ بھی لفظ لکھے ہیں۔

حیوانات کی تعجب خیز پرستش: مصر کا مشہور دیوتا آمون	خدنگ نظر دسمبر ۱۹۰۲ء
مشہور رزمی فیصر سسرو	خدنگ نظر دسمبر ۱۹۰۲ء
شادی (اسراف کے خلاف)	لسان الصدق (۱:۲) ۲۰ دسمبر ۱۹۰۳ء
نوبہار کی زندگی	لسان الصدق (۱:۲) ۲۰ جنوری ۱۹۰۴ء
اردو کا دکھڑا اور بنگالہ	" " (۱۲:۳-۵) اپریل مئی ۱۹۰۴ء
شگون	ایضاً
ڈی ماس تھینیز: یونان کا ایک خاتم لیکچرر (ترجمہ از انگریزی)	ایضاً (۳:۱-۲) اپریل مئی ۱۹۰۵ء

مولانا آزاد اور آہ اپریل ۱۹۰۴ء میں انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسے میں شرکت کے لیے لاہور گئے تھے۔ دونوں نے اس موقع پر تقریریں بھی کی تھیں۔ آہ کی تقریر انجمن کی سالانہ روداد میں چھپی ہوئی ہے۔ وصل بلگرامی کے تعزیتی شذرے سے معلوم ہوتا ہے کہ آہ انجمن کے سالانہ جلسہ منعقدہ ۱۹۰۵ء میں بھی شامل ہوئے تھے اور انھوں نے اس موقع پر بھی تقریر کی تھی۔

آہ کو اسلامی ممالک کی سیر و سیاحت کا بہت شوق تھا۔ وہ موقع کی تلاش میں تھے، جو اتفاق سے جلد میسر آگیا۔ ایک صاحب تھے حافظ عبدالرحمن امرتسری، انھوں نے اسلامی ملکوں کے بہت چکر کاٹے تھے، اسی لیے اپنے نام کے ساتھ 'سیاحِ ممالک اسلامیہ' لکھا کرتے تھے؛ ان کا سفرنامہ چھپ چکا ہے، آہ کی کہیں ان سے ملاقات ہوگئی۔ ان کی دلچسپ باتوں نے گویا سمندِ شوق پر تازیانے کا کام دیا۔ دونوں نے عراق اور مغربی ایشیا کے مختلف ممالک کی سیر کا منصوبہ بنایا۔ مولانا آزاد بھی ان کے ساتھ تھے۔ جب یہ قافلہ بغداد پہنچا، تو مولانا آزاد سخت بیمار پڑ گئے چونکہ ایسی حالت

میں ان کا سفر جاری رکھنا خطرہ سے خالی نہیں تھا، یہ بغداد سے ہندستان واپس چلے آئے۔ آہ اور حافظ عبدالرحمن آگے بڑھ گئے اور موصل، دیار بکر سے ہوتے ہوئے شام ولبنان پہنچے۔ اس سال ان نواح میں سخت برفباری ہوئی تھی اور سردی بہت شدید تھی۔ ہندستانی مزاج کو ایسا موسم کمتر ہی راس آتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے پھیپھڑوں پر حملہ ہوا۔ یہی تکلیف آگے چل کر موت کا بہانہ بن گئی۔ مولانا آزاد کا خیال ہے کہ ان کے ہمسفر حافظ عبدالرحمن نے کوئی خاص حقِ رفاقت ادا نہ کیا اور ان کی دیکھ بھال میں کوتاہی کا ثبوت دیا۔[14] رفتہ رفتہ آہ کی حالت خراب سے خراب تر ہوتی گئی۔ اسی بیماری کی حالت میں وہ بلادِ شام سے واپس بغداد آئے۔ یہاں اس زمانے میں سید سجاد حیدر یلدرم انگریزی قونصل خانے میں بحیثیت معاون ملازم تھے۔ انھوں نے ہر طرح مدد کی۔ جب مولانا خیرالدین کو بمبئی میں بیٹے کی بیماری کی خبر ملی، تو انھوں نے یہاں سے روپیہ بھجوایا اور یہ واپس وطن آئے، لیکن کس حالت میں کہ تندرستی بالکل تباہ ہو چکی تھی۔ والد انھیں لے کر کلکتے پہنچے۔ علاج معالجے کے باوجود کچھ افاقہ نہ ہوا اور بالآخر ان کا نمونیہ (ذات الجنب) سے ۱۹۰۶ء میں انتقال ہوگیا۔[15] قبرستان مانک تلہ میں اپنی خاندانی ہڑدواڑی میں دفن ہوئے۔

مولانا خیرالدین کو جواں سال بیٹے کی موت سے جو صدمہ ہوا ہوگا، اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ آہ اپنے والد کے بہت چہیتے فرزند تھے۔ مولانا آزاد بہت ابتدا ہی میں سرسید کی تحریروں کے مطالعے کے بعد اپنے موروثی عقائد سے بغاوت کر چکے تھے۔ مولانا خیرالدین پیری مریدی کے قائل اور

۱۴۔ آزاد کی کہانی۔ ۱۷۹

۱۵۔ ایضاً: ۱۴۵

بہت قدامت پرست تھے۔ انھوں نے دیکھا کہ میرے بعد یہ سلسلہ آزاد کو چلانے سے رہے، اس لیے انھوں نے اپنی خاص تصوف کی تعلیم اور توجہ کے لیے آہ کو چنا۔ آہ بھی امتحان میں پورے اترے۔ وہ بڑے راسخ الاعتقاد اور اپنے خاندانی عقائد و اعمال میں بہت پختہ تھے اور ہر بات میں والد کے نقش قدم پر تھے۔ انھیں کی طرح سے وعظ کہتے اور اپنے لب و لہجہ اور حرکات و سکنات میں پوری طرح ان کی تقلید کرتے تھے۔ آہ کا لباس، چال ڈھال، وعظ کہنے کا طریقہ اس حد تک اپنے والد سے ملتا جلتا تھا کہ جن لوگوں نے مولانا خیرالدین کے وعظ سُنے تھے، وہ اعتراف کرتے تھے کہ آہ کے وعظوں میں بھی وہی لطف آتا ہے۔

آہ کی وفات پر مقبول حسین وصل بلگرامی نے اپنے رسالے عالمگیر (اکتوبر ۱۹۰۶ء) میں یہ تفصیلی شذرہ لکھا تھا:[۱۶]

> مولوی ابوالنصر غلام یسین آہ دہلوی مرحوم نہایت ہی لائق مضمون نویس اور عمدہ شاعر تھے۔ آپ کا کلام اکثر خدنگ نظر اور دیگر علمی رسالوں میں شائع ہوتا رہا ہے۔ نثر کے مضامین، کوئی ایسا اردو اخبار اور رسالہ نہ تھا جس میں نہ نکلتے رہے ہوں۔ ۱۹۰۵ء میں انجمن حمایتِ اسلام لاہور کے سالانہ جلسہ میں خاکسار سے بھی ملاقات ہوئی تھی۔ اور اس جلسہ میں آپ نے جو لکچر دیے اور نظمیں پڑھیں، ان کا ایک ایک لفظ آپ کی اعلیٰ لیاقت اور جدت پسند طبیعت کا شاہد تھا حاضرین و سامعین سُن سُن کر نعرۂ آفریں بلند کر رہے تھے۔ حال میں آپ اسلامی ممالک کی سیر کو گئے تھے۔ وہاں سے آتے ہی آپ نے انتقال

۱۶۔ ابوالکلام آزاد (بیدار)، ۴۲۔۴۳

گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

ہمیں آپ کی ناگہانی اور بیوقت موت کا افسوس اور سخت افسوس ہے۔ ایسا ہونہار اور علمی مذاق کا دلدادہ کہاں سے لائینگے! خدا آپ کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے اور آپکے اعزّہ کو صبرِ جمیل۔ یقین ہے کہ آپنے اپنے سفرنامے کا مسوّدہ ضرور چھوڑا ہوگا۔ امید ہے کہ آپکے چھوٹے بھائی مکرمی حضرت ابوالکلام آزاد دہلوی جو مشہور انشا پرداز ہیں، آپ کا سفرنامہ، آپ کی سوانحعمری اور کلام و مضمون ضرور ایک جگہ ترتیب دے کر شائع کرینگے اور ان کی مختصر سرگذشت سے ہمیں آگاہ کرینگے۔

آہ نے غالبًا سفرنامہ تو نہیں چھوڑا، لیکن وہ اپنے سفر کے دوران میں ہفتہ وار وطن، لاہور کو مراسلات بھیجتے رہے تھے۔ ان خطوط میں ان کے سفر کے کوائف اور بہت دلچسپ معلومات ہیں۔

آہ کا بہت کم عمری میں نکاح ہوگیا تھا۔ ان کے والد کے ایک بہت مخلص مرید آفتاب الدین صاحب تھے۔ وہ مدة العمر کلکتے میں سروے کے محکمے میں ملازم رہے اور یہیں سے انہوں نے پنشن پائی۔ ان کے پانچ بیٹیاں تھیں۔ ان میں سے دو آہ اور آزاد کے عقدِ نکاح میں تھیں۔ آہ کے ان سے ایک صاحبزادہ نورالدین احمد پیدا ہوا، یہ بفضلہ اب بھی حیات ہیں، کلکتے میں قیام ہے۔

مولانا آزاد کہتے ہیں[۱۷] کہ آہ کا دیوان تقریبًا مکمل ہو چکا تھا جس میں ہر صنف کا معتدبہ کلام تھا، لیکن ان کی وفات کے بعد تلاش کروایا، تو نہیں

۱۷۔ آزاد کی کہانی: ۱۸۰

١٦ ء

ملا۔ دورانِ مطالعہ میں مجھے جو کچھ دستیاب ہوا، وہ یہاں یکجا کر دیا گیا ہے۔ یقیناً اور بھی بہت ہوگا، جو میری نظر سے رہ گیا۔

نئی دلی
یکم جون ۱۹۶۸ء

مالک رام

غزلیات

اشکِ حسرت ہیں ترے ہجر میں ڈھلنے کے لیے
ایک دریا مری آنکھوں سے اُبلنے کے لیے

کوئی تدبیر نہیں دم کے نکلنے کے لیے
کیا اُٹھا رکھتے ہیں بیمار سنبھلنے کے لیے

چاہیے صورتِ پروانہ دلِ سوز طلب
ایک پر ایک گرا پڑتا ہے جلنے کے لیے

داغ کیوں تم نے دیا مل کے رقیبوں سے مجھے
آتشِ ہجر نہ کم تھی مرے جلنے کے لیے

لے گئے ہو جو مرے ہوش و خرد، صبر و قرار
داغ دے جاؤ کوئی دل کے بہلنے کے لیے

نزع میں دیکھے کوئی حسرت و ارماں کا ہجوم
سب مرے ساتھ ہی تیار ہیں چلنے کے لیے

آبلے دل میں پڑے داغِ جگر کے ہمراہ
کیا بہار آئی مری پھولنے پھلنے کے لیے

جان ہی عشق کی افتاد نے لے لی آخر
ایک ٹھوکر ہی کھائی تھی سنبھلنے کے لیے

دو پہر حسن کی اب ہو چکی، اے مستِ شباب!
سر پہ آیا ہے دوپٹہ ترا ڈھلنے کے لیے

دیکھ یوں چاہتے ہیں چاہنے والے تجھ کو
ہر طرف آنکھیں بچھی ہیں ترے چلنے کے لیے

جب بگڑتے ہیں سنبھالے سے سنبھلتے ہی نہیں
آپ بھی میری طبیعت ہیں مچلنے کے لیے

ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا ہے کیوں پیرِ مغاں
مے ہے ڈھلنے کے لیے، جام ہیں چلنے کے لیے

سیکھ لے مجھ سے کوئی مشغلۂ تنہائی
تیری تصویر سے باتیں ہیں بہلنے کے لیے

لڑکھڑاتے ہیں کبھی رند، تو دیکھ، اے زاہد!
'یا علی!' منہ سے نکلتا ہے سنبھلنے کے لیے

کھائینگے زہر حسینانِ جہاں آج ان پر
دھانی پوشاک منگاتے ہیں بدلنے کے لیے

مجمعِ حسرت و اندوہ سے دم گھٹتا ہے
راہ پاتے نہیں ارمان نکلنے کے لیے

تم سلامت ہو، تو آئے گی قیامت بھی کہیں
اِک یہی چال اٹھا رکھی ہے چلنے کے لیے

لوٹ جاؤ دلِ بیتاب ہمارا لے کر
کوئی حیلہ نہیں درکار مچلنے کے لیے

ہے مرے خانۂ تاریک میں یکساں شب و روز
اِک چراغ آٹھ پہر چاہیے جلنے کے لیے

شاعری دادطلب، داد نہ دے جب کوئی، آہ!
پھر تو اک شغل ہے یہ دل کے بہلنے کے لیے

(نیرنگ عالم، اپریل ۱۸۹۹ء)

۲

طالعِ بد سے نہ آئی راست اک تدبیر بھی
تو پھر اکیا ہم سے ظالم! پھر گئی تقدیر بھی

دل میں لازم ہے خیالِ رُوئے پُر تنویر بھی
چاہیے اس آیینے کو نور کی تصویر بھی

مستعد ہے جان دینے کو دلِ نخچیر بھی
ناوک افگن پاس تیرے ہے کماں بھی، تیر بھی

سُوئے زنداں جب ترا دیوانۂ گیسو چلا
پانو پڑنے کے لیے آگے بڑھی زنجیر بھی

خاک میں ملنا ہے تجکو، خاک کا پُتلا ہے تو
خاک ہے منعم! یہ سازِ عیش بھی، تعمیر بھی

جم گیا نقشہ رقیبوں کا دلِ دلدار پر
ہو گئی بیکار اب تحریر بھی، تقریر بھی

سر میں سودا زُلف کا ہے، ابروؤں کی دل میں یاد
جان کے پیچھے پڑا ہے طوق بھی، زنجیر بھی

آپ آئے خانۂ دل میں، تو روشن ہو گیا
اب چمک اٹھے، خدا چاہے، میری تقدیر بھی

بسملِ نوکِ مژہ ہوں، کشتۂ ابروئے یار
ساتھ میرے ہو لیے ہیں، تیر بھی، شمشیر بھی

کمسنی میں چاہتے ہو تم اگر مشقِ جفا
ترچھی چتون سے زرا سیکھو لگانا تیر بھی

حالِ زخمیِ محبت سے کسے صدمہ نہیں
خم کیے ہے سر کو اے قاتل! تری شمشیر بھی

روح سارے جسم کی آتی ہے کھنچ کر کان میں
سحر ہے ظالم! تری جادو بھری تقریر بھی

آہ! اس سفاک نے ہم پر کبھی کھایا نہ رحم
"روتے جاتے ہیں ہمارے حال پر رہگیر بھی"٥

(خدنگِ نظر، جنوری ۱۹۰۰ء)

۳

کبھی او ستمگار! وعدہ وفا کر — مریضِ تپِ ہجر کی کچھ دوا کر

رقیبوں سے ملتے ہو باتیں بنا کر — مری جان لینا ہے تم کو رُلا کر

تپِ عشق کی آگ بھڑکی ہوئی ہے — مجھے بھی جلائیگی، دل کو جلا کر

شکایت یہ ہے دستِ قدرت سے ہم کو — بگاڑا تمھیں خوبصورت بنا کر

تجلّی پہ ہو جائیں مائل نہ موسیٰ — وہ بیٹھے ہیں پردے میں کیوں منہ چھپا کر

ہوا بوئے مے لائی کیا میکدہ سے — گرے شیخ سجدے میں کیوں لڑکھڑا کر

---

٥ یہ مصرع طرح تھا۔

ہمنشیں، بولیں میّت پہ آکر ہماری — وہ بیٹھے ہیں کیوں رونی صورت بنا کر
ہزاروں ہی دعوے ہیں، لاکھوں ہی پیماں — بہت سے نہیں، ایک ہی دو دفا کر
ترقی پہ ہے بیوفائی کسی کی — ابھی اور اے زندگی! کچھ دفا کر
قیامت کا غصّہ، غضب کے ہیں تیور — مری جان لینے ہو، آنکھیں کھا کر
زمانے کی نیرنگیاں کوئی دیکھے — بگاڑے بہت خوبصورت بنا کر

مرا دردِ پنہاں، مرے دل کی حسرت
وہ پوچھے کبھی آہ! مجھ کو بُلا کر

(خدنگِ نظر، فروری ۱۹۰۰ء)

۴

کہتا ہوں جب کہ مجھ پہ نگاہِ کرم نہیں — کہتے ہیں ناز سے وہ: خدا کی قسم نہیں
تیرے جفا و جور کا ہم کو الم نہیں — جینے کا اپنے رنج ہے، مرنے کا غم نہیں
تکتے ہیں گاہ مجھکو، کبھی وہ رقیب کو — شوخی سی شرم، شرم سی شوخی بھی کم نہیں
اِک میں کہ جان دیتا ہوں کس ذوق و شوق سے — اک تو کہ میرے مرنے کا کچھ بھی الم نہیں
دل کی تڑپ میں شوخیِ جاناں کا ہے مزہ — اب آرزوئے وصل، خدا کی قسم، نہیں
آئی صدا مری لحدِ پایمال سے — رفتارِ یار، فتنۂ محشر سے کم نہیں
ملتے ہی آنکھ، دل مرا چور چور ہو گیا — ترچھی نظر حضور کی، برچھی سے کم نہیں

کھنچ جانا بات بات پہ ان کا شبِ وصال — میرے لیے تو خنجرِ بُرّاں سے کم نہیں

تم ہو زباں دراز، تو ہم بے زبان ہیں — تم ہم سے کم نہیں ہو، تو ہم تم سے کم نہیں

جب سے کہ خطِ سبز کا نظّارہ ہو گیا — ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے، آپے میں ہم نہیں

عاشق نہ ہو دہان و کمر کا جو اس کی، آہ!

کچھ وہ مسافرِ رہِ ملکِ عدم نہیں

(خدنگِ نظر، فروری، ۱۹۰۰ء)

۵

بس کرو اب رونے والے رو چکے — "رات گزری، سونے والے سو چکے"[1]

آپ کی چتون پہ عاشق ہو چکے — جان اپنی رونے والے کھو چکے

اب تو سیدھی کیجیے ترچھی نگاہ — سیکڑوں ٹکڑے جگر کے ہو چکے

کچھ نئی حجت ہے، میری آپ کی — حشر تک ممکن نہیں، جو ہو چکے

آبرو پائی نگاہِ خلق میں — ہم شہیدِ تیغِ ابرو ہو چکے

یہ بھی وعدہ آپ کا ہم دیکھ لیں — آج ہی کل میں قیامت ہو چکے

آرزو یوں بھی نہ نکلی وصل کی — ہم کنارِ قبر میں بھی سو چکے

سادہ کاغذ رہ گیا، اے نامہ بر! — خط کو ہم اشکوں سے اپنے دھو چکے

خالِ روئے یار کے عاشق ہیں ہم — کشتِ دل میں تخمِ حسرت بو چکے

---

[1] مصرعِ طرح

کیا دہن ہے، کیا کمر ہے آپ کی دیکھتے ہی جان و دل گم ہو چکے

ہنس رہے ہیں باغ میں غیروں کے ساتھ میرے پھولوں میں وہ آ کر رو چکے

کُوئے جاناں میں عجب اندھیر ہے نقدِ دل ہم بھی اسی جا کھو چکے

بڑھ کے ہے عارض تمھارا یا قمر بحث بہ، رخ سے نقاب الٹو، چکے

نخلِ غم پھولے پھلیگا خلق میں

آہ ! ہم تخمِ محبت بو چکے

(خدنگِ نظر، مارچ، ۱۹۰۰ء)

۶

کشتۂ حسرت ازل سے ہے دلِ ناکامِ عشق

روح نے پہلے پہل آ کر دیا پیغامِ عشق

آبلوں کا گنجِ گوہر دے کے صحرا نے کہا،

سالکِ وحشت کو ملتا ہے یہی انعامِ عشق

فاتحہ پڑھنے جو آئے ہیں ہماری قبر پر

دوستوں کو آج آتا ہے نظر انجامِ عشق

آبلہ دل کا نہ ٹوٹا حشر تک، اے چارہ گر!

عالمِ فانی میں ہے کس درجہ استحکامِ عشق

اب نہ وہ جوشِ جوانی ہے، نہ داغوں کی بہار
صبحِ پیری آئی بجھتے ہیں چراغِ شامِ عشق

ہائے، وہ آنسو بہانا ان کا میری لاش پر
اور وہ کہنا کہ ہوتا ہے یہی انجامِ عشق

سہتے سہتے رنج وغم آخر نتیجہ یہ ہوا
جان دے کر کام اپنا کر گئے ناکامِ عشق ؎

اب رسائی خلوتِ محبوب تک آسان ہے
دل نے آہوں کو بنایا ہے کمندِ بامِ عشق

بٹ رہے ہیں جامِ الفت حُسن کی خیرات میں
دوست دشمن پہ ہے یکساں آج فیضِ عامِ عشق

جو تڑپنے میں مزا ملتا ہے ظالم! کیا کہوں
میرے دل سے کوئی پوچھے لذتِ آلامِ عشق

زہر کھا کر مرگیا اُس سبزہ رُو کے عشق میں
آہؔ نے پایا ہے ملبوسِ زمرد فامِ عشق

(خدنگِ نظر، اپریل، ۱۹۰۰ء)

؎ مصرعِ طرح

۷

مصحفِ رُخسار سے ہوتا ہے ہمسر آیینہ
کس قدر گستاخ ہے، اللہ اکبر، آیینہ

نامۂ آیینہ رُو ہے اے کبوتر! آیینہ
تُو تو اپنے ساتھ لایا ہے اڑا کر آیینہ

پہلے دل پر ہاتھ رکھ لیجے کہ آجائے نہ غش
"اپنی صورت دیکھیے گا پھر اُٹھا کر آیینہ"[٥]

لے چلا ہے اس کے رُوے صاف و روشن کا خیال
راہِ الفت میں ہوا ہے اپنا رہبر آیینہ

رُو برُو کی چوٹ ہے، وہ بھی بڑا بیباک ہے
دیکھیے صاحب! دمِ تزیین سنبھل کر آیینہ

موجزن اک نور کا دریا نظر آیا مجھے
آ گیا جس وقت اُس رخ کے برابر آیینہ

اب نہ چاہیں گے تمھیں اے مہوشانِ خود پسند
ہم نے رکھا طاقِ نسیاں پر اُٹھا کر آیینہ

---

٥ مصرعِ طرح

آئینہ میں ابروئے خمدار او قاتل! نہ دیکھ
ذبح کرتا ہے مجھے بن بن کے خنجر آئینہ

رُوئے تاباں دیکھتے ہی آگ دل میں لگ گئی
شان اس کی بن گیا سینے میں مجمر آئینہ

عکس سے بھی اپنے آتی ہے انھیں شرم و حیا
دیکھتے ہیں صبحِ وصل آنکھیں چُرا کر آئینہ

پر تَوِ رُوئے کتابی نے دیا مصحف کا کام
اللہ اللہ ہو گیا گویا پیمبر آئینہ

(خدنگ نظر، جولائی، ۱۹۰۰ء)

۸

جب سے دل میں اس حسیں کی یاد ہے
جو ہر پیکر شعلۂ فریاد ہے

ایک ہے مسرور، اک ناشاد ہے
بزمِ ہستی کی عجب رُوداد ہے

تم کو چاہا سب کی نظروں سے گرے
یہ ہمارے عشق کی افتاد ہے

قید میں جلتا نہیں بلبل کا دل
یہ چراغِ خانۂ صیّاد ہے

ناز ہم سے اور غیروں سے نیاز
مہرباں! یہ آپ کا ایجاد ہے

ایک عالم کی اُڑائی اِس نے نیند
اب مری فریاد کی فریاد ہے

زندگی میں تھیں ہزاروں گردشیں — مر کے بھی مٹی مری برباد ہے
ہو گئی برباد اپنی خاک بھی — وہ ابھی تک بر سرِ بیداد ہے
لطف کے پردے میں ظلم و جور ہیں — کس ستم کا وہ ستم ایجاد ہے
بن پڑی تو ہم بھی دیں حوروں کو دل — دشمنِ جاں، حسنِ آدم زاد ہے
خاک کر دے آسماں کو تو سہی — دوسری بجلی مری فریاد ہے
ہجر کی شب دیکھیے کیونکر کٹے — ہر ستارہ دیدۂ جلاد ہے

جس کو سب کہتے ہیں آہِ نیم جاں
یہ وہی تو خانماں برباد ہے[1]

(خدنگِ نظر، ستمبر، ۱۹۰۰ء)

۹

شرم کیسی یہ شبِ وصل: ادھر آؤ بھی
دیکھنا کون ہے، چپکے سے لپٹ جاؤ بھی
کیسے بیدرد ہو، سفاک ہو تم، جاؤ بھی
"آپ ہی ظلم کرو، آپ ہی پچھتاؤ بھی"[2]

---

[1] مصرع طرح: بتلائے غم دلِ ناشاد ہے۔
[2] مصرع طرح

پردے آنکھوں پہ پڑے ہیں کہ بہار آئی ہے
ہو چکی توبہ، بس اب ساغرِ مے لاؤ بھی

تم تو جانے ہی پہ تیار ہو صبحِ شبِ وصل
کچھ ہمارے دلِ بیتاب کو سمجھاؤ بھی

ہم نے مانا کہ غش آجائیگا موسٰی کی طرح
تم کو کیا فکر ہے، صورت ہمیں دکھلاؤ بھی

پانو اپنے نہیں اٹھتے طرفِ منزلِ عشق
دل بڑھا جاتا ہے، یہ کہتا ہوا : آؤ بھی

دیکھ کر دل کی تڑپ، آپ ہی ڈر بھی جاؤ
اور بجلی کی طرح، آپ ہی تڑپاؤ بھی

بات ہی وعدہ خلافی نے تمہاری کھو دی
روز کہتے ہو، ہم آئینگے ؛ اجی، جاؤ بھی!

آہ کے دل کا بھی دھو جائے پسِ مرگ غبار
چند آنسو کبھی تربت پہ بہا جاؤ بھی

(خدنگِ نظر، اکتوبر ۱۹۰۰ء)

۱۰

سرِ نبر ٹھوکر لگاتے ہوئے چلو، سوئی قسمت جگاتے ہوئے

اِدھر دیکھا ظالم کو آتے ہوئے
اُدھر دل کو پہلو سے جاتے ہوئے

چلے اُٹھ کے تیوری چڑھاتے ہوئے
وہ نظروں سے ہم کو گراتے ہوئے

مری قبر پر آکے کہتے ہیں وہ
بہت نیند کے آپ ماتے ہوئے

حیا ہے جو مانع، تو آتی ہے شرم
تصور میں بھی ان کو آتے ہوئے

نہ توڑو بتو! دل شکستوں کے دل
ڈرو، گھر خدا کا گراتے ہوئے

کھنچے تیغ کے ساتھ ابرو ترے
ستم پر ستم اور ڈھاتے ہوئے

مجھے دیکھ کر، ہائے، شرما گئے
چھپے، ہاتھ سے منہ چھپاتے ہوئے

دکھا کر وہ زلفِ سیہ، چل دیے
بلا میرے پیچھے لگاتے ہوئے

خدا جانے کب دل میں آئے، گئے
انھیں آتے دیکھا، نہ جاتے ہوئے

گلی سے تری ہم نے دیکھا ہے حور!
ہوا باغِ جنت کی آتے ہوئے

تمنائے دل کو ترے خوف سے
زباں تک بھی ڈرتے ہیں لاتے ہوئے

گھلے جاتے ہیں آہ! ہم عشق میں
اثر آہ کا آزماتے ہوئے[۵]

(خدنگِ نظر، نومبر ۱۹۰۰ء)

---

[۵] مصرع طرح تھا، جھجکتے ہو کیوں دل میں آتے ہوئے

۱۱

ظاہری صاحب سلامت اور ہے　　اور راہ و رسمِ الفت اور ہے

تھا لڑکپن قہر، اب آیا شباب　　یہ قیامت پر قیامت اور ہے

حاجتِ طوق و سلاسل کچھ نہیں　　عاشقِ گیسو کی وحشت اور ہے

بیوفا ہیں سارے عالم کے حسین　　ان کی صورت اور سیرت اور ہے

ظلم میں ان کے غضب کا ہے مزہ　　اس لیے دل کو محبت اور ہے

سامنے وہ، اور میں نظروں سے دور　　یار آیینے کی قسمت اور ہے

ہم سے کیا محشر میں ہوگی بازپرس　　شیخ! اس کی شان رحمت اور ہے

گرمیِ داغِ دلِ سوزاں ہے اور　　حدّتِ مہرِ قیامت اور ہے

قتل کر کے لاش بھی کر پایمال　　"ایک نکلی، ایک حسرت اور ہے"٭

زرد کی دل میں کھٹک پہلے سے تھی　　آپ کا جانا قیامت اور ہے

خاک تک تو کر چکے برباد تم　　اب بھی کیا دل میں کدورت اور ہے

ہم شبِ فرقت میں مر مر کر جیے　　کیا کوئی باقی قیامت اور ہے

کیا کہوں میں حالِ آہِ دہلوی

ان دنوں رنگِ طبیعت اور ہے

(خانگ نظر، دسمبر ۱۹۰۰ء)

٭ مصرع طرح

۱۲

کبھی وہ جان کا دشمن، وہ قاتل یاد آتا ہے
کبھی پہلوئے خاطر دیکھ کر دل یاد آتا ہے

چلے جاتے ہیں اُٹھتے بیٹھتے ہم دشتِ غربت میں
وطن اپنا ہمیں منزل بمنزل یاد آتا ہے

پھنسے اک ان سوا الفت کرکے ہم دوہری مصیبت میں
اِدھر وہ یاد آتے ہیں، اُدھر دل یاد آتا ہے

رہا پہلو میں جب تک ہم اُسے سمجھا کیے دشمن
گنوا بیٹھے ہیں، تو کم بخت اب دل یاد آتا ہے

گزرتا ہے نظر سے جب کوئی پھولا پھلا گلشن
تو پہروں ہم کو اپنا رنگِ محفل یاد آتا ہے

مزے کی نیند گو آتی ہے آغازِ جوانی میں
مگر انجام میں یہ وقت، غافل! یاد آتا ہے

کبھی جس دل کو ظالم! دمبدم تو یاد آتا تھا
اب اپنا ہم کو وہ آیا ہوا دل یاد آتا ہے

ہماری بیگناہی پوچھتی رہتی ہے قاتل سے
کبھی تم کو کوئی ناکام بسمل یاد آتا ہے

بُرا ہوتا ہے صدمہ ہم نشیں کے ہجر کا اے آہ!
کلیجہ کوئی مَل دیتا ہے، جب دل یاد آتا ہے

(از بغداد: مخزن، جنوری، ۱۹۰۶ء)

۱۳

قضا کیوں ہجر میں آتی نہیں، گر آنے والی ہے
کہ اب ٹوٹے ہوئے دل کی نہایت خستہ حالی ہے

اثر کیونکر رہے کچھ دیر ناصح کی نصیحت کا
مزاج اپنا ہے رندانہ، طبیعت لاابالی ہے

مری پھولوں کی محفل میں وہ اپنے دل میں ہنستے ہیں
مگر ظاہر میں صورت رونے والوں کی بنالی ہے

قلق یہ ہے کہ نازک پاؤں دُکھ جائیں نہ قاتل کے
وگرنہ فخر کی جا مجھ کو دل کی پائمالی ہے

بہار اس گلبدن کو ہر روش پہ نذر دیتی ہے
دمِ سبزِ چمن ہر شاخِ گل پہ پھولوں کی ڈالی ہے

اگر ساقی اجازت دے، تو اشکِ سرخ سے بھر دیں
بھرے بیٹھے ہیں ہم محفل میں جب سے جام خالی ہے

غضب کا ہے، قیامت کا ہے، یہ چلتا ہوا جادو
کیا دیوانہ اس کو تم نے جس پر آنکھ ڈالی ہے

اگر چاہا خدا نے، گھر کریںگے غیر کے دل میں
نئی اک راہ ہم نے اُن سے ملنے کی نکالی ہے

یہ کس نے اپنے پیارے ناخنوں سے چٹکیاں لی ہیں
کہ دل میں جو نشانِ زخم باقی ہے، ہلالی ہے

بنی ہے مدّتوں میں یوں شہیدِ ناز کی تربت
کہ ہر قاتل نے چٹکی چٹکی اس پہ خاک ڈالی ہے

جلا رکھو چراغ اے آہ! دن سے اپنے گھر میں تم
اندھیرا ہو چلا، شامِ جدائی آنے والی ہے

(مخزن، فروری ۱۹۰۶ء)

نظم

کچھ اور دیکھ لیتے

بچپن کر رہی ہے یہ مختصر کہانی
جب چل دیا لڑکپن اور آ گئی جوانی
کچھ اور ہو گیا دل، کچھ اور ہو گئے ہم
کھو کھو کے مل گئے ہم، مل مل کے کھو گئے ہم
کہتے یہ محتسب ہے، منصور دار مارا
اک بات تھی، "سکرنا یا ایہا السکارا"
سب سے جدا رہے ہم نقشہ جدا ہی دیکھا
آنکھیں جدھر اٹھائیں، عالم نیا ہی دیکھا
علم و ہنر کے ہاتھوں، ہم باکمال ٹھہرے
ہم ذی جلال ٹھہرے، ہم ذی جمال ٹھہرے
جانا تو کیا نہ جانا، سیکھا تو کیا نہ سیکھا
سب کام ہم نے سیکھے، پر دیکھنا نہ سیکھا

سرمہ بہت لگایا، چشمہ بہت چڑھایا
جو دیکھنے کا حق ہے، وہ دیکھنے میں آیا[۵]

ناکامیاب رہنا تقدیر میں لکھا تھا
کیا خاک دیکھتے ہم، جب دیکھنا نہ آیا

ہم کو ہماری فطرت جلوے دکھا رہی ہے
اِک چیز جا رہی ہے، اک چیز آ رہی ہے

بڑھنے لگی ضعیفی، ڈھلنے لگی جوانی
آنے لگا بُڑھاپا، ٹلنے لگی جوانی

ہے ہے اصولِ نیچر، آخر کو رنگ لائے
اور مضمحل قوٰی نے رہ رہ کے گُل کھلائے

اعضا میں کیا رکھا تھا، ڈھانچے میں کیا دھرا تھا
اک موت کا فرشتہ سر پر کھڑا ہوا تھا

---

۵ میرے سامنے نیرنگِ نظر کی وہ جلد ہے جو کبھی مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کے کتب خانے میں رہی ہے جس شمارے میں یہ نظم شائع ہوئی تھی، اس میں سرخ روشنائی سے یہ شعر یوں بنا دیا گیا ہے:

سرمے بہت لگائے، چشمے بہت چڑھائے
جو دیکھنے کا حق ہے، وہ دیکھنے میں آئے

یہ اصلاح مولانا آزاد کے قلم سے بھی ہو سکتی ہے اور خود آہ کے بھی، کیونکہ یہ جلد ان دونوں کے پاس رہی ہے۔

آئے خزاں کے جھونکے، جینے کے گلستاں میں
مرنے کی شکل دیکھی، آئینۂ جہاں میں
پھر خاک میں ملے ہم یاد آ گیا کندھلنا
قسمت پکار اٹھی: "اب دیکھنا سنبھلنا"

ہڈی لگی چٹخنے، چھٹنے لگے پسینے
واقع میں عمر بھر کے بدلے لیے زمیں نے

آنکھیں جو بند کر لیں، گویا کہ کچھ نہ دیکھا
پایا کہ کچھ نہ پایا، دیکھا کہ کچھ نہ دیکھا
اُف، تن بدن کی رگ رگ رہ رہ کے جل رہی ہے
اور دیکھنے کی حسرت دل میں مچل رہی ہے
سینے میں رہ گیا دل، دل میں رہی تمنّا
"کچھ اور دیکھ لیتے" یہ رہ گئی تمنّا

دنیا میں ہم نے دیکھا سب کچھ، مگر نہ دیکھا
کیا یہ بھی دیکھنا ہے، جو دیکھ کر نہ دیکھا

(خدنگِ نظر، اگست ۱۹۰۲ء)

رباعیات

یہ آپ سے کیا کہوں کہ اب کیسا ہوں
اللہ کا شکر ہے کہ میں زندہ ہوں
ہوں سُلسلِ بول و دردِ سر سے رنجور
رنجورؔ کے اصرار سے یاں آیا ہوں

بیداریِ شب سے تپ بڑھا کرتی ہے
اور فکر یہ تکلیف سوا کرتی ہے
سب کچھ مانا، مگر کہاں تک انکار
ہر چیز کی ایک حد ہوا کرتی ہے

[اردو ادب (آزاد نمبر): ۲۹۲]

فردیات

ہم نہ کہتے تھے کہ یوں نہ چکھے دو — تم اگر بات کے دھنی رہتے
زشت رُو کو حسیں سے کیا نسبت — آسماں کو زمیں سے کیا نسبت

[اردو ادب (آزاد نمبر): ۲۹۰]

ہنس ہنس کے داغہائے جگر دیکھتے بھی ہیں
اور یہ بھی کہہ رہے ہیں کہ شوقِ چمن نہیں

---

۵ مولوی محمد یوسف جعفری رنجور مراد ہیں

قطعات

•

ہر سمت سے آرہی ہے آواز
اللہ بھلا بشر بُرے ہیں
اللہ ہماری شرم رکھ لے
تیرے ہی تو ہیں اگر بُرے ہیں

•

اسراف کی دھوم ہر کہیں ہے
پابندیِ رسم دلنشیں ہے
اور اس کا نہیں خیال دل میں
اب گھر میں ہمارے کچھ نہیں ہے

•

پیری میں رو رہا ہے جوانی کو پیر مرد
یعنی وہ اگلے رنگ کے اب کھیل ہی نہیں
ایک خواب تھا زمانۂ ماضی کی چاہتیں
اگلا سا اب ملاپ نہیں، میل ہی نہیں
پہلو میں دل ہے، دل میں امنگوں کا کال ہے
کیونکر جلے چراغ کہ اب تیل ہی نہیں

•

پی کے کرنا مذمتیں مے کی
تو نے واعظ امری سنی ہی نہیں
جس میں حق الیقین کی بو ہو
ایسی تو نے کبھی کہی ہی نہیں
تیری باتوں میں خاک ہو تاثیر
ہائے کمبخت! تو نے پی ہی نہیں

رات کٹتی ہے بہر صورت فقیر و شاہ کی
اس نے ہنستے کاٹ دی اور اس نے روتے کاٹ دی
گو کہ دن کا جاگنا بھی غفلتوں کے ساتھ ہے
پر ہمیں دیکھو کہ ہم نے رات سوتے کاٹ دی

یہ تم کو کیا ہوا، اے اسیرانِ ہمصفیر!
اٹھتے نہیں ہلائے سے بھی، سو گئے ہو کیا؟
ہم تو وہی ہیں اگلے تمہارے نیاز مند
چپ چاپ کیوں ہو، ہم سے خفا ہو گئے ہو کیا؟

آرام کی چیزوں سے میسر نہیں آرام
دنیا میں ہر اک طرح سے مشکل ہے بشر کو
تھک تھک کے رہے جاتے ہیں کیوں راہِ طلب میں
کیا سر پہ کوئی لے کے چلے پائے سفر کو

شاعری اصلاً غلط گوئی نہیں
سب انھیں گندوں کے گندے ہیں خیال

جھوٹ کہنا شاعروں کا کام ہے
شاعروں سے شاعری بدنام ہے

(مخزن، اگست ۱۹۰۴ء)

قطعاتِ تاریخ

انتقالِ پُر ملال ملک الشعرا جناب منشی امیر احمد صاحب امیر مینائی لکھنوی
نور اللہ مرقدہ استادِ نواب رامپور خلد آشیاں

وفات ہیہات امیر الالقاب

۱۳۱۸ھ

بزبیں رفت کانِ علم و ادب — قرص خورشید در سیاہی شد
آہ غمگیں نوشت سالِ وفات — وائے مفتی امیر راہی شد

۱۳۱۸ھ

قدسی صفات سوئے ملکِ بقا شد

۱۳۱۸ھ

آہ، سرتاجِ بزمِ شعر و سخن! — آہ، ذی علم مفتی و منشی
مل گئیں خاک میں امیدیں سب — ہائے بیوقت تو نے رحلت کی
بلبلِ طبع بول اٹھی یہ سال — آہ، باغِ سخن میں آگ لگی

۱۹۰۰ء

صاحبِ وقار بخلد رسید

۱۳۱۸ھ

طوطیِ باغِ سخن استادِ دہر — حضرتِ مفتی امیرِ لکھنوی
فی الحقیقت علم کے بدرِ منیر — واقعی مہرِ لیاقت واقعی

رشکِ آتش، عزت افزای امیر فخرِ ناسخ، فخرِ میر و مصحفی
ان کو ہر اک نظم میں تھی دستگاہ کیا رباعی، کیا غزل، کیا مثنوی
تھے قصیدے میں ہو تو ہے بھی زیاد غیرتِ عُرفی کہوں یا انوری
کیا بجھا اُن کا چراغِ زندگی شمعِ بزمِ شاعری ہی بجھ گئی

آہ! لکھو مصرعِ سالِ وفات
ہو گیا تاراج ملکِ شاعری
۱۳۱۸ھ

ایک جاتا ہے، ایک آتا ہے ہائے، دنیا مقامِ عبرت ہے
کہیں ماتم، کہیں ہے بزمِ نشاط کہیں غم ہے، کہیں مسرت ہے
فاسمعوا کُلُّ مَنْ عَلَیْھَا فَان ایک اللہ کو قدامت ہے
آہ، منشی امیر احمد، آہ تیرا مرنا بھی اک قیامت ہے
سوز ہے دل میں، لب پہ نالہ و آہ ایسے ماتم کی کس میں طاقت ہے
پے تاریخ سنگِ تربت پر لکھ دو "از حد خدا کی رحمت ہے"
۱۳۱۸ھ

(خدنگ نظر، نومبر ۱۹۰۰ء)

باہتمامِ نظر یافت ایں چہ حسنِ قبول بلند شد ز فلک پایۂ خدنگ نظر
دعائیہ پے آغازِ سال گفتم، آہ! کہ باد بر سرِ ما، سایۂ خدنگ نظر
۱۹۰۰ء

قطعۂ تاریخ
سالِ نو خدنگِ نظر

مہِ چاردہ در بزم تاختہ | مکانم مگر آسماں ساختہ
چہ محبوب، محبوبِ محبوب[1] ہم | چہ مطلوب، مطلوبِ مطلوب ہم
بگو، چوں نباشد دلم شاد شاد | حق اُورا چہا حسنِ جاوید داد
بہر طور زحمت کشیدن چہ سود | کہ گلہا ببیں، خار چیدن چہ سود
زنام دل آویز پُرسی اگر | بلے گویمت، کو خدنگِ نظر
چہ گویم زتعریفِ اُو یللی | چہ خوانم زتوصیف او یللی
خدنگِ نظر، گلشنِ بیخزاں | کہ اشعار گلہا، نظر[2] باغباں
خدنگِ نظر اے خدنگِ نظر | دعا گوے تو آہ شام و سحر
بدل نیک دانم کہ شد سالِ نو | زمن نغمۂ شادمانی شنو
چہ از بہرِ تفصیل اجمال شد | خدنگِ نظر دیدنی سال شد
۱۹۰۲ء
دگر مصرع سال ازاں خوبتر | کہ محبوب زیبا خدنگِ نظر
۱۹۰۲ء

(خدنگِ نظر، فروری ۱۹۰۲ء)

---

[1] آصف جاہ ششم میر محبوب علی خان نظام حیدرآباد کی طرف اشارہ ہے۔
[2] مدیر خدنگِ نظر منشی نوبت رائے نظر

قطعاتِ تاریخ

جشنِ تاجپوشی اعلیٰ حضرت شاہِ انگلستان

شہنشاہِ ہندوستان خلد اللہ ملکہ،

در صنعتِ حروفِ منقوط

شہا بشو محوِ بادہ نوشی
بخیبر شاد جشنِ تاجپوشی
بعیش کوشی بعیش کاری
مبارک این تخت و تاج بادا
ز رنج رستی کہ چست و چاقی
بذوق و مستی بجام و ساقی
بلطفِ ہستی بکامگاری
مبارک این تخت و تاج بادا
بحرفِ منقوط سال گفتم
ببیں چہ دُرہائے نغز سُفتم
عجیب رسمے و ملکداری
مبارک این تخت و تاج بادا

۱۹۰۲ء

خسروا! تو با احترام بماں
بر ہمہ احترامِ تو ماند
اِسم تو وردِ ہمہ صغیر و کبیر
تا جہانست، نامِ تو ماند
آہ گفت این دعائیہ مصرع
عمر و دولت بکامِ تو ماند

۱۳۲۰ھ

در صنعتِ تخرجہ

اتفاقاً کل جو آنکھیں بند کیں
تخت پر دیکھا اسی جمجاہ کو
آہ نے اٹھ کر دعائیہ کہا
تاجپوشی راس آئے شاہ کو

۱۳۲۰ھ

علی جواد زیدی

اردو کا طویل ترین قصیدہ

قصیدے میں کم سے کم اور زیادہ سے زیادہ تعداد اشعار کتنی ہو، اس کے بارے میں فنِ شعر کے ماہرین کی رائیں مختلف ہیں۔ اگرچہ پانچ شعر تک کے کبھی مل جاتے ہیں، لیکن قصیدے میں اشعار کی کم سے کم تعداد سات بتائی گئی ہے۔ یہ بھی متفق علیہ نہیں ہے۔ کوئی کم سے کم تعداد بارہ بتاتا ہے، کوئی پندرہ، کوئی بیس، کوئی اکیس، کوئی پچیس، اور کوئی تیس۔ نواب صدرالدین محمد خاں فائز دہلوی نے اپنے دیوان کے خطبے (مقدمے) میں تعداد اشعار کے اعتبار سے قصیدے اور قطعے میں امتیاز کرنے کی کوشش کی ہے۔ لکھتے ہیں[1]:

> قصیدہ را بایدکہ مصرعِ اوّل مطلع بود، والّا قطعہ خوانند ہرچند از بیست وسی بیت بگذرد۔۔۔ چوں ابیات کم شود و از پانزدہ و شانزدہ بگذرد و بہ بیست رسد، آں را قصیدہ خوانند۔

اس سے گمان ہوتا ہے کہ متاخرین بیس سے کم اشعار والے ذو مطلع قصیدے کو بھی قصیدہ نہیں سمجھتے تھے، بلکہ اس کا شمار قطعے میں کرتے تھے۔

عام طور سے یہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ قصیدوں میں زیادہ سے زیادہ کی کوئی حد مقرر نہیں ہے۔ اس سلسلے میں بھی ۱۰۰، ۱۲۰ اور ۲۰۰ کی تعداد متعین کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ لیکن ان میں سے کوئی حد بھی قطعی نہیں ہے؛ اردو میں اس سے کہیں زیادہ اشعار کے

۱۔۔ فائز دہلوی اور دیوان فائز؛ مرتبہ سید مسعود حسن رضوی ادیب ۱۹۶۵

قصیدے لکھے گئے ہیں، مثلاً قطبی کا قصیدہ جو "تحفۃ النصائح" کا ترجمہ ہے، اس میں [illegible] شعر ہیں۔ قریب تر زمانے میں قدر بلگرامی کے قصیدے "آئینۂ محبوب" میں ۳۰۰ اشعار ہیں۔

عملی طور سے شعراء نے ان حد بندیوں کی کبھی کوئی پروا نہیں کی۔ جیسے جیسے زمانہ گزرتا گیا، مختصر قصیدے ناپید ہوتے گئے۔ جو مختلف اشعار مدحیہ مطلع کی قید کے ساتھ کم تعداد میں لکھے بھی گئے، انھیں قطعہ ہی شمار کیا گیا۔ قصائد میں عام طور سے ۱۰۰ کے قریب شعر ہوتے ہیں۔ یہاں بھی بڑی اکثریت ان قصائد کی ہے جن میں ۱۰۰ سے کم شعر ہیں۔ ۱۰۱ سے زائد اشعار والے قصائد بہت تھوڑے ہیں۔

اس پس منظر میں اردو کے طویل ترین قصیدے کی بحث غیر ضروری ہوتے ہوئے بھی دلچسپ ہے۔ یہ بحث سب سے پہلے ابو محمد سحر نے اٹھائی تھی۔ "اردو میں قصیدہ نگاری" کے پہلے ایڈیشن میں انھوں نے صلاح الدین یا احسن (شاگرد سودا) کے اس قصیدے کو اردو کا سب سے طویل قصیدہ قرار دیا تھا جو ردِ مصحفی میں لکھا گیا ہے۔[۲] اس قصیدے میں کل ملا کر ۸۳۹ مطبوعہ اور چھ محذوف اشعار ہیں۔ اس ہجویہ قصیدے کا مطلع ہے

کیا حضرتِ سودا نے کی اے مصحفی تقصیر کرتا ہے جو ہجو اس کی تو ہر شعر میں تحریر

ظاہر ہے کہ اتنے بڑے قصیدے میں تکرارِ قوافی سے گریز نہیں ہے۔ مصنف نے اس کوتاہی کا یہ عذر پیش کیا ہے:

ان قافیوں میں آٹھ سو اور کتنے ہیں اشعار کس طرح سے اس میں نہ قوافی ہوں بہ تکرار

سحر نے جس وقت پہلے ایڈیشن میں طویل ترین قصیدہ لکھنے کا شرف صلاح الدین کو بخشا تھا اس وقت ان کی نظر میں یہی ایک طویل ترین قصیدہ تھا۔ اب انھیں محمد عبدالرحمٰن شاکر بدر کا قصیدہ "اعجازِ عشق" دیکھنے کو ملا تو دوسرے ایڈیشن میں انھوں

۲۔ اس قصیدے کا حقِ تصنیف ان دو کے علاوہ بندرابن راقم کو بھی دیا گیا ہے اور یہ شبہ بھی ظاہر کیا گیا ہے کہ اسے کئی شاگردانِ سودا نے مل کر تصنیف کیا۔

نے رائے بدل دی[۳]۔ یہ قصیدہ سب سے پہلے ۱۹۰۴ء/۱۳۲۲ھ میں شائع ہوا۔ اس وقت یہ کل ۳۸۸ اشعار پر مشتمل تھا۔ اس کے بعد کئی ایڈیشنوں میں اس میں اضافے ہوتے رہے اور جب ۱۹۳۸ء/۱۳۵۷ھ میں یہ آخری بار شائع ہوا تو اس کے اشعار کی تعداد بڑھتے بڑھتے ۱۳۹۶ تک پہنچ چکی تھی۔ اسی بنا پر تحریر نے اردو کے طویل ترین قصیدے کے مصنف ہونے کا فخر شاطر کے حوالے کر دیا۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ بھی اردو کا طویل ترین قصیدہ نہیں ہے۔ ان دونوں قصائد کے برعکس کنور سین مضطر کے قصیدے "ریاض الشعرا" میں ۱۴۲۵ اشعار ہیں اور جب تک کوئی اور اس سے طویل تر قصیدہ ہمارے سامنے نہیں آجاتا، یہی اردو کا طویل ترین قصیدہ شمار کیا جائیگا۔

یہ مضطر کون تھے؟

لالہ کنور سین مضطر لکھنوی کا اصلی نام کرپا دیال تھا لیکن وہ اپنی عرفیت کنور سین ہی سے زیادہ مشہور رہیں۔ وہ قوم کے سکسینہ تھے۔ ان کے بزرگ شاہی میں ہمیشہ اچھے عہدوں پر سرفراز رہے؛ دادا دیوان چوڑامن داس دلی میں خزانہ شاہی کے دیوان اور پیشکار پنج ہزاری مغلیہ تھے۔ برہان الملک نواب سعادت خان (بانی سلطنت اودھ) کی رفاقت میں دلی سے لکھنؤ آئے اور محلہ کٹرہ رائے میں رہنے لگے۔ نواب منصور علی خان اور راجہ نول رائے کے زمانے میں نیابت اور پیشکاری کے عہدوں تک پہنچے۔ ان کے والد دیبی پرشاد یا بینی[۵] پرشاد اور ان کے چچا بھوانی پرشاد بھی دیوان تھے؛ ان کے بھائی صاحب سہائے بھی عمدہ روزگار تھے اور بھتیجے کاشی رام شاہی میں بخشی تھے۔

خود مضطر نے آصف الدولہ کے عہد میں کار لائقہ انجام دیے۔ یقیناً یہ آصف الدولہ

۳۔ اردو میں قصیدہ نگاری (طبع دوم)؛ ۱۴۲

۴۔ تذکرۂ ہندی؛ ۲۱۲

۵۔ عقد ثریا؛ حاشیہ ۵۷

کے عہدِ سلطنت کے آخری ایام کی بات ہوگی کیونکہ آصف الدولہ کی وفات کے وقت مضطر کی عمر ۲۴ برس کے لگ بھگ تھی۔ میرے خیال میں وہ پہلے پہل ۱۲۰۸ھ کے آس پاس اپنے والد کے ہمراہ محالات چاند پور وغیرہ (علاقہ چکلہ بریلی) کی فوجداری پر متعین ہوئے اور اپنے والد کے ہمراہ وہیں رہنے لگے۔ بعد کو مظفر نگر میں تحصیلدار ہوگئے شیفتہ نے لکھا ہے (۱۲۴۳ھ) کو بارہ برس سے بلند شہر میں تحصیلدار ہیں۔ تحصیل ڈبائی، بلند شہر کی تحصیلداری کا ذکر دوسرے تذکرہ نویسوں نے بھی کیا ہے[1]۔

مضطر کے بزرگ اصلاً دلی کے رہنے والے تھے۔ لیکن یہ خود لکھنؤ میں پیدا ہوئے "عقد ثریا" میں ہے کہ ۱۲۱۰ھ میں یہ ۲۵ سال کے تھے۔ اس حساب سے ان کی ولادت ۱۱۸۵ھ میں قرار پاتی ہے "تذکرۂ ہندی" کے نسخۂ رام پور میں ان کی عمر بیس سال کی بتائی گئی ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ اطلاع مصحفی نے "تذکرۂ ہندی" پر نظرِ ثانی کرتے وقت ۱۲۰۸ھ کے آس پاس فراہم کی۔

مضطر کی نشوونما اور تربیت بھی لکھنؤ ہی میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم بھی وہیں پائی گھر میں لکھنے پڑھنے کا ماحول تھا اس لیے مکتب نشینی ہی کے زمانے سے ہندی اور فارسی میں شعر کہنے لگے، لیکن کسی کو اپنا کلام دکھاتے ہوئے جھجکتے تھے؛ اپنے بزرگوں تک کو اپنی شاعری کی ہوا نہ لگنے دی تھی۔ بالآخر مصحفی کے شاگرد محمد علیؔ تنہا انھیں مصحفی کے پاس لائے اور مصحفی کا شاگرد بنا دیا۔

مصحفی نے "تذکرۂ ہندی" میں اگرچہ ان کی روانیِ طبع کا اقرار کیا ہے لیکن انھیں "طرزِ شعر" اور "محاورۂ زبان" سے بے اطلاع بتایا ہے "طرزِ شعر" کی بات تو سمجھ میں آتی ہے لیکن جس شخص کی اصل دلی کی ہو اور جس نے لکھنؤ میں تربیت پائی ہو اور جس کے گھر والے دلی کے "اہلِ قلعہ" اور نوابینِ اودھ کے مقرب اور متوسل رہے ہوں، وہ محاورۂ زبان سے بے اطلاع کیونکر ہو سکتا ہے! بہرحال مصحفی کو بھی مضطر کے جوہر قابل ہونے کا اعتراف تھا۔ انھوں نے "عقدِ ثریا" میں ان کے خیال کی رسائی "

[1] سخن شعرا ۱۰ ۔ ۲: تتمیم سخن ۱۳۰۲؛ بہارِ سخن: ۲۳۹؛ ۳: طبقات شعرائے ہند: ۲۸۵

کی تعریف کی ہے۔ نسخۂ رامپور، ۱۲۵۸ھ میں "محاورۂ زبان" سے بے اطلاعی والا ٹکڑا نہیں ہے، بظاہر نظر ثانی کے وقت مصحفی نے اسے حذف کر دیا۔

فارسی اور ہندی کی تعلیم تو پہلے ہی پا چکے تھے، بعد کو عربی اور حکمت کی طرف راغب ہوئے۔ سیاق اور انشا پردازی میں بھی دسترس رکھتے تھے۔ فارسی اور اردو دونوں میں شعر کہتے تھے۔ دہلی بھی گئے تھے، وہاں شیفتہ اور دوسرے شعرا سے وہاں ملاقات کی تھی۔

مضطر حسن ظاہری کے ساتھ "حسن سیرت" کے بھی مالک تھے۔ سولہ برس کے سن سے شراب، مسکرات اور منہیات سے توبہ کر لی اور برے کاموں سے پرہیز کرنے لگے۔ خدا ترس اور خدا پرست تھے۔ درویشوں کے اس حد تک نیازمند تھے کہ ان کے قدموں کی خاک چومتے تھے۔ علما، فضلا، شعرا اور فصحا کی خدمت کرنے میں فخر محسوس کرتے تھے اور ان کی صحبتوں کے جویا رہتے تھے۔

سال انتقال کا تعین معلوم ہو سکا۔ کریم الدین نے مضطر کا حال صیغۂ ماضی میں لکھا ہے۔ اس سے قیاس ہوتا ہے کہ ۱۲۶۴ھ / ۱۸۴۷ء سے پہلے انتقال ہو چکا تھا۔

ریاض الشعرا

مضطر کے قصیدے کا نام "فسانۂ غم" ہے جس سے ۱۲۳۶ھ برآمد ہوتے ہیں۔ یہ قصیدہ رائیہ اور موضوع کے اعتبار سے رثائی ہے۔ مضطر جب دلی گئے اور شیفتہ سے ملے، تو انھوں نے شیفتہ کو اس قصیدے کے دو تین شعر سنائے بھی تھے، اور انھوں نے اس کی تعریف بھی کی ہے۔ بظاہر شیفتہ نے یہ قصیدہ خود نہیں دیکھا تھا، بلکہ اس کے صرف یہی شعر مصنف کی زبان سے سنے تھے۔ یہ اس لیے کہ انھوں نے اسے واقعۂ کربلا سے متعلق بتایا ہے، حالانکہ یہ صرف واقعۂ کربلا تک محدود نہیں ہے۔ کریم الدین کا یہ بیان کہ مضطر کا یہ قصیدہ واقعۂ کربلا کے بارے میں ہے، شیفتہ ہی کے بیان

۶۔ گلشن بے خار: ۱۸۲-۱۸۱

سے ماخوذ ہے لیکن انھوں نے "گلشن بیخار" کا حوالہ نہیں دیا۔ ناسخ نے اس پر اتنا اضافہ کیا کہ اس میں واقعاتِ کربلا مسلسل نظم ہوئے ہیں[9] یہ بھی صرف جزوی طور پر صحیح ہے۔

اگرچہ "ریاض الشہدا" ۱۲۷۳ھ ہی میں مکمل ہو گیا تھا اور عزاداران سراپا اعتقاد کو اس کے مطالعے کا کمال ارمان تھا لیکن یہ ان کی زندگی میں شائع نہیں ہو سکا۔ مضطر کی وفات کے بعد ان کے بھتیجے بخشی کاشی رام نے اس کا چھپوانا منظور کیا۔ چنانچہ پنڈت بیج ناتھ نے اسے مطبع محرم لکھنؤ میں چھپوا کر محرم ۱۲۹۱ھ / فروری ۱۸۷۴ء میں شائع کیا بظاہر یہ ۱۲۹۰ھ ہی میں چھپ گیا تھا کیونکہ تاریخ طبع کے سلسلے میں جو قطعات درج ہیں۔ ان میں سے کچھ سے ۱۲۹۰ھ برآمد ہوتے ہیں۔

قطعاتِ تاریخ لکھنے والوں میں بعض ان کے اہل خاندان ہیں۔ خیالی رام خیالی شاگرد نواب عاشور علی خاں عاشور مضطر کے حقیقی بھتیجے اور منشی دھر کے بیٹے ہیں۔ دوسرے صاحب رجن لال نظم اپنے کو مضطر کا پوتا بتاتے ہیں۔ نظم کو اہلِ بیت اطہار سے عقیدتِ خاص ہے۔ قطعۂ تاریخ میں لکھتے ہیں:

ہے نظم کی یہ التجا، دل کو مرے دے اے خدا!	ہر دم غم آلِ عبا، جب تک ہے لیل و نہار
ماتم رہے شبیر کا، اہلِ حرم کا تذکرہ	مذکورہ وہ سجاد کا، قایم رہے اے کردگار!
یا رب رہیں خرم ہم جتنے ہیں اہلِ بندگار	لیکن بجز اس غم کے غم، کوئی نہ ہو پیدا الم

خود مضطر کو امام حسین اور کربلا سے گہری ذہنی وابستگی تھی، وہ ذاکرِ حسین بھی تھے۔ قصیدۂ "ریاض الشہدا" کے عنوان میں ان کے نام کے ساتھ "ذاکرِ حسین" کے الفاظ مکرر درج کیے گئے ہیں۔ انھوں نے یہ قصیدہ بھی ضرور عزاداروں کو پڑھ کر سنایا ہوگا، جس کے باعث خوش اعتقاد عزادارانِ حسین اس کی طباعت سے پہلے ہی اس کے مطالعے کے مشتاق تھے۔

قصیدہ اس مطلع سے شروع ہوتا ہے:

۸۔ طبقات شعرائے ہند، ۳۸۵

۹۔ سخن شعرا، ۴۲۵

اردو کا قصیدہ

طفلانِ اشکِ لالہ گوں ہیں گرمِ لعبِ آبشار   یا اک سحابِ بحرِ خوں گلشن پہ ورد شعلہ بار

شروع میں ۴۰ شعروں پر مشتمل تشبیب ہے۔ اس میں حزنیہ مضامین درج ہوئے ہیں اور آنیوالے واقعات کی طرف اشارے ہیں۔ اس کے بعد ہی قصیدہ کے اصلی مضامین شروع ہوتے ہیں۔
جن اہم ہستیوں کے واقعات شہادت، وفات وغیبت اس میں درج ہوئے ہیں وہ یہ ہیں

۱ ختم المرسلین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم
۲ حضرت فاطمۃ الزہرا صلوٰۃ اللہ علیہا
۳ حضرت علی علیہ السلام
۴ حضرت امام حسن
۵ حضرت امام حسین

واقعاتِ کربلا تفصیل سے بیان ہوئے ہیں اور اس ضمن میں حسبِ ذیل شہیدوں کا ذکر آیا ہے۔

۱ حضرت مسلم
۲ پسرانِ مسلم
۳ حضرت حُر
۴ حضرت قاسم
۵ حضرت عباس
۶ حضرت علی اکبر
۷ حضرت علی اصغر

ان کے علاوہ حضرت امام زین العابدین سے لے کر حضرت امام عسکری تک سب کی شہادتوں کا ذکر ہے۔ اور امام مہدی کی غیبت پر خاتمہ ہوتا ہے۔
اس تفصیل سے جہاں شیفتہ وغیرہ کا بیان کہ قصیدہ صرف واقعہ کربلا کے بارے میں ہے، غلط ثابت ہو جاتا ہے، وہیں منتظر کی اس کاوشِ شاعرانہ کی اہمیت بھی ظاہر ہوتی ہے کہ انھوں نے اتنی طویل تاریخ اس تسلسل کے ساتھ ایک ہی قصیدے میں نظم کر دی ہے

بحر زیادہ رواں نہیں ہے، اس پر قافیے کی پابندی اور قصیدے کا آہنگ، ان سب با کو نباہنا آسان نہیں تھا۔ چنانچہ اس میں روانی اور بے ساختگی کی کمی کا احساس ضرور ہے۔ پھر بھی یہ قصیدہ اردو قصائد میں خاص تاریخی اہمیت رکھتا ہے۔

اتنے طویل قصیدے کے اقتباسات پیش کرنا بھی طوالت سے خالی نہیں ہے۔ صرف نعت و منقبت کے چند شعر یہاں دئیے جاتے ہیں جس سے قصیدے کی عام فضا کا اندازہ ہو سکے

نعت حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

یعنی محمد مصطفےٰ، محبوب و مقبولِ خدا
ختم الرسل، خیر الوریٰ، عالی گہر، والا تبار
پیغمبرِ آخر زماں، شاہنشہِ کون و مکاں
سالارِ جیشِ مرسلاں، لمعانِ نورِ کردگار
پیغمبرِ آمیؔ لقب، والاحسب، عالی نسب
مہرِ عجم، ماہِ عرب، لامثل، فردِ روزگار
یٰسین لقب، سلطانِ دیں، منصوصِ آیاتِ مبیں
ہم رحمۃ للعالمیں، ہم شافعِ روزِ شمار
سر دفترِ ایجادِ کل، ماحیِ ہر شرع و سُبُل
ماموِرِ امرِ چارِ قُل، اصلِ فروعِ ہشت و چار

منقبت حضرت علیؓ

مولا علی نامِ خدا، ہمنامِ ذاتِ کبریا
خالق نصیری قوم کا، خلقِ خدا کا شہریار
وہ شہسوارِ لا فتیٰ، وہ مردِ میدانِ وغا
وہ صف شکن، شیرِ خدا، وہ حیدرِ ضیغم شکار

اردو کا قصیدہ

کون اُس پہ نصرت یاب ہے اشیروں کا زہرہ آب ہے
کس کی مجال و تاب ہے آنکھیں کرے جو اس سے چار

منقبت امام حسن

اوّل گلِ باغ علی، دوئم امام ابن الولی
آلِ عبا کا سوئمی اور پنجتن کا جزو چار
ریحانِ گلزارِ نبی نعمان بستان علی
لمعانِ نورِ احمدی فرمانِ فضلِ کردگار
باغِ نبوت کا سہی، خلدِ ولایت کا بہی
تاجِ سرِ فرمانِدہی چترِ سپہرِ شہر یار
نورِ جبینِ مرتضیٰ، پورِ مہینِ مرتضیٰ
مسند نشینِ مرتضیٰ، شہ کا وصیِ کامگار
وہ خضرِ اخضر پیرہن، وہ سروِ فردوسی چمن
وہ شمعِ قدسی انجمن، وہ گلبنِ طوبیٰ بہار

منقبت امام حسین

غواصِ بحرِ لوکشف، یک دانہ، درِّ نجف
شمس الضحیٰ شمس الشرف شمس الاسد شمس النہار
مذبوحِ شاہِ کربلا غفرانِ امت خونبہا
ذبح العظیم کبریا، مقبولِ عشقِ کردگار
روئے منور شمس ساں، باعزّ و جاہ و فرّ و شاں
شانِ یداللّٰہی عیاں، مانندِ شاہِ ذوالفقار

آخری جنگ کی جھلک

جس خصم سے مرکب ملا، شانِ ید اللہی میں آ
پٹکا سر زمین سے اٹھا، اٹھا نہ میدان سے غبار
گھوڑے کو چمکا کر گئے جس طرف، دشمن مرگئے
لاشوں سے ہر سو بھر گئے میدان کے آغوش و کنار
آئے جدھر بازو کشا، اک زلزلہ سا پڑ گیا
واقع ہوا یہ تہلکہ، فوجِ عدو سے ایک بار

بیانِ شہادت

وہ مہرِ برجِ حیدری، نہرِ شفق میں خون کی
چوں شمس ڈوبا جس گھڑی، اٹھا غبارِ تیرہ
لیکر سما سے تا سمک تاریک تھا روئے فلک
تھے لب گزاں جن و ملک مخسوف تھا...
وہ سیدِ گلگوں قبا، مظلومِ دشتِ کربلا
لختِ دلِ خیر النسا، مشکلکشا کی یادگار
عاشق، خدا کی ذات کا ٹکڑے رہِ حق میں ہوا
ابن جنابِ لافتیٰ، فرزند شاہِ ذوالفقار
شاہنشہِ کوثر عطا، بیکس لبِ دریا ہوا
لب تشنہ احمد آشنا، مقتول با خویش و تبار
دریائے خوں میں خشک لب، کیا کیا اٹھے سیراب سب
کیا کیا شجاعانِ عرب، اس شاہ کے غمخوار و یار

اس کے بعد اور اماموں کی شہادتوں کا ذکر کر کے یوں خاتمہ کرتے ہیں:-

اے خسروانِ خسرواں، بفرمان دہِ انس و جاں!
تم ہو کریم دو جہاں، ظلِ کریم کردگار
مضطر گدا حضرت کا ہے، بندہ درِ دولت کا ہے
دارین کی دولت کا ہے، یہ بینوا امیدوار

اور سب سے آخر میں یہ تاریخی بیت ہے۔

ہیں "غم فسانہ" سے لیے اعدادِ ختم اس نظم کے
۱۲۳۶ھ
مضطر سے تا باقی رہے یہ غم فسانہ یادگار

محمد اکبر الدین صدیقی

کتبۂ امین درگاہ، بیجاپور

امین الدین اعلیٰ کی جنھیں بعض اوقات امین الدین علی شیرِ خدا بھی کہا گیا ہے، درگاہ امین درگاہ کے نام سے بیجاپور سے ڈھائی میل کے فاصلے پر شاہ پور میں مرجعِ خلائق ہے۔ امین الدین اعلیٰ حضرت میران جی شمس العشاق کے پوتے اور حضرت برہان الدین جانم کے بیٹے تھے۔ آپ اپنے والد کی وفات کے بعد پیدا ہوئے۔ تاریخ ولادت کا کوئی مستند حوالہ نہیں ملتا، البتہ بعض شہادتوں سے یہ قیاس کی جا سکتی ہے۔

حضرت میران جی شمس العشاق نے جب شاہ پور میں حضرت شاہ کمال الدین مجرد بیابانی کے ہاتھ پر بیعت کی تو انھوں نے مرید کو متاہل زندگی اختیار کرنے کا حکم دیا، اس پر انھوں نے احمد نگر سے قریب ایک مقام بھینگار کے ایک خاندان میں شادی کی۔ ان کے دو صاحبزادوں، برہان الدین جانم اور خواجہ عطاء اللہ کا ذکر ملتا ہے۔ خواجہ عطاء اللہ کا نوجوانی میں انتقال ہو گیا۔ وہ بھی اسی ٹیلے پر جہاں حضرت امین الدین اعلیٰ کا مزار ہے، بلکہ ان سے قریب ہی ایک چوکھنڈی میں دفن ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ اس خاندان میں جو بھی غیر شادی شدہ نوجوان انتقال کرتا ہے، اسی احاطے میں دفن کیا جاتا ہے۔

حضرت میران جی جانم اور امین الدین کی مدح میں اور اس کے بعد آپ کے پوتے علی پیر کی تعلیمات پر ایک کتاب تذکرہ غوثیہ کے نام سے موسوم ہے۔ اس میں سے جانم اور اعلیٰ کے چند مدحیہ اشعار حسب ذیل ہیں

وصف حضرت شاہ برہان

رکنِ شرعِ مصطفےٰ برہانِ دین　　　　شاہ برہان اسم ذات بہترین

جانشین شاہ میراں آن ولی
در ریاضت بود یکتا منجلی

شاہ انس وجان و مولائے کرم
متقی مرتاض و ہم ثابت قدم

صاحب مشکل کشا روشن ضمیر
ہادی ہر بندگاں اسا دستگیر

فاخر لفظ رسول کبردگار
شرح وصف ذات پاکش بیشمار

وصف حضرت امین الدین اعلیٰ

صاحب سجادہ بعد شہ ببیں
بد امین الدین علی آن شمس دین

بود آنحضرت امین راز حق
ذات پاک بہترین ہمراز حق

ہادی کونین و مقبول خدا
از خدا یک دم نمی بود آں جدا

این ہمہ تدبیر و تقدیرات ہم
ہمعناں فی بود در دست کرم

سال تاریخ وصالش منجلی
گفت ہاتف از ندا: ختم ولی

امین الدین اعلیٰ کے مرید معظم و شاگرد قادر لنگا کوتال نے ایک نظم شجرۃ الاتقیا لکھی ہے، جس میں بہ بتلایا ہے کہ حضرت برہان الدین جانم پندرہ سال کی عمر میں فارغ التحصیل ہو گئے اور سیاحت کے لیے نکلے تین سال بعد واپس آئے تو اس کے بعد آپ کے والد کا وصال ہوا۔ لکھا ہے:

عمر جب ہوا پانزدہ سال کا
ہوا شوق غالب پچھے حال کا

ہوتے دست بیعت پدر سوں کتے
ہوا قطب روشن پدر سوں، کتے

اس کے بعد سفر پر جانے کا واقعہ بیان کر کے واپسی کی اطلاع ہے۔ پھر کہتا ہے:

کیے جانشین شاہ برہان کو
خلافت دیے ظل سبحان کو

اول حق کی سب آشنائی دیے
بعد از سو شاہ رحلت کیے

اس لحاظ سے والد کے انتقال کے وقت جانم کی عمر اٹھارہ اور بیس سال کے درمیان ہو گی۔ والد کے انتقال پر انھوں نے اپنے خیالات کا اظہار ایک مرثیہ میں کیا ہے جس کی ردیف ہے: "جے کچ حکم الہیٰ کا" ایک شعر میں فلسفہ کا اظہار کیا ہے کہتے ہیں:

دنیا کا تیج پدا ہے، ہور دین منج لنگر اہے ؛؛ اس دکھ کا منج عذر اہے، جے کچ حکم الہیٰ کا

ایک اور شعر میں اپنی تربیت کا ذکر کیا ہے:

دنیاں تھے منج فاضل کیا، اور دین منج حاصل کیا، — باحق منج واصل کیا، جے کچ حکم الٰہی کا

والد کی عمر اور تاریخ وفات کا ذکر ان شعروں میں ہے :

تاریخ سال نو سو دو اس پر اگلے بھی دو — دو دن مدت دنا شو، جے کچ حکم الٰہی کا

اربع تسون یہ سال ہے، ماہ کون بو شوال ہے — رحلت کیے اس حال ہے، جے کچ حکم الٰہی کا

تاریخ بست و پنج بود بسیار گریاں رنج شد — در حال واصل گنج خود ، جے کچ حکم الٰہی کا

شب پنجشنبہ روشن کیا ہجرت منور پور کیا — جیوڑا قبض کر ان لیا، جے کچ حکم الٰہی کا

برہان الدین جانم کے رسالۂ نثر کلمۃ الحقائق کی اشاعت کے موقع پر میں نے پہلے مصرع میں "نو سو دو اس پر" دو ولوین کے ساتھ اور دوسرے شعر کے پہلے مصرع میں " اربع سول " پڑھا تھا لیکن اس کی اشاعت کے بعد جب ایک اور نسخے تک رسائی ہوئی، تو مقابلہ کرنے پر شبہہ اس طرح رفع ہوا کہ پہلے مصرع میں "نو سو دو" اور دوسرے شعر کے پہلے مصرعے میں" تسون " (تسعون) تھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ آپ نے ۹۴ سال کی عمر میں ۲۵ شوال ۹۰۴ھ کو چہار شنبہ کا دن گذرنے کے بعد شب پنجشنبہ میں وصال فرمایا۔ اس طرح آپ کی ولادت کا ۸۱۰ھ قرار پاتا ہے۔ اور حضرت جانم کی عمر اس وقت اٹھارہ تا بیس سال ہو تو ان کی پیدائش کا سال ۸۸۴ تا ۸۸۶ھ ہوگا۔ انھوں نے ۹۹۰ھ میں اپنی طویل نظم ارشاد نامہ لکھی اور کلمۃ الحقائق کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ رسالہ ارشاد نامہ کے بعد لکھا گیا تھا۔ اس لیے کہ اس میں ارشاد نامہ کے اشعار موجود ہیں، اگرچہ اس کا کوئی اندازہ نہیں کیا جا سکتا کہ کتنے دن بعد۔ مولوی عبدالحق کے خیال[1] کے برعکس آپ نے ۹۹۰ھ کے بہت بعد انتقال کیا۔ کتب خانۂ آصفیہ جل بیجاپور کی ایک بیاض میں کئی بزرگوں کی وفات اور اہم واقعات کی تاریخیں درج ہیں، اس میں حضرت جانم کی تاریخ وفات "عزیزِ جانِ چشتیاں جانم" لکھی ہے، جس سے ۱۰۰۶ نکلتے ہیں۔ اگر اسے صحیح تسلیم کیا جائے، تو برہان الدین جانم کی وفات ۱۰۰۶ھ میں واقع ہوئی اور یہی سنہ حضرت امین الدین کی پیدائش کا بھی ہوگا، چونکہ آپ اپنے والد کی وفات کے بعد پیدا ہوئے تھے گویا اس وقت حضرت جانم کی عمر ایک سو بیس یا بائیس سال ہوگی۔ اس کبر سنی میں توالد و تناسل کا

۱۔ اردوے معلیٰ مولوی عبدالحق کے خطوط، بنام سخاوت مرزا۔

سوال پیدا ہوتا ہے، لیکن یہ اس وقت ہماری بحث سے خارج ہے۔ صاحب شجرۃ الاتقیا امین الدین اعلیٰ کی پیدائش کا ذکر اس طرح کرتا ہے کہ حضرت جانم نے فرمایا:

اسی روز شہ نے دیے سب خبر	صفت سب امیں کی کہے کھول کر
خدا کا کہے شیر آتا ہے یو	برابر چھپے گنج لاتا ہے یو
نزیک شہار دو ملک رہتے پلنگ	نزیک میان میں دو سلاتے فرنگ
کہے سر او پہ ہے تمہارے خدا	ہمیں اب تمہارے سوں ہوتیں جدا
مریداں تھے شاہ کے بیشمار	فقیراں تھے شاہ کے کتی ہزار
خلیفاں تھے شہ کے سب نامور	ولے ان میں سید اتھے صاحب گر
نگہ کر کے سید طرف دیکھ کر	کہے تم امیں کو سو بولو خبر
کہے ان کو سب راز بولو تمھیں	امیں پر چھپی بات کھولو تمھیں
امین علی پر یو کھولو تمام	امیں کو ہمارا اچھ بولو سلام
کلاہ اور شجرہ امیں کو دیے	اسی روز عالم سوں رحلت کیے
دنیا میں کیتک ان کر آیا امیں	برابر چھپے گنج لایا امیں

آپ کی تربیت حضرت جانم کی وصیت کے مطابق شیخ محمود خوش دہاں، سید داول اور سید عبداللہ شاہ خلفائے جانم کے ہاتھوں ہوئی، جس کا ذکر راقم نے "کشف الوجود" تصنیف سید داول کے مقدمے میں کیا ہے۔ آپ کی صغر سنی کی کرامتوں کے کتنی واقعات روضۃ الاولیائے بیجاپور، حدیقۂ رحمانی، برکات الاولیاء، تذکرۂ اولیائے دکن، تاریخ دکن (نجم الغنی رامپوری)، واقعات مملکت بیجاپور (بشیر الدین احمد)، اور بساتین السلاطین وغیرہ میں درج ہیں۔ شجرۃ الاتقیاء معظم کی روایت ہے کہ حضرت برہان الدین جانم کی زندگی میں لوگ تعظیماً ان کے سامنے جھک جایا کرتے تھے، اور سجدۂ تعظیمی کو آپ نے جائز قرار دیا تھا اس کے بعد یہ روایت امین الدین اعلیٰ کے دور میں بھی قائم رہا۔ دوسرے یہ کہ آپ ہمیشہ جذب کے عالم میں رہتے تھے۔ اس لیے ارکان شریعہ کی پابندی نہ ہو سکتی تھی، علمائے وقت آپ سے ناراض ہی نہیں رہے، بلکہ ایک عالم سید محمد بخاری نے سکندر عادل شاہ تک یہ بات پہنچا کر نماز پڑھنے پر مجبور کیا۔ یہ واقعہ تقریباً ہر تذکرے میں موجود ہے۔ قادری

مشرب کے ایک شاعر صادق نے آپ کی ہجو میں ایک طویل مثنوی لکھی جو کتب خانۂ گچی محل بیجاپور میں محفوظ ہے۔ آپ نے مریدوں کو عرفان و سلوک کی تعلیم دی، اور آپ کے خاندان میں بڑے بڑے اولیا اور بزرگانِ دین پیدا ہوئے، اور ادیب، عالم اور شاعر بھی۔ یہ کہنا غلط نہیں کہ دکن میں چشتیہ سلسلہ حضرت میران جی شمس العشاق ہی سے پھیلا چنانچہ آپ کے خلفا میں آپ کے صاحبزادے برہان الدین جانم کے علاوہ فصیح الدین بھی ہیں جن کے شاعر ہونے کا ذکر بعض تذکروں میں ملتا ہے۔ حضرت جانم کے خلفا میں سید داول، حاجی محمد اسحٰق مدراسی، خداوند شاہ، شیخ خان میاں، شیخ محمود خوش دہان، رن سنگا خاں، قاضی محمود بحری کے والد بحر الدین قاضی دریا شاعر اور صاحب تصانیف ہیں۔ اسی طرح حضرت امین الدین اعلیٰ کے خلفا میں ان کے بیٹے حضرت باباشاہ اور پوتے علی میر کے علاوہ شاہ عبد القادر معروف بہ قادر لنگا کوتال، سید شاہ محمد قادری نور دریا، معصوم شاہ، من عرف شاہ میران حسینی میران جی خدا نما (کمرخی گنبد کاروان سنہ، حیدر آباد) میران سید حسن خداوند خدا نما (چنچولی ضلع گلبرگہ) شاہ محمدی اور معظم بیجاپوری وغیرہ ہیں۔

حضرت امین الدین اعلیٰ کی ۲۴ رمضان ۱۰۸۵ھ کو وفات ہوئی، نہ کہ ۱۰۸۶ھ میں جیسا کہ مولوی عبد الحق صاحب نے اپنے مضمون مطبوعہ اردو جنوری ۱۹۲۸ء میں ذکر کیا ہے۔

آپ کے ایک مرید اور معتقد افضل خاں بلخی نے آپ کی اجازت سے ایک مکان خانقاہ کے بالمقابل ٹیلے سے کوئی تین فرلانگ کے فاصلے پر بنایا جس کے کھنڈر آج بھی باقی ہیں۔ تعمیر کے وقت اس میں صدابندی کی گئی تھی، یعنی اگر خانقاہ کے شمالی چبوترے پر باہر کھڑے ہو کر تالی بجائیں یا آواز دیں، تو اس کی گونج لوٹ کر آتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ جب آپ افضل خاں کو یاد فرمانا چاہتے تو تالی بجاتے اور وہ حاضر ہو جاتے۔ اسی افضل خاں بلخی نے آپ کا گنبد بھی بنوایا تھا۔ گنبد کی تعمیر سے قبل آپ کی نعش گنبد کے چبوترے سے قریب امانتاً دفن کی گئی تھی، چبوترہ تیار ہونے پر ۱۰۸۲ھ میں یہ چبوترے پر منتقل کر دی گئی۔ وہ مزار جہاں نعش پہلے رکھی گئی تھی، اب بھی موجود ہے۔

حضرت امین الدین اعلیٰ کے متعدد رسائل نثر و نظم ملتے ہیں۔ مثلاً (۱) آپ نے اپنے والد کی شان میں ایک قصیدہ لکھا ہے، جس کی ردیف "برہان بن میراں اُپر" ہے۔ (۲) محب نامہ بشکل قصیدہ در ردیف کون کو؛ (۳) رمز السالکین یا رموزِ السالکین (۴) رسالہ وجودیہ (۵) رسالہ قربیہ؛

(۹۹م نارینہ ہارے) ارشادنامہ نثر ان کے علاوہ غزلیں، دوہرے، ریختے (نصف مصرع فارسی نصف دکنی) بھی ملے ہیں۔

کتبہ

دکھنی زبان میں یہ سب سے پہلا طویل منظوم کتبہ ہے، جو بحر رجز مثمن سالم میں ہے۔ اس شان و شوکت کا کتبہ بہت کم عمارتوں پر ملیگا۔ کاتب نے اسے تحریر کرتے وقت اپنی خوش نویسی کا کمال دکھایا ہے۔ لکھے جانے والی ہر مصراع کو کسی ایک حرف کی کشش سے دو حصوں میں تقسیم کر دیا ہے، اور اس مصرع خوبصورتی کے ساتھ بے ترتیب اور بلا تسلسل لکھ دیا گیا ہے۔ مصرع میں جتنے الف یا لام آگے آتے ہیں، انھیں مساوی فاصلہ دے کر لکھا ہے خواہ ان کی تعداد دو ہے یا تین یا پانچ۔ دوائر کے لیے کوئی توازن قائم نہیں کیا گیا، یہ کہیں خط نسخ کے دائرے ہیں اور کہیں عربی رسم خط ان کی شکل کے۔ دو تین مصرعوں میں حروف امتداد زمانہ سے بگڑ گئے ہیں، اور ان کا پڑھنا مشکل ہے، خوبصورتی کے لیے اعراب اور جزم کے علاوہ جگہ بھرنے کے لیے چھوٹے چھوٹے الف یا جزم یا یکساں حروف دیے گئے ہیں۔ خط کی نزاکتیں (نیچے درج) پر نظر آتی ہیں۔

عربی اور فارسی کتبے تھوڑی سی محنت سے پڑھے جا سکتے ہیں، لیکن دکھنی کتبہ کا پڑھنا خصوصاً جب کہ تحریر میں تسلسل بھی باقی نہ رہا ہو، مشکل ہے۔ کاتب نے آخر میں اپنا نام حسین لکھا ہے اور کتبہ کی تیاری کا سال ۱۰۸۸ھ دیا ہے۔ یہ پندرہ اشعار کی ایک نظم ہے جسے شاعر غزل کہتا ہے۔ تحریر کے لیے یہ تین حصوں میں تقسیم کر دی گئی ہے: باب الداخلہ کے سیدھی جانب چھ اشعار لکھے گئے ہیں، دروازے کے اوپر تین، اور بائیں جانب پھر چھ۔ اشعار کے اوپر اور بازوؤں کے مربعوں کو پُر کرنے کے لیے اسمائے حسنیٰ میں سے کوئی اسم، اسمائے دوازدہ امام، حضرت خواجہ بندہ نواز، یا حضرت میران جی اور امین الدین اعلیٰ کے القاب اور ادعیہ تحریر کیے گئے ہیں۔

دروازے کی دائیں اور بائیں جانب ۲۱۰ سنٹی میٹر لمبا اور ۴۰ سنٹی میٹر چوڑا پتھر لیا گیا ہے۔ دونوں طرف کے کتبوں پر اوپر سے نیچے کی طرف تقریباً ۵ سم کی گنجایش لے کر اطراف میں حاشیہ دیا گیا ہے اور درمیان میں ایک بڑے گنبد کی تصویر بنائی ہے، جس کے نیچے کنول کی پتیاں ہیں، اس کے نیچے ایک پٹی یا حلقہ ہے۔ اس سے نیچے کنگورے ہیں، جن کے دونوں سروں پہ کنگوروں کی بلندی کے مساوی

کتبۂ امین درگاہ، بیجاپور

دو چھوٹے چھوٹے مینار ہیں جن پر متناسب گنبد بنے ہیں۔ ستون اور گنبدوں کی ابتدا میں کنول کی پتیاں بنائی ہیں۔ ان کے نیچے بھی ایک حلقہ یا پٹا بنایا گیا ہے۔ بڑے چھوٹے سب گنبدوں پر کلس ہیں اور ان پر چاند کی شکل بنائی گئی ہے۔ گنبدوں میں تحریر موجود ہے۔ اس سے نیچے تقریباً ۴ سم کا حاشیہ دے کر ۳۰ سم جگہ لی گئی ہے اور اس میں مساوی لمبائی کی تین عادل شاہی وضع کی کمانیں لگی ہیں۔ درمیانی کمان کے اوپر خالی جگہ میں آٹھ آٹھ پتیوں کے اور بازوؤں کی کمانوں پر چار چار پتیوں کے پھول ہیں اور محراب میں تحریر موجود ہے ان کمانوں کے نیچے ۱½ سم کا حاشیہ دے کر ۲۰ سم چوڑی آڑی محراب بنائی ہے جس کے دونوں پہلوؤں پر کنگورے دار کمانیں ہیں۔ کمانوں کے چاروں گوشوں میں چھوٹا سا دائرہ کھینچ کر مرکز پر ایک نقطہ دیا گیا ہے۔ اسی میں ایک مصرع لکھا ہے۔ اس سے نیچے ۱½ سم کے حاشیے سے ۲۰ سم کا فاصلہ لے کر جگہ کو تین برابر حصوں میں تین مربعے بنا کر درمیان میں دائرے کھینچے گئے ہیں اور تینوں دائروں میں تحریر ہے۔ اس کے نیچے ۱½ سم کا حاشیہ ہے اور پھر ۲۰ سم کا فاصلہ لے کر اس کو تین برابر حصوں میں تقسیم کر کے اس میں اوپر نیچے عادل شاہی وضع کی کمانیں بنا کر ان کے گوشوں میں دائرے اور درمیان میں نقطے دیے گئے ہیں۔ پھر پہلے کی طرح تین مربعے بنا کر ان میں دائرے اور دائرے میں تحریر ہے اور اس کے نیچے آڑی کنگورے دار محراب میں ایک مصرع لکھا ہے۔ پھر اوپر کا جواب تین مربعوں کی شکل میں نیچے بھی موجود ہے اور اس کے نیچے پہلے کی طرح ۵۰ سم کی لمبی تین کھڑی محرابیں ہیں اور اس کے نیچے حسب سابق تین مربع دائرہ اور تحریر پھر آڑی کنگورے دار محراب جس میں مصرع ہے اس کے نیچے پھر سابق تین مربعے مع دائرہ و تحریر ہیں۔ اس سے نیچے ۵۰ سم کی گنجائش میں کھڑی محرابوں میں تین مصرعے ہیں اور نیچے تین مربعے مع دائرہ و تحریر ہے اور پھر آخر میں آڑی کمانی دار محراب ہے۔ جو چبوترے سے قریب ہو جاتی ہے اور اسی محراب میں مصرع کی بجائے ایک جملہ تحریر ہے۔ اسی ترتیب کو دروازے کی بائیں طرف کے کتبے پر بھی قائم رکھا گیا ہے۔ دونوں کتبوں کے درمیان باب الداخلہ پر ۸۵ سم لمبا اور ۶۰ سم چوڑا پتھر لے کر اس کے تین مساوی حصے کیے گئے ہیں۔ اس میں سیدھی جانب ایک حصے میں تقریباً سابقہ ابعاد کے اندرونی دائرے کے ساتھ مربع ہیں اور درمیان میں ۵۰ سم لمبی آڑی عادل شاہی وضع کی تین محرابیں ہیں جن کے گوشوں میں دائرے ہیں اور ان میں

نقطے بنے ہیں۔ بائیں جانب اس کا جواب ہے۔ درمیانی حصہ میں یعنی دروازہ پر خوبصورت کنگوروں والی آڑی محراب بنائی گئی ہے اور اس کے گوشوں میں چار دروازے کھینچ کر ان میں عربی عبارت تحریر کی گئی ہے۔ محراب میں بھی عربی عبارت ہے۔ اس حصے میں بہت زیادہ نقاشی کی گئی ہے اور گل بوٹے بنائے گئے ہیں۔

اس طرح پورے کتبے میں:

بڑے گنبد : دو

چھوٹے گنبد : چار، اور

چھوٹی کھڑی محرابیں : چھ

آڑی اور کھڑی محرابیں تینیس جن میں سے ۱۴ میں مصرعے اور ۲ میں جملے لکھے ہیں۔ مربعے ۸ جن میں دائرے ہیں اور ان میں اسماء ادعیہ تحریر ہیں

— بڑی آڑی محراب خوبصورت کنگوروں والی ایک ہے جس میں اللہ تعالیٰ اور کلمہ لکھا ہے: یہ دروازے کے اوپر ہے۔

دائرے چار: یہ بڑی محراب کے گوشوں میں ہیں۔

گنبد اور اس کے نیچے کی کمانوں میں حسب ذیل عبارت تحریر ہے:

دونوں بڑے گنبدوں میں۔ إِنِّي أَنَا اللّٰهُ

چار چھوٹے گنبدوں میں: - یا اللہ سیدھے جانب کتبے کی کمانوں میں۔ پہلی سیدھی کمان میں: - اللہ معافی۔ درمیانی کمان میں۔ اللہ، محمد، علی، بائیں طرف کی کمان میں: - اللہ بانی۔ بائیں جانب کے کتبے کی کمانوں میں۔ سیدھے طرف کی کمان میں: - اللہ بانی۔ درمیانی کمان میں: - اللہ، محمد، علی، بائیں کمان میں۔ اللہ شافی کتبہ کی ابتدا بائیں جانب سے ہوتی ہے، سب سے نچلی سطر (۱) میں تحریر ہے:

۱۔ بنیاد عشق باز کیا جز نیاز زہد بالمقصود بنور

۲- اس کے اوپر درمیانی مربع میں 'یا حاجت روا' اور بازوؤں کے مربعوں میں 'یا امیر مدد' لکھا ہے۔ امیر سے مراد عموماً حضرت علیؓ ہیں، لیکن حضرت امین الدین اعلیٰ کے دادا کا نام بھی امیر الدین عرف میراں جی اور لقب شمس العشاق تھا۔

۳- پہلی سطر (پہلا مصرع): دل بحر میں غواص ہور ورح صدف کی کاجیں امین
دوسری سطر (دوسرا مصرع): دُرِ بے بہا تس صدف میں نور جاں توں ساجیں امین
تیسری سطر (تیسرا مصرع): گر گیان کے عرفان سوں سنبھال سیپنی چیر کر

۴- مربعوں میں۔ پہلا : یا صاحب الکرامات
دوسرا : یا امیر مدد
تیسرا : یا صاحب الکرامات

۵- آڑی محراب میں (چوتھا مصرع) : موتی مزتین ہاتھ لے عرفان انگوں پر کار امین

۶- مربعوں میں : (پہلا) : یا شمس العشاق (لقب حضرت میراں جیؒ)
(دوسرا) : یا معشوق ربانی (لقب حضرت امین الدین اعلیٰؒ)
(تیسرا) : یا ملک المہمات

۷- (پانچواں مصرع) : سو ہے منور نور توں تس حال جو نفا ہر طلوع
(چھٹا مصرع) : کر یا حضورِ حق او چت ہدیہ اپس تب توں امین
(ساتواں مصرع) : مقبولِ حق از حق ہوا نا گر چرا کس جا دھرے

۸- مربعوں میں: پہلا : یا حاجت روا
دوسرا : یا امیر مدد
تیسرا : یا حاجت روا

۹- آڑی محراب میں (آٹھواں مصرع) : راضی رضا حق جو خدا نعمان ذوق نادر حیا امین

۱۰- مربعوں میں پہلا : یا عاشقِ شہباز (لقب حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز رحہ۔
حضرت [illegible] اعلیٰ کو بھی اس لقب سے یاد کیا گیا ہے)
دوسرا : یا امیر مدد۔

تیسرا : یا بلند پرواز (لقب حضرت خواجہ بندہ نواز رحمہ، اور حضرت امین الدین اعلیٰ)

۱۱- (نواں مصرع) : اس ذوق کی تمثیل کوں کس لوک سوں کیا کر کہوں

(دسواں مصرع) : نا ہر کسے نہ ہرو ستھاں نا او کوئی سکیا امین

(گیارھواں مصرع) . حق سوں وصل بھو بھانت ہے بس بھاگنے قتل اللسان

۱۲- (مربعوں میں) پہلا : یا نور نوری

دوسرا : یا امیر مدد

تیسرا : یا سِر سِری

۱۳- (دائرہ کی محراب میں بارھواں مصرع) : نعن کعن منزہ روپ اہے بھو جک اچنبھ کن امین۔

(اوپر سے پہلا مصرع)

دوسرا کتبہ
(دروازے کے اوپر)

سیدھی طرف پہلی سطر پہلا مربع : امام علی المرتضیٰ

(تیرھواں مصرع) : ہادی ہدایت جس اہے وصل بحر امواج میں۔

دوسرا مربع : امام حسن المجتبیٰ صابر

دوسری سطر پہلا مربع : امام محمد الباقر

(چودھواں مصرع) ، ورنہ شفا اغلب ستھاں باریک رہ تاریک امین۔

دوسرا مربع : امام جعفر الصادق

تیسری سطر پہلا مربع : امام محمد التقی۔

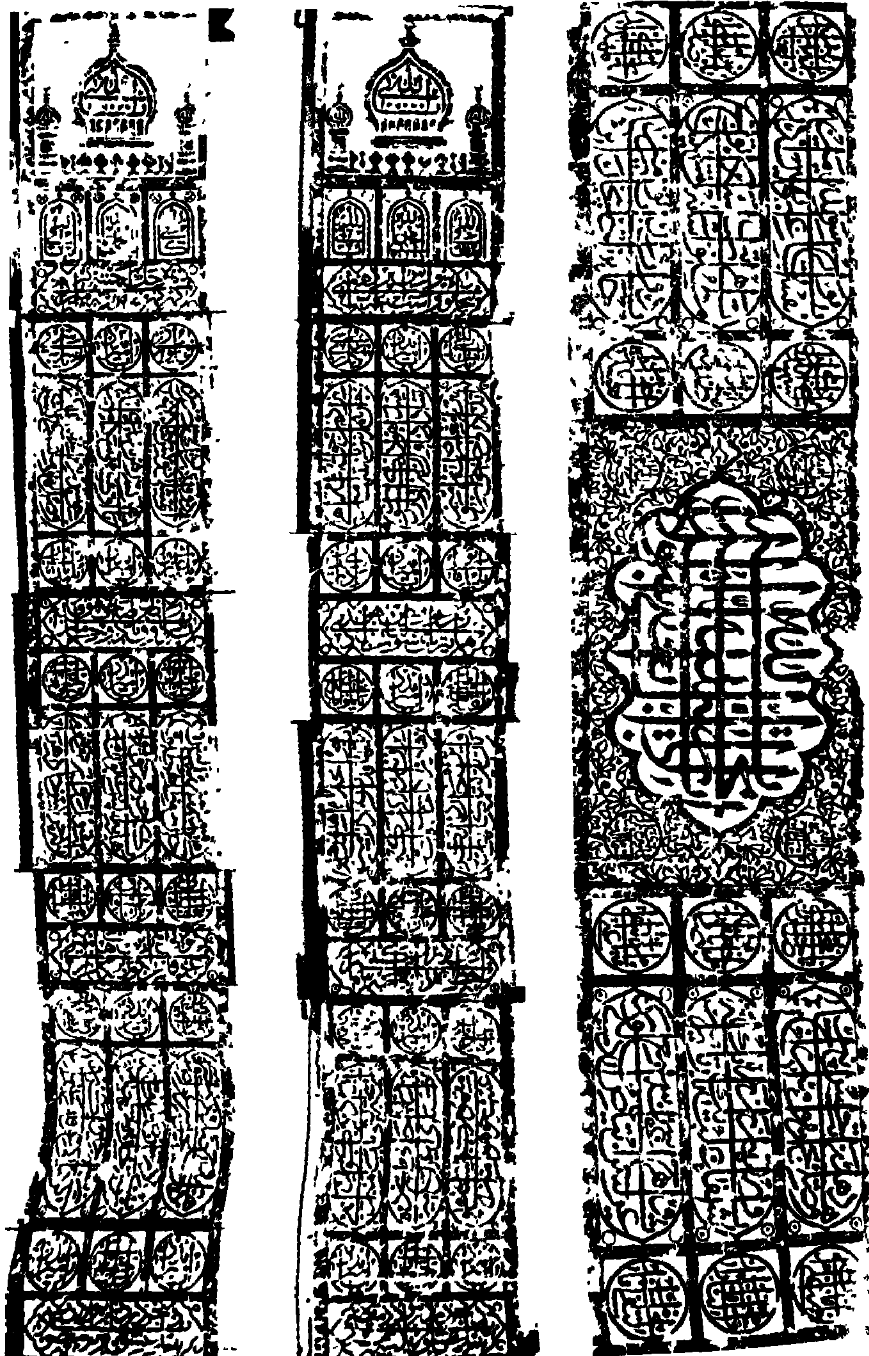
پندرھواں مصرع : لیکن عروج ہے سن ایتا غواص توں دل کی سمع۔

دوسرا مربع ، امام علی النقی

درمیان میں عبارت بشکل طغرا :

اللہ تعالیٰ۔ لا الٰہ الا اللہ۔ انا محمد رسول اللہ۔

کتبۂ امین درگاہ بیجاپور



کتبۂ امین درگاہ، بیجاپور

۱- پہلے گوشے میں، سیدھی طرف، اوپر کے دائرے میں :

قال رسول اللہ وبہ الشفاء

۲- دوسرے گوشے میں، بائیں طرف، اوپر کے دائرے میں :

رسول اللہ النبی وآلہ وصحبہ

۳- تیسرے گوشے میں، سیدھی طرف، نیچے کے دائرے میں :

لما اسری الی السماء المینا

۴- چوتھے گوشے میں، بائیں طرف، نیچے کے دائرے میں :

دل علی آخر العرش لمکتوب ؟

بائیں طرف پہلی سطر پہلا مربع : امام حسین الشہید کربلا

دسواں مصرع : امواج نفسانی سو اللہ یز تیجیو، ۱۰ ڈرامین

دوسرا مربع : امام زین العابدین

دوسری سطر پہلا مربع : امام موسیٰ کاظم

سترھواں مصرع : مطلوب ہے آسان تب اشکال نا مشکیل نوج

دوسرا مربع : امام موسیٰ الرضا

تیسری سطر پہلا مربع : امام حسن العسکری

اٹھارھواں مصرع : جا ڈوب کر او جا رتا بے چار توں کرنا مبین

دوسرا مربع : امام محمد المہدی

تیسرا کتبہ
(بائیں طرف)

۱- کمانوں سے نیچے، پہلی سطر :

کڑی محراب میں انیسواں مصرع : بے چار بو وسواس سب بڑا ہے تو اس نے

دوسری سطر پہلا مربع : بامر رب اللہ

دوسرا مربع : یا امیر مدد

تیسرا مربع : وکل شئی من ربی

۳۔ تیسری سطر۔ بیسواں مصرع : مردان حق تن نام ہے جن ہیم اس پیلیٹھا امین

اکیسواں مصرع : شاہیہ ہو تو دل انگ سوں وانادلا ورز ورتر

بائیسواں مصرع : پیر سے معلم خاص تھے امداد دے حق سو امین

۴۔ چوتھی سطر۔ پہلا مربع : یا بندہ نواز (لقب حضرت خواجہ سید محمد حسینی بندہ نواز گیسو دراز رحمہ)

دوسرا مربع : یا امیر مدد

تیسرا مربع : یا گیسو دراز

۵۔ پانچویں سطر۔ آخری خراب میں تیئیسواں مصرع : برہان کیرے فیض سوں غوثالیا اپ ڈھونڈنے

۶۔ چھٹی سطر۔ پہلا مربع : یا مفتح الغنات عنا

دوسرا مربع : یا امیر مدد

تیسرا مربع : یا حدیز المواناح

۷۔ ساتویں سطر پہلی سطر چوبیسواں مصرع : یا یا جو سقا اب تمدنجہ ملس ۔ راہو امین

دوسری سطر پچیسواں مصرع : برہان بن میراں کیرے درگاہ کی سب خاک پہ

تیسری سطر چھبیسواں مصرع : تن من جاں دے کر کھال قربان بل کیتا امین

۸۔ آٹھویں سطر۔ پہلا مربع : یا فک المہنات

دوسرا مربع : یا معشوق ربانی (لقب حضرت امین الدین اعلیٰ)

تیسرا مربع : یا شمس العشاق (لقب حضرت میراں جی جد امین الدین اعلیٰ)

۹۔ نویں سطر آخری خراب میں ستائیسواں مصرع : خط غلامی منجہ سما امیر اس دربار کا

۱۰۔ دسویں سطر۔ پہلا مربع : یا ہادی برتر

دوسرا مربع : یا امیر مدد

تیسرا مربع : یا ساقی کوثر

۱۱ - گیارھویں سطر۔ پہلی سطر۔ اٹھائیسواں مصرع : آزادگی کونین تھے میں منہ تجھے پایا امین
دوسری سطر۔ انتیسواں مصرع : ابیات خالی نہ دہ تمت کیا بہ غزل میں
تیسری سطر۔ تیسواں مصرع : مفہوم کرستار ہوا عیب جو سمجھ نا امیں

۱۲ - بارھویں سطر۔ پہلا مربع : یا امیر مدد
دوسرا مربع : یا حاجت روا
تیسرا مربع : یا امیر مدد

۱۳ - تیرھویں سطر، آخری محراب میں : بنیاد عشق ناری جز بنیاد درد با مقصود نبود

حسین سنہ ۱۰۸۸

کتبے کا مفہوم

شعر ۱۔ اے امین، صدوف کی روح کے لیے دل کی سمندر میں غوطہ زنی کیجیے تو آپ نہان کے نور کا بیش قیمت موتی حاصل کر سکینگے۔ (من عرف نفسہ فقد عرف ربہ (جس نے اپنے آپ کو پہچانا اس نے خدا کو پہچان لیا) کی طرف اشارہ ہے)

شعر ۲۔ اے امین! مرشد کا تصور کرکے سیپی جیسے کریمہ تین موتی حاصل کیجیے اور عرفان کو پیش نظر رکھیے۔

شعر ۳۔ آپ تو ایک منور نور ہیں۔ جب آپ عرفان پالیں تو اپنے آپ کو موزوں اور مناسب ہدیہ کے طور پر بارگاہِ خداوندی میں پیش کیجیے۔

شعر ۴۔ آپ خدا کی بارگاہ میں مقبول ہیں، اب اور کہاں جائینگے۔ خدا آپ سے راضی ورنہ خدا پر آپ فدا ہیں۔ اس کے سوا آپ کا کوئی دوسرا ذوق نہیں۔

شعر ۵۔ میں اس ذوق کی مثال آپ کے سامنے کس منہ سے پیش کرسکتا ہوں اور آپ کو سارا زرا کس کو تبلا سکتا ہوں، ہر شخص کی اتنی جرأت نہیں ہوتی اور نہ ہر شخص امین بن سکتا ہے۔

شعر ۶۔ خدا تک رسائی حاصل کرنے کے متعدد طریقے ہیں، لیکن ہم اس کے اظہار پر قادر نہیں۔ اس سے ہماری زبان کٹتی ہے۔ اس کی پاکیزہ اور لطیف شکل لمحہ بہ لمحہ حیرت میں ڈالنے والی ہے۔

شعر ۷۔ اس طوفانی اور متلاطم سمندر میں (وصل الٰہی) کو حاصل ہوسکتا ہے جس کو ہادی (مرشد) کی ہدایت اور رہنمائی حاصل ہو، ورنہ یہ راستہ نہایت باریک اور تاریک ہے اس لیے بد نصیبی کا امکان ہے۔

شعر ۸۔ لیکن اے عواص! تو دل کے کانوں سے سن کہ عروج جب ہی حاصل ہوتا ہے جب ہم خواہشات نفسانی کو ترک کریں! اور اے امین! سوائے خدا کے کسی سے نہ ڈریں۔

شعر ۹۔ اے امین! آپ کے لیے مطلوب یا مقصود کا پانا آسان ہے۔ اس میں آپ کے لیے کوئی دشواری نہیں۔ آپ ان اسرار و غوامض پر غور و فکر کر کے ہماری رہنمائی کیجیے۔

شعر ۱۰۔ یہ خیالات بغیر غور و فکر کے راز ہی رہینگے (ان پر پردہ پڑا رہیگا) اے امین! مردانِ حق وہی کہلاتے ہیں جن کے دل میں حق کی محبت جاگزیں ہے۔

شعر ۱۱۔ تو دل و جاں سے گواہ بن اور اپنے خاص معلم اور مرشد امین سے جو دانا اور بہت ہی دلاور ہیں، حق کو جاننے کے لیے مدد لے۔

شعر ۱۲۔ آپ نے برہان کے فیض سے اپنے آپ میں غوطہ لگا کر عرفان حاصل کیا ہے۔
(دوسرے مصرعہ کا مفہوم سمجھ میں نہیں آسکا۔ شاید غلط پڑھا گیا ہو)

شعر ۱۳۔ امین نے برہان الدین میراں کی درگاہ کی خاک پر تن من جان اور طاقت سب قربان کر دی ہے۔

شعر ۱۴۔ مجھے اس دربار سے خطِ غلامی مل گیا جس نے مجھے اسیر کر لیا ہے۔ اور اے امین! میں نے کونین سے آزادی حاصل کر کے تجھے پالیا ہے۔

شعر ۱۵۔ میں نے پندرہ اشعار میں یہ غزل ختم کی ہے۔ اے امین! آپ انھیں پڑھ کر میری عیب پوشی کیجیے اور میری برائیوں کی چھان بین نہ کیجیے۔

سیدھے اور بائیں کتبوں کا آخری جملہ:

بنیادِ عشق بازی جز نہادِ درد و بلا مقصود نبود

عشق بازی کی بنیاد سے بلاؤں اور تکالیف کی اصل کے سوا کوئی اور مقصود نہیں یعنی میدانِ عشق میں قدم رکھنے کے بعد ہم مصائب و آلام کے سوا کچھ حاصل نہیں کرتے۔

کتبۂ امین درگاہ، بیجاپور

مولوی عبدالحق نے اپنے ایک مضمون (اردو، جنوری ۱۹۲۸ء) میں اسی کتبے کے پانچ شعر درج کیے ہیں اور انھیں امین الدین اعلیٰ سے منسوب کیا ہے۔ پوری نظم کا مطالعہ کرنے کے بعد ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ ان کے کسی مرید نے لکھے ہیں۔ ابھی تک ہمیں شاعر کا نام معلوم نہیں ہو سکا، نظم میں اس کی طرف کوئی اشارہ بھی نہیں ہے۔ مولوی صاحب مرحوم کے منتخبہ اشعار حسب ذیل ہیں[1]:-

دل بحر میں غواص ہو ر دُرج صدف کے کا جیں امیں ۔۔۔ بے باہ دُر تس صدف میں تو رجال تو تجیس امیں

گر گیان کے عرفان سوں سنبھال سینے جبر کر ۔۔۔ موتی مزین ہاتے لے عرفان انگوں پر کار امیں

اس ذوق کی تمثیل کوں کس سوں کیا کر کہوں ۔۔۔ نا ہر کسی زہراتہاں نا آ ورکہ سکتا امیں

نے پا ریو سو اس سب پردار ہے تیج ادریں ۔۔۔ مردان حق تن نام ہے جن میم او س میں ٹھا امیں

تمت کیا یک غزل میں ابیات خامی پنج دہ ۔۔۔ مفہوم کر سنتا رہو، نا عیب جب ہونا امیں

یہ متن کے شعر (۱)، (۲)، (۵)، (۱۰) اور (۱۵) ہیں۔ کہیں کہیں ہم نے انھیں مختلف طور پر پڑھا ہے۔

---

[1] "اردوئے قدیم"۔ (انجمن ترقی اردو)۔ ص ۵۵۔

سید امیر حسن عابدی

عہدِ ہمایوں و اکبر کی دو اُردو غزلیں

اردو کا سب سے پہلا شاعر کون تھا، اس سے متعلق بہت کچھ چھان بین ہوئی ہے لیکن آئے دن کوئی نہ کوئی نیا نام سامنے آجاتا ہے جس سے یہ روایت اور پیچھے لے جانے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔

ابھی حال میں مجھے عہدِ ہمایوں و اکبر کے ایک شاعر سقا کی دو غزلیں ملی ہیں جنہیں ہم ابتدائی اردو میں شمار کرسکتے ہیں اور جن سے شمالی ہند میں اردو کی روایت بہت قدیم سے قائم ہوجاتی ہے۔

درویش بہرام بخاری متخلص بہ سقا قوم کے چغتائی ترک تھے۔ ان کا پیر سید علی ہمدانی (ف: ۷۸۶ھ/۱۳۸۴ء) کے مرید حاجی محمد خبوشانی کے سلسلے سے تعلق تھا۔ بعض تذکرہ نویسوں نے انہیں ماوراءالنہری بھی لکھا ہے۔ ان کی زندگی کا بیشتر حصہ سیر و سیاحت میں گذرا مگر خود انہیں بخارا سے بہتر کوئی جگہ نظر نہ آئی:

بسے گشتم در اقصائے جہاں از شہر و شہرستان
خراسان و عراق و مصر و روم و شام و ہندستان
ز مشرق تا بمغرب از برائے فیضِ ربانی
جہاں را سربسر گشتم ز مغرب تا ترکستان

ندیدم چوں بخارا کشورے پُر فیض در عالم
ز بستاں شد غلامس از جنت و جوے منش گرفتار!

ان کے ایک شعر سے ان کے لاہجان کے سفر کا پتا چلتا ہے۔ ۹۴۵ھ/۱۵۳۸ء میں وہ حج کے لیے گئے، تو تاریخ کہی:

از طرفِ اولیائے بخارا علی الدوام	اے دل! ز سید فیض بسے یافتم گدا
زانجا بطوفِ کعبہ رواں گشتم از نیاز	تا در حریمِ فخرِ رُسُل سازم التجا
آمد ندا ز غیب بتاریخِ ایں سفر	سقا بگو ہمیشہ کہ "یا فخرِ انبیا!"
	۹۴۵ھ

ان کا آخری سفر ہندوستان کی طرف ہوا، جس کے بعد انھیں وطن واپس جانا نصیب نہ ہوا۔ ان کی زندگی کا کافی حصہ شمالی ہند میں گذرا۔ اور وہ بھی زیادہ تر دلی اور آگرے میں۔ حضرت قطب الدین بختیار کاکی رح کا کس عقیدت سے ذکر کیا ہے:

بخت یاری کرد اے سقا کہ در دہلی ترا
خسروی دادند ملکِ نظم را دادی نظام
خواجہ قطب الدین سپہرِ قطب الاقطاب کہست
خادمانِ بارگاہش فیض بخشِ خاص و عام

صحیح پتا نہیں چلتا کہ وہ یہاں کب پہنچے۔ بعض تذکرہ نویسوں کا خیال ہے کہ وہ عہدِ ہمایوں میں آئے۔ بہرحال ابتدائے عہدِ اکبری میں ان کی آگرے میں موجودگی یقینی ہے۔ اکبر ان کی بہت عزت کرتا اور ان سے مہربانی سے پیش آتا تھا۔ سقا نے بار بار اکبر کی تعریف کی ہے۔

ندہد دلبش را بادشہ بارے	در ایامِ جنوں افتاد کارے
عجب فرخندہ شاہے سرفرازے	ہمایوں طلعتے مسکیں نوازے
شہنشاہے کہ بود نعمہ از عام	جلال الدین محمد اکبرش نام

۱۔ یورپ میں دیوان کے جو دو خطی نسخے ہیں، ان میں آخری دو شعروں کے مصرع ہائے ثانی آپس میں بدلے ہوئے ہیں۔

مرا در آستانِ او گذر بود	برحمت سُوئے من اورا نظر بود
بہ تختِ آگرہ منزل بود او را	مراد از بختِ حاصل بود او را
برائے پائے تختِ بادشاہے	بنامِ دہلی آمد دیں پناہے

ان کے اکبر کی توصیف میں اور شعر بھی ملتے ہیں۔

سقّا نے اپنے شعروں میں شیخ حسین، فخرالنبی اور حضرت سعدؔ کا بھی ذکر کیا ہے، جن سے انہیں عقیدت تھی یا جن سے شاید ان کے تعلقات رہے ہوں ــــ اس کے ایک شعر سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ طریقۂ نقشبندیہ میں مرید تھے۔ شعر ہے:

زشاہِ نقشبند است ایں ہمہ آثارِ کیفیت
کہ باشد طالباں را حالتے از جامِ سرمستاں

سقا کوئی پیشہ ور بہشتی نہیں، بلکہ صاحبِ علم سالک، مجذوب اور روشن دل انسان تھے۔[۲] یہاں کے قیام کے دوران میں شاید ان کے کوئی مرشد زادے ہندستان آئے تو انھوں نے اپنی تمام پونجی ان کے حوالے کر دی اور خود فقیرانہ لباس پہن، مشک کاندھے پر رکھ، اپنے شاگردوں کے ساتھ آگرے کی گلیوں میں لوگوں کو پانی پلانے لگے۔ اسی عالمِ جذب و سلوک میں سقایت کرتے اور اشعار بھی پڑھتے تھے۔ اس عالم میں بعض اوقات ایسے اشعار بھی ان کی زبان سے نکل جاتے جن پر ظاہر پرست کفر کا فتوٰی لگا سکتے ہیں، مثلاً،

درمطبخِ گدائیِ ما اشترے خلیل
خادم محمد آمد و موسٰی شبانِ ما

لیکن انھیں صحابۂ کرام اور اولادِ پیغمبر صلعم، خاص کر حضرت علی، امام حسین اور امام رضا سے بڑی عقیدت تھی۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

دورۂ فقر و فنا جز آل و اصحابِ رسول	التجا گر بردہ سقا: بکس ایوا ے تو!
خوش آں دمے کہ زشوقِ ایں کرہ سلمانی	زبعدِ طوفِ نجف پُر کنم ز آبِ فرات
با بلا خو کردہ سقا گر کشندش باک نیست	زندۂ جاوید گشتہ چوں شہیدِ کربلا

۲۔ روزِ روشن: ۲۴۵

علمدارم، سیہ پوشم، بگردوں شد مرا مسکن
گرفتہ خاص از بہرِ شہیدِ کربلا ماتم
منت ایزد را، اگر سقا صفت گشتم گدا
ہر چہ می جستم من، از شاہِ خراساں یافتم
مرد ہچوں گدایاں در بدر سقائی در وزی
بہر جائے کہ در مانی طلب شاہِ خراساں را

یوں معلوم ہوتا ہے کہ بالآخر سقا اکبر سے اجازت لے کر بنگال کے راستے سراندیپ (یعنی لنکا) کے لیے روانہ ہوئے ؛ ۳

رواں باش، از سوادِ ہند بگذر
سیہ بختاں بزنداں در نماند

از رہِ بنگالہ چوں عزمِ سراندیپت شد راست
از جفائے کوہ از غولِ بیاباں غم مخور

مگر دورانِ سفر بردوان میں انتقال ہو گیا، اور وہیں مدفون ہوئے۔ قبر ریلوے اسٹیشن سے ملی ہوئی ہے۔ یزار وَ یتبرکُ۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ انہوں نے لنکا پہنچ کر انتقال کیا ؛ یہ غالباً صحیح نہیں ہے۔

ان کی تجہیز و تکفین سے متعلق ایک کرامت نما قصہ بیان کیا گیا ہے۔ مؤلف ذخیرۃ الآثر لکھتے ہیں کہ ایک شخص نے جو مرنے کے وقت سقا کے پاس تھا بیان کیا کہ ایک شخص جنازے کے پاس آ کر کہنے لگا ؛ تین دن ہوئے میں نے حضرت رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا، فرما رہے تھے کہ فلاں جگہ میرا ایک دوست دنیا سے جا رہا ہے، تم جا کر اس کی نماز جنازہ پڑھو۔ اس کے بعد اس نے نماز پڑھی اور چلا گیا ——
مؤلفِ مخزن الغرائب کے قول کے مطابق اس شخص کے آنے کی وجہ یہ تھی کہ اس جگہ کوئی ایسا آدمی نہ تھا جو ان کے غسل و کفن کا انتظام کر سکتا۔ اس لیے پیغمبر علیہ السلام کے حکم سے وہ شخص آیا اور ان کی تجہیز و تکفین کر کے چلا گیا۔

۳ ، ڈاکٹر غفور رسالہ پارس (ص : ۳۱) میں لکھتے ہیں کہ سقا کے آگرے سے جانے کی وجہ یہ تھی کہ لوگوں نے ان پر رافضی ہونے کا الزام لگایا تھا، اس سے بددل ہو کر وہ آگرے سے چلے گئے۔ ڈاکٹر غفور نے کوئی سند پیش نہیں کی ؛ میری نظر سے بھی کسی تذکرے میں یہ بات نہیں گذری۔

خود بردوان میں ان کی قبر دیکھی - ایک قول کے مطابق ان کی قبر اچھی حالت میں موجود ہے۔[1]
سقا کے سالِ وفات میں اختلاف ہے۔ ڈاکٹر اشپرنگر اور ایتھ نے مندرجۂ ذیل قطعے کی بنا پر جو دیوانِ سقا کے بانکی پور والے ایک نسخے میں موجود ہے، سالِ وفات ۹۶۲ھ/۱۵۵۴ء متعین کیا ہے:

بادرد و محنت و غم آں یادگار خوباں
رفت از جہانِ فانی امروز سوے عقبیٰ
چوں دید، ایں گلستاں بُوے وفا ندارد
آں سروِ قدِ موزوں، فردوس کرد ماوا
آں گل چو زیں چمن رفت پرسیدمش ز تاریخ
گریاں بگفت: سقا ایں باغ ماند بے ما

مگر مؤلف فہرست بانکی پور کو اس سے کئی سبب سے اختلاف ہے - ان کی یہ رائے غالباً درست ہے کہ یہ قطعہ خود سقا نے اپنے کسی عزیز یا دوست کی وفات پر کہا تھا۔ کیونکہ بدایونی نے سقا کو عہدِ اکبری کے شعرا میں شمار کیا ہے، جو ۹۶۲ھ میں ان کی وفات ہو جانے کی صورت میں درست نہیں ہو سکتا۔ نہ صرف یہ، اس کے علاوہ بانکی پور والے نسخہ ہی میں سقا کی ایک مثنوی ہے جو ۹۶۶ھ/۱۵۵۸ - ۱۵۵۹ء میں تصنیف ہوئی تھی۔ اس کا مادہ تاریخ کا شعر ہے:

نہ صد و شصت و شش بماہِ عشور
آمد از غیب نظم ما بظہور

سب سے اہم یہ کہ بردوان میں خود سقا کی قبر پر ایک کتبہ لگا ہوا ہے جس میں حسبِ ذیل دو قطعے ہیں۔ ایک سے سالِ وفات ۹۷۰ھ نکلتا ہے؛ دوسرے میں صاف صاف دیا ہے کہ سقا کا انتقال ۹۷۰ھ میں ہوا۔

1- Objects of Antiquarian Interest in Bengal. ص ۲۸۱

پورا کتبہ یہ ہے:

یا اللہ۔ یا فتاح۔ یا اللہ۔ یا فتاح۔ یا اللہ
لا الہٰ الا اللہ محمد رسول اللہ۔ حقا

زہے درویش عالم گشتہ بہرام
کہ در عرفاں دلِ او بود دریا
زعالم رفت در راہِ سراندیپ
شد از ملکِ فنا بہرام دانا
حسابِ سالِ فوتِ آں یگانہ
زحق کردیم چو نحتی تمنا
ندا آمد کہ تاریخ وفاتش
بود، "درویش ما بہرام سقا"
(۹۷۰)

بہرام کہ بود شہرہ در سقائی
بود عالمِ علم دینی و دنیائی
در نہصد و ہفتاد برفت از عالم
زد خیمہ بر درِ یکتائی

بے حلیہ و زرق
ناخواندہ سبق
در کشورِ ہند
شد واصلِ حق

یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ یہ دوسرا قطعہ بانکی پور کے دیوانِ سقا کے ایک نسخے میں بھی موجود ہے۔[5]

ان کے ایک شعر سے پتا چلتا ہے کہ انہوں نے نوے سال سے زیادہ کی عمر پائی:

عمرِ تو بگذشت از نود، بگذر زخصلتہائے بد
درپوش چوں سقا نمد، ابدال شو، ابدال شو!

۵۔ نمبر ۲۱۴۲ (ص ۱۹۸ ب)، خدا بخش لائبریری، پٹنہ

اس سے ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ سقا کی ولادت ۸۸۰ھ/۱۴۷۵ء سے پہلے ہوئی ہوگی۔ ہمیں سقا کی نجی اور گھریلو زندگی سے متعلق کوئی تفصیل نہیں ملتی لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کا ایک بچہ جس کا نام غالباً یوسف تھا، کم سنی ہی میں انتقال کر گیا تھا[۱] اور اس موقع پر انہوں نے یہ قطعۂ تاریخ کہا تھا:

نشستہ بود بہ بازیچہ لعبتم امروز　　بیکدم از نظرم بُرد چرخِ شعبدہ باز
شکستہ تازہ نہالم ز تندِ بادِ اجل　　ہزار حیف ازاں عندلیبِ گلشنِ راز
ربود گرگِ اجل یوسفِ شریف مرا　　بصد امید کہ پروردمش بنعمت [و] ناز
چو بود بندۂ مقبولِ حق قبول افتاد　　بلے بخدمتِ محمود لایق است ایاز
منال بہرِ جگر گوشۂ خود اے سقا!　　بداغِ ہجر اگر سوختی، بسوز و بساز
بنالہ بلبلِ طبعم شد از پےِ تاریخ　　خیال ماتمش آورد شاخ بنیاز (؟)

سقا غالباً بھنگ پینے کا عادی تھا، یہ دو شعر دیکھیے:

می گذشتم دوش از دار السلامِ بنگیاں　　خضر را دیدم دراں مسجد امامِ بنگیاں
داد تا آں سبز خط ساقی مرا یک بیضہ بنگ　　شد لبالب از مےِ اسرار جامِ بنگیاں

ممکن ہے کہ وہ کسی ہندو زادے پر عاشق بھی ہو:

بہ ہندو زادہ شد مرغِ دلم رام　　کہ بے رویش نمیگیرد دل آرام
مثلِ بتِ ہندوے سقا کجاست　　در دکن و آگرہ و گجرات

شعرا میں وہ حافظ کے شیدائی اور عطار، مولانا روم، غیاث حلوائی، سعدی، خواجو کرمانی اور قاسم انوار کے معترف نظر آتے ہیں:

منم دیوانہ و شیدائے حافظ　　دریں عالم شدم رسوائے حافظ
مولوی گفت خدائے من شمس الحق من　　ہم دلیلست بدیں منطقِ عطارِ شما
غیاث و سعدی و خواجو بمدحِ روئے تو اند　　یکے لطیف، دوم کامل و سیم دلجوے
خطت و سنبل گیسو کہ شاعراں گفتند　　یکے غیاث و دوم سعدی و سیم خواجو
بخدا گفت کہ من در دلِ انساں دیدم　　مہرِ خورشیدِ ازل قاسمِ انوارِ شما

سقانے اپنا دیوان اپنی زندگی میں مرتب کر لیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ جذب کے عالم میں ان نے اسے پانی کی نذر کر دیا تھا۔ بعض تذکرہ نویسوں نے تو یہ بھی لکھا ہے کہ انھوں نے کئی مرتبہ ایسا کیا۔ بہر حال دیوان کے قلمی نسخے مختلف کتابخانوں میں ملتے ہیں، جو کمیت کے لحاظ سے ایک دوسرے سے مختلف بھی ہیں۔

بانکی پور کے ایک قلمی نسخہ مکتوبہ ۱۰۷۲ھ (نمبر ۲۲۱) میں غزلیں، مسدس، مخمس، قطعے فردیات، رباعیاں، ترجیع بند، قصیدے اور مثنویاں ہیں۔ اس نسخے میں ایک عربی غزل بھی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ شاید عربی میں بھی شعر کہتے تھے۔ اسی کتابخانے میں دو اور نسخے ہیں (نمبر ۲۲۲ اور ۲۷۳۸)؛ یہ نسبتہً مختصر اور انتخاب ہیں۔ ایشیاٹک سوسائٹی، کلکتہ میں بھی ایک نسخہ ہے (نمبر ۶۶۹) اس میں بھی غزلیں، ترجیع بند، قطعے رباعیاں، فردیات، ساقی نامہ، ایک مثنوی، مسدس، مغنی نامہ، متفرق نظمیں وغیرہ ہیں۔ اسی کتابخانے کا دوسرا نسخہ (نمبر ۶۷۰) آخر سے ناقص ہے۔ بھنڈارکر اورینٹل انسٹیٹوٹ، پونا کے نسخہ (نمبر ۵۹) میں جو ردیف 'ی' کے آخر سے ناقص ہے، صرف غزلیں ہیں۔

تمام دیوانوں میں پہلے حمد و نعت میں یہ دو غزلیں ہیں جو الفبا کی ترتیب میں شامل نہیں ہیں:

باز سر کردہ براہ طلبش حیرانم   کہ من خستہ کجا و ہوس عمانم
تو روح روانی و آرام جانی   رسول بحق رہبر عارفانی

اس کے بعد تمام نسخوں میں غزلیں الفبا کی ترتیب سے ہیں۔ نیز زیادہ تر نسخوں میں بھی الفبا کی ترتیب اس غزل سے شروع ہوتی ہے:

در آئینۂ روے تو دیدیم ہویدا   سرّے کہ نہاں بود تقدس و تعالیٰ

مگر بعض نسخے ان غزلوں سے بھی شروع ہوتے ہیں:۔

الا یا ایہا الساقی، بدہ آں بادۂ حمرا
بیاد رُدے آں لیلی بجنونانِ بے پردا

عہد ہمایوں و اکبر دو اردو غزلیں

صبح فرخ دم رسید، از عالم غیبم ندا
رفع ظلمت شد از ان انوار شمس والضحیٰ

سقا پختہ اور قادر الکلام شاعر تھے۔ ان کے یہاں جذب، رندی، سلوک اور تصوف کا غلبہ ہے اور انھوں نے شاعری کو زیادہ تر اپنے حالات و کیفیات کے بیان کرنے کا آلہ بنایا تھا۔ بہر حال ان کے دیوان میں بکثرت ایسے سلیس اور رواں اشعار ملتے ہیں جن میں تصوف کی لذت کے ساتھ ساتھ شعریت کا بھی امتزاج ہے۔ کچھ ایسے اشعار نقل کیے جاتے ہیں:

حالاتِ صوفیاں وہیا ہوے طالباں — در بزمِ وجد ہر کہ بود مست جام ماست

ہمہ سرگشتۂ دیدار او بیند — اگر زاہد، وگر رندِ خرابات

سقا قدحی درکش و مستانہ برقص آی — تا چند دریں صومعہ ہشیار تواں بود

کفر زلفش دلیلِ ایماں شد — کہ بر بندند کافراں زنار

رخش دجام مے پیداست امروز — لبے در میکدہ غوغاست امروز

از کون و مکاں مقصدِ من اوست چو سقا — بیزارم از ان عقبیٰ و زیں دار فنا ہم

دلِ دیوانہ را سرگشتہ در کوے تو می بینم — بہر مو بستہ زنجیر گیسوے تو می بینم

ہر دو عزیزاں نقدِ جاں بر کف نسودائے رخت
از خانہ یوسف لقا یک رہ سوے بازار شعر

تا خراماں گشتہ با گلرخاں سرو قد — درمیانِ عاشقاں صد فتنہ برپا کردۂ

پیر شد دل زغم عشق جواں بایستے
ناتواں شد بہ ہنوز تاب و تواں بایستے
حیف، از اں خاک کفِ پائے کہ باشد ریزیں
جائے او دیدۂ صاحب نظراں بایستے
می بری سجدہ بمحراب خدا اے زاہد!
سجدہ بر ابروے خوبانِ جہاں بایستے

خلق رفتند پئے زاہد و گمراہ شدند

ہمہ را راہنما پیرِ مغاں بایستے

کبھی کبھی وہ تصوف سے ہٹ کر عشقِ مجازی سے لبریز شوخ غزلیں بھی کہتے ہیں، جو ان کے عہدِ جوانی کی یادگار ہوں۔ مثلاً کہتے ہیں :

اے مستِ حسن شب بکنارِ کہ بودۂ — در بزمِ عیش ہمدم و یارِ کہ بودۂ

اے سیمبر گداختۂ از حنا بسے — در کوئے عشق زار و نزارِ کہ بودۂ

لعلِ لب ترا کہ بدنداں گزیدہ است — چوں سیبِ سرخ بر سر بارِ کہ بودۂ

سقا نے بعض عجیب و غریب زمینوں میں غزلیں کہی ہیں۔ مثلاً یہ مطلعے دیکھیے :

میرود دمبدم آں مہ مہ من دل دل

کہ از دبر دل و جاں جاں شدہ مشکل کل کل

ذکرِ کبوتراں او نعرہ بقو بقو بقو

خیز دلا، تو ہم بگو بقرہ بقو بقو بقو

تن تن نمی شناسی منکر شدی بتن تن

اے زاہدِ فروتن، رندیم و تن تنن تن

فارسی کے علاوہ سقا کو ترکی میں بھی کمال تھا، بعض تذکرہ نویسوں نے انھیں ترکی میں بھی صاحبِ دیوان شاعر بتلایا ہے۔ مؤلف نفائس المآثر نے لکھا ہے کہ انھوں نے دیوانِ نسیمی کا ترکی میں جواب دیا تھا۔ ہنوز ان کے ترکی دیوان کا کوئی سراغ نہیں ملا۔ ممکن ہے کہ اسے خود انھوں نے کبھی جذب کے عالم میں دریا برد کر دیا ہو۔ لیکن ترکی شاعر انھیں بغیر کسی تکلف کے تسلیم کیا جا سکتا ہے، کیونکہ بھنڈارکر انسٹیٹوٹ والے نسخے کی ردیف 'ن' میں ان کی ایک ترکی غزل ملتی ہے۔

فارسی اور ترکی میں ملکہ تو سقا اپنے وطن سے لے کر چلے ہوں گے، مگر ہمارے لیے ان کا

خاص کارنامہ یہ ہے کہ اس ملک میں آنے کے بعد انہیں ہندی سے بھی خاصی واقفیت حاصل ہو گئی تھی، یہاں تک کہ انہوں نے یہاں کی زبان میں شعر کہنے کی ہمت کی جہاں انہوں نے اس عہد کے اور غیر ہندی شعرا کی طرح اپنے فارسی کلام میں بعض ہندی الفاظ کا استعمال کیا، مثلاً :

اے خواجہ گر زرِ تو گذشت از لک (و) کرور
زاں زر چہ سود گر نبری جبہ بگور

مسخرہ باش از رہِ عرفاں مکن   صدر نشینی د بہا بھاتہ (؟)

وہیں کم از کم دو ایسی غزلیں ان کے کلام میں ملتی ہیں جنھیں ہمیں ریختہ یا اردو کا نام دینا پڑے گا۔ بھنڈارکر انسٹی ٹیوٹ والے نسخے میں ردیف 'ی' میں مندرجہ ذیل دو غزلیں ملتی ہیں :

۱

رہ بسوے دَیر بردم بھل پڑے[۶]   دُرد دُرد بادہ خوردم بھل پڑے
در طریقِ زہد خونِ دل مخور   مے بجش با یار ہمدم بھل پڑے
جامِ مے بستاں و بنشیں شادکام   بر درِ میخانہ بیغم بھل پڑے
از سفالِ دُرد نوشاں جرعۂ   بہ ز جامِ تست اے جم بھل پڑے
ترکِ ہستی کن، درآ در کوے فقر   بگذر از وسواسِ عالم بھل پڑے
ہست در معنی گداے کوے یار   از شہِ دوراں مقدم بھل پڑے
عاقبت سرمے ردد در راہِ عشق   گر نمی آری تو با کم بھل پڑے
جو بیارے ہر طرف بر روے من   شد رواں از چشمِ پُرنم بھل پڑے
ہمرہاں رفتند، اے سقا بدہ   یکدمے آبے بما ہم بھل پڑے

۶ - اصل نسخے میں ردیف "بول پری" ہے، میں اسے "بھل پڑے" (بھول پڑے) پڑھتا ہوں۔

عہد ہمایون و اکبر کی دو اردو غزلیں

۲

باز ہندو بچۂ قصدِ دلم دھرتی ہے	کچھ نہیں جانوں، از ین خستہ کیا کرتی ہے
چیں برابر وزدہ برلبستہ کٹاری بمیاں	چل چل اے دل منگر تجھ کنے اوہ لڑتی ہے
چشمِ اوطرفہ غزالیست کہ در باغِ جمال	ہمہ ریحان و گل و سنبل تر چرتی ہے
ہاتھ مہندی لائیا، دست فرد برد بخوں	کہ بسے کشتہ زدستانِ غمش مرتی ہے
بت مہ سروِ سہی شرم ندارد زقدش	خویشتن را بچہ رو ایں ہمہ ردپڑتی ہے
آنکہ مردم کش او دمبدم از خونِ جگر	قدحِ چشم مرا از غم خود بھرتی[۱۲] ہے
چپ کرائے دل شد و ستاز غم یار منال	گر جفا رفت بجاں تو مبا[۱۳] کرتی[۱۴] ہے

• ڈاکٹر نذیر احمد نے " فکر و نظر[۱۵]" علی گڑھ میں " سلاطین مغلیہ کا نیا کلام " کے تحت کتابخانہ حبیب گنج کی ایک بیاض[۱۶] کا تفصیلی تعارف کرایا ہے، جو ان کی تحقیق کے مطابق ۹۲۳ھ اور ۹۸۰ھ کے درمیان مرتب ہوئی تھی ۔ اپنے مضمون کے اختتام پر لکھتے ہیں: " ایک قابلِ توجہ امر جس کا ذکر ضروری ہے، یہ ہے کہ اس میں دو غزلوں کی ردیف اور قافیہ اردو ہے جس کو مرتبِ بیاض غزلِ ملمع کہتا ہے ۔ سات شعر کی پہلی غزل مؤید بیگ کور کی ہے ۔ اس کا مطلع ہے،

ہرگہ آں ساقیِ ہندی کہ طرب کرتی ہے
کاسۂ مے زشرابِ لبِ خود بھرتی ہے

شہدی بخاری نے اسی زمین اور قافیہ ردیف میں اس کا جواب دیا، اس میں صرف چار شعر ہیں، اس کا مطلع یہ ہے :

ہندوے چشم تو گفتم کہ بمن لرتی ہے ۔۔۔ رفت در خندہ و گفتا کہ " مغل درتی ہے؟"

---

۷ ۔ اصل " درتا " ۸ ۔ اصل " کتاری " ۹ ۔ اصل " تو ج کنے اوہ "
۱۰ ۔ اصل " غنش " ۱۱ ۔ اصل " قدحی " ۱۲ ۔ اصل " برتے " ۱۳ ۔ مباح ۔
۱۴ ۔ خطی نسخوں میں یائے معروف ہر جگہ مجہول کی شکل میں ملتی ہے، ہم نے ہر جگہ درست کر دی ہے۔
۱۵ ۔ جنوری ۱۹۶۳ء ۔ ۱۶ ۔ نمبر ۵۰/۹۲

گمانِ غالب ہے کہ یہ تینوں شاعر ہمعصر تھے اور تینوں نے ایک دوسرے کا جواب کہا ہے۔ تینوں غزلیں بیحد ایک دوسرے سے ملتی ہیں۔ اب یہ فیصلہ تو ممکن نہیں کہ تینوں میں سب سے پہلے کس نے غزل کہی تھی اور بعد کو کس نے؛ بہر حال موید اور شہدی کی نسبت سقا کی غزل میں ہندی کا اثر زیادہ ہے۔ ان کی غزلوں میں ردیف و قافیہ کے علاوہ ایک آدھ اور ہندی لفظ کا استعمال ہوا ہے، لیکن سقا کے یہاں ردیف و قافیہ کے علاوہ اسماء، ضمائر اور مختلف قسم کے افعال (ماضی، امر، مضارع) بھی استعمال ہوئے ہیں۔
سقا کی غزلوں میں بعض جگہ "واو" ضمہ کی نمایندگی کرتا ہے۔ مثلاً کوج = کچ (کچھ) توج = تج (تجھ)۔ اسی طرح سقا کی پہلی غزل میں "بول" "کو بھل" پڑھینگے۔ "نہی نہی" "کو" "نہیں" اور "چپ کر" بمعنی "چپ رہ" ہے۔ "کیا" اگرچہ سوالیہ ہے لیکن فعل کی طرح باظہار تحتانی پڑھا جائیگا۔ موید اور شہدی کی غزلوں میں بھی یہ لفظ اسی شکل میں استعمال ہوا ہے۔ علاوہ بریں ہائے مخلوط اور رائے ہندی (ڑ) املا میں دکھائی نہیں گئی ہے۔ "گنے" آج بھی مغربی بولی میں بولا جاتا ہے۔
یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ بہت دن کی بات ہے، پروفیسر محمود شیرانی مرحوم نے ایک مضمون "بعض جدید دریافت شدہ ریختے"[17] کے عنوان سے لکھا تھا جس میں سقا کی دوسری غزل ان کے دیوان کے حوالے سے نقل کی تھی، مگر پہلی غزل انھوں نے نہیں دی تھی۔ ہوسکتا ہے کہ ان کے نسخۂ دیوان میں یہ غزل نہ ہو یا ممکن ہے ان کی نظر اس پر نہ پڑ سکی۔ بانکی پور کے تین نسخہ ہائے دیوان میں سے صرف دو میں دوسری غزل ہے، مگر پہلی غزل صرف ایک نسخے میں پائی جاتی ہے۔
شیرانی صاحب نے اس مضمون میں شیخ بہاء الدین باجن (وفات ۹۱۲ھ / ۷-۱۵۰۶ء) میاں مصطفےٰ گجراتی (وفات ۹۸۴ھ / ۷۷-۱۵۷۶ء) اور عشقی خان میر بخش (وفات ۹۹۰ھ / ۱۵۸۲ء) کے متعدد ریختے نقل کیے ہیں۔ یہ تینوں حضرات تقریباً سقا کے معاصر تھے۔

---

۱۷ - اورینٹل کالج میگزین (لاہور) مئی ۱۹۳۹ء

اسی مضمون میں شیرانی مرحوم نے جمیل تعارکی بیاض کا جو ۱۰۶۲ھ / ۵۲-۱۶۵۱ء سے ۱۰۶۷ھ / ۵۷-۱۶۵۶ء تک کے درمیانی زمانے میں مرتب ہوئی تھی، اور جس کا قلمی نسخہ خود ان کے کتابخانے میں تھا، خاص طور پر تعارف کرایا ہے۔ انھوں نے اس مضمون میں بہت سے ریختے اس بیاض سے دیے ہیں، جو سقا کے زمانے یا اس کے کچھ بعد کے کہے ہوئے ہیں۔ ان میں خاص طور پر بیرم خاں خانخاناں، شیخ جمالی کنبوہ، فیضی (؟)، جامی (؟)، سیدن کے ریختے بہت اہم ہیں۔

اس بیاض میں سب سے دلچسپ وہ ریختہ ہے جو عام سے حضرت امیر خسرو سے منسوب ہے۔ مگر جمیل تعار کے ہاں اسے کسی جعفر نامی شاعر کا کلام کہا گیا ہے۔ مطلع اور مقطع درج ذیل ہے،

زحالِ مسکیں مکن تغافل دُرائے نیناں بنائے بتیاں
چو تابِ ہجراں ندارم اے جاں! نلیہ وگاہے لگائے چھتیاں
بمہرآں شوخ چرخ با مہر برد مارا شکیب جعفر
سپیت من منہ درائے راکھوں جو توہ پاتوں پران کتیاں

یہاں یہ بتانا [illegible] نہیں ہوگا کہ انجمن ترقی اردو علی گڑھ کے کتابخانے میں ایک بیاض ہے جو غالباً تیرھویں صدی ہجری (انیسویں صدی عیسوی) کے آخر میں مرتب ہوئی تھی؛ اس میں بھی [illegible] صاحب بیاض اس غزل سے متعلق لکھتے ہیں کہ "یہ غزل اکثر قوال لوگ گاتے ہیں اور تذکروں میں یہ امیر خسرو کے نام سے درج ہے۔ ایک پرانی کتاب جو کہ عالمگیر کے زمانے کی لکھی ہوئی ہے، اس میں جعفر کے نام سے اسے لکھا دیکھا، نہایت تعجب ہوا۔"[18]

کتابیات

۱ - دیوانِ سقا نسخہ ہائے خطی، شمارہ ۵۹، (بھنڈارکر اورینٹل انسٹی ٹیوٹ، پونا)، ۲۴۱، ۲۴۲، ۳۷۳۸ (خدابخش لائبریری، پٹنہ)

۲ - ملا عبدالقادر بدایونی، منتخب التواریخ (ج سوم) کالج پریس، کلکتہ، ۱۸۶۹ء

۱۸ - نمبر ۱۲

۳ - ابوالفضل علامی : آئین اکبری، بیپٹسٹ مشن پریس، کلکتہ ۱۸۷۲ء
۴ - میر علاءالدولہ قزوینی : نفائس المآثر، (خطی، ۲۳۸۸) رضا لائبریری، رامپور
۵ - تقی الدین اوحدی : عرفات عاشقین، (خطی، ۸۵ ب) خدا بخش لائبریری پٹنہ
۶ - علی قلی خان والہ داغستانی : ریاض الشعرا، (خطی، ۴۲۷ ۵ نیشنل میوزیم، نئی دہلی
۷ - احمد علی ہاشمی سندیلوی : مخزن الغرائب، (خطی، ۲۷۱۷) رضا لائبریری، رامپور
۸ - علی ابراہیم خان : صحف ابراہیم، (خطی، ۷۰۹) خدا بخش لائبریری، پٹنہ
۹ - محمد مظفر حسین صبا : روز روشن، مطبع شاہجہانی بھوپال، ۱۲۹۷ھ
۱۰ - نور الحسن خان : نگارستان سخن، مطبع شاہجہانی بھوپال ۱۲۹۳ھ
۱۱ - محمد عبدالغنی خاں فرخ آبادی، تذکرۃ الشعرا، مطبع انسٹی ٹیوٹ گزٹ، علی گڑھ
۱۲ - مجلہ "فکر و نظر" جنوری ۱۹۶۳ء
۱۳ - درگا داس : سفینۂ عشرت (خطی، ۶۹۹) خدا بخش لائبریری پٹنہ
۱۴ - اورینٹل کالج میگزین، مئی ۱۹۳۹ء
۱۵ - پارس (نشریۂ انجمن روابط فرہنگی پاکستان و ایران، کراچی) اکتوبر ۱۹۶۷ء
۱۶ - بیاض نمبر ۱۲ (خطی) کتب خانہ انجمن ترقی اردو علی گڑھ
۱۷ - بیسٹن : فہرست مخطوطات بوڈلین، آکسفورڈ (۱۹۵۴ء)
۱۸ - عبدالمقتدر : فہرست مخطوطات اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ (جلد دوم ۱۹۱۰ء)
۱۹ - و۔ ایوانوف : فہرست مخطوطات ایشیاٹک سوسائٹی بنگال، کلکتہ (۱۹۲۴ء)
۲۰ - اشپرنگر : فہرست کتب خانۂ شاہانِ اودھ، کلکتہ (۱۸۵۴ء)
۲۱ - ہرمن ایتھے : فہرست مخطوطات انڈیا آفس لائبریری، آکسفورڈ

بیرم خان خانخاناں

ریختہ

دلا ! کن یاد آں ساعت دردِن گور جب سوہ[1]
عذابِ سخت تر باشد کہ لوہو آنسواں روہ[2]
نہ آنجا خویش[3] نے قربت، نہ ساتھی باپ اور بھائی
نہ زن فرزند کو بیلی[4]، دراں تاریک تنہائی
بیاید جانستاں ناگہ چو ملک الموت دربارت
جو ہیگا جیو کر سنچا کنند دریک زماں غارت
تہی رفتند آں مردم جنھوں کے لاکھ تھے پالے
نہ با خود بُرد یک جیتل[5] کہ ریتے[6] ہاتھ اٹھ چالے[7]
دراں درگاہ بے رشوت نہ جانوں کیوں لہے پردا
نلیا[8] آج جن سنبھل، گھنے[9] پچھتاہنگے[10] فردا
ہمیں دنیا کہ محبوب است، گھنے ہم سار کے کھالے
ندانستم کہ تا آخر ہی بھر خجل مکھ کالے (کذا)
گماں دارم دریں دنیا دو گز گھرباس اور ماٹی
پیارا دور کر جنہیں چو لقماں باندھ رہ ٹاٹی
(کہ) بیرم نقد جو ہونے (تو) صرفِ راہِ او کیجے
ارے جو چھاڈ کر جاناں ہر این کھاسے لے لیجے

---

۱. سووے ۲. روئے ۳. کوئی ۴. بمعنی دوست
۵. اس زمانے کا کم قیمت سکہ ۶. ؟ (محل خالی کا ہے) ۷. چلے
۸. نہ لیا ۹. بمعنی بہت، بیحد ۱۰. پچھتائینگے

سید اوصاف علی

شاہ عبدالعزیز دہلوی رح

(بعض غلط فہمیوں کا ازالہ)

جس وقت حضرت شاہ عبدالعزیز رح (۱۸۲۴ - ۱۷۴۶ء) نے آنکھیں کھولیں، نادر شاہ کی دس سال قبل کی خون ریزی اور غارت گری کے قصے عام تھے۔ جب شاہ عبدالعزیز رح سنِ بلوغ کو پہنچے تو احمد شاہ ابدالی کے سفاک سپاہیوں کے ہاتھوں دلی دوبارہ لٹی۔ اور جب انھوں نے ۱۷۶۳ء میں اپنے والدِ ماجد حضرت شاہ ولی اللہ رح کے انتقال کے بعد مدرسۂ رحیمیہ[1] میں ان کی جگہ قرآن اور حدیث پڑھانا شروع کیا، تو جاٹ، سکھ اور مرہٹے دلی پر یلغار کرنے کے لیے پر تول رہے تھے۔ مسلمانوں میں احساسِ شکست، جو اورنگ زیب کی وفات (۱۷۰۷ء) کے بعد سے بڑھنے لگا تھا، اب نقطۂ عروج تک پہنچ چکا تھا۔ اقتدار اور خزانے چونکہ زیادہ تر مسلمانوں کے پاس تھے، اس لیے حملہ آوروں کے مقابلے میں وہی پیش پیش رہے اور سب سے زیادہ زخم خوردہ بھی۔ اب ان کی ذہنی شکست اور زبون حالی بیان سے باہر تھی۔ تعلیمی معیار پست ہو چکا تھا؛ اخلاقی قدریں گر گئی تھیں؛ خانہ جنگی شروع ہو گئی تھی؛ شیعہ سنّی اختلافات کے شعلے لپکنے لگے تھے؛ فقہ کے چاروں مذاہب

۱۔ اس مدرسے کے بانی شاہ عبدالعزیز رح کے دادا شاہ عبدالرحیم رح تھے۔ یہ مدرسہ پہلے مہندیوں میں تھا جہاں اب شاہ عبدالعزیز رح کا مزار ہے۔ جب محمد شاہ بادشاہ نے مدرسہ کی بڑھتی ہوئی شہرت دیکھ کر ایک عمارت کشمیری دروازے پر دے دی تو مدرسہ وہاں منتقل ہو گیا۔ مدرسے کی پہلی عمارت ۱۸۵۷ء میں غارت ہو گئی۔

پر د آپس میں جنگ کرنے کے لیے تیار تھے۔ مسلمانوں کا یہ حالِ زار دیکھ کر شاہ عبدالعزیز نے یہ فیصلہ کیا کہ اپنے والد مرحوم کی طرح وہ بھی اپنی زندگی ان کے تعمیری اور اصلاحی کاموں کے لیے وقف کریں گے۔ چونکہ شاہ عبدالعزیز کی کوششیں تمام تر مسلمانوں ہی میں خود اعتمادی اور بیداری کی نئی لہر پیدا کرنے کی طرف رہیں۔ اس لیے ان سے متعلق طرح طرح کی غلط فہمیاں پیدا ہو گئیں۔ انہیں میں سے بعض کے ازالے کی ہم یہاں کوشش کریں گے

افسوس ہے کہ آج تک شاہ صاحب کی سی عظیم شخصیت کے حالات و خدمات پر مشتمل کوئی جامع کتاب نہیں لکھی گئی، ورنہ بعید نہیں تھا کہ ان کے خیالات و نظریات پر پوری طرح روشنی پڑنے سے ساری غلط فہمیاں خود بخود دور ہو جاتیں۔ شاہ صاحب سے متعلق سب سے مستند کتاب شیخ رحیم بخش دہلوی[2] کی ہے۔ لیکن اس کا بھی یہ حال ہے کہ بقول مولانا نسیم احمد فریدی امروہوی[3]:-

"اس میں سوانح کا حق ادا نہیں کیا گیا، حالانکہ سوانح نگار کے پاس پورے پورے حالات بہم پہنچانے کے اس وقت کافی ذرائع موجود تھے۔"

شاہ عبدالعزیز کے ملفوظات بھی ہم تک کچھ زیادہ نہیں پہنچے۔ ان کا ایک مجموعہ بڑی کاوش کے بعد قاضی بشیر الدین میرٹھی کو میرٹھ سے ملا تھا، جو انھوں نے مطبع مجتبائی میرٹھ سے ۱۳۱۴ھ میں شائع کیا تھا۔ خطی نسخہ کرم خوردہ تھا اور اس کے جامع تک کا نام نہیں معلوم ہو سکا۔ یہ ملفوظات شاہ صاحب کی وفات سے چھ برس پہلے کے ہیں، اور تین چار ماہ کے اندر قلمبند ہوئے۔ یقیناً شاہ صاحب کے کچھ اور مریدوں اور شاگردوں نے بھی ملفوظات جمع کیے ہوں گے، لیکن غالباً وہ اب تلف ہو چکے ہیں۔ اگر آج وہ ہمارے سامنے ہوتے تو ہمیں شاہ صاحب کے افکار کے سمجھنے میں کتنی آسانی ہوتی!

شاہ عبدالعزیز کی تصنیفات بھی تعداد میں کچھ زیادہ نہیں۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ ان کے شاگردوں اور مریدوں کا حلقہ بہت وسیع تھا اور ان کا بیشتر وقت انھیں کی

۲۔ حیات عزیزی۔ دہلی ۱۳۱۹ھ۔

۳۔ "شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی"، ماہنامہ الفرقان (مئی ۱۹۶۷ء)، ۱۷

اصلاح و تربیت میں صرف ہوتا تھا۔ دوسری وجہ یہ بھی تھی کہ ۲۵ برس کی عمر سے وہ مختلف امراض کا شکار ہو گئے، جس سے ان کی بینائی کمزور ہو گئی تھی۔[۴] بہرحال ان کی دو ایک کتابیں جو دستیاب ہوتی ہیں، ان سے اور ان کے فتاویٰ اور مجموعۂ ملفوظات کا غائر مطالعہ کرنے سے ان کے خیالات سمجھنے میں کافی مدد ملتی ہے۔

شاہ عبدالعزیزؒ سے متعلق تین غلط فہمیاں عام ہیں۔ اول یہ کہ شاہ صاحب شیعوں کے خلاف تھے؛ دوم یہ کہ انہیں ہندو مذہب اور اس کے ماننے والوں سے نفرت تھی؛ سوم یہ کہ وہ انگریزی تعلیم اور جدید علوم و فنون کی تحصیل کے حق میں نہیں تھے۔

پہلی غلط فہمی کا سبب شاہ عبدالعزیزؒ کی کتاب "تحفۂ اثنا عشریہ" ہے۔ اس میں شاہ صاحبؒ نے تاریخ کی روشنی میں شیعی عقائد کا ابطال اپنے عالمانہ رنگ میں کیا ہے۔ اس کتاب کو دیکھ کر شیعی حضرات اس غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے کہ شاہ صاحب کو شیعوں سے نفرت تھی، اسی سبب انھوں نے اس میں شیعی مذہب کے خلاف مواد جمع کیا ہے۔ اور سُنّی حضرات کو اس سے یہ غلط فہمی ہوئی کہ شاہ صاحب نے اسے اس لیے تصنیف کیا کہ شیعوں سے مناظرے میں وہ اس سے استفادہ کر سکیں۔ یہ غلط فہمی اتنی عام ہوئی کہ سر سید احمد خاں تک اس کا شکار ہو گئے؛ شاہ عبدالعزیزؒ کے ذکر میں لکھتے ہیں:[۵]

> "حضرت نے بہ سبب التماس طالبینِ کمال کے کتاب تحفۂ اثنا عشریہ کہ غایتِ شہرت سے محتاجِ بیان نہیں، بادلِ توجہ قلیل بصرفِ اوقات دیر سے بایں کثرتِ ضخامت تصنیف کی کہ طالب العلم بیمایہ بھی علمائے شیعہ کے ساتھ مباحثہ و مناظرہ میں کافی ہو گیا۔

حالانکہ شاہ عبدالعزیزؒ جیسے سنجیدہ اور دور رس نگاہ رکھنے والے بزرگ سے نہ اس کی توقع کی جا سکتی ہے کہ جب ملت کا شیرازہ بکھر رہا ہو، وہ کوئی ایسی کتاب لکھتے جس سے شیعہ سنّی اختلافات میں اضافہ ہوتا، نہ اس کی کہ وہ اپنے والد کی راہ سے انحراف کرتے۔

۴۔ عبدالحی بن فخر الدین الحسنی، نزہۃ الخواطر، ۷، ۲۷ (حیدرآباد، ۱۹۵۹ء)

۵۔ سید احمد خاں، آثار الصنادید: ۵۱۹ (دہلی، ۱۹۶۵)

مولانا سید محمد میاں نے شاہ عبدالعزیز رح کی تربیت کے جو نو مقاصد بتائے ہیں ان میں پہلا مقصد یہ ہے[6]؛ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رح کے نظریات کو ذہن نشین کرانا۔ شاہ ولی اللہ کا شیعہ سنی اختلافات کے بارے میں جو نظریہ تھا وہ سب کو معلوم ہے۔ ڈاکٹر تارا چند کے الفاظ میں[7]؛

> ۱۸ ویں صدی میں خانہ جنگی کی بڑی وجہ تورانی نسل کے امراء اور ایرانی نسل کے شیعیوں کے درمیان کشمکش تھی۔ شاہ ولی اللہ رح نے اپنے رسالے ازالۃ الخفاء میں خلفائے راشدین کے سوانحی حالات، ان کے کارناموں اور فضائل کو اس انداز سے بیان کیا کہ دونوں فرقوں میں اتحاد پیدا ہو جائے۔

شاہ ولی اللہ رح سے متعلق ایک قصہ خود شاہ عبدالعزیز رح نے نقل کیا ہے[9]؛

> شخصے از والد ماجد مسئلۂ تکفیر شیعی پرسید۔ آں حضرت اختلاف حنفیہ کہ دریں باب است بیان کردند۔ چوں مکرر پرسید، ہماں شنید۔ شنیدم کہ می گفت شیعہ است۔

شاہ عبدالعزیز رح نے اپنے والد کی پیروی کی اور بالکل ازالۃ الخفاء کے طرز کا ایک رسالہ عزیز الاقتباس فی فضائل اخیار الناس کے نام سے لکھا جس میں خلفائے راشدین کے طرز عمل پر محققانہ انداز میں روشنی ڈالی۔ اس کے باوجود کہ نجف خاں اور دوسرے شیعہ اصحاب اقتدار نے شاہ عبدالعزیز کو ایذا پہنچانے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی تھی[9]۔ شاہ رح نے شیعی فرقے کو کبھی مخالفانہ نظر سے نہیں دیکھا، بلکہ وہ ہمیشہ اسے اہل سنت والجماعت کے قریب لانے کی کوشش کرتے رہے۔ یہ ان کے والد ہی کی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ ۶۱ میں پانی پت کی جنگ میں شیعی اور سنی شانہ بشانہ مرہٹوں سے لڑے اور انہیں شکست

۶۔ مولانا سید محمد میاں، علمائے ہند کا شاندار ماضی، ۲: ۴۴۳ (دہلی، ۱۹۵۷ء)

۷۔ تارا چند، ہسٹری آف دی فریڈم موومنٹ ان انڈیا (انگریزی)، ۱: ۲۰۷ (دہلی: ۱۹۶۱ء)

۸۔ محمد اکرام، رود کوثر، ۳۷۷ (تاج آفس، کراچی)

۹۔ علمائے ہند کا شاندار ماضی، ۲: ۵۰-۵۲

جس سے ان کا خواب پریشان ہوگیا، کہ وہ شیعی سنّی تفرقے سے فائدہ اٹھا کر مسلمانوں پر فتح حاصل کر لینگے ۔ والد کی وفات کے بعد شاہ عبدالعزیز رح نے بھی حتی المقدور اس کی سعی کی کہ شیعی سنّی اختلاف ختم ہوجائے ۔ 'تحفۂ اثنا عشریہ' لکھنے سے بھی یہی مقصود تھا۔ وہ شیعی فرقے پر یہ واضح کر دینا چاہتے تھے کہ سنیّوں سے ان کے اختلافات اصولی نہیں، فروعی ہیں ؛ اور فروعی مسائل پر لڑنا بےمعنی ہے ۔ اس کتاب میں شاہ صاحب رح نے شیعی علماء کی کتابوں سے بکثرت حوالے دیے ہیں، تاکہ ان کے خیالات معلوم کرنے کے بعد شیعی حضرات کو اپنی غلطیوں کا احساس ہو، اور وہ دیکھ لیں کہ تمام اختلافات بے بنیاد ہیں ۔ تحفۂ اثنا عشریہ کے مقدمے میں تحریر فرماتے ہیں:[10]

"غرض از تسوید این رسالہ و تحریر این مقالہ آنست کہ درین بلاد کہ ما ساکنیم و درین زمان کہ ما درایم، رواجِ مذہب اثنا عشریہ و شیوعِ آں بحدے اتفاق افتادہ کہ کم خانہ باشد کہ یک دو کس ازیں خانہ بایں مذہب متمذہب نباشند، و راغب بایں عقیدہ نشوند، لیکن اکثرے از حلیۂ تاریخ و اخبار خود عاطل و از احوالِ اصولِ اسلافِ خود بیخبر و غافل می باشند و ہر گاہ کہ در محافل و مجالس با اہلِ سنت و جماعت گفتگو می نمایند کج مج می گویند و شتر گربہ می آرند حسبۃً للّٰہ تعالیٰ تحریر این رسالہ کہ پرداختہ شد۔"

تحفۂ اثنا عشریہ کی تاریخ نکالنے والے نے بھی مندرجۂ ذیل شعر میں اسے 'منبعِ نورِ ہدایت' قرار دیا ہے:

بسکہ نورِ ہدایت است یقیں   سالِ تصنیفِ او 'چراغ' آمد[11]

شاہ عبدالعزیز رح نے ایک بار فخریہ فرمایا کہ ایک شخص نے اس کتاب کے متعلق کہا ہے کہ اگر اس کے وزن کے برابر سونے کی قیمت پر اسے فروخت کیا جائے تو بھی بیچنے والا گھاٹے میں رہیگا ۔ یاد رہے کہ یہاں شاہ صاحب نے فخر اپنے کمالِ علم پر نہیں کیا جو

۱۰- تحفۂ اثنا عشریہ، ص ۳، (لکھنؤ، ۱۲۹۵ھ)

۱۱- نیز ملاحظہ ہو: ھذا الکتاب لو بیع ذھبًا بوزنہ لکان البائع المغبون (ملفوظات ص ۱۴۴)

تحفۂ اثناعشریہ کے صفحے صفحے سے جھلکتا ہے، بلکہ اس پر کہ انھوں نے اسے لکھ کر د خدمت انجام دی ہے جو ملت کی تاریخ میں ہمیشہ یاد رہیگی۔ یعنی شیعیوں پر ان کے عقائد واضح کر کے انہیں اہلِ سنّت کے قریب لا کھڑا کیا ہے۔ افسوس کہ شاہ صاحب کی یہ آرزو پوری نہ ہوئی اور تحفۂ اثناعشریہ کو عالمانہ اور تحقیقی کتاب کے بجائے فرقہ وارانہ کتاب قرار دے دیا گیا۔

شاہ صاحب سے متعلق دوسری غلط فہمی یہ ہے کہ وہ ہندو مذہب کو کفر سمجھتے تھے۔ یہ بات ان کے دشمنوں نے ان کی زندگی ہی میں پھیلا رکھی تھی، اور یہ غلط فہمی بعض حلقوں میں اب تک چلی آرہی ہے۔ ہندو مذہب سے متعلق شاہ صاحب نے بالتفصیل کچھ نہیں کہا، یا کم از کم ہمیں اس کا علم نہیں۔ البتہ ایک بار ایک شخص کے سوال پر کہ کرشن جی کے بارے میں ان کی کیا رائے ہے، شاہ صاحب نے فرمایا:[12]

"بہتر تو یہی ہے کہ ان کے حق میں چپ رہا جائے، لیکن بھگوت گیتا سے جو ہندوؤں کی معتبر کتاب ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اولیاء میں سے تھے۔"

اس جواب سے ظاہر ہے کہ شاہ صاحب نے بھگوت گیتا کا اچھی طرح مطالعہ کیا تھا اور اسے دیکھ کر کرشن جی کے متعلق ان کے ذہن میں جو نقش ابھرا تھا، اس کی تصدیق ہندو مذہب کی دوسری کتابوں سے نہیں ہوسکی۔ بہرحال ان کے مجوزہ فوق الفاظ سے بڑھ کر ان کی حق گوئی اور کشادہ دلی کی دلیل اور کیا ہو سکتی ہے! اس ضمن میں یہ بات بھی قابلِ لحاظ ہے کہ انھوں نے سکھوں، جاٹوں اور مرہٹوں کے (جو دہلی پر برابر یورش کرتے رہے) قبضے میں جو علاقے تھے ان کو کبھی دار الحرب قرار نہیں دیا، لیکن جب دلی سے کلکتے تک برطانوی اقتدار کا پرچم لہرانے لگا تو مندرجۂ ذیل فتوٰی جاری کیا، حالانکہ نصاریٰ کو اسلام نے اہلِ کتاب قرار دیا ہے:[13]

۱۲۔ رودِ کوثر: ۳۹۱

۱۳۔ فتاوٰی عزیزی: ۱۷ (دہلی: ۱۳۱۱ھ)

"دریں شہر حکم امام المسلمین اصلاً جاری نیست و حکم رؤسائے نصاریٰ بے دغدغہ جاری است و مراد از اجرائے احکام کفر اینست کہ در مقدمۂ ملک داری و بندوبست رعایا و اخذ خراج و باج و عشور اموالِ تجارت و سیاستِ قطاع الطریق و سراق و فیصلِ خصومات و سزائے جنایاتِ کفار بطورِ حاکم باشند۔ آرے اگر بعضے احکام اسلام را مثل جمعہ، عیدین و اذان و ذبح بقر تعرض نکنند، نہ کردہ باشند لیکن اصل اصول ایں چیزہا نزد ایشان ہباء و ہدر است، زیرا کہ مساجد را بے تکلف ہدم می نمایند و ہیچ مسلمان یا ذمی بغیر استئمان ایشان دریں شہر و در نواح نمی تواند آمد و برائے منفعتِ خود از واردین و مسافرین و تجار مخالفت نمی نمایند۔ اعیانِ دیگر مثلاً شجاع الملک و ولایتی بیگم بغیر حکم ایشان دریں بلاد داخل نمی توانند شد و از ایں شہر تا کلکتہ عمل نصاریٰ ممتد است۔ آرے در چپ و راست مثل حیدرآباد، لکھنؤ و رامپور احکام خود جاری نہ کردہ اند بسبب مصالحت و اطاعتِ مالکانِ آں۔"

اس فتوے میں شاہ صاحب کے یہ الفاظ بڑے معنی خیز ہیں، "ہیچ مسلمان یا ذمی بغیر استئمان ایشان دریں شہر و در نواح نمی تواند آمد" شاہ صاحب صرف مسلمانوں کے حق میں نہیں، ہندوؤں (ذمی) کے حق میں بھی آواز بلند کر رہے ہیں۔ ظالم بادشاہ کی مخالفت، چاہے وہ مسلمانوں پر ظلم کرے یا ہندوؤں پر، شاہ صاحب کا فرض تھا کیونکہ شاہ ولی اللہ رح نے نظامِ حکومت کے جو بنیادی اصول مقرر کیے تھے، ان میں ایک اصول یہ بھی تھا:[1]

"مذہب، نسل یا رنگ کے کسی تفاوت کے بغیر عام باشندگانِ ملک کے معاملات میں یکسانیت کے ساتھ عدل و انصاف، ان کے جان و مال کی حفاظت، ان کی عزت و ناموس کی حفاظت، حقِ ملکیت میں آزادی، حقوقِ شہریت میں یکسانیت، ہر باشندۂ ملک کا بنیادی حق ہے۔"

فتویٰ جاری کرنے سے شاہ عبدالعزیز کا مقصود دہلی میں تخت نشین مسلمان بادشاہت کی

۱۔ علمائے ہند کا شاندار ماضی، ۲: ۱۱

حمایت نہیں تھا، جیسا کہ بعض مورخین نے لکھا ہے[15]، بلکہ ظالم کے خلاف آواز بلند کر:
اور قوم کو متحد کرنا تھا۔ ایک غیر ملکی طاقت کا ہندوستان آ کر اقتدار حاصل کرنا ان
کے نزدیک ظلم کے مترادف تھا اور کفر سے بدتر۔ ایک بار انھوں نے فرمایا تھا[16]: "اسلام
میں ظلم صدر جہ پھیل گیا ہے اور ملک کفر کے ساتھ تو قائم بھی رہ سکتا ہے ظلم کے ساتھ نہیں۔"
شاہ صاحب سکھوں، مرہٹوں اور جاٹوں کی حکومت تو گوارا کر سکتے تھے، کیونکہ یہ
لوگ بہرحال ہندوستانی تھے، مگر کسی غیر ملکی طاقت کا تسلط کسی حالت میں برداشت
نہیں کر سکتے تھے، یہ ملک کے رہنے والوں کے بنیادی حقوق کی پامالی ہوتی۔

شاہ عبدالعزیز پر تیسرا اعتراض یہ ہے کہ وہ قدیم طرزِ تعلیم کے شدید حامی تھے اور درسِ
نظامیہ سے ہٹ کر کچھ اور پڑھانے کے قائل نہ تھے۔ پروفیسر مجیب لکھتے ہیں[17]:

> "نیا نظامِ تعلیم جس کے خلاف شاہ عبدالعزیزؒ نے پچاس برس سے کچھ اوپر
> پہلے فتویٰ جاری کیا تھا، اب قومی حریف بن کر پرانے نظام سے ٹکرا رہا
> تھا۔

یہاں جس فتوے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے[18]، اس میں شاہ صاحب نے یہ نہیں کہا کہ
انگریزی تعلیم بذاتِ خود بری چیز ہے، بلکہ زور اس بات پر ہے کہ انگریزوں سے راہ و رسم
بڑھانے کی خاطر یا ان کے تحت ادنیٰ ملازمتوں کے حصول کی نیت سے انگریزی پڑھنا برا
ہے۔ اگر مقاصد یہ نہ ہوں تو کوئی ہرج نہیں۔

بقول پروفیسر مجیب صاحب[19] "شاہ عبدالعزیز نہایت روشن خیال علماء میں سے تھے۔
حقیقت یہ ہے کہ وہ ایسے روشن دماغ عالم تھے کہ نہ صرف انھوں نے دوسرے مذاہب
مثلاً ہندو دھرم اور یہودیت سے متعلق کتابیں پڑھی تھیں، بلکہ اتنے علوم کا مطالعہ کیا
تھا کہ آج بھی لوگ اسے جان کر انگشت بدنداں رہ جائیں۔ مولوی رحمان علی نے

۱۵۔ مثلاً محمد مجیب، دی انڈین مسلمس (انگریزی)، ۳۹۱ (لندن، ۱۹۶۷ء)۔

۱۶۔ ملفوظات: ۹۶ | ۱۷۔ دی انڈین مسلمس، ۵۲۰

۱۸۔ فتاویٰ عزیزی: ۱۹۵ | ۱۹۔ دی انڈین مسلمس: ۳۹۸

ان سے متعلق جو یہ لکھا ہے کہ، [20] " بالجملہ وے جامع علوم بلکہ آیتے از آیاتِ الٰہی بود "
تو کچھ مبالغہ نہیں کیا۔ شاہ عبدالعزیز خود فرماتے ہیں کہ جن علوم کا میں نے مطالعہ کیا اور
جو مجھے یاد ہیں، ان کی تعداد ۱۵۰ ہے۔ [21] اتنے روشن دماغ اور وسیع المطالعہ عالم سے
یہ کس طرح توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ صرف درسی کتابیں ہی پڑھنے پڑھانے کا قائل ہوگا۔
اگر شاہ صاحب کے زمانے کے تعلیمی حالات کا جائزہ لیا جائے، تو معلوم ہوگا کہ علماء کا
ایک بڑا طبقہ قرآن، حدیث، تفسیر اور فقہ کے علاوہ دوسرے علوم کی تدریس کے سخت خلاف
تھا اور منطق، فلسفہ، ریاضی وغیرہ کو بنظرِ حقارت دیکھتا اور ان علوم کے مطالعہ کرنے والوں
پر کبھی کبھی کفر کا فتویٰ بھی لگا دیتا تھا۔ شاہ عبدالعزیزؒ نے نہایت جرأت مندی سے ان
علوم کو مدارس میں جگہ دی اور خود اپنے بہت سے شاگردوں کو ان سے آشنا کیا۔ مثلاً
محمد اسماعیل شہیدؒ کو ریاضیات اور قانونِ مسعودی اچھی طرح پڑھایا۔ انگریزی پڑھنا تو علما
کی نظر میں سراسر کفر تھا، لیکن یہ شاہ صاحب کی با اثر شخصیت ہی تھی کہ اس نے مسلمانوں کو
انگریزی کی تعلیم حاصل کرنے پر آمادہ کیا۔

جب ایسٹ انڈیا کمپنی نے دلی میں کالج قائم کیا اور مسلمان اس کالج میں تعلیم پانے پر آمادہ
نہ ہوئے تو شاہ صاحب نے ان کے شبہات کو رفع کر کے ان سے کہا کہ دلی کالج سے استفادہ
کریں، یعنی شاہ صاحب علی گڑھ کالج کے قیام سے ۵۰ سال پہلے ہی انگریزی اسکولوں
اور کالجوں میں تعلیم حاصل کرنے کی اجازت دے چکے تھے۔ [22]

اور بقول پروفیسر خلیق احمد نظامی علی گڑھ تحریک کے روحِ رواں سر سید احمد خاں مرحوم
سے متعلق یہ بات قابلِ لحاظ ہے کہ وہ مولانا مملوک العلی (ف: ۱۸۵۰ء) کے شاگرد تھے،
جو شاہ عبدالعزیز کے شاگرد مولانا رشید الدین خان کے شاگرد تھے۔ [23]

۲۰۔ تذکرہ علمائے ہند، ۱۲۲ (لکھنؤ، ۱۹۱۴)　　۲۱۔ ملفوظات، ۹۱

۲۲۔ عبدالمجید سالک، مسلم ثقافت ہندوستان میں، ۴۲۴؛ نیز رودِ کوثر، ۳۹۴

۲۱۔ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام، ۳: ۴۳۱ (لائڈن: ۱۹۶۷ء)

منثورِ سخن دریں سال منظوم شد و جواہرِ معنی کہ در گنجینۂ ضمیر مخفی بود
بسلکِ انتظام درآمد"

اس سے پتہ چلتا ہے کہ ظفر خاں ۱۰۱۴ھ/۱۶۰۵ء میں پیدا ہوا ہوگا۔ پھر بھی
پیدا ہوا، لیکن آزاد بلگرامی اس کے باپ کے متعلق لکھتا ہے :

" خواجہ در عہدِ اکبر شاہ واردِ ہند شد و بوزارت شاہزادہ د
دیوان دکن اختصاص یافت "

شاہزادہ دانیال ۱۰۰۹ھ/۱۶۰۰ء میں اس عہدے پر مامور ہوا تھا اور
میں اس کا انتقال ہوگیا۔ اس لیے اغلب ہے کہ ظفر خاں ہندستان میں
شہر میں پیدا ہوا، یہ معلوم نہ ہو سکا! بعض تذکرہ نویسوں نے اس کو تربتی یا
ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ یہ نسبت اس کے باپ کی وجہ سے لکھی گئی ہے! تاریخ م
ملتی ہیں۔

ظفر خاں احسن کی ابتدائی تعلیم و تربیت کے لیے کافی معلومات دستیاب نہیں ہ
دیوان کے مقدمہ سے اتنا معلوم ہوتا ہے کہ اس نے حکیم رکن الدین طالب آ
گیلانی کے سامنے زانوے ادب تہ کیا تھا۔ اس کے علاوہ اپنے خالو میرز
سے خوشخطی کی مشق کی۔ فنِ شاعری میں اس نے صائب تبریزی کی شاگردی اخ
مؤلف بزمِ تیموریہ لکھتا ہے کہ ظفر خاں میرزا صائب کے مدح لکھنے اور صا
احسن کی شاگردی پر افتخار کرتے تھے۔ لیکن ظفر خاں نے شاعری کو اپنا ہمہ وقتی
بنایا۔ اس نے اپنی تمام زندگی سیاست میں گذار دی۔ کابل میں جب اس ک
صوبہ دار کی حیثیت سے تقرر ہوا، تو ظفر خاں نے اپنے باپ کی نیابت کی۔ ۲
کے لیے باپ کی جگہ کشمیر میں صوبہ دار کی حیثیت سے مقرر کیا گیا۔ باپ کے انتق
بعد اسی جگہ مستقل صوبہ دار ہوگیا۔ وہ انتظامِ حکومت میں بہت قابل تھا۔
اس کا شمار اپنے دور کے ان چار افسروں میں ہوتا تھا جن میں سے ہر ایک اپنے

ے مثلاً مراۃ الخیال ص ۸۹ میں اسے سبزواری کہا گیا ہے۔

...یادہ لائق اور مشہور ہوا۔

"یکے جہانگیر قلی خاں پسر خان اعظم، دوم سعداللہ خان پسر سعید خان چغتا، سوم ظفرخان پسر زین خان و چہارم ظفرخان احسن پسر خواجہ ابوالحسن خان ترتی ہے"

...ر ظفرخان کو بھی اس پر ناز تھا، کہتا ہے:

بروزگار کسے کامران چوں احسن نیست
مدام کام دلِ خود ز جام و شیشہ گرفت

...ظفرخان احسن اپنے والد کی طرح دبلا پتلا اور پست قد تھا۔ اس کے قد کے بارے میں مشہور ہے کہ ایک بار مجلس میں ملا حفظی موجود تھے، انہوں نے کہا[52]:

"ظفرخان برائے این کوتاہ قد است کہ تخم زدہ بے آبے است، وگفت کہ ابوالحسن در تمام روز یک بار آب می خورد۔"

...وہ بہت محنتی، صابر اور صاحبِ ہمت تھا۔ کبھی مصائب اور پریشانیوں سے ناامید نہیں ہوتا تھا۔ خود اس پر فخر کرتا ہے:

باہمہ محنت دلِ من آشنائے نالہ نیست
ہیچ کس احسن ندارد صبر ایوب مرا

...ظفرخاں احسن کا سب سے بڑا وصف اس کی سخاوت تھی۔ نواب علی ابراہیم اس کی سخاوت کے بارے میں لکھتے ہیں[53]:

"از امرائے عالیقدرِ ہندوستان بعد عبدالرحیم خانخانان در کرم گستری و قدرشناسیِ اربابِ کمال نظیرِ او نخاستہ و بسیارے از ہنرمندان بشنیدنِ آوازۂ جودش از ایران روئے توجہ بہندستان گذاشتہ اند۔"

...محمد علی ہاشمی نے ظفرخان احسن سے متعلق ایک عجیب حکایت لکھی ہے۔ کہتے ہیں[54] کہ

---

[51] مآثرالامرا ۲: ۷۶۲
[52] مآثرالامرا ۲: ۷۶۲
[53] صحف ابراہیم (قلمی) ورق ۶۲
[54] مخزن الغرائب (قلمی) ورق ۴۷

ظفرخاں احسن

ایک مرتبہ ظفرخاں احسن کشمیر میں ایک شاعر سے ملنے گیا۔ اس نے دیکھا کہ شاعر سو
ٹھوکر مار کر اسے اٹھایا اور کہا کہ فلاں غنیم کو میں نے مار ڈالا ہے۔ شاعر نے کہا کہ غنیم
جوانمردوں کا کام ہے، لیکن لات مارنا گدھوں کا کام ہے۔ خدا معلوم اس واقعہ میں
یک صداقت ہے۔ لیکن ظفرخاں کے سے خوددار شاعر دوست اور ادب پرور ا
سے امید نہیں کی جاسکتی کہ وہ کسی کو ٹھوکر مارے۔

ظفرخاں جوانی میں بہت عیش پرست اور احکام شریعت سے بالکل بے تعلق تھا۔ ۲۱
دوشنبہ کی شب ۲۴ جمادی الاول ۱۰۶۳ھ کو حضور اکرم صلعم کو خواب میں دیکھا اور آ
سامنے اپنے تمام گناہوں سے توبہ کی۔ ایک قطعہ میں اسی واقعے کو نظم کیا ہے :

ظفرخاں خواب دید از بخت بیدار — کہ بردست رسول آورد انابت
برائے خواب خود تاریخ می جست — خرد گفت "دآنگہے بودہ بجوابت"

اس سے تاریخ برآمد نہیں ہوتی، البتہ اگر "آن" کے عدد شمار نہ کیے جائیں تو تاریخ نکل آتی۔
اس واقعے کے بعد اس دور کے علما اور مشائخ نے ظفرخان کے کہنے پر ایک کتاب بنا
"احسن الدعوات" مرتب کی جو احادیث اور آیات قرآنی پر مشتمل ہے۔ اس کے ساتھ
ظفرخاں نے مطالعے کی آسانی کے لیے توضیح اور تشریح بھی کر دی ہے۔

احسن کے کلام میں زندگی کے دونوں رُخ ملتے ہیں؛ وہ اخلاق کی بلندی اور عملی سعادت
کی ترجمانی بھی کرتا ہے اور دنیا سے لذت اندوز ہونے میں بھی اسے باک نہیں۔ اس نے
اپنے کلام میں اپنے معاشرے کی طرف جابجا اشارے کیے ہیں۔

مآثر الامرا میں ہے[۵] کہ اگرچہ اس کا باپ خواجہ ابوالحسن سُنّی تھا لیکن ظفرخان تشیع میں سخت
متعصب تھا۔ وہ اس فرقے کا سرگرم رکن تھا اور اسے آل رسول سے خاص عقیدت
تھی؛ چنانچہ خود لکھتا ہے:

یکے نیست اعتقادِ مرا
اعتقادم بآلِ یاسین است

---

۵ مآثر الامرا، ۲: ۷۶۰

ظفر خان احسن

... روزِ محشر اولادِ نبی کو اپنا شفیع کہتا ہے اور اپنے گناہوں کی اس طرح عذر خواہی کرتا ہے :

روزِ محشر از گنہ احسن ندارم ہیچ بیم
مہر اولادِ نبی را عذر خواہ آوردہ ام

... امام علی الرضا شاہ خراسان سے اسے خاص ارادت تھی :

خاک در تاج فریدوں میکنم چوں از شرف
خاکروبِ درگہِ شاہ خراساں می شوم

ظفر خان احسن بڑا خود دار اور مستقل الرائے شخص تھا۔ اسے اپنی خود داری بہت عزیز تھی ! اسی وجہ سے اس نے دوسرے شعرا کی طرح شاعری کو اپنا شغل نہیں بنایا، نہ کسی کی جھوٹی مدح کی۔ مثنوی "میخانۂ راز" میں اس نے زاہدوں کو ان کی ریاکاری اور فریب نفس پر لعنت ملامت کی ہے۔ حضور اکرم صلعم، حضرت علی اور دوسرے اماموں کی مدح کی ہے۔ اس کے صرف چند شعر شاہجہاں کی مدح میں ملتے ہیں۔ شاہجہاں کی مدح کرتے ہوئے کہتا ہے :

پادشاہا ! من بدرگاہت پناہ آوردہ ام
مہر اولادِ نبی را عذر خواہ آوردہ ام

من نمی دانم، چہ خواہم گفت روزِ باز خواست
نامۂ اعمال از عصیاں سیاہ آوردہ ام

آنچہ میخواہی تو در محشر، تہی دستم ازاں
حاصلِ عمرِ گرامی اشک و آہ آوردہ ام

تا نباشم پیشِ لطفت از تہی دستی خجل
دادہ نقدِ زندگی جنسِ گناہ آوردہ ام

ظفر خان نے اپنے کشمیر کے طویل قیام کے دوران میں مشاعروں کے ذریعے سے یہاں شعر و شاعری کو بہت رواج دیا۔ یہ مشاعرے دربار دہلی میں منعقد ہوا ہی کرتے تھے۔ احسن انہیں اپنے ساتھ کشمیر لے گیا اور پھر اس کے بعد امرا اور دوسرے حکمرانوں نے اس سنت کو کشمیر میں قائم رکھا۔[۵] احسن کی ادبی مجلسوں کے بعض قصے مشہور ہیں۔ ایک روز میرزا طالب کلیم اور میرزا صائب شعر پڑھ رہے تھے۔ ظفر خان نے مضمون و موضوع دے کر موزوں کرنے کی فرمائش کی۔ پہلے کلیم نے کہا :

۵ مقدمۂ دیوان محسن فانی : ۲

زخمِ دنداں خوبتر کرد آں لبِ پُر خندہ را
قیمت آرے بیش می باشد عقیقِ کندہ را

اہلِ مجلس نے بہت تحسین اور تعریف کی۔ اس پر میرزا صائب نے کہا:

باشد بلبش نشانِ دنداں
نقشے کہ بمدّعا نشیند

اہلِ مجلس نے اس کی بھی بہت تعریف کی۔ کلیم کو اس پر بہت غصہ آگیا۔ اس فی البدیہہ کہا:

پیش این جوہریانے کہ دریں بازارند
قیمتِ رشتہ فزونتر بود از گوہرِ ما

جواب میں صائب نے کہا:

تیرہ روزے بیں کہ می خواہد کلیم بے زباں
پیشِ شمعِ طور اظہارِ زباندانی کند

اس پر دونوں آپس میں لڑنے مرنے کے لیے آمادہ ہوگئے۔ ظفر خان نے بیچ بچاؤ کر صلح کرائی اور کہا کہ عرصۂ اشعار ہے، نہ کہ میدانِ کارزار[1]

صائب کے بارے میں ایک اور قصہ بھی مشہور ہے۔ ایک مرتبہ ایک لڑکا اس کی مجلس میں آگیا۔ اس وقت صائب اپنے شعر سنا رہا تھا۔ اہلِ مجلس داد دے رہے تھے اسی اثنا میں کہیں اس لڑکے نے کہہ دیا کہ قدما نے جو اشعار کہے ہیں، آج کل کے شعرا انہیں مضامین کا لفظوں میں رد و بدل کر کے اعادہ کر دیتے ہیں۔ صائب اس پر ہنسا اور یہ شعر کہا:

اہلِ دانش جملہ مضمونہائے رنگیں بستہ اند
ہست مضمونِ نبستہ بندِ تنبانِ شما

ظفر خان اس حاضر جوابی سے خوش ہوا اور صائب کو انعام دیا[2]

[1] تذکرہ حسینی، ۱۹۰-۱۹۱
[2] تذکرہ مرآۃ الخیال، ۸۹

ظفر خان احسن

ظفر خان احسن نہ صرف غزل سرا تھا، بلکہ اس نے تین مثنویاں بھی کہی ہیں۔ اس کی غزلیات بالعموم عرفانی اور عاشقانہ مضامین سے پُر ہیں۔ اور بہت سے اشعار تاریخی اہمیت کے حامل ہیں۔ وہ اپنے معاصر شعرا کا نام بہت احترام سے لیتا ہے۔ اس کے دیوان میں ۳۸۲ غزلیات ہیں، جن میں ۲۰۲۱ شعر ہیں۔

ظفر خان نے تین مثنویاں "جلوۂ ناز، میخانۂ راز اور ہفت منزل" بھی کہی ہیں۔ ان میں اس نے اپنے معاصرین کی پیروی کی ہے۔ مثنویات سے اس کے عمدہ ذوق کا پتہ چلتا ہے، اور معلوم ہوتا ہے کہ اسے کشمیر کے لوگوں سے کتنا عشق تھا۔ اس کے علاوہ ان میں لاہور اور پنجاب کی بھی تعریف کی ہے۔

جلوۂ ناز : اس مثنوی میں تقریباً ۹۵۰ شعر ہیں۔ اس کا مطلع آغاز ہے :

بنامِ آنکہ گل ہم بلبلِ اوست
بہ بستان لالہ مہ خوش ازلِ اوست

خداوند کریم کی حمد اور سرورِ انبیاء محمد مصطفیٰ صلعم کی نعت کے بعد معراج کا بیان کرتا ہے پھر جناب مصطفوی اور امیر المومنین علی ابن ابی طالب اور ان کی اولاد اطہار کی منزلت اور قدر کا ذکر کرتا ہے۔ اس کے بعد خاقانِ عصر شاہجہاں کی مدح ہے۔ وجہ تصنیف کے بیان کے بعد کہتا ہے :

نمودم جمع احسن! گوہرے چند — غلط گفتم، درخشاں اخترے چند
ازاں نامش نہادم جلوۂ ناز — کہ گردد دفترِ حسنِ شباں باز

اس مثنوی کی تاریخ تصنیف معلوم نہیں لیکن بعض اشعار سے خیال ہوتا ہے کہ غالباً ایامِ جوانی کا کلام ہے۔ مثلاً کہتا ہے :

سخن را در جوانی کن جہانگیر — کہ در پیری طبیعت می شود پیر
بیا ساقی کہ ایامِ جوانیست — جوانی فصلِ عیش و کامرانیست

اس مثنوی میں احسن نے جا بجا ہندوستانی پھلوں پھولوں وغیرہ کا ذکر کیا ہے۔ ملاحظہ ہو :

امرت پھل :	زشادابی امرت پل چگویم	کہ شیریں شاد و مفش گ
آم :	باشبہ ہیچ میوہ نیست ہم سنگ	کہ بویش میر ود فرسنگ
انناس :	انناس است نقل مے پرستاں	زبوے او معطر بزم
بیل، جوہی، جاہی :	زجوش بیل واز جوہی و جاہی	نگہ راے شود گشتی
کیوڑہ :	زگلہا کیوڑہ گردید ممتاز	درو پیچیدہ بوچوں نغو
فالسہ، بیر، جامن :	بود از پالسہ و ز بیر و جامن	بگلشن باغباں را چشم
پان :	زپاں زینت بود حسن بتاں را	چہ گویم بیش ازیں تعریف
شفتالو :	گرفتارم بشفتالو گرفتار	کہ یادم می دہد از بوس
کتارہ :	بسازد کار عاشق از نظارہ	بود ہر موے مژگانش
کچنار :	شگفتہ آنچناں گلہاے کچنار	کہ گوئی آتش افتادہ لگا
گلرخ :	زگلرک بزم مستاں گشت روشن	زشمع او گلستاں گشت رو
کیلا :	زکیلہ چوں بتقریبے سر دم	بود بر درد افسونے درد
ناشپاتی :	یکے از میوہایش ناشپاتیست	کہ رنگ او زشیرینی نباتیست

میخانۂ راز : اس مثنوی کے پہلے منثور مقدمہ ہے۔ آغاز میں حمد و مناجات ہے۔ اس میں زاہدوں کی ریاکاری اور فریب کا بیان ہے۔ اس کے بعد گل و مے کے ساتھ ساقی کی دلربائی کا ذکر کیا ہے۔ آخر میں کشمیر کی تعریف ہے، اس میں یہاں کی شدید سردی کا حال خاص طور پر لکھا ہے۔ یہ مثنوی جلوۂ ناز کے ہمپایہ ہے؛ جلوۂ ناز میں البتہ ہندی الفاظ کا استعمال زیادہ ہے، جب کہ یہ الفاظ سے خالی ہے۔

ہفت منزل : اس مثنوی کو نظم کرنے کی وجہ ظفر خاں نے خود مقدمہ میں یہ بتائی ہے کہ جب شاہجہاں کشمیر میں مقیم تھا اور وہاں کی صحت بخش اور خوشگوار آب و ہوا سے مستفید ہو رہا تھا، اس نے شعراے فرمائش کی کہ اس خطے کے وصف میں شعر کہیں۔ اس پر ظفر خاں نے یہ مثنوی کہی۔ اس میں تقریباً ۰۰ ے شعر مناطق کشمیر اور یہاں کے گل و گلزار، کوہ و دمن اور رود و زعفران زار کے وصف میں ہیں۔

مرقع ظفرخان احسن: ظفرخان احسن کو اپنے معاصر شعراسے بڑا لگاؤ تھا۔ ا
ںہ صرف ان کی ہمت افزائی کی بلکہ ان کا کلام خود انہی کے ہاتھ سے لکھوا کر ایک مجموعہ
ب دیا جس میں شعرا کی تصویریں بھی شامل تھیں۔ سرخوش نے اس مرقع کا ذکر کیا ہے[1]:

"تذکرۂ اشعارِ شعرائے کابل کہ باوے ربط و آشنائے داشتند، مثل صائب
و کلیم و سلیم و قدسی و سالک یزدی و قزوینی و دانش، میر صیدی و غیرہم کہ
دران زمان کوسِ سخنوری می نواختند، انتخابِ ہر کدام بخطِ او نویسانیدہ
بر پشتِ ہر ورق صورتِ آن معنی سنج نیز ثبت کردہ بود۔ یک ورق کہ برو
شبیہ کلیم بودہ، فقیر دیدہ و صورتش را زیارت کردہ ام۔"

سرخوش کے علاوہ بندرابن داس خوشگو[2] نے بھی اسے مجموعہ ہی کہا ہے، لیکن مولانا صباح
الدین عبدالرحمن[3] اور نواب علی بن ابراہیم[4] اسے مجموعہ کی بجائے بیاض کہتے ہیں، مگر ڈاکٹر
سید علی رضا نقوی نے سرخوش اور خوشگو کے قول کو رد کرتے ہوئے اس انتخاب کا نام
رقع رکھا ہے۔ لکھتے ہیں[5]:

"مرقع کتابیست البوم مانند کہ درآن اشعار و تصاویرِ شعرا و آیاتِ قرآن و
پارہ ہائے نثر بہ خطِ خوب نوشتہ باشند و گاہے مرقع را با اشعار یا پارہ ہائے
نثر بخطِ گویندگان و نویسندگانِ آن ترتیب دادہ عکس آنہا را نیز دران
می گذارند۔ . . . . . . مرقعے کہ ظفرخان تربتی متخلص بہ احسن در زمانِ
نظامتِ کابل ترتیب دادہ بود و سرخوش آن را اشتباہاً تذکرہ نوشتہ
است۔"

افسوس کہ اب اس مرقع کا کسی کتابخانے میں سراغ نہیں ملتا۔ بقول مولانا شبلی[6] اگر یہ مرقع
آج ہاتھ لگ جائے تو اس کی قیمت لاکھ روپے سے بھی زیادہ ہوگی۔ شبلی کے زمانے میں

---

[1] کلمات الشعراء: ۴
[2] سفینۂ خوشگو
[3] بزمِ تیموریہ
[4] صحفِ ابراہیم (قلمی): ۶۶
[5] تذکرہ نویسی در ہند و پاکستان: [illegible]
[6] [illegible]

لاکھ روپیہ بڑی گرانقدر رقم ہے، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ ایسا مجموعہ لاکھوں میں ایک ہے۔

احسن الحکایات : ظفر خاں احسن نے اپنے معاصرین میں سے بعض لوگوں سے فرمایش کی تھی کہ وہ کتابیں تصنیف کریں۔ چنانچہ محمد رضا نے اس کی تعمیل میں 'احسن الحکایات' لکھی۔ اس کتاب کا ذکر صرف فہرست بانکی پور[۵۱] اور کشمیر[۵۲] کے علاوہ کہیں اور نہیں ملتا۔ بانکی پور کے نسخے سے متعلق مؤلف فہرست لکھتا ہے کہ مقدمۂ کتاب سے ایسا لگتا ہے کہ مولف اپنا نام لکھنا نہیں چاہتا۔ وہ ظفر خاں کے درباریوں میں سے تھا۔ جب ۱۰۴۱ھ/۱۶۳۲ء میں ظفر خاں کشمیر کا صوبہ دار مقرر ہوا، تو وہاں اس کی حافظ محمد رضا سے ملاقات ہوئی، جس کی عمر اس وقت نوے سال کی تھی۔ اس شخص نے پچاس سال کی عمر میں ہندستان کے مختلف مقامات کی سیر کی تھی اور آخیر میں کشمیر میں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی۔ وہ کبھی کبھی احسن کے پاس جاتا اور اسے مختلف داستانیں سناتا جو سچے واقعات پر مبنی تھیں۔ ظفر خاں نے اسے ان داستانوں کو ایک کتاب میں جمع کرنے کا حکم دیا۔ محمد رضا نے حکم کی تعمیل میں یہ کتاب مرتب کی اور اسے احسن ہی کے نام سے موسوم کیا۔ یہ کتاب ماہ ذی الحجہ ۱۲۵۹ھ میں نستعلیق خط میں لکھی گئی تھی۔

احسن الدعوات : اسی سلسلے کی دوسری کتاب جس کا گذشتہ سطور میں ذکر بھی ہو چکا ہے، 'احسن الدعوات' ہے۔ اس کے لکھے جانے کی وجہ بیان کی جا چکی ہے۔ اس کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس کو مختلف دانشوروں نے ترتیب دیا تھا۔ اس میں ائمۂ اطہار کے حالات ہیں اور مزید استفادے کے لیے فارسی توضیحات شامل کر دی گئی ہیں۔ اس کے علاوہ اس میں آیاتِ قرآنی اور احادیثِ نبوی اور مذہبی داستانیں بھی درج ہیں۔

ظفر خاں کی تاریخِ وفات سے متعلق اختلاف ہے۔ بیشتر تذکرہ نویسوں نے اس کی وفات ۱۰۷۳ھ کی لکھی ہے۔ لیکن ایتھ نے سراج سے نقل کیا ہے کہ ظفر خاں نے اپنے بیٹے کے بعد ۱۰۸۱ھ میں وفات پائی۔ چونکہ ظفر خاں کا ذکر صرف ۱۰۶۷ھ تک ملتا ہے، اس لیے ۱۰۷۳ھ زیادہ

---

۵۱ فہرست کتابخانہ بانکی پور، ۱۸۱ ۵۲ کشمیر، ۲۷۱

قرینِ قیاس ہے۔ ظفر خان کی آخری آرامگاہ مغلپورہ لاہور کے ایک مقبرے میں ہے جو اس کی والدہ نے اپنے شوہر کے لیے بنوایا تھا۔ جب ظفر خان کا انتقال ہوا تو اسے بھی وہیں دفن کر دیا گیا ہے۵

کتابیات

۱ تذکرۃ الشعرا : دولت شاہ سمرقندی (بمبئی، ۱۲۷۱ھ)

۲ تذکرۃ الشعرا : مولانا عبدالغنی (علی گڑھ، ۱۹۱۶ء)

۳ تذکرہ حسینی : میر حسین دوست سنبلی (کانپور، ۱۲۹۲ھ)

۴ تذکرہ نویسی در ہند و پاکستان : ڈاکٹر سید علی رضا نقوی (تہران، ۱۳۴۳ش)

۵ تذکرہ سفینۂ خوشگو : بندرابن داس خوشگو (پٹنہ ۱۹۵۹ء)

۶ تذکرہ صحفِ ابراہیم : نواب علی بن ابراہیم (نسخۂ عکسی کتابخانہ مرکزی دانشگاہ تہران)

۷ مراۃ الخیال : شیر علی خان لودی (بمبئی ۱۳۲۳ھ)

۸ پارسی سرایانِ کشمیر : ڈاکٹر گردھاری لال ٹیکو (تہران، ۱۳۴۲ش)

۹ مآثر الامرا : نواب صمصام الدولہ شاہنواز خان (کلکتہ، ۱۸۸۸ء ببعد)

۱۰ کلیاتِ احسن : نسخۂ خطی خدا بخش لائبریری، بانکی پور پٹنہ

۱۱ بزمِ تیموریہ : سید صباح الدین عبدالرحمٰن (اعظم گڑھ)

۱۲ شعر العجم : مولانا شبلی نعمانی (اعظم گڑھ ۱۹۵۶ء)

۱۳ احسن الدعوات : نسخۂ خطی در کتابخانہ مجلس تہران

۱۴ مآثر الکرام : غلام علی آزاد بلگرامی (لاہور، ۱۹۱۳ء)

---

۵ ماہِ نو (کراچی) اکتوبر ۱۹۶۴ء، ۱۳۳

ظفر خان احسن

۱۵ مخزن الغرائب : احمد علی خان ہاشمی (نسخۂ خطی، کتابخانۂ مرکزی دانشگاہ تہران)

۱۶ مجلہ ماہِ نو : اردو ماہنامہ (کراچی، اکتوبر ۱۹۶۴ء)

۱۷ کشمیر : جی - ایم - صوفی (کراچی)

بحث و نظر

رضا کون تھا؟

اکبر علی ترمذی

تحریر کے گذشتہ شمارہ (۱۷، ۳، ۴/ ۱۹۶۷ء) میں جناب ڈاکٹر سید امیر حسن عابدی کا ایک مقالہ دیوان رضا۔ تعارف کے عنوان سے شائع ہوا ہے۔ اس میں انھوں نے مختلف تذکروں کی مدد سے رضا تخلص کے ۲۱ فارسی شاعروں کی طویل فہرست پیش کی ہے جو مختلف مقامات اور ادوار میں گذرے ہیں، لیکن انھوں نے ان میں سے کسی ایک کو بھی وہ رضا شناخت نہیں کیا، جس کے دیوان پر انھوں نے یہ مقالہ سپرد قلم کیا ہے۔ اس طرح بیرونی شواہد سے مایوس ہو کر انھوں نے اندرونی شواہد کے پیش نظر رضا کے وطن کے بارے میں مندرجہ ذیل نتائج اخذ کیے ہیں، (۱) دیوان کا مصنف شاہجہانی عہد میں ہندستان میں موجود تھا (ص ۳۶۱)، (۲) شاعر پہلے آگرے میں تھا، مگر وہاں سے مایوس ہو کر اسے گجرات جانا پڑا۔ (۳۶۲)، (۳) آہستہ آہستہ اسے گجرات سے دلچسپی پیدا ہو گئی اور وہ اسے اپنا وطن کہنے لگا۔ (ص ۳۶۲)؛ (۴) رفتہ رفتہ اس پر تصوف کا رنگ غالب آگیا اور وہ گجرات کے مشہور صوفی شاہ عالم کا مرید ہو گیا۔ (ص ۳۶۲)

عابدی صاحب لکھتے ہیں کہ سید محمد ملقب بشاہ عالم ۲۹ ذی قعدہ ۸۱۷ھ/ ۱۴۱۵ء کو پیدا ہوئے اور ۲۰ جمادی الثانی ۸۸۰ھ/ ۱۴۷۵ء کو ان کا انتقال ہوا (ص ۳۶۲) اور دیوان رضا کا یہ مصنف ان کے قول کے مطابق شاہجہان کے عہد میں موجود تھا۔ (ص ۳۶۱) شاہجہان کے عہد اور حضرت شاہ عالم کے زمانے میں تقریباً دو سو سال کا بُعد ہے۔ عقل یہ بات تسلیم کرنے سے عاجز

ہے کہ عہدِ شاہجہانی کے ایک شاعر نے دو صدی قبل کے ایک صوفی بزرگ کے ہاتھ پر بیعت کی ہو۔
دراصل رضا کا نام سید جلال الدین مقصود عالم تھا، اور وہ گجرات کے مشہور بخاری خانوادے سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کا سلسلۂ نسب چھ پشتوں کے بعد سید سراج الدین محمد شاہ عالم بخاری تک پہنچتا ہے۔ جو سید برہان الدین عبداللہ قطب عالم کے بیٹے تھے۔ قطب عالم سید جلال مخدوم جہانیان جہانگشت کے پوتے تھے۔ وہ ۸۰۲ھ / ۱۳۹۹ء میں اُچھ سے گجرات تشریف لائے، اور احمد آباد کے قریب بٹوہ نامی گاؤں میں پیوندِ خاک ہوئے۔ قطب عالم کے بیٹے شاہ عالم کی خانقاہ احمد آباد کی ایک بستی رسول آباد میں تھی، جہاں آج ان کا مزار مرجعِ خاص و عام ہے[1]۔

سید جلال مقصود عالم رضاؔ کے والد کا نام سید محمد مقبول عالم تھا، اور وہ جلالی تخلص کرتے تھے۔ رضا کی طرح وہ بھی صاحبِ دیوان تھے۔ ان کی تصانیف میں لطائفِ شاہیہ، جمعاتِ شاہیہ، احصار الاسماء جامع المثنیٰ، اذکار الاطہار وغیرہ قابلِ ذکر ہیں، لیکن سید محمد جلالیؔ کا سب سے اہم کارنامہ ان کا قرآن کا فارسی ترجمہ ہے، جو انھوں نے جہانگیر کے ایما پر کیا تھا[2]۔

جلالیؔ کے سب سے بڑے صاحبزادے سید جلال مقصود عالم رضاؔ تخلص، ۱۵۹۵ء میں احمد آباد میں پیدا ہوئے، اور ۳۰ سال کی عمر میں اپنے والد کی اجازت سے شاہجہان کے جشنِ تخت نشینی میں شرکت کے لیے آگرے تشریف لے گئے، بادشاہ نے خلعت و فیل تین ہزار روپیہ نقد عنایت کیا[3]۔ اس کے بعد وہ کئی مرتبہ دربار میں طلب کیے گئے، اور ہر بار انعام و اعزاز سے مشرف ہوئے یہاں تک کہ ۱۶۴۱ء میں شاہجہان نے انھیں صدارتِ عظمیٰ کا عہدہ قبول کرنے پر مجبور کیا۔ اور چہار ہزاری ذات اور ہفت صد سوار کا منصب دیا[4]۔ پھر ۱۶۴۵ء میں ترقی دے کر شش ہزاری ذات اور یک ہزاری سوار

---

(۱) خاتمۂ مرآۃ احمدی (علی محمد خان): ۲۶-۲۱، ۲۶-۳۴ (کلکتہ، ۱۹۳۰ء)

(۲) جلالی احمد آبادی کے عنوان سے راقم الحروف نے ایک سلسلۂ مضامین لکھا تھا جو نوائے ادب (بمبئی) میں شائع ہوا تھا۔ ملاحظہ ہو: نوائے ادب۔ جنوری ۱۹۵۱ء، اپریل ۱۹۵۱ء، جولائی ۱۹۵۴ء، اکتوبر ۱۹۵۴ء۔

(۳) بادشاہ نامہ از عبدالحمید لاہوری، ۱: ۲۲۸ (کلکتہ)

(۴) مآثر الامرا (شاہ نواز خاں)، ۲: ۴۴ (کلکتہ)

کے عالی منصب پر فائز کیا[5] چند دنوں کے بعد ان کے منصب میں پانسو سواروں کا اور اضافہ ہوا۔ اس کے دو سال بعد یعنی، ۱۶۴۷ء میں انھوں نے لاہور میں وفات پائی[6] نعش گجرات بھیجی گئی اور رسول آباد میں اپنے بزرگوں کے پاس گنبدِ ثانی میں دفن ہوئے۔

سطورِ بالا سے ظاہر ہے کہ رضا عہدِ شاہجہانی کے مشہور صدر الصدور سید جلال بخاری کا تخلص تھا۔ اور وہ گجراتی تھے۔ رضا کی طرح ان کے بیٹے سید جعفر بدر عالم بھی صاحبِ دیوان تھے اور صفا تخلص کرتے تھے۔ رضا اور صفا کے مفصل حالات اور ان کی شاعری سے متعلق بحث ۔۔۔ اپنی انگریزی کتاب ''گجرات کے فارسی شعراء'' میں کرونگا، جو زیر ترتیب ہے۔

۵۔ بادشاہ نامہ ۱: ۹۷۴۔

۶۔ مآثر الامراء ۳: ۷۵۴؛ خاتمہ مرآۃ احمدی: ۳۴۔

مطبوعاتِ علمی مجلس

گلشنِ ہند

از سید حیدر بخش حیدری
مرتبہ ڈاکٹر مختار الدین احمد
لندن اور آکسفرڈ کے خطی نسخوں پر مبنی متن اور مبسوط حواشی۔

مجلد: ۵ روپے

کلیاتِ میر (حصہ اول)

مرتبہ ظل عباس عباسی
میر کی زندگی کے ۱۸۱۱ء کے نسخہ پر مبنی متن،
چھ دیوانوں کی غزلیات کے علاوہ شروع میں چار نثری مضامین از رشید احمد صدیقی، قاضی عبدالودود، آلِ احمد سرور، فراق گورکھپوری۔

۸۴۰ صفحات، غیر مجلد: ۲۰ روپے؛ مجلد: ۲۵ روپے

کلیاتِ مصحفی (۲)

مرتبہ نثار احمد فاروقی
پیش لفظ، مالک رام
یہ مصحفی کا دوسرا دیوان ہے اور پہلی مرتبہ شائع ہوا ہے۔

۲۵۶ صفحات۔ غیر مجلد: ۶ روپے؛ مجلد: ۶/۷۵ روپے

علمی مجلس مصحفی کا تمام کلامِ نظم و نثر — اردو، فارسی — بارہ جلدوں میں شائع کرنے والی ہے

مالک رام

وفیات

حافظ علی بہادر خاں

ان کا خاندان مراد آباد کا رہنے والا تھا۔ یہ ۱۸۹۶ء میں پیدا ہوئے۔ والد کا ان کی بہت کم عمری میں انتقال ہو گیا، جب کہ ہنوز ان کی تعلیم شروع بھی نہیں ہوئی تھی۔ اس کے بعد ان کی والدہ نے یہ بار بڑی مردانگی سے اٹھایا اور انھیں اعلیٰ تعلیم دلائی۔ ان کا تعلیمی دور بہت کامیاب رہا۔ دسویں درجے میں صوبے بھر کے اولین دس طلبہ میں تھے؛ وظیفہ حاصل کیا۔ اس کے بعد علی گڈھ پہنچے؛ ہمارے صدر جمہوریہ ڈاکٹر ذاکر حسین بالقابہ ان کے معاصر تھے۔ یہاں سے ۱۹۱۸ء میں بی ایس سی کی امتیازی سند لی۔ ایم ایس سی میں تعلیم پا رہے تھے کہ ملک میں قومی تحریک اور عدم تعاون کے ہنگامے میں کالج کو خیرباد کہہ دیا، اور کانگریس اور خلافت کے سرگرم رکن بن گئے۔

اب انھوں نے صحافت کی طرف رخ کیا۔ تاج، جبلپور اور مدینہ، بجنور اور نصرت، بمبئی کی ادارت سے وابستہ رہے؛ اور اس میں اتنی کامیابی حاصل کی کہ مرکزی جمعیت خلافت کے اخبار خلافت، بمبئی کی ادارت ان کے سپرد کر دی گئی؛ اس عہدے پر چار برس تک کام کیا۔ اس کے بعد انھوں نے اپنا ہفتہ وار اتحاد اور خواتین کے لیے معینِ نسواں جاری کیے۔ اسی کے ساتھ روزنامہ ہلال جاری کیا، جو آج تک زندہ ہے۔ اسی دوران میں قید و بند کی ابتلا سے بھی دوچار ہونا پڑا۔

وسیع معلومات کے مالک تھے اور متعدد زبانیں جانتے تھے۔ قلم میں زور تھا؛ اس لیے ان کی

تحریر سے وثوق اور وقار کا اظہار ہوتا تھا۔ صحافتی سرگرمیوں کے علاوہ بعض کتابیں بھی ان سے یادگار ہیں مثلاً محمود غزنوی، حکومتِ الٰہیہ، پردہ اور اسلام، ترکی زبان کی بعض انگریزی کتابیں اور مختصر رسالے بھی شائع ہوئے؛ انگریزی میں بعض پرچے بھی چھاپے۔ وفات سے پہلے اردو ہفتہ وار دورِ جدید کے ایڈیٹر تھے۔
حرکتِ قلب کے بند ہو جانے سے ۵/۶ نومبر ۱۹۶۷ء کی درمیانی شب میں انتقال کیا اگلے دن جنازہ اٹھا اور جسدِ خاکی فیروز شاہ کوٹلہ کے قبرستان میں سپردِ خاک کیا گیا۔

صولت ٹونکی

محمود الحسن نام تھا، لیکن چونکہ قوم کے عرب تھے، اس لیے عام طور پر محمود الحسن عرب کے نام سے پکارے جاتے تھے۔ ان کے والد سید حامد عرب، نواب ابراہیم علی خان بہادر کے عہد میں ٹونک وارد ہوئے۔ یہاں ان کی مناسب آؤ بھگت ہوئی۔ نواب صاحب نے دو گاؤں "جایداد اہلِ عرب" کے نام سے وقف کر رکھے تھے؛ ان سے عرب مہمانوں کو تحفے تحائف اور نذرانے دیے جاتے تھے۔ انھوں نے سید حامد کو "معرفِ عرب" نامزد کر کے اس جایداد کا منصرم بنا دیا۔
یہیں ٹونک میں .... ۱۳۱۳ھ میں سید حامد کے ہاں محمود الحسن پیدا ہوئے، تو نواب وزیر الدولہ مرحوم کی صاحبزادی اور مخیر بہو (اور صاحبزادہ عبداللہ خاں کی بیوی) رقیہ بیگم نے نومولود کو اپنا متبنّیٰ بنا لیا۔ چنانچہ ان کی پرورش بڑے ناز و نعم سے ہوئی اور وہ شاہی خاندان کے صاحبزادگان کے ساتھ پروان چڑھے۔ تعلیم کا معیار بھی بلند رہا؛ مختلف اساتذہ سے جملہ درسیات پر عبور اور ان میں پوری مہارت حاصل کی۔
نواب ابراہیم علی خان شاعر تھے؛ خلیل تخلص تھا۔ بعض اساتذۂ عہد ان کے دربار سے وابستہ تھے۔ سلیمان خان اسد لکھنوی، احمد حسین بسمل خیرآبادی، افتخار حسین مضطر خیرآبادی، ظہیر دہلوی ان میں خاص طور پر مشہور ہیں۔ نواب صاحب کے اس ذوق کے باعث پوری

فضا پر شعر و نغمہ چھائے ہوئے تھے۔ داغ کے مشہور تلامذہ صاحبزادہ احمد سعید خاں عاشق اور کیف کی نشو و نما اسی ماحول میں ہوئی تھی۔ صولت نے ہوش سنبھالا، تو وہ بھی اسی کیف و رنگ کی دنیا میں کھو گئے، اور شعر کہنے لگے؛ اس میں مشورہ عاشق اور کیف سے رہا۔ دونوں استاد ماہرِ فن اور قادر الکلام سخنور تھے۔ بہت جلد صولت بھی اس میدان کے نشیب و فراز سے واقف ہو گئے۔ رہی سہی کسر مشق نے پوری کر دی، اور ان کا شمار اپنے زمانے کے صفِ اول کے شاعروں میں ہونے لگا۔

بنیادی طور پر وہ غزل کے شاعر تھے۔ درباری تعلق کے باعث ان کے کلام میں قصائد اور مدحیہ قطعات وغیرہ کا بھی وافر حصہ ہے۔ ان کی عشقِ رسول میں ڈوبی ہوئی نعتیں مولود کی محفلوں میں بڑی مقبول ہیں۔ ٹونک کی ایک خاص صنفِ سخن چار بیتی ہے۔ صولت نے اس میں بھی طبع جدت پسند کے خوب جوہر دکھائے ہیں۔ کچھ مزاحیہ کلام بھی ہے، لیکن افسوس کہ مزاج کی وارستگی اور لاابالی پن نے عمر بھر کلام کو تدوین سے بے نیاز رکھا؛ آج تک ان کا کوئی مجموعہ شائع نہیں ہوا۔ غیر مرتب کلام ان کے ورثا کے پاس موجود ہے۔ کاش کوئی اللہ کا بندہ محنت کر کے اس کا ایک نمائندہ انتخاب شائع کر دے تاکہ یہ ضائع ہونے سے بچ جائے اور ان کی یادگار بھی قائم رہے۔

انھوں نے کبھی کوئی ملازمت نہیں کی۔ صاحبزادہ افتخار علی خان ان کے شاگرد تھے، وہ سو روپیہ مہینا نذرانہ پیش کرتے تھے۔ نواب اسماعیل علی خاں نے بھی سو روپیہ مہینا اپنی جیبِ خاص سے ان کے لیے مقرر کر رکھا تھا۔ 'جایدادِ اہلِ عرب' اور 'قدیم' کے ترکے سے بھی کچھ ملتا تھا۔ لیکن چونکہ ذمہ داریاں بہت تھیں، اس پر گرانی کا یہ عالم کہ اس نے بڑے بڑوں کا ناطقہ بند کر رکھا تھا، عسرت سے بسر اوقات ہوتی تھی۔ ۲۹ مارچ ۱۹۶۸ء کی صبح کو گلے کے کینسر کے عارضے سے انتقال ہوا۔ یہ تو ایک بہانہ ہو گیا، ورنہ ہے یہ کہ جب پار سال ان کا بڑا بیٹا پیارے میاں اللہ کو پیارا ہوا، تو

... تمام جانیں پیدا ثابت ہوا۔ تو تلے مشہور شاہی قبرستان موتی باغ کے حصۂ خاص میں دفن ہوئے ۔ ہجری سال (۱۳۸۷) ان کے نام "مولانا محمود الحسن صولت ٹونکی" سے برآمد ہوتا ہے۔ اولاد میں ایک لڑکا اور دو لڑکیاں یادگار چھوڑیں ۔

پریم شنکر فرحت دہلوی

یہ پرانے دلّی والے تھے ۔ یہیں ۴ جنوری ۱۹۲۶ء کو ایک متمول تجارتی گھرانے میں پیدا ہوئے ۔ ان کے والد لالہ موہن لال گوئلہ کا (جو حیات ہیں) گھڑیوں کا کاروبار ہے۔ شاید اس خیال سے کہ بالآخر انھیں تجارت ہی کرنا ہے، تعلیم صرف انٹرنس پائی ؛ لیکن اس کے باوجود انگریزی بہت اچھی جانتے تھے جیسا کہ ان کے ٹیگور کی متعدد نظموں کے تراجم سے ظاہر ہے ۔ فارسی سے بھی اچھی مزاولت تھی۔ اردو کے علاوہ ہندی سے بھی شغف تھا؛ ہری ونش بچن ان کے محبوب شاعر تھے ۔ اردو میں انیس و دبیر کے مراثی اور اقبال کے کلام کے شیدائی تھے ۔

اردو کا شوق بہت ابتدا میں پیدا ہوا ۔ چندے لالہ دھرم پال گپتا وفا سے مشورہ رہا؛ اب بہت دن سے بشیشور پرشاد منور لکھنوی اور کامل نظامی دہلوی (تلمیذ سائل دہلوی مرحوم) سے اصلاح لیتے تھے ۔ مجموعۂ کلام سازِ حیات کے عنوان سے ۱۹۶۵ء میں شائع ہوا تھا۔ اس کے بعد کا کلام غیر مطبوعہ رہ گیا ۔ آخری ایام میں ایک مثنوی (ساقی نامہ) لکھ رہے تھے جو نامکمل رہ گئی ۔

ان کے جسم میں موٹاپے کے اثرات تھے جس سے قلب کا فعل کمزور رہنے لگا تھا ۔ ۳۰ اپریل ۱۹۶۸ء کو اچانک اپنے دوسرے سکونتی مکان میرٹھ میں حرکتِ قلب بند ہو جانے سے انتقال ہوا ۔ کامل نظامی کے قطعۂ تاریخ کا آخری شعر ہے :

از سرِ آہ ہے ملی تاریخ یہ
فرطِ غم سے سب ہیں دو پارہ جگر
(۱۹۶۸ = ۱۹۶۷ + ۱)

پرویز شاہدی

ان کا اصلی نام سید محمد اکرام حسین تھا۔ ۱۹۱۰ء میں پٹنے (لودی کٹرہ) میں پیدا ہوئے۔
ان کے والد سید احمد حسین (ف ۱۹۵۳ء) اچھے کھاتے پیتے زمیندار تھے۔ اس لیے
انھوں نے بیٹے کو ایک زمانے تک کسی مدرسے میں نہیں جانے دیا؛ تمام تعلیم نجی کے طور پر
خاص اساتذہ کی نگرانی میں گھر پر ہوئی۔ اسی زمانے میں انھوں نے درسِ نظامیہ کا عربی
اور فارسی کا بیشتر نصاب پڑھا جو بعد کو بہت کام آیا۔ اس کے بعد لا محالہ انگریزی کی
طرف توجہ کرنا پڑی۔ بالآخر انھوں نے کلکتہ یونیورسٹی سے دسویں درجے کی سند لی۔
پھر پٹنہ یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا۔ اور یہاں سے یکے بعد دیگرے بی اے، ایم اے
(اردو اور فارسی) اور قانون (ایل ایل بی) کے امتحانوں میں کامیابی حاصل کی۔
شروع میں خیال تھا کہ وکالت کریں گے، لیکن اسی زمانے میں ایک ناخوشگوار حادثہ پیش
آیا جسے انھوں نے "جذباتی صدمہ" سے تعبیر کیا ہے۔ واقعہ کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انھیں
ایک خاتون سے محبت ہوگئی اور وہ اس سے شادی کرنا چاہتے تھے؛ وہ بھی اس پر
رضامند تھیں۔ لیکن بدقسمتی سے لڑکی کے والدین اس عقد کے خلاف تھے؛ ہمارے
ہاں والدین بچوں کے جذبات اور خواہشات کا کم ہی خیال کرتے ہیں۔ قصہ کوتاہ، ان
دونوں کی مرضی کے باوجود ماں باپ نے لڑکی دوسری جگہ بیاہ دی۔ عنفوانِ شباب
اور ایسا حادثہ، غریب کو پٹنے کے در و دیوار سے وحشت ہونے لگی؛ انھوں نے ترکِ
وطن کی ٹھانی اور کلکتے کی راہ لی۔ یہ ۱۹۳۵ء کی بات ہے۔

کلکتے میں انھوں نے بسر اوقات کے لیے وکالت کی جگہ درس و تدریس کا پیشہ
اختیار کیا۔ شروع میں مختلف اسکولوں میں معمولی جگہ اور قلیل مشاہرے پر کام کرنا پڑا؛
لیکن آدمی تھے مستقل مزاج اور دُھن کے پکے، ہمت نہیں ہارے اور ڈٹے رہے۔ اسی
دوران میں (۱۹۳۸ء) بی ٹی کی سند بھی لے لی تاکہ تعلیمی محکمے میں ترقی کا راستہ کھل
سکے۔ ۱۹۴۱ء سے ۱۹۴۶ء تک ملنا پور کالج میں رہے۔ ۱۹۴۷ء میں سرسشا رناتھ

... ن جلد ہی یہاں سے ملازمت
کا سلسلہ منقطع ہوگیا۔
۱۹۴۹ء میں وہ کمیونسٹ تحریک سے وابستہ ہوگئے۔ اس کی پاداش میں قید و بند تک
نوبت پہنچی۔ ڈیڑھ سال کی نظر بندی کے بعد ۱۹۵۱ء میں آزاد ہوئے، تو معلوم ہوا کہ
اب وہ کالج کی ملازمت نہیں مل سکتی۔ مجبوراً ایک معمولی اور مفلسی کے شکار اسکول میں
ہیڈ ماسٹری قبول کرلی۔ یہاں تنخواہ اتنی بھی نہیں تھی کہ اس سے روزمرّہ کے معمولی
اخراجات ہی چل سکتے؛ لیکن مرتا کیا نہ کرتا۔ حسب توقع، دو برس بعد اسکول نے
دم توڑ دیا اور ان کی نوکری کے ماتھے بھی گئی۔ بارے جلد بعد ہی سی ایم او ہائی اسکول
کلکتہ میں ہیڈ ماسٹر مقرر ہوگئے اور اب گویا اطمینان کی سانس لینا نصیب ہوئی؛ یہاں
وہ ۱۹۵۷ء تک رہے۔
۱۹۵۸ء کے آغاز میں کلکتہ یونیورسٹی میں اردو کا شعبہ کھلا، تو لکچرر کی جگہ پر ان کا تقرر
ہوگیا؛ اپنی وفات تک اسی عہدے پر کام کرتے رہے۔
مرورِ ایام سے وہ جوانی کی ناکام محبت کا زخم مندمل ہوگیا تھا۔ اب مادّی آسایش
بھی میسر تھی، اس لیے انھوں نے نومبر ۱۹۵۸ء میں ایک بنگالی خاتون فضیلت النسا بیگم
سے شادی کرلی۔ دونوں ہم مذاق تھے؛ وہ بھی ایک اسکول میں پڑھاتی ہیں۔ جسمانی
یادگار ایک خرد سال لڑکی چھوڑی۔
انھیں ایک زمانے سے دمے کا موذی مرض لاحق تھا۔ آخری ایام میں بعض اور عوارض
نے بھی آگھیرا تھا؛ بالخصوص کم خوابی اور بےچینی کی شکایت پیدا ہوگئی تھی۔ علاج ہو رہا
تھا کہ ۴ مئی بروز ہفتہ طبیعت یکایک زیادہ خراب ہوگئی۔ گیارہ بجے رات غشی
کا دورہ پڑا اور اس کے بعد وہ پھر ہوش میں نہیں آئے۔ اسی حالت میں اگلے دن
اتوار ۵ مئی کو سات بجے شام جاں بحق ہوگئے۔ پیر کی صبح کو جنازہ اٹھا اور گوبرا
قبرستان (۱) میں سپردِ خاک ہوئے۔
پرویز کے والد سید احمد حسین شعر کہتے تھے؛ احمد اور ضو تخلص تھا۔ پرویز نے جب ہوش

سنبھالا تو اپنے ارد گرد شعر و ادب کی باتیں ہی سنیں؛ چنانچہ یہ بھی بہت کم عمری میں شعر سے دلچسپی لینے لگے۔ جب سنِ تمیز کو پہنچے، تو مولانا عین الہدیٰ قمر (تلمیذ سید فرزند احمد صفیر بلگرامی) سے مشورہ کرنے لگے۔ شاہدی کا جزو اپنے ۔۔۔ بیار شاہد حسین کے نام کی مناسبت سے اضافہ کرلیا تھا۔ اگرچہ ان کی تعلیم و تربیت غزل کے دور اور ماحول میں ہوئی تھی، لیکن اپنے سیاسی رجحانات کے باعث انھوں نے غزل کے علاوہ نظم پر بھی توجہ کی؛ اور اس میں اپنا منفرد مقام بنالیا۔ وہ کل ہند انجمن ترقی پسند مصنفین کے بانیوں میں سے تھے۔ ان کے کلام کا ایک مجموعہ "رقصِ حیات" چھپ چکا ہے (مکتبہ شاہراہ دلی، ۱۹۵۷ء)۔ دوسرا "تشکیلِ حیات" الٰہ آباد میں زیرِ طبع ہے۔ افسوس کہ یہ انھیں دیکھنا نصیب نہ ہوا۔ اس کے شروع میں انھوں نے جو پیش لفظ لکھا تھا، اس میں مختصراً اپنے حالاتِ زندگی لکھے ہیں اور اپنے نظریۂ شعری پر بھی ایک نظر ڈالی ہے۔

وہ کمیونسٹ خیالی کے آدمی تھے، لیکن نہ ان کے خیالات میں جارحانہ شدت تھی، نہ ان کی وجہ سے ان کے کسی دوست کو شکایت پیدا ہوئی۔ ان کے تمام ملنے والے ان کی انسان دوستی اور وسیع القلبی، خلوص اور حسنِ نیت کے قائل تھے؛ ان کا کلام بھی اس کا شاہد ہے۔

خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں

ظل عباس عباسی پرنٹر پبلشر نے کوہِ نور پریس دلّی میں چھپوا کر
دفتر علمی مجلس ۱۴۲۹ چھتہ نواب، فراشخانہ، دلی ۶ سے شائع کیا
(ایڈیٹر، مالک رام)

تحریر

علمی مجلس دلی کا سہ ماہی رسالہ

سالانہ ۱۲ روپے — مرتب

اس شمارے کی قیمت ۳ روپے ۵۰ پیسے — مالک رام

جلد (۲)	۱۹۶۸ء	شمارہ (۳)

فہرست

الک رام	ملاحظات	۲
یام الدین حیرت	تذکرہ مقالات الشعراء (مرتبہ نثار احمد فاروقی)	۳
ور الحسن ہاشمی	کلیات تواریخ (سناتھ سنگھ بیدار)	۱۰۳
شہاب الدین دسنوی	وفیات: (نجیب اشرف ندوی	۱۲۱
لک رام	شفا گوالیاری)	

ملاحظات

تحریر کا تازہ شمارہ (۷) حاضر ہے۔ اب کے ہم نے ایک
تذکرہ مقالات الشعرا شامل اشاعت کر لیا ہے۔ یہ حیرتؔ کی تالیف ہے اور آج
شائع نہیں ہوا تھا۔ اسے جناب نثار احمد فاروقی نے مرتب کیا ہے۔ مقدمہ اور حوا
کتابی شکل میں اشاعت کے ساتھ اضافہ کیے جائیں گے۔ ہم چاہتے ہیں کہ اسی طرح
دیگر بعض کم یاب تذکرے جو آج تک منظر عام پر نہیں آئے، شائع کر دیے جائیں

۱۹۶۹ کے پہلے شمارے کو غالب سے منسوب کر دینے کی تج
بہت لوگوں نے خیر مقدم کیا ہے۔ مشکل یہ ہے کہ وقت بہت کم رہ گیا ہے اور غالبؔ
شایان شان معیاری مضامین کی فراہمی کے لیے اس سے کہیں زیادہ وقت درکار ہے۔ ا
ہے کہ شاید پورا پرچہ اس موضوع کے لیے وقف نہ کیا جا سکے۔ اُمید ہے کہ ہم آیندہ
میں مزید تفصیل دے سکیں گے۔

ہم چاہتے ہیں کہ صاحبِ علم حضرات پرچے کی توسیع اشاعت
خاص توجہ کریں؛ یہ اُن کا اپنا پرچہ ہے اور اسے جاری رکھنا بھی ان کا فرض ہے۔

مالک رام

تذکرۂ

مقالات الشعراء

مؤلفہ

قیام الدین حیرت اکبر آبادی



تذکرۂ

مقالات الشعراء

مؤلفۂ

قیام الدین حیرت اکبرآبادی

(ولادت تقریباً ۱۱۴۳ھ/۳۱-۱۷۳۰ء)

نوشتۂ بسال

(۱۱۷۳ھ/۶۰-۱۷۵۹ء)

بہ تصحیح

نثار احمد فاروقی

استاد شعبۂ عربی، دہلی کالج، دہلی

علمی
مجلس
دہلی

پیش گفتار

تذکرۂ مقالات الشعراء اُن (۱۵۹) شعراے فارسی گو کا مختصر تذکرہ اور انتخاب کلام پیش کرتا ہے جو اواخرِ عہد اورنگ زیب (ف ۱۷۰۷ء/۱۱۱۸ھ) سے عہد عزیز الدین عالمگیر ثانی (ف ۱۷۶۰ء/۱۱۷۳ھ) تک ہندوستان میں گرم سخن تھے۔ ان میں وہ شعراء بھی ہیں جو اسی سرزمین پر پیدا ہوئے، اور وہ بھی شامل ہیں جو بیرونِ ملک خصوصاً ایران سے ہجرت کرکے یہاں آئے اور آباد ہوئے۔

مولف کے حالات

اس تذکرے کا مولف اورگرد آور قیام الدین حیرت اکبر آبادی ہے۔ یہ اپنے دور کی کوئی معروف یا اہم علمی اور ادبی شخصیت تو نہیں ہے[1]، نہ اس تذکرے کے مشمولہ شعراء میں، ماسواے چند، وہ کسی سے اپنی ذاتی واقفیت کا اظہار کرتا ہے، لیکن تذکرے کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ اس کو زبان فارسی و عربی سے اچھی مناسبت ہے اور طرز انشا میں ابوالفضل اسکول کا پیرو ہے۔ خصوصاً دیباچے کی

---

[1] حیرت کا حال شعراے فارسی کے تذکروں میں عموماً نہیں ملتا۔ البتہ سفینۂ ہندی مولفہ بھگوان داس ہندی (نسخہ خدا بخش پٹنہ قلمی مکتوبہ ۱۲۲۰ھ ورق ۲۶ ب) پر اس کا مختصر ترجمہ اور چار شعر ہیں جو بظاہر اسی تذکرے سے ماخوذ معلوم ہوتے ہیں۔

عبارت بہت پیچیدہ ہے ۔ الفاظ زیادہ معنی کم ۔ اس کا سبب یہ بھی ہے کہ یہ تالیف زمانۂ شباب کی ہے اور عجب نہیں کہ اپنے مولف کا اولین کارنامہ ہو، ایسے دور میں طبائع عموماً مشکل پسندی اور اغلاق کی طرف مائل ہوا کرتی ہیں ۔

اسی تذکرے میں ایک موقع پر اس نے اپنی عمر ۲۰ سال بتائی ہے[1] ۔ اس لحاظ سے حیرت کا سنہ ولادت ۱۱۴۳ھ (مطابق ۳۱ – ۱۷۳۰ء) قرار پاتا ہے ۔ وہ اپنے والد کا نام شیخ امان اللہ لکھتا ہے[2] اور انھیں "سلمہ اللہ تعالیٰ" کہہ کر یاد کرتا ہے یعنی ۱۱۷۳ھ میں وہ بقید حیات تھے اور آگرے میں حکومت کی کسی خدمت پر مامور تھے[3]

حیرت نے درسیات کی تکمیل رواج زمانہ کے مطابق کی ۔ اپنے اساتذہ میں وہ محمد نعیم نیاز[4] کا خاص طور سے ذکر کرتا ہے اور کہتا ہے کہ ان سے میں نے بہت استفادہ کیا ہے اور "اصلاح شعر و انشا" کے علاوہ بعض کتب بھی ان سے پڑھی ہیں ۔ نیاز کا انتقال تالیف تذکرہ کے دوران ہی ہوا ۔ حیرت نے ان کی وفات پر قطعہ تاریخ بھی لکھا ہے جس سے ۱۱۷۳ھ (مطابق ۱۷۶۰ء) برآمد ہوتے ہیں[5] ۔ نیاز ہی کے دوسرے بھائی محمد لطف اللہ مفتون تھے، ان کا انتقال ۱۱۷۳ھ (۱۷۶۰ء) سے قبل ہی ۲۴ سال کی عمر میں ہو چکا تھا[6] ۔ ان کے حال میں بھی حیرت نے لکھا ہے کہ "جامع اوراق چندے اصلاح شعر از ان مرحوم گرفتہ[7]" ۔ ان کے علاوہ وہ محمد حیات ساکن گوپامئو کو بھی اپنا استاد بتاتا ہے "از بدو طفولیت تا حد بلوغ جمیع کتب متداولۂ فارسیہ از نثر و نظم بخد متش دیدہ ام و فیض ہا از ان معدن بلاغت ربودہ"[8]

تالیف کا سبب

تالیف تذکرہ کا سبب بھی سن لیجیے : احمد شاہ ابدالی نے جب ۱۱۷۰ھ/ ۵۷ – ۱۷۵۶ء) میں دہلی پر پہلا حملہ کیا تو یہاں کی جمعیت کو بڑی حد تک منتشر کر دیا تھا ۔ اس دار و گیر میں بہت سوں کے قدم اکھڑ گئے اور گھر بار بھی

---

[1] مقالات الشعراء (قلمی) ورق ۳۰ ب [2] مقالات الشعراء ورق ۳۰ ب [3] حوالہ سابق
[4] مقالات الشعراء ورق ۷۵ ب [5] مقالات الشعراء ورق ۷۶ ب [6] ورق ۶۸ ۔ الف
[7] ورق ۶۸ ب [8] ورق ۲۹ ب

لٹ گئے۔ انند رام مخلص (ف ۱۱۶۴ھ/۱۷۵۱ء) کے داماد رائے تن سکھ رائے شوق بھی دہلی سے نکل کر سورج مل جاٹ کے علاقے میں آ گئے تھے اور آگرہ میں قیام کیا[1]۔ یہاں انھوں نے خانہ نشین ہو کر وقت گذاری کے لیے ایک تذکرہ لکھنا شروع کیا، اور اس کے لیے کچھ حالات متداول تذکروں (خصوصاً ریاض الشعرا اور مجمع النفائس) سے فراہم کیے اور بعض شعراء سے ذاتی طور پر حالات اور کلام طلب کیا۔ چناں چہ میر تقی میر (ف ۱۲۲۵ھ/۱۸۱۰ء) نے بھی اپنا منتخب فارسی کلام اس تذکرے میں شمول کے لیے شوق کو بھیجا تھا[2]۔ جس میں سے حیرت نے چند شعر انتخاب کر کے اس تذکرے میں درج کیے ہیں[3]۔ اس تذکرے کا نام "سفینۃ الشوق" تھا۔ یہ اب ناپید ہو چکا ہے۔

اسی زمانے میں (یعنی ۱۱۷۰ھ/۱۷۵۷ء) حیرت بھی "یک سال و چند ماہ" شوق کے متوسل رہے[4]۔ انھوں نے لکھا ہے کہ تذکرے کی تالیف سے پہلے رائے تن سکھ رائے شوق کو شعر گوئی کی طرف میلان نہیں تھا، دوران تالیف میں یہ چسکا بھی لگ گیا لہٰذا انھوں نے تین ماہ کے اندر اپنا دیوان مرتب کر لیا جس میں "ہزار و چند" شعر تھے[5]۔ شوق کا ایک مختصر فارسی دیوان خود اُس کے قلم کا لکھا ہوا رضا لائبریری رام پور میں محفوظ ہے[6]۔ (تعداد اوراق ۴۲)۔

تذکرے کے مآخذ

خیر تو اسی زمانے میں غالباً حیرت کو بھی تذکرہ لکھنے کا شوق پیدا ہوا ہو گا۔ انھوں نے آگرے سے نکل کر بھرت پور میں دیوان کشن جی کی ملازمت کر لی[7] یعنی ان کے بچوں کے اتالیق مقرر ہو گئے۔ یہ دیوان کشن جی سورج مل جاٹ (والی بھرت پور) کے طبیب تھے۔ اسی اثنا میں ابدالی کا دوسرا حملہ ہوا (۱۱۷۳ھ/۱۷۵۹ء) اور سکون خاطر برہم ہو گیا۔ زیادہ تر لوگ حفظ ناموس کے خیال سے گھروں میں گوشہ نشین ہو گئے

---

[1] ورق ۵۴ب [2] ورق ۲۷ب [3] ورق ۲۷ب و ۳۷ الف [4] ورق ۵۴ب [5] ورق ۴۷ الف

[6] مخطوطات فارسی، دواوین: رقم ۳۷۰۶۔ اس دیوان کا ترقیمہ ہے "ابیات چندکہ از افکار ناقص فراہم آمدہ بودند بخط شکستہ بستہ خود برین اوراق بطریق یادگار رقمی گردید۔ بروز چہارشنبہ نہم رمضان المبارک ۱۱۷۴ھ واقع قلعہ ڈیگ حررہ احقر الانام تن سکھ رائے متخلص بہ شوق"۔ [7] ورق ۳۰ب

تھے۔[1] حیرت نے بھی وہی تن سکہ رائے شوق والا نسخہ آزمایا۔ ریاض الشعراء، مجمع النفائس سفینۃ الشوق اُن کے سامنے تھے ان کی مدد سے ایک نیا مختصر تذکرہ ترتیب دے دیا۔ اس تذکرے میں جتنے ہندی نژاد شعرا ہیں۔ ان کا ماخذ "سفینۃ الشوق" ہے[2] جو اب دستیاب نہیں ہوتا، اس لیے مقالات الشعراء کی اہمیت دو چند ہوگئی ہے۔ باقی ایرانی الاصل شعرا کے حالات اکثر ریاض الشعراء اور کمتر مجمع النفائس سے مقتبس ہیں اور یہ دونوں تذکرے غیر مطبوعہ ہیں۔ ان تین کے سوا کسی اور تذکرے سے حیرت نے کچھ اخذ کیا ہو، اس کا امکان بہت کم ہے۔

زمانۂ تالیف "مقالات الشعراء" تاریخی نام ہے اور اس سے ۱۱۷۴ھ (۶۱-۱۷۶۰ء) برآمد ہوتے ہیں لیکن حیرت نے خود دیباچے میں لکھا ہے کہ:

"بہ مقالات الشعراء کہ متضمنِ تاریخِ تالیف است بہ نقصانِ پنج شش ماہ موسوم ساختہ"[3]

گویا حیرت اپنے تذکرے کی ترتیب سے جمادی الثانیہ یا رجب ۱۱۷۳ھ (مطابق مارچ۔ اپریل ۱۷۶۰ء) میں فراغت حاصل کرچکا تھا، ابھی ۱۱۷۴ھ شروع ہونے میں ۵-۶ ماہ کم تھے، لیکن تذکرے کا مناسب نام ہاتھ آگیا تھا، اس لیے ایک عدد کی زیادتی کو گوارا کرلیا گیا ورنہ وہ خود دیباچے میں ۱۱۷۳ھ کو "دریں ہنگام" کہتا ہے اور اسی طرح محمد نعیم نیاز کی وفات کا حوالہ "دریں ولا" کہہ کر دیا ہے[4] اور جو قطعہ تاریخ لکھا ہے وہ ۱۱۷۳ھ پر مشتمل ہے۔ اس تذکرے میں کوئی اندراج ایسا نہیں ہے جو ۱۱۷۴ھ یا اس کے بعد کسی سنہ میں اضافات ہونے پر دلالت کرتا ہو، اس لیے یہی سمجھنا چاہیئے کہ ۱۱۷۳ھ ہی اس تذکرے کے شروع ہونے اور ختم ہونے کا سال ہے

حضرت مولانا امتیاز علی عرشی کا خیال ہے کہ " خواجہ محمد ناصر عندلیب نے ۱۱۷۲ھ (۵۹-۱۷۵۸ء) میں وفات پائی ہے۔ حیرت نے ان کا ذکر ایسے لفظوں میں کیا ہے جن سے

---

[1] ورق ۲ ب [2] حوالہ ماسبق [3] ورق ۲ ب

[4] ورق ۷۶ - الف

معلوم ہوتا ہے کہ یہ بقید حیات تھے۔ اس سے یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ ترتیب کا آغاز ۱۱۷۰ھ سے قبل ہوا ہے"[1]

ترجمہ عندلیب میں صرف ایک لفظ "است" ایسا ہے جس پر فاضل مقدمہ نگار نے یہ قیاس کیا ہے، لیکن اس کلمہ کا ایسا استعمال اُن شعراء کے تراجم میں بھی ملتا ہے جن کا انتقال مسلمہ طور پر ۱۱۷۳ھ سے بہت قبل ہو چکا تھا۔

عندلیب کے لیے حیرت نے لکھا ہے: مرد سے صاحب کمال، درویش وضع و متوطنین شاہ جہان آباد است۔ " (ورق ۱۵ ب) اور خود تذکرہ نگار کے قول کے مطابق میرزا لطف اللہ سالم ۱۰۷۹ھ (۶۹ - ۱۶۶۸ع) تک بقید حیات تھے ان کا ترجمہ ں شروع کیا ہے:

" از سادات کشمیر است "۔ (ورق ۴۰ ب) میری ناقص رائے ہیں " از متوطنین شاہ جہان آباد است " اور " از سادات کشمیر است " دونوں ایک ہی طرح کے استعمال ہیں۔ اگر اس کی بنیاد پر آغاز تالیف ۱۱۷۲ھ قرار دیا جا سکتا ہے تو اُس کی روشنی میں سے قبل از ۱۰۷۹ھ بھی کہا جا سکتا ہے۔

خطی نسخے اس تذکرے کے صرف ایک خطی نسخے کا ہمیں علم ہے جو ۱۲۲۸ھ (۱۳-۱۸۱۲ع) کا مکتوبہ ہے اور رضا لائبریری رامپور میں محفوظ ہے۔[2] اسی کو موجودہ متن کا بنیاد بنایا گیا ہے۔ یہ نسخہ اگرچہ بہت صاف اور خوش خط نہیں ہے، لیکن اسے احتیاط سے پڑھا گیا ہے، اور صرف چند اشعار ایسے ہیں جن کی صحت فی الوقت دوسرے ذرائع سے نہیں ہو سکی ان کے سامنے 'کذا' لکھ دیا گیا ہے۔

مقالات الشعراء کا دوسرا خطی نسخہ شاہان اودھ کے کتب خانے میں تھا جس کا ذکر اشپرنگر نے اپنے کیٹلاگ میں کیا ہے[3] لیکن یہ نسخہ اب ناپید ہو چکا ہے۔ اشپرنگر نے اس

---

[1] مقدمہ دستور الفصاحت/۶۱ [2] مقدمہ دستور الفصاحت ۵۹ تا ۶۲

[3] اشپرنگر: فہرست کتاب خانہ شاہان اودھ (انگریزی) طبع کلکتہ ۱۸۵۴ع/ص ۱۵۲ (رقم: ۳۱)

... ...م میں جو فہرست دی ہے اور لکھا ہے کہ اس میں ڈیڑھ سو شعراء کا حال ہے لیکن یہ طباعت کی غلطی ہے، اشپرنگر نے مقالات الشعراء کے تراجم کی جو فہرست دی ہے اس میں ۱۶۰ شعراء کے نام ہیں، ایک ترجمہ جو نسخہ رام پور سے غیر حاضر ہے چھنی لال احسان کا۔

مشمولات کی کیفیت اس تذکرے کے دیباچے کی زبان اگرچہ مشکل ہے، اور تراجم میں بھی کہیں کہیں مرصع طرز نگارش کا میلان پایا جاتا ہے لیکن مجموعی طور پر اس کا اختصار بھی ایک خوبی ہے۔ شعراء کا حال اور کلام دونوں مختصر ہیں۔ صرف چند شعراء مثلاً شیخ علی حزیں[1] مرزا مظہر جان جاناں[2]، تن سکھ رائے شوق[3] اور انند رام مخلص[4] وغیرہ کا انتخاب قدرے طویل ہے ورنہ عموماً چند شعروں پر اکتفا کی گئی ہے بعض شعراء کے ضمن میں لطائف بھی بیان ہوئے ہیں مثلاً شرف الدین علی خاں پیام[5] کا پہلا تخلص 'خرد' تھا، یہ انھوں نے کیوں ترک کیا؟ اس کا لطیفہ حیرت نے درج کیا ہے، جو ضروری نہیں کہ صحیح ہو۔ اسی طرح نواب امیر خاں انجام کے حال میں نادر شاہ کو قہوہ پیش کرنے کا واقعہ (ورق ۹-الف) میر محمد جعفر طہرانی کی وفات کے سلسلے میں ایک خواب کا تذکرہ (ورق ۷ اب) ملا ظفر علی جرأت اصفہانی کے تقریباً چھ سو خربوزے کھا جانے کا قصہ (ورق ۸ اب) خان آرزو اور حزیں کا ایک لفظ پر معارضہ (ورق ۲۹ الف) میرزا محمد منشی تبریزی کا نادر شاہ درانی کی "رسم عالم کشی" پر اعتراض اور نادر شاہ کا جواب (ورق ۶۳-الف) اس تذکرے کے دلچسپ اور اہم مشمولات ہیں۔

نثار احمد فاروقی

---

[1] ورق ۲۵-الف تا ورق ۲۹-الف [2] ورق ۶۹ ب تا ورق ۲۷ ب

[3] ورق ۶۳ ب تا ورق ۶۸-الف [4] ورق ۳۹-الف تا ورق ۴۶ ب

[5] ورق ۱۴-الف و ب

یا فتاح

رب یسّر بسم الله الرحمن الرحیم وتمّم بالخیر

گلشن گلشن گلہاے حمد و ثنا نیازِ جنابِ عالی مجید سخن آفرین کہ فردِ انسان را مظہرِ معنیِ احسن تقویم ساختہ از افرادِ جمیع کائنات امتیاز بخشید۔ و افسر افسر جواہرِ ستایش و سپاس نثارِ حضورِ سامیِ سلطانِ ے کو مجموعہ مخلوقات را بصنائع بدیع مرتّب گردانید، عندلیب را شعلۂ ذوق در دلِ حزین از دست بہ غزل خوانیِ فراقِ گل نغمات است، و سمندر را شررِ سودا ندیم جانِ دردمند از وکہ در بیت النار لمین د ثبات سوزان است۔ عالمی کہ مفہومِ مثنوی ایّام و مقطعات اسابیع[1] و قصائد شہور و سنین ہر قدرتِ متینِ کاملش برہانِ ساطع است، ای صہبای خم خانۂ تحمید آگاہ شو، و نشاءِ دیوانگی از سر واکن کہ مدح جامعی کہ اختتامِ نسخۂ گرامی تذکرۂ نبوت بنامِ معجز نظامِ عارفِ اسرارِ ربّانی واقفِ حقائقِ سبحانی فلتحِ ابوابِ ہدایت، حاکمِ ملکِ رسالت (۲ لف) فصیحِ شیرین تکلّم محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم، کہ فروغِ نیّرِ عظمت و ضیاے کوکبِ جلالتِ او در اعدامِ ظلامِ کفر مانندِ نورِ خورشید در ازالۂ سوادِ شب پرداختہ، و ایمای انگشتِ شہادتِ او شغفِ دو نیم گشتن در دلِ ماہِ سالم انداختہ، فرمودہ و سفینۂ تکوین را بر باعیِ ذواتِ اربعۂ مقدسہ کہ از ہر چہار مصراعش یعنی وفا و حشمت و حیا و جرأت واضح است، و مخمّسِ نفوسِ خمسۂ مطہّرہ کہ ہر یک مصرعۂ برجستۂ دیوانِ آزادی و رضا و مطلعِ منتخبِ قصیدۂ جود و سخاست مزیّن نمودہ، از تو بے نوا چہ آید، و بیانِ صفاتِ او را چون تو نارسای بسملِ دشنۂ حسرت نشاید۔

زلافِ حمد و نعت اولی است بر خاکِ ادب خفتن

سجودی می توان بردن درودی می توان گفتن

اما بعد، می گوید ذرّۂ خاکسار خادم و فداے اصحابِ غیرت قیام الدین حیرت کہ چون در ایّام

[1] اصل: اصابیح۔ حاشیے پر باریک قلم سے کسی نے لکھا ہے: یعنی ہفتہ۔

ندارد یاد ایامِ جدائی چشمِ مستِ او — شمارے نیست در پیشِ فرنگی سالِ ہجرت را

عشق مارا تیزتر کا آورد — غم ز یعقوب صبر از ایوب

شیخ ایجادِ عوی لقوی نخواہد رفت پیش — عالمِ آب است این واللہ جائے زُہد نیست

ابروش را نتوان گشت حریف — تیغ پیشش سپر انداختہ است

با روزِ ہجر حرف مزن آب می شود — بشنو دلِ من است ستم گر دلِ تو نیست

بہ ثمین (الف ب) عشقِ تو ممنونِ عالمی شدہ ام — کدام دل کہ درو جائے آرزوی تو نیست

نگداخت از چہ لعلے دلش گر ز سنگ نیست — یاقوت را کہ پیشِ لبِ یار رنگ نیست

یارب زیادہ زین نپسندی خرابیش — مسکین دلِ من است دیارِ فرنگ نیست

اے توبہ زہرۂ تو چرا آب می شود — آوازِ قلقل است صدائے تفنگ نیست

بے ہوشی کہ تا بہ قیامت نمی رود — کیفیتِ خطِ تو بود کارِ بنگ نیست

از خرامیدنِ او تا سبقِ ناز گرفت — خاکِ ما خیلِ تذروی شد و پرواز گرفت

دمِ عیسیٰ کہ بہ بیمار شفا می بخشد — از خطِ پشتِ لبت نسخۂ اعجاز گرفت

نقاشش رخت چو دیدہ باشد — کارش بکجا کشیدہ باشد

گلرخان تنگ دلم خاطرِ من شاد کنید — چون شود بندِ قبا باز مرا یاد کنید

پند گو با منِ حیرت زدہ بیجاست جدل — بحث با صورتِ دیوار چہ معنی دارد

شدیم در فنِ اشعار پیرو غیر از خود — سر کسے پئے تحسینِ ما نمی جنبد

عشق روزے کہ بدل خلعتِ سودا بخشید — جامہ واری بمن از دامنِ صحرا بخشید

خجل از روی حبابم کہ درین ظرفِ تنک — ہر چہ در کاسۂ[1] خود داشت بدریا بخشید (الف)

از جا نمی روند بر آتش نشستگان — زین دودمان برآمدہ پرنا خلف سپند

ای زخمِ دل ز بہ شد نمت در خجالتم — بے دردِ ہائے چشم تری داشتی چہ شد

تا چند انتظارِ قیامت کشیم ما — بر خاکِ کشتگان گذری داشتی چہ شد

---

[1] اصل: کالسہ

بود از مرگ بدتر انتظاری کشتگانت را
تو بر پاکن ز قد محشر، قیامت دیر می آید

فرشته را چو به کوے بتان گذار افتد
عنانِ دل بدو دست دعا نگه دارد

می شناسد که چه در وصل و جدائی باشد
هر کرا عضو ز جا رفته بجا می آید

ناخوانده نامه بر سرِ قاصد زدی زنار
پیغام اشتیاقِ مرا این جواب بود

گر بروے تو زلیخا مژه را وا میکرد
آنچه در خواب ندیده است تماشا میکرد

چو آن جامه که می بافند در وصفے سورهٔ قرآن
قماشِ حسن از خط واجب التعظیم می گردد

بے دماغم از پریشان اختلاطیهائے دل
گر بزلفش بر خورد با من نگوید شب بخیر

در دامنِ یار داغِ مے نیست
بدمستیِ او شگفته گل گل

چو نگذاری که من روزے ترا در دست و پا افتم
ببوسم سایهٔ ات را دست و در پاے حنا افتم

این دل که هست باعث خاموشیِ لبم
قفلے که بود بر درِ خود از درون زدم

کین دل ما آخر از ان شوخ کشیدی
ای آئینه ما قدر تو نشناخته بودیم (۵ ب)

بتقریب عجب بودم رفیق محتسب عمرے
پئے تاراج مے تا خانهٔ خمار می رفتم

اے زلیخا ز خریداری یوسف بگذر
بندهٔ عشق شدی ترک خداوندی کن

آرزو بهر خلاص از غم عجب تقریب بود
شد جدا یار و نمردی در فراقش وائے تو

بقربان دیوانهٔ می روم
که در دست طفلی است زنجیر او

ز تو چشم مهربانی دگر اے فلک ندارم
شب هجر بود ممکن که سحر کنی نکردی

قیامتم بسر آورده پس از مردن
زجانِ من دگر ای آسمان چه میخواهی

زلفت که از نظم جهانِ حسن است
نازل شده سورهٔ بشانِ حسن است

خطت که برو شد است خوبی همه ختم
پیغمبر آخر الزمانِ حسن است

۲- میرزا اسمعیل ایما - موطنش اصفهان است با بعضے شعراے آنجا مثل میر نجات و شفیعاے اثر هم طرح و هم عصر بوده، خوش فکر و صاحب تلاش است از وست:

مال ظالم می شود دائم نصیب دیگران
شمع هرگز خانهٔ زنبور را روشن نکرد

بے وعده آمد امشب آن مرهم دلِ ریش
هم چون گلے که آید در غیرِ موسم خویش

نمکے بود نگہ تیزی در دلِ دیوانہ ام   خوش ہوا از پستی دیوار باشد خانہ ام

۳ - احمد علی خاں امین (۶ الف) - مولدش قم کہ شہرے است از شہرہائے مملکت ایران و از اقربائے برہان الملک سعادت خاں بودہ در عہد سلطنت اورنگ زیب عالمگیر بہ ہندوستان وُرُود نمودہ بہ منصب سرفرازی یافت و در زمان فردوس آرام گاہ در جنگ نادرشاہ کہ بکرنال واقع شدہ بود، بہ شہادت رسید، او راست۔

سرفرازیم زپا بوسِ توای مایۂ ناز   سایۂ سرو قدت کم نشود از سرِ ما

۴ - امیر احسنی - نامش میر غلام علی، و وطن گوالیار است، خانِ آرزو مغفور اوائلِ مشقِ سخن، اشعارِ خود را از نظرش می گذرانید۔ یک بیت ازو بہ نظر رسیدہ۔

شانہ را آہستہ زن مشاطہ بر گیسوی او   رشتۂ جان من است ای بے خبر ہر موی او

۵ - میرزا محمد امین ازل - در سخن سنجی قدرت تمام و صحبت ارباب فضل و کمال را بغایہ دوست می داشت و اکثر اوقات در انزوا و عزلت می گذرانید در ایام محاصرۂ اصفہان کہ در سنہ یک ہزار و یک صد و سی و سہ (۱۱۳۳ھ) افواج افاغنہ از قندہار یورش نمودہ مدت یک سال و کسری شہرِ مسطور را محصور نمودہ بودند، (۶ ب) بعد ازان بتصرف آنہا در آمدہ ہفت و نیم سال زمام سلطنت آن مملکت بہ قبضۂ اقتدار آن جماعہ خونخوار ماندہ، وفات یافتہ اند

دل جفاسے کہ از ان زلفِ گرہگیر کشید   نتوان گفت کہ دیوانہ ز زنجیر کشید

گر خرابم کنی ای عشق چناں کن بارے   کہ نباید و گرم منت تعمیر کشید

پیش تشریف رسای کرمِ دوست ازل   خجلت از کوتہیِ قامتِ تقصیر کشید

شنیدم از زبانِ شمع و روشن گشت بر من ہم   کہ یک شب اختلاطِ خلق جان بگداز دو تن ہم

۶ - معز زخان افسر - نامش محمد علی بیگ بودہ و موطنش ایران - ابتدائے سلطنت فرخ سیر در رفاقت تعرب خان خانساماں بسر می برد و آخر بوسیلہ اش بصوبہ داری بنگالہ سرفرازی یافتہ بود، از وست۔

بآن اکراہ در آئینہ عکسِ خطِ خود بیند   کہ پنداری بہ مصحف می کند نظارہ ترسائے

۷ - نظام الملک آصف جاہ - از امرایانِ عالی تبار و خوانینِ والا مقدار است

چون حسب و نسب آن گرامی مرتبت بر همگنان[1] مثل آفتاب روشن است احتیاج به نوشتن ندارد بمقتضاے موزونی طبیعت اکثر اوقات عنانِ توجه بسوی نظم اشعار معطوف (۷ لف) می داشت. او راست۔

آہِ درد آلود می باید مرا — نغمۂ داؤد می باید مرا
عارض بے خال و خطِ پُر دلربا است — آتش بے[2] دود می باید مرا
تا رخ آن ماه تابان بنگرم — طالع مسعود می باید مرا

۸۔ قزلباش خان اُمید۔ نامش محمد رضا بود و مولدش ہمدان و در اصفہان نشو ونما کردہ و تخلص از میرزا طاہر وحید یافتہ اوائل عہدِ بہادر شاہ وارد ہندوستان گردیدہ بذریعہ نواب ذوالفقار خان بہزاری منصب و خطاب قزلباش خانی ممتاز و مخاطَب شد آخر برفاقت نواب آصف جاہ در دکن رفت و ترقیات نمایان بحالش راہ یافت در سنہ یک ہزار و یک صد و چہل و یک ہمراہ نواب مرحوم سطور بہ شاہجہان آباد رسیدہ بعد مراجعت نادرشاہ از ہندوستان از رفاقت باز ماندہ قریب دوازدہ سال ہمانجا سکونت اختیار کرد در موسیقی مہارتِ عظمیٰ داشت و با وصفِ ولایت زائی لغہم دقائقِ موسیقی ہندی خوب میرسید، در سنہ یک ہزار و یک صد و پنجاہ و نہ (۱۱۵۹ھ) بمرض سکتہ رخت ہستی بسوی عالم بقا کشید دیوانش قریب بہفت ہزار بیت (۷ ب) خواہد بود از آن جملہ است:

کفر و دین بر گردنِ ما بستہ اند — رشتۂ تسبیح و زناریم ما
زندہ می سازی بحرفے از نگاہی می کُشی — آفرین بر سحر و رحمت باد اعجاز ترا
گر بپرسند کہ امید چرا نالانی — ای ستم پیشہ بغیر ما چہ جواب است مرا
پیش آن غارتِ گر جان دل ندارد قیمتے — راہزن کے قدر داند گوہر دزدیدہ را
وعدۂ بوسہ زغم می کند آزاد مرا — می توان کرد باندک سخنے شاد مرا

---

[1] اصل: ہمگیان [2] اصل: دل دود

بوسه خواهم از لبی که ز شرم | هیچ کس را نداده است جواب

من نمی گویم گل و باغ و بهار از دست رفت | یک بهار آرزو یعنی که یار از دست رفت

گفتمت ای دل ترا کاری بکار من مباد | آنقدر بی طاقتی کردی که کار از دست رفت

چنان که روی ترا نیست نسبتی با گل | تفاوت از من و بلبل هزار چندان است

نتوانست به سر منزل تاثیر رسید | ناله را از دل او پای به سنگ آمده است

جز میکده ها دگر ندیدیم | جائی که ز خویش می توان رفت

امید چه گویم که از آن وعده فراموش | صد حرف شنیدیم و یکی یاد نمانده است

روی تو هر که دید به مصحف شبیه گفت | هر کس شنید ذالک لاریب فیه گفت

امروز جامه بهر چه برتن درید صبح | آیا فسانهٔ شب ما را شنید صبح (۸ الف)

دیده گریان می شود از دل چو آهی می کشم | آری آری راست باشد باد باران آورد

اشک و آهم صبر و طاقت از دل بیتاب برد | پارهٔ را سوخت آتش پارهٔ را آب برد

شمشیر جور و خنجر کین می کشی چرا | قطع امید از تو با اینها نمی شود

بودیم بدوستیش خورسند | این نیز نصیب دشمنان شد

از خرابات به مسجد چه کنی تکلیفم | برو ای زاهد بیکار که فرصت دارد

تو که از شیشه شکستن نکنی شرم بگو | محتسب توبه شکستن چه قباحت دارد

یادی ز صحبت من و آن شوخ میدهد | در صحن باغ خندهٔ گل گریه های ابر

چون نماند بحیرت (ا با ی) | چشم آئینه شد بروی تو باز

شب که درستی از آن لب کام دل می خواستم | بوسه داد از حجاب و بی تامل گفت بس

شد حرف رقیب پیش او سبز | امید بگو دگر چه حاصل

رفت قاصد که برد نامه مرا گفت خمش | این خط از نامه سیاهی است که من میدانم

رفتن از قهر شب آمدن از مهر بروز | عذر بدتر ز گناهی است که من میدانم

یار گفتا این سراپا بیم کیست | گفتمش دیوانهٔ امید نام

شوق گستاخانه زان لب بوسه درخواست (۸ ب) کرد | این گنه بر ما گرفت و از کرم بخشید هم

من واماندہ را چون نقشِ پا از ناتوانیہا | بکویت آمدن بسیار دشوار است و رفتن ہم
گفتی کہ بیک بوسہ کنم کام تو شیریں | قربانِ دہانِ تو بگو بار دگر ہم
نمی ترسم زبیم کشتن ای ترک جفا مشرب | تو خنجر میکشی من نیز بسم اللہ می گویم
روشن شود بہ پیشِ تو چون شمع سوزِ من | یک شب اگر تو ہم بہ نشینی بروز من
رقیب دیدۂ ما ہم بسرمہ محتاج است | بخاکپا ے کسے دیدہ را سیاہ مکن
بے رحم دیدہ اند زبس چشم یار را | برگشتہ اند آن مژہ ہای سیاہ ازو
فرش است چشم منتظر آن ہم چو نقش پا | ہر جا کہ میروی بخدا دیدہ دیدہ رو
تو کہ از دل بروں نیامدۂ | ایں قدر شوخ از کجا شدۂ
رہ آمد شد کویت چرا مسدود شد آخر | اگر صلح است پیغامی دگر جنگ است دشنامی

۹ - نواب امیر خان انجام - از امرایانِ عظام عہدِ فردوس آرام گاہ است و علوشان
در رفعت منزلتش اظہر من الشمس، دراوافہمی و بذلہ سنجی و لطیفہ گوئی و حاضر جوابی و موسیقی
دانی عدیم المثال بود در سنہ یک ہزار (۹ ب) یک صد و پنجاہ و نہ بہ صحن قلعۂ شاہ جہان آباد
زدست ملازمی بزخم جمدھر شربت شہادت چشید - از وست -

سرِ شکم کم نمیگردد بسعی چشم تر بستن | کہ نتوان شد رہ سیلاب را مانع ز در بستن
پئے آسودگی انجام صید لاغر ما را | ز تار عجز باید رشتۂ بر بال و پر بستن

نقل ہنگامے کہ نادر شاہ بر ہندوستان تسلط داشت روزے ہر دو بادشاہ در دیوان
اص نشستہ بودند کہ قہوہ[۵] آوردند فردوس آرام گاہ امرِ ساقی گری بنواب امیر خاں فرمود آداب
باآورد و پیالہ پُر کردہ در دل اندیشید کہ اگر جام اوّلین بدستِ نادر شاہ می دہم موجب تحقیر
شاہِ خود است و اگر بدست محمّد شاہ میدہم شاہ غیور و سفاک[۶] است ہمیں ساعت حکم بکشتن
کُند لختے تامل کردہ پیالہ را بدست محمّد شاہ داد و گفت کہ شاہ مہمانست حضرت از دست مبارک
پیالہ اول را تواضع نمایند ایں حرکت او ہر دو بادشاہ را پسند افتاد و زبان بہ تحسین کشودند۔

---

۵ بین السطور (ر شاہ بر ہا) ۶ بر حاشیہ : خون ریز

۱۰- اسدیارخان انسان - از رفقای (۹ ب) نواب امیرخان مغفور مذکور بوده و بوسیله اش ترقیات (نموده) چنانچه بصوبه داری کشمیر و بخشی گری رسالهٔ شمشیرداغ، و خطاب اسدالدوله سرفرازی یافته بود و هنگامے که نواب به نظامت صوبه اکبرآباد مامور و مشتغل بود خانِ مسطور با مرو کالتش بحضور می ماند فردوس آرام گاه نظر به لیاقت او در کمتر زمان نوعی متعقد حالش گردیده که چون نواب بحضور رسیده رشک بر مرتبه اش می برد از وست -

از کوے یار باز سفر میکنیم ما　　فردا قیامت است خبر میکنیم ما

۱۱- اسحاق خان اسحاق تخلص - از امراے عهد فردوس آرام گاه است گویند که شاهد ذات او بحلیه کمال آراسته و بلباس حسن خُلق پیراسته بود در سنه یک هزار و یک صد و پنجاه و دو (۱۱۵۲ھ) بعد رفتن نادرشاه بدیوانی خالصه سرفراز شاه بود و در همان سال رخت حیات ستعار را از برکشید او راست -

خداکند که گرفتار نازِ خویش شود　　کسے که آفت صبر من از تغافل بود
شگفته آید گوهر اشکم بچشم　　بسکه در دل می خلد پیکانِ او
(۱۰ الف) باردر هرگز نمی گردد چنار　　دستِ صاحب جوهران خالی بود
برائے جستنِ دل سینه را که کافته ام　　سوائے درد تو چیزے دگر نیافته ام

۱۲- شاه فقیرالله آفرین - از متوطنین لاهور است مردے درویش از اهل تصوف صاحب ورد بوده اوقات خود را مصروفِ عزلت وانزوا میداشت عبدالصمد خان و زکریاخان صوبه دارانِ آن شهر پاس تحریم و تکریمش می نمودند در فن شعر صاحب قدرت ست از وست -

دل قبله و نیاز نمازِ دوام ما　　گردانیدنِ رخ است ز دنیا سلام ما
پخته کے خواهد شدن سودائے خامِ عاشقان　　مصلحت بینی که دل نام است خود دیوانه گرفت
آفرینِ خاک شد اعضا و همان بے تابم　　بال و پر ریختیم و شوخی پرواز بجاست
آفرینِ دستے که وامی کرد آن بندِ قبا　　حلقهٔ احتسب بر در چاک گریبان می زند
عزتے نیست هنرمند حوادث زده را　　هست بے قدر چو آن نسخه که ابتر باشد

یار ساقی بزم خالی از رقیب   هرچه بادا باد می خواهد دلم

از شبِ غم تا کشیدم آتش افشان ناله (۱۰ب)   بر لب ما کرم شب تاب است هر تبخاله

۱۴۳- محمد صلاح بیگ آگاه - برفاقتِ معنی یا بخان شاعر که در حرف شین مذکور خواهد شد می بود، و چندی همراه غلام محی الدین خان دیوان بیوتاتِ سرکار والا نیز بسر برده اوراست.

کار از دانهٔ تسبیح روا می گردد   عقده از نامِ خدا عقده کشا می گردد

هوای دیدنِ آن ماه رو از بس بسر دارم   نمی خواهم که هم چون مهر چشم از نامه بردارم

۱۴۴- راجه دیا مل امتیاز خلفِ اصغر رائے بهوکن مل کایسته که بدیوانی نواب اسد خان وزیرِ محمد اورنگ زیب عالمگیر سرفرازی داشت بوده و خودش مدتے بدیوانی سرکار نواب غازی الدین خان فیروز جنگ پسر نواب نظام الملک مذکور، و من بعد تا بقاے حیات خود بدیوانی نواب وزیر الملک غازی الدین خان بهادر بن غازی الدین خان مرحوم مسطور که درین ایام بسببِ استیلاے خیلی از دیوانِ مردم آزار و گروهی موذیانِ ستم شعار یعنی افاغنهٔ بد نهاد که بقصدِ ایذاے عالم، بر نزهت آبادِ هندوستان تاخته اند، و ساحرانِ دکهن که فسونِ دمِ شمشیر شان (۱۱ الف) سرکشان بلاد و امصار را در شیشهٔ اطاعت خود فرود آورده، از غلبه هراسِ آنها سحرِ شجاعت و مردانگی یک قلم فراموش ساخته خلقے از بیم آسیبِ این بلیهٔ ناگهانی مساکن گذاشته رو باطراف و جوانب نهاده اند، در بهرت پور تشریف وارد، اشتغال داشت صاحب طبع عالی بوده و در نظم و نثر دست گاهِ رسا داشته از وست.

کے شود بے شورش دریا عیان روے حباب[2]   شاهد سوز درون باشد همین تبخالِ ما

خو با غبارِ جلوه گهِ یار کرده ام   در دیده هم چو گرد بود توتیا مرا

زاهد از قصه حسن تو ز خود رفت بجاست   سایه از پرتو خور در پس دیوار گریخت

بے روے تو جان ز دیدهٔ تر   پُر کرده قدح در انتظار است

از راحت و فراغت کنج عدم مپرس   در زیر خاک هر که بیا سود بر نخاست

---

[1] اصل: بهوکینل   [2] اصل: حُباب

آشفته کرد عاقبت اجزای جمع خویش
از باغ دہر ہر کہ چو گل زود بر نخاست

دریادِ خالِ عارضِ او بسکہ سوختم
چون داغ لالہ ز آتشِ من دود بر نخاست

۱۵۔ میرزا ارجمند آزاد پسر میرزا عبدالغنی بیگ (۱۱ب) قبول است کہ در حرف قاف مسطور است او راست۔

بجامِ تلخِ صبر آسان علاجِ ظلمِ ظالم کن
نباشد بہتر از می چارہ سرمای عقرب را

بکعبہ بی دل روشن نمی توان رفتن
کسی بخانہ تاریک بی چراغ نرفت

می کِشم آن دو لبِ میگون را
نشا تمین است بکامم امروز

گل گشت باغ بی تو مرا بسکہ جان گزاست
آواز عندلیب بگوشم ہزار پاست

حرف الباء

۱۶۔ میرزا مہدی بیان۔ ہمشیرہ زادۂ ابو طالب کلیم بودہ و در ادا بندی ونازک خیالی گوی سبقت از معاصران می ربودہ کم فکر و بامزہ گوست۔ در عہد محمد اورنگ زیب عالمگیر بہندوستان وارد شدہ بود امار وزگار ماوی مساعدت نکرد و در دکھن رفتہ رحیلِ دار البقا گردید از وست۔

آنکہ کج بہرِ ستم ساختہ شمشیر ترا
راست کرد است برائی دل ما تیر ترا

بہ کی بوسہ اش سر میدہم چون زر نمی گیرد
خیالی کردہ ام با خویش اما سر نمی گیرد

بیان خاکِ رہت گردید عمریست
بزیر پا نگاہی میتوان کرد

شب حنا بست و دلِ خلقی زکف امروز لبست
خوب دستی آن بت بیداد گر و (۱۲ب) کردہ است

بسکہ تیغش ستم بدلہا کرد
دہن زخم را بخود وا کرد

داغ جای برائی خود میخواست
تن چو دادیم دست پیدا کرد

۱۷۔ میرزا محمد شفیع تسبمل از اکابرِ بلدہ نیشاپور و عمِ نواب ابو المنصور خان صفدر جنگ مغفور است کہ در زمانِ سلطنت میرزا احمد خدمت والای وزارت بوی تعلق داشت در تقوی و صلاح کامل و اکثر علوم و فنون را ماہر بودہ از وست۔

گردِ ہستی را بآہی میتوان بر باد داد　　این قدر بسمل غبارِ خاطرِ قاتل مباش

در دیار زندگانی فرصتِ آرام نیست　　ابلقی چون روز و شب در زیر ران داریم ما

۱۸- شاه خلیل الله بینوا پسر خلیفه ابراهیم از سالکانِ مسالکِ طریقت و ناهجان مناهج حقیقت بوده و کسب سعادت از پدر خود نموده وطنش دهلی است و شعرش بیش تر رباعی و اکثر مطالب تصوف و توحید را دران نظم می فرماید او راست۔

من آب شدم سراب دیدم خود را　　دریا گشتم حباب دیدم خود را

آگاه شدم تمام دیدم غفلت　　بیدار شدم بخواب دیدم خود را

۱۹- میرزا بدیع پسر میرزا طاهر نصر آبادی است (۱۲ ب) از پدر تربیت یافته در فن شعر و انشا دست گاه عالی داشت و بیش تر اوقاتش مصروف فکر و سخن بوده علی الخصوص تاریخ گوئی را بدرجهٔ رسانید که هیچ کس را قدرت هم سری او نبود جهت عمارات بادشاهی قصائد و قطعها گفته که هر مصرع تاریخ باشد در تاریخ یکے از عمارات شاه سلطان حسین قصیده زیاده از صد بیت نظم کرده که از [illegible] اولش تاریخ بنا و از مصرع دوم تاریخ اتمام عمارت که تفاوتِ یک سال داشت بر می آید باعتقاد جامع اوراق این امر کمتر از کرامات نیست۔ بادشاه در صله آن بخلعت فاخره و چند هزار روپیه نقد سرفراز فرموده بود چند سال قبل از اختلالِ سلطنت وفات یافته و همانجا مدفون گشت و نصرآباد قریه ایست متصل باصفهان - ازوست۔

گریه ہائے سرد زاهد را نماید کار سست　　می شود از ریزشِ بارانِ دی دیوار سست

شد عرش سیر نالهٔ زنجشیانِ اثر　　هر کس بهر کجا رسد از جود میرسد

در مکتبِ آفرینش استاد علی است　　عالم همه بنده اند آزاد علی است

آمد نمک و (۱۳- الف) علی موافق بعدد　　یعنی نمک سفرهٔ ایجاد علی است

۲۰- آقا صالح برهان مولدش مازندران است و از مدتے در هندوستان اقامت گزیده متوکلانه معاش می نمود در روز قتل عام شاهجهان آباد مجروح گشته بعد چند روز بهمان رنج ازین سرائے فانی سفر بعالم جاودانی کرد قصیدهٔ در مدح نادر شاه گفته باخود میداشت و می خواست که بوسیلهٔ کسے از مقربان بنظر شاه بگذراند اما مرگ فرصت

ندا و اوراست.

خلاصی خواهی از قید علائق گوشه گیری کن
نیارد رنج صیادے بدام خویش عنقا را

زنده ام کن که روم باز بقربان سرت
تا بکے صبر کنم روز قیامت دیر است

کنندش خلق دائم چو بکاری
بلند آوازه هرکس گشت چون کوس

آب گشتیم از این شرم که چون ابر چرا
قطرهٔ در جلو برق سواری نزدیم

چنان رنجور گردیدم ز هجر تار گیسوے
که هم چون خامه گردد سد راه من سر مویے

۲۱- محمد باقر بیگ - از امرا زادہ ہاست، آئینہ وجودش صورت نمای اکثر کمالات و حسنات بوده برفاقت نادر شاه در هندوستان نیز رسیده (۱۳ ب) و بعد از مراجعت شاه در ایران بخدمتے مامور گردیده بود با آنکه خدمت را موافق حکم سرانجام می نمود ولے که بحضور جمیع امرا معاتب شد از فرط غیرت بکار دے که در کمر داشت رو بروے شاه خود را ہلاک ساخت خانو الهٔ مرحوم نوشته که هنگام ورود شاه جهان آباد این ابیات خود را بخط خود نوشته بمن داده بود۔

دامے نگسستم قفسے را نشکستم
صیاد جفا پیشه چرا بست پر ما

بردند زکف قوت گیرائیم افسوس
روزے که رسانند بدامان تو دستم

هر سبزه که از خاک شهیدان تو برخاست
چون لالهٔ دل سوخته داغ جگری داشت

۲۲- میر شرف الدین پیام - سخن سنج شیرین کلام بود و در انشا نیز صاحب دستگاه عالی، وطنش فیض بنیاد اکبرآباد است، وقتے در شاهجهان آباد نیز بسر کرده با شعراے آنجا مثل خان آرزو مغفور و رائے انند رام مخلص وغیرها باهم صحبت می بود و در سنه یک هزار و یک صد و شصت و شش (۱۱۶۶ھ) وفات یافته او راست۔

جز عزیز القدر یوسف را کجے نوشته است
از غرور میرزائی شوخ بے پروا ست (۱۴ ا)

بس از عمرے قضایش داده است ای هم نشین حیف
کشاد کار من موقوف بر دل بستن است امشب

ناله می رقصد مگر گوشش بفریاد من است
می طپد دل شاید آن بے رحم در یاد من است

یار از خانه بر نمی آید
زندگی در نظر نمی آید

از رفیق غریب یعنی دل | مدتے شد خبر نمی آید
بے خبر می رود خبر شرط است | عمر بار دگر نمی آید
ساخت است آئینہ سان با خوب و زشت روزگار | دل بہر صورت کہ باشد زندگانے می کند
رحم کن صیاد بر باغ خراب سینہ ام | گاہ گاہے بلبلے اینجا صفیری می کشد
شام شد آہ نقاب از رخ او دور نشد | صبح امید غریبان ندمید است ہنوز
دل از دستم ربودن باز برفرقم زدن یعنی | بتو صد بار گفتم انچہ من دارم ہمین دارم

(نقل) شنیدہ شد کہ میر مسطور اول خرد تخلص می نمود، روزے در ایام مبارک ماہ صیام لسے وارد شد و ہنگام افطار دال نخود آوردند شخصے کہ قسمت می کرد حصہ میر را پیش از ہمہ رسانید روے بخوردن نیز اقدام نمود ہر گاہ قسمت تمام شد کسے را نظر بجانب میر افتاد گفت کہ فلانے را (۱۴ ب) دال نرسیدہ میر گفت کہ من دال خود را خوردم، آن کس از راہ ظرافت نظر بہ تخلص میر گفت کہ خوب گردید کہ دال خود را خورد ید، میر بدین رمز پے بردہ از ان روز متخلص بہ پیام گردید۔

۲۳ - خواجہ احسن الدین خان بیان۔ مجمع خوبیہائے بے شمار است و معدن مکارم ہزاران ہزار، اگرچہ مولدش اکبر آباد است اما از مدتے در شاہجہان آباد توطن گزیدہ بہ ولائے صاحب خداوند خیلی اتحاد و ارتباط دارد، ہنگامے کہ این زلّہ ربای مائدہ ارباب سخن بمقتضائے قسمت آب و دانہ وارد شاہجہان آباد بود تفقد آن بزرگ منش زیادہ از انچہ کہ متصوّر شود بحال خود مشاہدہ می نمود حسن خلق و وفور مروّت با علو ادراک و رسائی طبیعت در طینت او جمع است و این اشعارش برین معنی گواہ - از وست:

بیک وا کردن بند قبا وا دوم دل و جان را | بیک افشاندن دامان دہم برباد ایمان را
این قدر زلکہ ہلاک عاشق مسکین چرا | وعدۂ امروز کردن آمدن فردا بس است
چو پرسیدم بیان را دیدۂ تو | تامل کرد و گفتا دیدہ باشم
اگرچہ ز (۵ الف) کوہ تمکینم چو بنشینم از جا | نمی خیزم ... اگر چہ باستقبال برخیزم
زدامان دراز خوش خرامان چشم اندازم | کہ گر سازند چون خاک رہم پامال برخیزم

۵ اصل: زلہ

سیم بازو دل مارا که بردهٔ | چین بر جبین فگنده بگفتا سپردهٔ
آنی تو که بی تو زیستن نتوانم | دانی تو که بی تو زیستن نتوانم
گر از تو دمے جدا شدم می میرم | جانی تو که بے تو زیستن نتوانم

حرف التاء

۲۴ - ملا محمد تقی تعظیم مولدش یکے از قصبہ ہاے مازندران است و تحصیل علم در اصفهان نموده و صحبت اکثرے از شعرا دریافته به یمن تاثیر خدمت ایشان در کمترزمانی نام بشاعری بر آورد تا استیلاے افاغنه بقید حیات بوده او راست۔

اے گداے نمک حسن تو سلطانے چند | بندهٔ مورِ خطت گشته سلیمانے چند
یک گریبان زغمت چاک نمود از رقیب | دست رس بود مرا کاش گریبانے چند
آسان نیامد است بکف دامنِ وصال | از جان گذشته ام که بجانان رسیده ام

۲۵ - رحمت الله تمکین از متوطنین کشمیر است و شاگرد میرزا عبد الغنی بیگ قبول و در شعر بطور استاد ایهام را بسیار مائل است۔

هست بے مهر ماه پارهٔ من | شاید این بود در ستارهٔ من
خاموشیم ز وصفِ خط او نه از دست | هر چند هم چو خامه زبانم بریده است
ز فکر شعر کے از تیره روزی باز می مانم | سلوکِ راه معنی سر نوشتم چون قلم باشد

۲۶ - سید رضا تمکین از اولادِ شاه نعمت الله ولی است سرخوشِ بادهٔ حقائق عرفان بوده مولد او قم است و بهندوستان نیز رسیده در بارگاه فردوس آرام گاه د احمد معزز و موقر بود او راست۔

خاک راهِ او شدن گر دسترس باشد مرا | کے بغیر از نقشِ پا گشتن هوس باشد مرا
سینه خالی نیست در هر صورت از آه و فغان | ناله چون در دل گره گردد جرس باشد مرا
خواست در پرده کند شمع رخش جلوه گری | طرح این گنبدِ حیرت کده فانوسی ریخت

حرف الثاء

۲۷ - محمد افضل ثابت از یکّه تازان معرکهٔ سخن دانی و شهسواران عرصهٔ رنگین بیانی است و اصلش از بدخشان و مولدش دهلی شاهد وجودش بزیور کمال و پیرایهٔ (۱۶ الف) فضیلت محلّی و مزیّن بوده در فقه و حدیث مهارت عظمیٰ داشته و درویشانه معاش می نمود امرا و اکابر شهر در تحریم و توقیرش دقیقه از دقائق نامرعی نمی داشتند در فن شعر مسلّم صاحب سخنان هنداست و دیوانش قریب پنج هزار بیت در سنه یک هزار و یک صد و پنجاه و یک (۱۱۵۱ھ) عالم فانی را پدرود نموده. از واست۔

ماند نور حسن برو سے تو ماندہ است — برگشتن از رخ تو نداند نگاهِ ما

از راه یابد اگر کف خاکی بسر کنیم — رقصد چو گرد باد ز شادی کلاهِ ما

خواب دیدیم که آئینه معارض بتو شد — می کند صورت این واقعه حیران مارا

بگریبان نمی رسد و ستم — آه از دست نارسائیها

چو ریگ شیشهٔ ساعت نمود سرگردان — طلسم این دو قدم راه کاروان مارا

درون قطرهٔ اشکے توان ملاحظه کرد — چو موی در نجف جسم ناتوان مرا

چشم او از کم نگاهی بیرم از دل می برد — ترک مفلس بیشتر در شهر غارت می کند

ترگشت زخون دامن صحرائے قیامت — مژگان کراذوق شکاراست نه بیند

شفقی جامه آفتابم سوخت — (۱۶ ب) آسمانی است این بلا چه کنم

پان وئی بوسه میزند لبش — من بے برگ و بے نوا چه کنم

قسم به مصحف گل عندلیب باغ توام — بمرگ شمع که پروانهٔ چراغ توام

عکس رخ تو آئینه را رو نمی دهد — تسکین خاطرش بچه صورت کند کسے

۲۸ - محمد عظیم ثبات فرزند میر محمد افضل ثابت مرحوم مذکور است تولدش فی سنه یک هزار و یک صد و بست و دو (۱۱۲۲ھ) در اله آباد شده گویند ذات با کمالش مجمع خصائل حمیده و منبع اخلاق پسندیده بود بدرستی سلیقه و رسائی فهم موصوف و اکثر به نظم ...

... بهت اصلاح پیش من می آورد - دیوانش قریب چہار ہزار بیت خواہد بود از وست -

چون شمع تافتاده به زحمت گذر مرا — در اشک و آه زندگی آمد بسر مرا
دل را نوید آمدن او نمی دہم — شاید بحال خود نگزارد دگر مرا
بغیر از ینکه گریبان صبر پاره کند — کسے ز دست تو ظالم دگر چه چاره کند
یک نفس واشدنی داد چو گل بربادم — غنچه از تنگ دلی بهر چه دل گیر شد است
(۱۷-الف) ستم خوب است اگر باد و شود لطف نهانی هم — جفا از حد گذشت ای شوخ گاہے مهربانی هم

۲۹- آیت الله ثنا جوانے ـــــ خوش فکر و خوب طبیعت - از شاگردان شیخ محمد علی حزین است مدتے در لاهور برفاقت جانی خان بسر برده رائے صاحب خداوند نوشته اند که درین قریب الایام بمولد خود که شاهجهان آباد است رسیده - او راست -

تو سہ در زندگی پرسیدی از شبهاے تار من — که بعد از مرگ خواهی سوخت شمعے بر مزار من
ز بس بحسن بنا سے شور و غوغا شدنی است — زین زلف دراز فتنه بر پا شدنی است
از قامت تو قیامتے در عالم — امروز اگر نگشت فردا شدنی است

۳۰- راجه جگل کشور ثروت از عمده هاے شاه جهان آباد است و به نکته دانی و لطیفه گوئی و خوش عاشقی و یار باشی معروف، مدتے بو کالت ناظم صوبه بنگاله اشتغال داشت از وست -

گفتم که بزمن شود رخا طرت گر آید — گفتا که روے خود بین حرفے بگو که شاید

حرف الجیم
(ج)

۳۱- میر محمد جعفر موطنش طهران است از فضلاے کامل و همواره بافاده خلائق شاغل بوده، و در علم دعوت مهارت (۷ ب) عظمے داشته شاه سلطان حسین صفوی با عزاز و اکرام تمام از وطنش در اصفهان نزد خود خوانده بود در هنگام محاصره آن شهر با جمیع متعلقات برآمد و به مشهد مقدس رفته سکونت گزیده گاه گاه فکر شعری کرد از وست -

از پستی بخت از نزد دست ئے — نومیدیم دامن آن زلف دراز است

بامیدیکه اکثر گنج در ویرانه می باشد   خراب شهرت بے حاصلِ دوران مکن خود را

نقل شبے سیدی از خدمهٔ روضه مقدسه حضرت امام علی موسی رضی الله عنه بخواب دید که حضرت امام می فرمایند که ما میر جعفر را از نزد خود نگاه می داریم آن کس ا... نخه را صبح پیش هر یک بیان نمود روز سوم میر مسطور وفات یافت۔

۲۳۔ میرزا ابوطالب جناب ولد میرزا نصیرا از اکابر نجبای ایران بوده فضل و کمال را با خلقِ خوش و وسعتِ مشرب جمع داشت، بعد از محاصرهٔ اصفهان در سنه یک هزار و یک صد دسی و پنج (۱۱۳۵ھ) داعی اجل را لبیک اجابت گفت او راست۔

اسیرم بینوایم بیکسیم زار رم گرفتارم   بخون غلطیدهٔ اشکم زچشم افتادهٔ یارم

(۱۸۔الف) عزیزان دوستان فکرے که ما را فتاده است از تو   بنو خط دلبری نامهربان شوخی سرو کارم

سخن در پرده تا کے هرچه باداباد می گویم   گرفتارم گرفتارم گرفتارم گرفتارم

نه بوصل یار طاقت نه بهجر تاب دارد   چکنم چنین دلے را که مرا خراب دارد

به ستمگری چه سازم که چو روزگار با من   بوفا درنگ ورزد بجفا شتاب دارد

خبر از جناب داری که ز دوری تو شبها   بدر ... ار و طاقت نه بدیده خواب دارد

چشم مست تو خوش آمدم که شرابش ببرد   ...شِ مژگاں زده خوابش ببرد

ایمن از گرمی خورشید قیامت گردد   آنکه در سایهٔ دیوار تو خوابش ببرد

۲۴۔ ملا ظفر علی جرأت از طالب علمان اصفهان بوده و در مدارس آنجا سکونت می زد، اکثر اوقات صرف فکر اشعار می کرد و خود را از اوستادان می شمرد با وجود آنکه از ملائی بغیر از اسوادی نداشت او راست۔

ساقی است ستیزه کار باما   آیا چه کند خمار باما

ای کاش که ساغرِ نگاهش   می ساخت درین بهار باما

خانواله مرحوم در تذکرهٔ خود نقلی عجیبانه (۱۸۔ب) کثرتِ اشتهای مرقوم نموده که موجب ... ب و حیرت منگر دد و ازیں جهت در اوراق ایرادی یابد۔

نقل می نویسد که خود نقل می کرد که روزے بخانهٔ آشنائے وارد شدم و آن شخص

فالیزے کاشته بود دوران روز خربزه ها از فالیز آورده بخانه اش انبار کرده بودند که تخمیناً ششصد عدد خواهند بود و می خواست که بخانه هائے دوستان بقدر هر یک بغرضه چون مرا بدید گفت که اگر این خربزه ها را بتو واگذارم در چند مدت توانی خورد گفتم امتحان باید کرد گفت انچه از اشتهاے تو شنیده ام شاید که در یک ماه بخوری و باز گفت اکنون این خربزه ها را بتو گذاشتم و تا تمام شدن بخانهٔ خود مهمان داشتم گفتم بشرطے که مرا زوجهٔ هست آن را نیز درین امر شریک خواهم کرد گفت چه مضائقه دارد، پس ببازار رفتم و به تفحص زنے که بامر نکاح راضی شود می گردیدم تا آنکه پیر زنے گاذر بدست آمد او را همراه آوردم و لنگ به بستم بر لبِ حوضی نشستم و باکلِ خربزه و مجامعت بآن زن مشغول گشتم تا وقت عصرِ روز سیوم نشانے از آن خربزه باقی نمانده بود و زان (۱۹ - الف) زیاده از سه خربزه نخورده، روزِ اول بست نوبت، و باقی ایام چهل چهل نوبت جماع بآن پیرزن کرده بودم، که قریب بهلاک شده بود، پس از بیم آنکه مرا رسوا خواهد کرد چهار روز دیگر بطعام صبح و شام که آنمرد می فرستاد قناعت کرده از آن مکان بیرون نیامدم بعد هفته بر آمدم آنمرد تا که زنده بود بهر مجلس که وارد می شد از راهِ تعجب این ماجرا را نقل میکرد۔

حرف الحاء

۳۴ - حاجی محمدؐ گیلانی از فضلاے کامل زمان و علماے معتبر همه وان بود تا عهد سلطنت شاه سلطان حسین در موطن خود معاش می نمود در فن شاعری صاحبِ قدرت و دست گاه عالی است و متخلص به حاجی او راست۔

آمد رقیب و یار نهان گشت از نظر	پنهان نمود لکهٔ ابر آفتاب را
به پیری منع دل از خواهش دنیا بآن ماند	که بعد از گل کسے کوتاه سازد دست گلچین را
ندانستم دل کس در جهان چون جمع میگردد	مدامن تا نیاوردم فراهم اشکِ خونین را
باشد سفرِ گردِ سر کوئی تو گشتن	شغلے که زدل محو کند حبِ وطن را
باهمه (۱۹ ب) سنجیدگی بیقدر و مقداریم ما	چون ترازوی دیارِ قحط بیکاریم را

کهن وزد از سخن وزد امتیاز فاحشے دارد — که آن پیراهن تن می برد این جامهٔ جان را

بداصل، گاه دولت از کف دهد عنان را — دیوانه می شود سگ چون یافت استخوان را

با صاف دل کسی را یارائے برتری نیست — برخاک می نشاند آئینه آسمان را

لاف دانش گر زند پیوسته نادان دور نیست — خفته دائم خویش را بیدار می بیند بخواب

می خواست مرا یار به پروانه نماید — در آتشم افگند و نشان داد که این است

گذشتن از سر کوی بتان بسیار دشوار است — درین وادی چو نقش پا ز پا افتاده بسیار است

بے قرار عشق آسایش ببالینے نکرد — کوهکن تا گشت عاشق خواب شیرینی نکرد

بمن هر گه دوچار آن مایهٔ اقبال میگردد — دلم وا می شود اما زبانم لال میگردد

صاف دل از صحبت ناجنس باطل می شود — قطره چون برخاک غلطد مهرهٔ گل می شود

از ضعیفان شد دائم سر بلندان کام جو — نخل را پیوسته آب از ریشه بالا میرود

۳۵ میر محتشم علی خان حشمت۔ اصلش از سادات (۲۰۔ الف) بدخشان است که اجداد او در ایام پیشین بهندوستان وارد شده توطن گرفته بودند، و وے درهمین مملکت تولد یافته سخن دان صاحب کمال و سپاهی عدیم المثال بود و خوش صحبتے و گرم اختلاطی را علاوه آن داشت دیوانش قریب بهفت هزار بیت خواهد بود از وست۔

کشتند شمع را چو سحر اهل بزم گفت — این روز بود ز اول شب در نظر مرا

رونق از دیوانهٔ ما کشور سودا گرفت — دشت از ما بود کو مجنون دو روزی جا گرفت

در آرزوی زخم تو صد سینه چاک شد — تیغ تو در غلاف و جهانے هلاک شد

بارقیبان نکنم سجدهٔ خاک در دوست — این نمازی است که بے شرط جماعت باشد

ز آشنائی مردم ز بس پشیمانم — بخانه چون نگه از چشم خویش پنهانم

قدم ز جادهٔ تسلیم بر نمی دارم — چو سایه محو رضا جوئی رفیقانم

۳۶ سید محمد حسرت از سادات مشهد مقدس است خوش اختلاط و گرم جوش بسلک خدمهٔ روضه رضویه رضی الله عنه ارثاً منسلک بوده، افیون بکثرت می خورد و در متوسط سلطنت (۲۰ ب) فردوس آرام گاه وفات یافته او راست۔

ز دریا سر بهوا آرد هر کجا سیلاب کم گردد — دل مارا بکوی دوست پیدا می توان کردن
شرر در پنبهٔ تر چون فتنه خاموش میگردد — ز فیض چشم گریان دفع اعدا می توان کردن

۳۷ ـ حکیم بیگ خان حاکم ولد شادمان خان از شاگردان شاه فقیر الله آفرین مرحوم مذکور است در شاهجهان آباد و لاهور بسری برد از وست .

هستند از ان دلیر بخون ریختن بتان — کز یک ادا ادای دو صد خونبها کنند
زنده در گور بی تو می سوزم — هم چو اخگر بزیر خاکستر
سرگشتگی بطالعم هست — بر گرد سرت چرا نگردم
شود قاصد خود گشتم از رشک و ز ناکامی — پیغام شد از یادم گم گشت کتابت هم

۳۸ ـ شیو رائے داس حیا خلف رائے بهوکن مل کایته دیوان نواب اسد خان و برادر بزرگ راجه دیا مل امتیاز مذکور است در علو ادراک و رسائی فهم و بلندی فطرت مثل او از این قوم کمتر کسی بعرصهٔ ظهور آمده باشد. شاگرد میرزا عبد القادر بیدل است طبع عالی و استعدادی کامل داشت و نثر بطور (۲۱ ـ الف) میرزا بسیار بمتانت و لطافت می نگاشت شعرش از انشاء دل چسپ و رنگین تر و نثرش از نظم خوشتر و دل نشین تر است با وصف علم و قابلیت صاحب جاه و ثروت نیز بوده دیوانش که قریب چهار هزار بیت خواهد بود بمشاهده در آمده اما هنگام تسوید این نسخه در پیش نداشتم این چند شعر از بیاضی که نگاشته بخطِ او بود نقل نموده شد .

چنان گرویده از بیتابی من منفعل دریا — که موج خویش چون آئینه می دزدد بدل دریا
ساده لوح آن دل که با عشق تو می گردد طرف — غیر حیرانی چه دیگر ره دهد آئینه را
حرص دنیا می شود در موسم پیری فزون — نشه می گردد دوبالا بادهٔ پارینه را
تا سخن پیش سخن رس نرسد در عدم است — می شود بوی گل آخر به شنیدن پیدا
نیست در بازار هستی جز نفس سامان ما — تخته از پیوستن لب ها شود دکان ما
گریهٔ ما بسکه گرم از سوز دل گردیده است — هم چو دود شمع مژگان موی آتش دیده است
بوالهوس از جام دگر وا شود در راه سخن — بارها حال مرا پرسیده و (۲۱ ب) نشنیده است
از بسکه درین دور کدورت برواج است — تا گرد بمالند بر آئینه صفا نیست

۱؎ کذا بجوت نگر

آن شخص که گوش خود از آواز گدا بست — در گلشن امید ره باد صبا بست

غفلت ز جهان باعث آگاهی من شد — وا گشت بر ویم در دل تا مژه ها بست

تا وا کند از گردن خود دعوی خونم — بر دست خود آن شوخ ستم پیشه حنا بست

ای وای به محرومی آن مرغ که صیاد — سر داد و بطرف چمن و رشته بپا بست

[illegible] رمنده دارد ید اعمال خودم — میکنم امروز کاری را که فردا کردنی است

دل اگر سخت است نرمش از گداز عشق کن — زینهار ای بیخبر کین سنگ مینا کردنی است

زین قد خم گشته اش چشم تواضع ابلهی است — بیخبر پشت دوتای چرخ تیغ قاتل است

جوش گل است و نشاء صهبا رسیده است — ساقی چو شیشه در بغل ما رسیده است

یک زخم تیغ در تن من هم چو موج آب — هر جا رسیده در همه اعضا رسیده است

چو ز بنور عسل دربان خویشم — مرا در خانهٔ خود نیز جا نیست

بیا بناز و مترس از زبان بدگویان — (۲۲-الف) حدیث لطف تو با من که اعتبار کند

می شوی ایمن چو از دل حرص دنیا می رود — تا سبوخالی بود بر روی دریا می رود

رهروان را می شود از گرد منزل رو سفید — چون بآخر می رسد عمر تو گردد مو سفید

از آن آرام جان مکتوب لطف آمیز می خواهد — برای دادن دل دیده منت دیده تو باید

فریب وعده زودش کجا تسکین دهد دل را — ره نارفته گو نزدیک تر باشد [illegible] دارد

کیسهٔ آشفتگان پاک است از داغ درم — جز هوا النقدی نمی بندد بهمیان گردباد

پریشان می شود هر جزو جزو غنچه چون گل شد — بکف دامان جمعیت دل اندوهگین دارد

بود گردن کشی ها مقتضای دولت دنیا — که مینا چون شود خالی سر خود بر زمین دارد

نگاه من براه انتظار کیست حیرانم — که چشم من بهم چون دیدهٔ روزن نمی آید

بوصف آن کمر چون موی آتش دیده در تابم — دلم خون گرد مضمونی که در بستن نمی آید

نه اندازی نه حرفی نی نگه نی جنبش ابرو — هنوزش از حیا آئین دل بردن نمی آید

منع اشکم نکند هر که مرا دارد دوست — آب چون (۲۲ ب) خانه نشین گشت بناچار بگندد

گوهر جان نمی تواند ماند — [illegible]

سر بر صحبت بود بر یی آید درین محفل | زبانم سوخت از ضبط نفس چون شمع وخاموشم
دشمنم در گریه می آید حیا از حال من | عاقبت از لاغری در چشم حاسد مو شدم
نمی آید برون از غنچگی هرگز بهار من | چو خونِ مرده باشد در رگِ خار اشرار من
تنگ چشمیهاست یکسر در بساطِ چرخ و بس | دانه چون اختر نریزد خرمنِ غربالِ او
رفته از پیش نظر تا چشم کافر کیش او | رشتۂ تسبیح شد از اشک زنارِ نگاه
قطره چون با قطره آمیزد ندارد امتیاز | برنمی تابد جدائی دل بدل پیوستنی
ز اوراق کتاب غنچه ها گل کرد این معنی | که نتوان بست بے خونِ جگر مضمونِ رنگینی

۳۹ - میرزا امام قلی حشمت برادر خورد محمد جعفر راهب است که آینده در حرف را مذکور خواهد شد، از علم و فضل بهرۂ وافی داشته خانواله مرحوم نوشته که من و او باتفاق وارد شاهجهان آباد شده بودیم چندے برفاقت نواب برہان الملک سعادت خان (۳۴ - الف) مرحوم بسر برده و بعد آن بوساطتِ سادات خان و حکیم الملک معصوم علی خان شرف ملازمت فردوس آرام گاه دریافته بعطاے خلعت و جاگیر و خطاب عماد الدین خان سرافراز گردیده بود و دختر حکیم الملک را به عقد نکاح درآورده، اوراست۔

خرامان ساختی در صحن گلشن سرو قامت را | بپا کردی دگر هنگامۂ روز قیامت را
نمی پیچم سر از فرمان آن سرو سهی حشمت | بگردن هم چو قمری بسته ام طوق اطاعت را
درین بستان بسر مانند سرو آزاده می باشد | کند جمع از خس و خار علائق هر که دامان را
کاکل و زلف و خطش دست بهم تا ندهند | جمع کی میشود اسباب پریشانی ما
از اشک رواں دیده خطر هیچ ندارد | سیلاب، بویرانه ضرر هیچ ندارد
اندوخته دل همه از دیده فرو ریخت | این ابر تنک مایه دگر هیچ ندارد
بسته است پے کشتنِ عشاق میان را | تا چند که پیداست کمر هیچ ندارد
بجاے نقطه می ریزد شرار از خامه ام حشمت | اگر زان شعله خو حرفے کنم تحریر بر کاغذ

۴۰ - گر بخش حضوری از سکنۂ (۳۴ ب) شاهجهان آباد و قوم کنبوه است، خان زد مغفور در مجمع النفائس آورده که اشعار خود را جهت اصلاح پیش من فرستاده بود،

او راست ۔

عشق ظالم دوست چون عاشق کشی بنیاد کرد — انچه با پرویز می بالیست با فرہاد کرد
بکوی دوست روان است کاروان سرشک — تو نیز گر روی ای دل غریب قافله ایست

۱۴۔ شمع محفل روشن بیانی شیخ محمد علی حزین گیلانی امروز در زمان ما کسی است
که دیہیم فرمان روائی اقلیم سخنوری لفرق فرقدان سایش زینت پذیر است و سریر کشور آرائی
مملکت بلاغت گستری بقدم ہمایونش زیب گیر نقد سخنی را که در دار الضرب موزونی مسکوک نام
نامی او ست پیش نقادان چارسوی رسائی فہم رواج اعتبار است وگوہر کلامی را که سفته متقب
فکرتش آن معدن بلاغت است، بر جوہریان بازار صفائی ذہن قیمت و مقدار بیش از شمار۔
ارکان خلافت دار الملک نظم اگر بر پاستش بردارند بجاست و در خطه سخندانی خطبهٔ ملک
الشعرائی بنامش خوانند سزا ۔ مولد شریفش لاہیجان (۴۲ ۔ الف) گیلان و از اکابر زادہائی
آنجاست که بادشاہان ایران بخانه اش می آمدند ابتدا تحصیل علوم در صفاہان و شیراز کرده و
اکثر بلاد ان مملکت را بسبیل سیاحت پے سپر نموده در سنه یک ہزار و یک صد و چہل و شش
از ہراس نادر شاه بسبب آنکه در یکے از قلاع ایران که شاه جہت تسخیر آن فوج تعین کرده
بود و حارس آنجا قلعه را مسدود و ابواب جنگ مفتوح ساخته شیخ ہم که دران قلعه اقامت
داشت در جنگ شریک گشته و آخر بوقت نیم شب گریخته بہند رسید و چندی در شاہجہان آباد
سکونت ورزیده بلاہور رفت و ہنگام آمدن نادر شاه باین طرف باز وارد شاہجہان آباد
گردیده بخانه خالو اله مرحوم مخفی ماند و چند ماه در اکبر آباد نیز مقیم بوده الحال به سمت بنارس
تشریف دارد و در مذمت ہند و اہل ہند اہاجی رکیکه گفته صاحب سخنان این جا نیز خصوصاً
خان آرزو مغفور کمیت زبان را در میدان ہجوش جولان داده اند بلکه رساله مسمے به تنبیه الغافلین
مشتمل بر ایراد اشعار شیخ (۴۲ ب) نگاشته که اکثرے ازان رساله در ریاض الشعرای خالو اله
مرحوم مندرج است القصه شیخ سخندا نے بے نظیر و شاعر خوش تقریر و ماہر اکثر فنون و عالم
بسیاری از علوم است که باعتقاد جامع اوراق و جمعی از بلند طبعان صاحب انصاف امروز
در ایران و ہندوستان به بسیار دانی و زبان آوری وے در عرصه روزگار پیدا نیست

کلیاتش که بر دیوان غزلیات و قصائد و مثنویات و رباعیات و مقطعات قریب پانزده هزار بیت و از نظر گذشته مصنف بود و در خطبه اش مرقوم که این دیوان چهارم است جامع اوراق تمام سیر نموده، از جمله آن دو هزار بیت انتخاب زده که همه را لائق داخل کردن این نسخه می دانند اما نظر بطوالت کتاب و ملالت خاطر بینندگان که اکثر هم مردم این زمان راغب مختصرات مرئی می گردد برین چند بیت اکتفا کرد وهی هذه:

رفتیم و مانده است بجا چون قلم حزین	بر صفحهٔ زمانه سخن یادگار ما
ز فیض خط بهار حسن گردد از خزان ایمن	ز صرصر (۲۵-الف) نیست پروای چراغ زیر دامان را
هر کس آسودهٔ خاک است برآید چو سپند	آه اگر شرح دهم گرمی جولانی را
ز تنها باد نلرزد چو شاخ سنگین شد	دو است رطل گران دست رعشه دار مرا
گیرد شرار عبرت از بی بقائی ما	برق آستین فشاند بر خود نمائی ما
از خون ما نکردی سرخ آن کف نگارین	گیرد مگر رکابت اشک حنائی ما
ما و تو در حقیقت چون آتش و سپندیم	ای عشق از تو آید مشکل کشائی ما
تبسم ریز شد گلبرگ یاد از شرم رسوائی	لب از دندان شبنم می گزد گلهای خندان را
بود هم نسبتان را عقد جمعیت بهم فطری	نباشد رشتهٔ در کار گوهرهائے دندان را
چو بسمل می طپیم از رشک در کوی جفاجوئی	به کوثر می کند زاهد غلط تیغ پر آبش را
به محفل تا صفائے ساعد او پرتو افگن شد	ز خجلت شمع می خاید سر انگشت حنائی را
دیار عشق را نازم که طفلان هوسناکش	چو پستان میکنند از ذوق زهر آلوده پیکان را
قاصد اگر شنیدهٔ از لب یار وعدهٔ	رخصت بازگشت (۲۵ب) ده جان بلب رسیده را
چشم رقیب گفتمش محرم روی خود مکن	کرد بکار دیده ام مصلحت شنیده را
آه تو فاش میکند راز نهفته را حزین	دود دلیل می شود آتش ناپدیده را
دل در حریم وصل تو پا را نگه نداشت	داغم ازین سپند که جا را نگه نداشت
پنهان نگشت در دل صد چاک راز عشق	این خانهٔ شکسته هوا را نگه نداشت
زلفت به مددگاری آن لب نمکے چند	با مشک بهم کرد بداغ دل ما ریخت

نخلی شد و بارش همه پیکانِ بلاگشت — هر تخم که نازِ تو بباغ دل ما ریخت

روزیکه حجت از خلق خواهند در قیامت — روی تو حجت ماست ای قبله گاه حاجت

در کوی او کشیدیم چون کوه پا بدامن — گر تیغ بارد این جا ما و سر اطاعت

نه دست بردِ دل من می نهی نه پائے بچشم — بیا که رشک عنان غیرت رکابم سوخت

شب فراق تو از بسکه شعله در جان ریخت — چو شمع گریه آتش عنان در آبم سوخت

دمیدن از سمنش مشکناب نزدیک است — بشب نهان شدن آفتاب نزدیک (۲۶-الف) است

دلم ز وعده بر آتش فگندی و رفتی — بیا که سوختن این کباب نزدیک است

ید بیضا که میزد پنجه با خورشید در دعوی — برنگ آستین امروز بیکار است از دستت

از زخم شود جوهر شمشیر نمایان — دانست ترا هر که بحالم نظر انداخت

همراه رقیبان مگذر از سر خاکم — ما را ز وفاے تو جز این ملتمسے نیست

در سینه حزین [illegible] سوخته پیدا است — چون شمع که در پردهٔ فانوس نهان نیست

یارب [illegible] یار که امروز — با ما نگهٔ یار نهان است و نهان نیست

از پهلوی لاغر بدنی خرم یارم — آن گوهر یک دانه برین تار کشید است

خیالِ جلوهٔ نازش بهانه می طلبد — بسینه شیشهٔ دل را شکست و پا نگذاشت

تو آمدی و من از خویش منفعل ماندم — نثار راهِ تو جان داشتم حیا نگذاشت

علاجِ چهره بما گشته حزین — عبث آئینه زدودیم عبث

خطرے نبود در ره بے پا و سران هیچ — رهزن نزند قافلهٔ ریگِ روان هیچ

از وعدهٔ وصال غم از دل نمی رود — نتوان به بوسے باده علاج (۲۶-ب) خمار کرد

می کرد کاش چارهٔ بیتابیٔ مرا — مشاطهٔ که زلفِ ترا تاب دار کرد

با بیقراری دل عاشق چها کند — حسنے که آب آئینه را موج دار کرد

دوش از بزم چو رفتی آگه نگشتم آرے — عمری و رفتنِ عمر آواز پا ندارد

عجبے نبود گر نکشد [illegible] بار نگاهم — مژگانِ تو از سایهٔ مژگان گله دارد

در جعبهٔ مژگانِ جفا کیشِ تو جانا — یک تیر ندیدیم که دل دوز نباشد

مشهد پروانه است عالم بالا — کشتهٔ شمع قدرت مزار ندارد
تسلی می کنم دل را با برقے عرقناکی — گلوی تشنه تیغے آبدارے در نظر دارد
دلے دارم که رنگ از پرتو مهتاب می بازد — چه خواهم کرد اگر آن آستیں رو بے نقاب آید
سمند ناز را یک لحظه نتمائی عنان داری — ترا گر موج خون بیگناهان تا رکاب آید
ز شوخی لیلی ناز آفرین را میکند مجنون — اگر طرز نگاهت چشم آهو را بخواب آید
سیاهی می برد از نامه ہائے ما گنهگاران — نمی آید بدریا آنچه از چشم پر آب آید
پیمانهٔ نگاه تو از ما اثر نه هشت — ایں طرفه مجلسی است که ما را شراب خورد
بر هر چه تافت (۷-الف) نور محبت صفا گرفت — پاکست هر زمین نجس کافتاب خورد
یاقوت صفت دود نبود آتش ما را — دود از دلم آن لعل خط آلود برآورد
بکف چون شمع ما را در شب هجران بکار آمد — سر انگشتے که در گستاخی برقع کشائی شد
ارواح بخاکم همه سایند جبین را — از کوی تو گر بعد هلاکم گذرانند
کدامیں چشمهٔ نوش است یارب تیغ نازا — ز زخم بخیه مویه نهان با آلوده را ماند
آخر ز شعله گردد بد گوهری هویدا — تو آب زر دو رو [illegible] عیب نحاس پوشد
بقتلم چون کمر بندی مکن آگه ترحم را — مباد خصم [illegible] مجال فرصتی یابد
فرامش میکند ما را بوصلت چون رسد قاصد — شود بیگانه از یاران دنی چون دولتے یابد
سودائے کریماں همه سود است که نیسان — گوهر عوض قطره ز دریا بستاند
از گرسنه چشمان بحذر باش که ساغر — هر قطره که خم داده زمینا بستاند
این است حزین از کرم ساقی امیدم — ما را به یکے جرعه مے از ما بستاند
حسنت (۷-ب) بکار عاشق یک مو نکرده تقصیر — ابرو به تیغ بازی مژگان بکار دیگر
گرچه بے جگر دد از پرهیز هر درد کہ هست — درد دین را می کند پرهیزگاری بیش تر
جز مهر او که در دل صد پارهٔ من است — در شیشه شکسته شرابی ندید کس
گذر کرد از گلویم ناوکش چون قطرهٔ آبے — چه منتهاست بر گردن مرا الصافی کششش
چه لذت بود از قاتل حزین نیم بسمل را — که در خون می طپید و آفرین میگفت بر تیغش

سرودے نیست بہ از قلقل مے — بپائے شیشہ چون پیمانہ می رقص
زامشب مگذران گرمیکنی فکری بروز من — من آتش بجان چون شمع تا فردا نمی مانم
بہ کلینم جعبہ ہائے غمزہ خالی گشت وخاموشم — اگر تیغ تغافل میکشی زنہار می آرم
زبس راز ترا پنہان ازین نامحرمان دارم — بجائے مغز مکتوب ترا در استخوان دارم
چنان رسوائے عالم گشتہ ام در عشقبازیہا — کہ گر آیم بخاطر یار را آواز پا دارم
تا صبح حشر پردہ نشین است ہم چنان — از شرم ساعدت ید بیضا در آستین
ثابت نمی شود بتو خون شہید عشق — خنجر بدست (۲۸-الف) داری حاشا در آستین
گر چنین پر رخنہ از سوز جگر خواہد شدن — نامۂ من دام مرغ نامہ بر خواہد شدن
گر چنین ماند بدل اندوہ آن نازک میان — رشتۂ جان من آخر می کمر خواہد شدن
جمع آمدہ امروز می و مطرب و ساقی — یارب نشود ابر ہوا دل پریشان
شمع را شعلہ مسلسل ز دل آید بیرون — آہ جان سوختگان [illegible] آید بیرون
این نہ ابر نیست کہ لشمردہ بجاکش ریزم — اشک گل رنگ بصد خون دل آید بیرون
نمکین بود کہ صحبت بتو اتفاقم افتاد — من و سوز عشق گفتن تو و [illegible] کردن
دل و دین فدائے طورت بکدام مذہب است این — [illegible] کشیدن [illegible] احتراز کردن
محو سبک عنان مژۂ کافرت شوم — رنگین نشد بخون دو عالم سنان تو
خونم بتو ثابت شدہ حاشا چہ نمائی — چشم تو نزد تیغ گرفتم مژہ ہا چہ
از شکوہ و شکرم بمیان فتنہ گری چیست — من دانم و دلدار رقیبان شما چہ
زان شب کہ رہ طرار گرفتم خبر دل — پیچید بخود زلفش و میگفت کجا چہ
از عزت ناقص نرسد نقص بہ کامل — بت گر بپرستند جہانے بخدا چہ (۲۸-ب)
— بحسرت تا کشید از سینہ ام صیاد پیکان را — دلم ماند بآن یارے کہ از یاری جدا ماند
ای زاہد افسردہ ترا زندہ نہ گویم — [illegible] چہ حال است نہ [illegible] نہ [illegible]
چون شمع فروزندہ ز فانوس عیان است — در پیرہن آن [illegible]
دشنامی اگر [illegible] آید ز دہانت — [illegible] کند [illegible]

چون شمع لبت سوخت حزین از نفس گرم | ای خسته ندانم چه تب است این که تو داری
عاقل انگشت چرا در دهن مار کند | دست در حلقهٔ آن زلف چلیپا نکنی
گفتهٔ دست نگارین کنم از خون حزین | همه امید دل این است مبادا نکنی
سراپا نازمن از تربتم دامن کشان مگذر | مبادا غافل از خاکم بر آرد آرزو دستی

من رباعیات

ساقی قدحے که دور گلزار گذشت | مطرب غزلے که وقت گفتار گذشت
ای هم نفس از بهر دل زار بگو | افسانهٔ آن شئے که بابار گذشت
از داغ فراق سینه ام جوشان است | هوش من شوریده زمد بوشان است
در بزم تو شمع گوید احوال مرا | این چرب زبان وکیل خاموشان است
گفتم که به یاد یار خواهی آمد (۲۹-ا) | یا خون شده در کنار خواهی آمد
نے زان اثرے نه زین نشان نظری | ای دل تو کجا بکار خواهی آمد

نقل۔ از جمله هجاجات و معارضاتے است که فیما بین شیخ و خان آرزو مغفور واقع شده خان آرزو مغفور بر شعری از اشعار شیخ که عزیز و تمیز قافیه داشت سخن کردند که این قافیه درست نیست زیرا که لفظ در اصل تمییز است بر وزن تفعیل کسے این ماجرا را به سمع شیخ رساند گفت که آن عزیز اگر تمیزے میداشت با وچیزے گفته می شد، چون معذور است هیچ نمیتوان گفت که ابیت

مسکین خر اگر چه بے تمیز است | چون بار همی برد عزیز است

مخفی نماند که هم هجو معترض است و هم سند است بر قول خود.

۴۲ ۔ جامع الکمالات و الحسنات میاں محمد حیات سلمه الله تعالیٰ اگر مدح و ثنائ آن والا جناب پردازم کم فرصتی زمان عمر تنگ خجالت یکے از هزار نگفتن خواهد کشید و اگر به تعریف و توصیفش خود را مشغول سازم انفعال عجز از بسیاری بیان نه نمودن پردهٔ رسوائی خواهد درید و چون حقوق تربیت وی را برشمارم حیات خضر (۲۹ ب) و مسیحا وفائی تواند کرد پس چه امکان که ادا سے شکر آن کرده باشم ازین معنی انحراف بهتر و اعتزال اولی است، استاد احقر است که از

بدوِ طفولیت تا حدِ بلوغ جمیع کتب متداوله فارسی را از نثر و نظم بخدمتش دیده ام و فیضها
از آن معدنِ بلاغت ربوده، مولدش گوپامؤ سهالی که شهریست از توابع قنوج، و از مدتی
در اکبرآباد توطن اختیار کرده، و به پیشۀ معلم گری که در آن فن چون معلّم اوّل (به حکمت) کوس
شهرت می نوازد، روزگار بسر برده، خاطرِ عاطر را بشنیدن و جمع کردن اشعار در غایت مرتبه
راغب و مائل میدارد، و صحبتِ اہل آن را از موہبات عظمی و نعمای کبری می شمارد گاه گاه
بحسب اتفاق در عرصه نظمِ اشعار اشہب طبیعت را جولان می دہد، از وست۔

بزشتی عملم طاعتم گواه شود — چو شیشه سجدۂ من باعثِ گناه شود

زندگی بسیار بیزاری فزاید مرد را — زان سبب پیران به جنبانند سر برِ ط(؟) ...

۴۴ — تختۂ مشق ہجویری معنیٔ لفظِ سادگی، محوِ تماشا کدۂ نگارستانِ عالم (؟)
صورت، قیام الدین متخلص به حیرت جامعِ این اوراق، مؤلف این اجزا [illegible] تا ...
کدۂ صبا و بے خبری در دبستانِ بلوغ و شعور خرامیده فردی از افراد انسان به ناسنجی [illegible]
بے ربطی خود ندیده، بارے بیمنِ تاثیرِ توجه بزرگانے که لمعاتِ نظرِ ایشان برنگِ پرتو خور [illegible]
در لعل ساختنِ سنگ، و طلا کردنِ خاک، بگرمی تمام مؤثر است، اندک تمیز در سپید و سیاه بہم
رسانده، و ہم به فیضِ صحبتِ شان از ابتدای طلوعِ صبحِ ادراک، خاطرِ ناقص را بشنیدن و جمع
کردن اشعارِ خوب، و ابیاتِ مرغوب، راغب و مائل می داشت، تا آنکه بمقتضای مزاولتِ
کثیر و مناسبتِ بسیار، نصیبی از موزونی طبیعت دریافت۔ و گاه گاه بحسبِ اتفاق غزلی
و بیتی در تتبع بعضے از بزرگانِ ہم عصر بہم می رساند، اگرچه می خواست که زادہای طبعِ خود را
نظر به ناسنجیدگی آنها یک قلم در پردۂ خفا دارد، تا از طعنِ حرف گیران مصئون ماند، اما در اختفاء عدم
زوالِ معیوب آنها (۳۰ ب) نموده، اندکے از نتایجِ [illegible] طبعِ حیرت مآثر را در جلوه گاهِ این اوراق
بر روی کار آورده، امید از بالغ نظرانِ عرصۂ انصاف آنست که چون خللے در معانی و الفاظِ این
ابیات بے معنی ملاحظه فرمایند، حمل بر قلّتِ استعداد و کم مشقی قائل نموده زبان طعنه دراز
نسازند، بل باصلاح پردازند و مخفی نماند که مولد و مسکن این اضعفِ عباد از آباء و اجداد خلاصۂ
بلاد اکبرآباد فیض بنیاد است و والدم سلمه الله تعالی که شیخ امان الله نام دارد به بعضی خدماتِ

جزئیه آن شهر اشتغال می داشته است، ومنکه گوهرِ گرامی عمرِ سی ساله را در لای لهو ولعب انداخته و در عین فرصت و بیکاری کارے از دنیا و عقبیٰ نساخته ام، از چند ماه همراهِ خداوندِ قدردان منبعِ جود و احسان، دیوان کشنجی سلمه الله تعالیٰ که در سرکار ٹهاکر سورج مل بعلاقه طبابت می گذرانند و درین فن کارهائے دست بسته از دست ایشان بظهور می رسند، ومعهذا رائحهٔ حسنِ خلق و وفورِ سخاوت وکمالِ قابلیت و قدرشناسیِ اهلِ هنر (۳۱ - الف) از گلِ ذاتِ ایشان مشامِ خرد را معطّر می دارد، در بهرت پور بسر می برم و بعهدهٔ تعلیمِ اطفالِ بلند اقبال مامور و مشتغلم بدامن هزلیاتی:

عشق تا دالهٔ این لاله رخان ساخت مرا — غرقِ خون کرده و از داغ نشان ساخت مرا
غم هجرِ قدِ چون تیرِ هلال ابروئے — عاقبت پشت دو تا هم چو کمان ساخت مرا
آه ازین هستی و ذلّت که عدم به باشد — هیچ پیشِ همه ان نگهبان ساخت مرا
شد دلم پابندِ خطِ چهرهٔ خالی زخال — مرغ را بیدانه در دام آورد صیادِ ما
در خیال چهرهٔ او مشق حیرت تا کنیم — تختهٔ آئینه در دستم سپرد استادِ ما
در آرزوی بوسهٔ پای تو چون حنا — دل خون شد است و نیست بآن دسترس مرا
کو طالعی که بر سرم آئی ز روی مهر — کز عمر مانده هم چو سحر یک نفس مرا
از جورِ هجر هیچ نبا شد غمم که نیست — چون ناله یارِ دل کش و فریاد رس مرا
هوا ے زلف تو گر در سرم نمی پیچید — نداشت این قدر آشفته روزگار مرا
بوهم او سر مو صورتش نمی گنجد — کشد چگونه مصوّر دهانِ تنگِ ترا
ز آه و ناله (۳۱ ب) من کوه آب گردید است — فغان که نیست موثر دل چو سنگِ ترا
یک نگاه تند اے ظالم بجانِ ما بس است — می کشی از بهرِ قتلِ ما چرا شمشیر ها
در بغل خورشید دیدم خواب مردم می بینند — وصل آن سلطانِ مه رویان نه بیند ها
برد یک گردشِ نگه هوشم — دو قدح باده کرد مست مرا
چون حنا سر بپاے او سایم — نهد این آرزو چو دست مرا
در هوا ے قد بلند چو سرو — دهر چون خاک کرده پست مرا

یار پہلو نشین چہ چارہ کنم — نیز عشقش بدل نشست مرا

چون بر طوطی نماید سبز سطر صفحہ ام — ہست توصیف خط او یک قلم مضمون ما

حل شود صد عقدۂ حکمت ز فیضش ساقیا — می بیاور خم نشین تا چند افلاطون ما

دارم از افتادگی حیرت بچنگ آورد صید — می شود از خاکساری ہر کسے ممنون ما

تا بیاد عارضش روشن مرا کاشانہ است — ہر ستون شمعی و ہر یک پردہ اش پروانہ است

از خیال چشم شوخ وحشت انگیز کسے — بسکہ پر شد سینہ ام گویا کہ آہوخانہ است

آبرو بسیار دارد حرف شخص کم سخن — در (۲۲۲ا) صدفہا بیش قیمت گوہر یکدانہ است

بر سر زلفش چہ بے باکانہ می سازد دراز — سینۂ من چاک چاک از رشک دست شانہ است

سورۂ نون نقش باید کرد بر سنگ مزار — چون مرا قاتل شہید از تیغ ابرو کردہ است

خستۂ چشم فسونساز تو ہر کس دید وگفت — ساحرے شاید برین بیمار جادو کردہ است

تیر آہ ما چہ شد کز شیشۂ گردون گذشت — از دل مانند فولادش تواند چون گذشت

از سر سرو آب خجلت شد بصد بالا بلند — در چمن چون سبزہ من با قامت موزون گذشت

چشم مدہوشش نمی دانم بکار او چہ کرد — محتسب در پاے خم مست و خراب افتادہ است

کار آب تیغ زہر آلود می آید ازو — چین کہ در ابروے جانان از عتاب افتادہ است

سیر ہا دارد جنون من کہ بے امداد دست — ہم چو گل صد چاک از خود با گریبان آشناست

ہر طرف از لب او شوری و غوغائے ہست — این کہ بر روے زمین نیز مسیحائے ہست

سرو چوبی است بچشم دبہ آزار مرا — دیدنش بسکہ مرا دیدہ ببالائے ہست (۲۲۳ب)

تمیز مجرم و بے جرم خود نخواہی کرد — کنون کہ تیغ بدست تو قاتل افتاد است

پسند خاطر من شد لباس فاختہ گون — دلم بسرو قدے بسکہ مائل افتاد است

تا جامہ وار تنگ در آغوشش آورم — دستے بگردنش چو گریبانم آرزو است

گریۂ ما آبرو سے ابر را بر خاک ریخت — گرمی بازار برق از آہ ما بر باد رفت

یادگارے ماندہ است افسانۂ شیرین ازو — گر ز دنیا خسرو ملک جنون فرہاد رفت

سبز بختان گاہ جمعیت تواضع پیشہ اند — چون ثمر می آورد شاخ شجر خم می شود

ای آه گرچه هستی خاراشگاف باری | اندر دل چو سنگش تاثیر می توان کرد
یاد بهار رویش دیوانه ساخت ما را | بر پایم از رگ گل زنجیر می توان کرد
خطی که بر لب شیرین یار می آید | بمصر شکری از زنگبار می کرد
شبی که آن ماه طلعت خفته در آغوش من باشد | نخواهم صبح را هرگز مجال دم زدن باشد
ز بس گل کرده زخم بی عدد از تیغ بیدادش | مرا نظارهٔ اندامم خود سیر چمن باشد
کجا نسبت بود با غنچه آن لبهای شیرین را | که (۱۳۲) هم چون ترش رویان دائمش چین بر جبین باشد
بموزونی علم شد هر که در وصف قد خوبان | بجمع سربلندان چون رود بالانشین باشد
چنان در فکر چشم او دماغش پر ز سودا شد | که نرگس در چمن دائم نگاهش بر زمین باشد
حوادث می شود در دشمنان را هم ملال افزا | بهنگام شکست آئینه را چین بر جبین باشد
گرفتم بار قیبت نیست میل دوستی لیکن | مرا گر دید نتش دائم بکویت بدگمان دارد
بذوق زخم خیزد سرنگون از خاک چون نرگس | بحشر کشتهٔ تیغ نگاهش این نشان دارد
مگر از حلقه در گوشان زلف او بود سنبل | سیه فام است ربط بندگی زان دو دهان دارد
بسکه وقت وعدهٔ آن راست قامت می رسد | بر دلم امروز هر ساعت قیامت می رسد
هیچ کس از شاخ نتواند گل قالی شکست | بر زمین افتادگان را کمتر آفت می رسد
رو مگردان از توکل چون صدف کز آسمان | لقمهٔ در حلق اصحاب قناعت می رسد
شد نمایان از ته زلف سیاهش خط سبز | زان نمط گوئی که خضر از راه ظلمت می رسد (۱۳۳)
نه زیر ابروی خود خال دل ربا دارد | ستاره ایست که در برج قوس جا دارد
به یُمن وصف قدش شهره ام بموزونی | که بیت هر غزلم مصرعهٔ رسا دارد
ناتوانم کرده یاد آن دو لب؛ رنج مرا | غیر یاقوتی ندارد سود درمان دگر
هم چو بلبل که سر خود بنهد در پر خویش | غنچه در شاخ فرو برده ز شرمت سر خویش
ساده شود در نظر مردم صورت حیرت | پیش کس آئینه سان عرض مده جوهر خویش
غمزهٔ مستانه اش کیفیتی دارد دگر | می ز دست ساقی سرشاری خواهد دلم
هم چو نرگس دان سراپا چشم شد اعضای من | ای گل رعنا بیا، دیداری خواهد دلم

رہزنِ ایمانِ من شد ہندوے زلف بتے — کافرم در عشق او زنّار می خواہد دلم
دگر دنبال آن بدخو دویدن آرزو دارم — عتاب آلوده دشنامی شنیدن آرزو دارم
تنِ نازک کہ از تاب نظر بارنگ گرداند — چہ بیدردم بہ بر تنگش کشیدن آرزو دارم
چون در افتاد عقده در کارم — بسکہ من حفظ آبرو کردم
من امام صف شہیدانم — ز آب تیغ تو چون وضو کردم
بآن چشمے کہ سازد غارتِ جانہا نگارِ من — چہ خواہم کرد یارب گر شود ر دلے دو چارِ من
پریشان خاطرم کر داز درازیہاے بے پایان — بزلفش ہمسری دارد مگر شبہاے تارِ من (۴۴ الف)
اے صنم روے تو ہم قبلہ ہم آتشکدہ است — بخدا سجدہ گہ گبر و مسلماں شدۂ
یک ذرہ مہر می طلبم از توای فلک — کاں ماہ کینہ جوی مرا مہرباں کنی

حرف الخاء

۴۴ - بندرابن خوشگو از قوم ہندو بقّال است ابتدا مشقِ سخن پیش میرزا بیدل و محمد افضل سرخوش و سعد اللہ گلشن نمودہ و خان آرزو مغفور نوشتہ کہ از مستفیدانِ فقیر است، از مدتے در بنارس و عظیم آباد معاش می کردہ گویند کہ تذکرۃ الشعراے ہم تالیف نمودہ است، از وست ۔

جور بخے کہ بہ گردد از قطعِ عضو — بعشقِ تو شد دردِ درمانِ ما
ہر نفس میکرد صد احوال پرسیِ دلم — غیرِ غم یادش بخوبی ہیچ غم خواری نبود
ہر کہ رخت سفر از وادِ فنا می بندد — محمل داغ بدوش دل ما می بندد
در سرکوی تو رنگی کہ پرد از دلِ من — چون شفق نقش گلستان بہوا می بندد

۴۵ - محمد مہدی خیّام از اصفہان است پدرش بخیمہ دوزی روزگار بسری کرد وے بتحصیل علوم پرداختہ طبعی موزون بہم رسانیدہ بود ظاہرا نسبت بہ حرفۂ پدر خیام تخلص (۴۴ ب) می نمود در ایام محاصرۂ سلطان روحش از حصارِ جسم برآمدۂ در عرصہ ملک بقا خیمہ زد از وست ۔

تا شد قفس شکسته بال و پرم فرو ریخت　　پرواز را درین باغ برما حرام کردند

۴۶ - نواب خاندوران از امرایان عالی مرتبت و خوانین والا منزلت عهد فردوس آرام گاه است، بیان اوصاف شوکت و حشمت و بذل و سخاوت و تهوّر و شجاعت آن مرحوم مغفور که در جنگ نادرشاه بچه مردانگی و دلاوری داد کارزار داده بنا بر غایت اشتهار محتاج تکرار نیست، این مطلع را بآن جنت مکان نسبت می دهند۔

شعر خورشید لرزان برسر کوی تو می آید　　دل آئینه را نازم که برروی تو می آید

۴۷ - نظیر بیگ خادم از شاگردان میر محمد افضل ثابت مرحوم مذکور است، و از سکان دهلی بوده چند سال قبل ازین (دیار) راهی دار الملک بقا گردیده او راست۔

گر کند از قفس آزاد مرا　　نی کشد دوری صیاد مرا

سوزشش دیده ز شرم آب نشد　　حیرت از آئینه روداد مرا

ایکه می گوئی دم مردن فراموشم مکن　　منکه می میرم برایت چون فراموشت کنم (۱۲۵)

خویش را ساخته بودم بهوس قاصد خویش　　چون رسیدم بتو پیغام خود از یادم رفت

شعری باین مضمون از حکیم بیگ خان حاکم که در حرف حا مسطور شده نیز گذشته که۔

خود قاصد خود گشتم از رشک زناکامی　　پیغام شد از یادم گم گشت کتابت هم

این قسم در اشعار بسیار واقع است، خواه بر سبیل توارد باشد خواه بطریق سرقه، امّا اکثر توارد است که ننگ سرقه بخود پسندیدن کار دون همتان است واللّٰه اعلم۔

۴۸ - خوشتر پسر میرزا محمد افضل سرخوش مولف کلمات الشعراء است و بر دیگر حالاتش مطلع نشده ام از وست۔

بسکه سرگرم سفر گردیده ام مانند شمع　　قطع راه زندگانی را بیک پا می کنم

حرف الدال

۴۹ - میر میرزا هاشم دل از سادات آرنیان است که از توابع همدان است، صاحب

سلسله — میر الفوقین اضافه برحاشیه

طبع کریم و مشرب وسیع بود خادمان را بکسوت ہائے فاخرہ پیراستہ می داشت و خود بلباس درویشی می گذرانید و صحبت ارباب سخن را از مغتنمات می انگاشت ہنگام تسلط افاغنہ برایران (۵۳ھ ب) با حاکم ہمدان اتفاق کردہ مع جمعے از رفقای و خدمہ بجنگ درپیوست و در کمال ثبات و دلاوری کارزار نمودہ شربت شہادت چشید گویند اول بہ ہاشم متخلص بود و از شیخ محمد علی حزین دل تخلص یافتہ از وست۔

گل باغ کے بچشم من نزاکت آید اے دوست — کہ بدیدہ بے جمالت مژہ خار آید اے دوست
زفشار پنجۂ غم چو رہد ز آتش افگن — دل خون گرفتہ آخر بچہ کار آید اے دوست

۵۰۔ محمد جان دیوانہ رائے صاحب خداوند در سفینۃ الشوق نوشتہ اند کہ از جلسائے رائے انند رام مخلص بودہ و افیون بہ وفوری خورد و در سنہ یک ہزار و یک صد و پنجاہ (۱۱۵۰ھ) درگذشت۔

بہار آمد ہوا گلدستہ ہائے تازہ می نبدد — پریشان نسخہ گل را دگر شیرازہ می نبدد

۵۱۔ محمد فقیہہ دردمند از صاحب سخنان شاہ جہان آباد و شاگردان میرزا جان جانان مظہر است طبعی بغایت رنگین و دیوانے مختصر نہایت دلچسپ و دلنشین دارد کہ این چند بیت منتخب ازان است۔

جز بوصف نوخطان کے واشود لبہا مرا — چون قلم از سر می گردد (۱۴۹۰ ا) زبان گویا مرا
کاش خاکم رنگ خون میداشت مانند حنا — تا شدے در زیر آن پا ے نگارین جا مرا
بیاد قامت خوبان سبز تہ گلگون — کشیم تنگ در آغوش خویش مینا را
نہ نالہ در غم ہجران نہ گریہ در شادی — بگو کسے چہ کند این دل شکیبا را
بسان میوۂ خامے کہ برخاک افگند بادش — در آغاز بہار افتاد از شاخ آشیان ما
دوش یارم بہ تجاہل فرمود — کہ زخاطر شدہ نام تو مرا
دردمند از سر صد عجز و نیاز — گفت خوانند غلام تو مرا
من نمی گفتم مخور می از صراحی جان من — دیدی آخر رنگ لعل از صدمۂ قلقل شکست
خانمان عشق زین سیلاب آخر شد خراب — چشم من از گریہ ہم چون چشمہائے دل شکست

بتمنای لبت بوالهوسی افتاد است | حیف در شربت عیشم مگسی افتاد است
میروم سوی گلستان و بخود می لرزم | که درین راه پر و بال بسی افتاد است
پیش آن شوخ مبر باد صبا نام مرا | این قدر گوی بگوی تو کسی افتاد است
دیدهٔ خونبار من از گریه روشن می شود | آب هم چون لاله روغن در چراغم می کند (۳۶ ب)
معنی آوارگی اینست کاندر راه عشق | کم شدن چندانکه گم گشتن سراغم می کند
بر سر دیدهٔ من کس نگذارد قدمی | چشم عشاق نه بحری است که پایاب شود
ما شنیدیم که آخر به تمنای تو مرد | دردمندی که ترا هیچ باو کار نبود
سعی معاش محترمان را چه لازم است | چون گوهر است جزو بدن آب و دانه هم
امسال هم چو قالب بی روح دردمند | خالی فتاده است بباغ آشیانه هم
غم من باعث شادی است هردم راز هی طالع | که چون ابر است چشم عالمی بر چشم نمناکم
بحق آنکه می از دست سبزان خورده ام عمری | الهی کم مگردان سایهٔ تاک از سر خاکم
چسان دست و گریبان صفا باشد جبین من | که هم چون شمع هرگز چین ندارد آستین من
گناهم زیستن پیشش مقرر شد ندانستم | که جان و عمر من خواهد نشستن در کمین من
جانم فدای رمزشناسی که کرده ثبت | تاریخ فتح یار بلوح مزار من
فتد با آه لختی از دل پر داغ من بیرون | چو برگ لاله کاندازد نسیمش از چمن بیرون
(۳۷ الف) خم زلف سیاهش با دلم سخت الفتی دارد | نمی آرد رگی چون مهرهٔ مار از دهن بیرون
هلاک لذت دردم که تیرکم چون کمان گیرد | رود هر عضو من از جا باستقبال تیر او
خود آرائی است اینها یا خدائی دردمند آخر | که بی رحم تو از چشم غزالان سرمه دان کرده
سر ز دو قم فرو باید بهر لعل شکرخائی | کنم صد کوه اگر یابم چو شیرین کار فرمائی
فتد کار دلم چون با دماغ نازکش ترسم | چو آن شخصی که از دستش خورد مینا بمینائی

۵۲ - خواجه میر درد ولد خواجه ناصر عندلیب از متوطنین شاه جهان آباد برسائی فهم و علو استعداد موصوف است، اکثر شعر ریخته می گوید و گاهی بطرف فارسی هم مائل، این دو رباعی از وست -

یک عمر ز دور می شنیدم اُو را | در بر بخیال می کشیدم اُو را
اکنون کہ چو آئینہ رسیدم پیشش | خود را او دید و من ندیدم اُو را

دیگر

ہر چند چو صبح سینہ شق باید کرد | ہر شام جگر خون چو شفق باید کرد
بر ہستیِ بے ثبات مثلِ شبنم | سر تا قدم از شرم عرق باید کرد

حرف الذال

(۳۷ب) ۵۳ ۔ میر عبد اللہ ذرّہ پسر محمد باقر مجلسی صاحب فطرت و ذکا بودہ، آخر شباب بہ تحصیل پرداختہ، در کمتر زمانے بسیارے از مطالب علمیہ را دریافت نمود ہنگام محاصرہ از اصفہاں بر آمدہ در خرم آباد کہ شہر یست از ان مملکت رخت سفر بسوی عالم بقابست ۔

مگر از نو گلے خارے بیاد آرد نگارِ من | کہ ہم چون غنچہ از سیر چمن دل تنگ می آید

حرف الراء

۵۴ ۔ میرزا محمد رضا از سادات شیراز است بحسن سیرت و خلق و صفاے ذہن موصوف، و بطاعات و عبادات مشغوف بودہ، ایامے چند بحکم شاہ طہماسپ ثانی حکومت لار، کہ شہر یست از ممالک ایران بوی تفویض یافتہ بود، گاہ گاہ بیتی از خاطر او سر میزد و از راست ۔

صیقلے زنگارِ دل را ہم چو عکس یار نیست | خلوت آئینہ را شمعے بہ از رخسار نیست

۵۵ ۔ میرزا ایزد بخش رسا در زمان محمد اورنگ زیب عالم گیر بادشاہ، بودہ در انشاے نثر قدرت عظمیٰ داشتہ، چندی خدمت بیوتاتِ صوبہ اکبر آباد بہ عہدہ اش مقرر بود و از راست ۔

نباشد در خور دیوانہ ام پیراہن صحرا (۳۸ الف) | گریبان می درد مجنون من تا دامن صحرا
آفت تاراج نبود رہروانِ عشق را | نیست غیر از غم متاعی کاروانِ عشق را

۵۶ ۔ محمد جعفر راہب ۔ موطنش دار الامان اصفہان است در سنہ یک ہزار و یک صد و ہیژدہ (۱۱۱۸ھ) تولد یافتہ خانِ خالہ مرحوم در ریاض الشعراء آوردہ کہ از عنفوانِ شباب عنان

همت بهمتِ تحصیل علوم معطوف ساخته در عرصهٔ قابلیت و استعداد گوی سبقت از معاصرین ربوده و بعلوِ ادراک و رسائی فهم یگانهٔ زمانه و در کمالِ ظاهر و صفای باطن بعالم نشانه بود، و در رسائل و انشاپردازی مهارت عظمی داشت، و مصاحبت و مجالست اربابِ کمال را از غنائم می انگاشت الحق که بلندیِ طبیعت و رنگینیِ فطرت از اشعارش هویداست:

انگشت بپا سلسلهٔ زلف دوتا را — آراست برای دل ما دام بلا را
نه مژدهٔ وصلی نه پیامی نه حدیثی — در کوی تو بستند مگر پای صبا را
صد عقدهٔ غم از دل غم دیدهٔ راهب — بکشاید اگر باز کنی بند قبا را
ضعف تن بسکه مرا مانع شبگیر شده است — سایه‌ام هم چو خط جاده زمین‌گیر شده است (۳۸ب)
با اسیرانِ بلا هیچ نمی پردازد — غمزهٔ یار ز خون خوردن ما سیر شده است
راهب از میکده گر پا نکشم معذورم — خط پیمانه مرا حلقهٔ زنجیر شده است
گر پیش نهال قد او جلوه طراز است — عذر گنه سرو همین بس که دراز است
عاشق خبر از گردش ایام ندارد — روز و شبِ محمود رخ و زلف ایاز است
در احسانِ اهلِ ستم نیست فیضی — فروغِ شرر اعتباری ندارد
ز چشمش مردمی جوید دلِ پر درد حیرانم — که بیمار زبیمار پرستاری طمع دارد
چو مرغ نیم بسمل تا بکی راهب بخون غلطد — ز شستِ غمزه‌ات یک ناوک کاری طمع دارد
می کشد عاقبت کار محبت به جنون — باده چون کهنه شود نشاءِ دیگر دارد
لحظهٔ آئینه از وصل تو محروم نشد — می توان گفت که اقبال سکندر دارد
ساقیا بی شر و شور است بسی محفل ما — سر مینا مکشا تا بکشاید دلِ ما
گر نگردم دیده را فرش رهت بی وجه نیست — ترسم از مژگان من خاری خلد در پای تو
جان حسرت دیدگان را نیست تابِ انتظار — می کشد امروز ما را وعدهٔ فردای تو
دل بی تو طمع ز هستیِ خویش برید — شد دیده در انتظارِ وصلِ تو سپید (۳۹ا)
چون نقش قدم نشسته‌ام بر سر راه — چون حلقه بدر دوخته‌ام چشم امید
راهب نگهش مست و خرابم دارد — زلف سیهش بپیچ و تابم دارد

داغم زتغافل لب کم سخنش — این آتش خاموش کباب هم دارد

در هجو خانمی نام فاحشه معشوقه بیژن بیگ که یکی از ملازمان بادشاه بود گفته۔

رباعی

میلم بجماع خانمی گشت فزون — رفتم بر برش گفت که ای ساده درون
هر کس که درین چاه فتد چون بیژن — مشکل که بسعی رستم آید بیرون

۵۷- آقا رضا گیلانی عالم اکثر علوم بوده، و در شعر سلیقه وافی داشته هنگام تسلط افاغنه بر ممالک ایران، این جهان گذران را پدرود نمود او راست۔

هرگز طبیب فکر من مبتلا نداشت — گویا برائے درد دل من دوا نداشت
خلوت طلب برائے چه می گشت هر زمان — گر مدعی ز وصل تو صد مدعا نداشت
خاموشیم نبود ز آسودگی رضا — از بسکه بود تنگ دلم ناله جا نداشت

۵۸- فصاحت خان راضی از قاضی زادہائے کشمیر و شاگردان میرزا عبدالغنی بیگ قبول است تا سنه (۱۱۲۳ھ) نوزده (سنه ۱۹ جلوس) فردوس آرام گاه در شاه جهان آباد بقید حیات بوده، اشعارش خالی از فصاحتے نیست او راست۔

بسان چشم که گرید ز درد هر عضوے — غمے بهر که رسد می کند ملول مرا
سالکان راست رو در بند ملت نیستند — تیر چون آید بجولان می گذارد کیش را
ظاهر نشد ز قحط سخندان شعور ما — هم چون کمان حلقه نهان ماند زور ما
صاحبان خلق خوش را مامرید و بنده ایم — هر که در تعظیم باشد قامتش خم پیر ماست
آه دل مکدر ما گریه آور است — راضی چو خاک باعث باران بخار ماست
خال بیجا نه ته ابروے اوست — نقطه را جاے بزیر ابروے الحست
ذکر دل سوز را کالے سفرا چون کباب — خود رود در آب و آتش گر نمک پرورده است
آن رخ و لب ز خال مستغنی است — گل و مل را نقط نمی باید
با عندلیب صلح کنم یا بباغبان — ای گل ترا بخاطر عاطر چه می رسد

۵۹- محمد رحیم خان کرامی است که پدرش حاکم آن جا بوده و وے از اوائل ترقیات

نادرشاه برفاقتش تن درداده بعد از فتح اصفهان از تصرف افاغنه یکے از خدمت عمده سرفرازی یافته بود در هنگامے که شاه (۴۰ - الف) عنانِ توجه به سمت بغداد معطوف داشت بسببے از جانبش سوء مزاجی بهم رساند و وے ترک خدمت و منصب نموده بلباسِ درویشان به نجف اشرف رفته ساکن شد، و بعد چندے وارد هندوستان گردید، نواب برهان الملک بنا بر سابقه دوستی و اتحاد مراسمِ مراعات بجا آورده، به منصب سرفراز کنانید، اما ترقی به حالش راه نیافت، اوقات را به ظاهر خوش و به باطن ناخوش می گذراند و در فن سپهداری بے بدل بوده و خط نسخ و تعلیق خوب می نوشت هنگام رسیدنِ نادرشاه در لاهور بمرضِ ذات الجنب بشاهجهان آباد راهی عالم بقا گشت، این دو رباعی از وے بنظر رسیده۔

با آنکه صباح و شام در کوے توام — محرومِ وصالِ قد دلجوی توام
بے طالعی ام نگر که هم چون سایه — از وصل تو بے نصیب پهلوی توام

بر اسپِ سیاه آن بت مه پیکر — تا گشت سوار خاست صد فتنه و شر
شد جلوه حسنش از دو بالا چه عجب — مه را به شبِ تیره بود فیض دگر

حرف السین

۶۰ - ملا ساطع کشمیری از رفقای اسلام خان میر آتش بوده، عهد بهادرشاه (۴۰ ب) ومداحی نواب صمصام الدوله میکرد، و در صله بخدمتی از خدماتِ وطن مع جاگیر سرفرازی یافته همانجا بسر می برد، نثر رنگین می نگاشت و شاگرد میرزا داراب بیگ جویاست۔

می رساند بتو پیغام زجان سختی ما — دم شمشیر تو هرگاه که برمی گردد
من بخود چون نامه می پیچم چو میرانی مرا — وا شوم، در بزم خود هرگاه میخوانی مرا
دنیا و آخرت بریاضت کشان دهند — دار و کمان زچله نشینی دو خانه را

۶۱ - میرزا لطف الله ساطع از سادات کشمیر است، در ایران رفته اکثر بلاد آن جا را سیر کرده و با بسیاری از ارباب کمال صحبت داشته تا سنه یک هزار و هفتاد و نه (۱۰۷۹هـ) بقیدِ حیات بود و راست۔

مال می شود صاحب کرم مولیولت افزون تر   بلے ہر چاہ را آب از کشیدن باز می آید

۶۲ - میر عبدالصمد سخن وطنش ہندوستان است چندے برفاقت ضیاء اللہ خان حاجی عنایت اللہ در اکبرآباد ماندہ و ازان جا ہمراہ نواب سربلندخان بگجرات رفتہ یافت، خان آرزو مغفور اوائل مشق سخن شعر خود را بہ نظرش (۱۴ - الف) میگذرانداز وست -

ان روزے کہ بہ پاے تو سر گرم نیاز افتم   دم برخاستن چندان روم از خود کہ باز افتم

از کہ پرسم خبر آہوی رم کردۂ خویش   کیست تعبیر کند خواب فراموش مرا

بنمای رہ کہ ہرگز دیگر بخود نیایم   ساقی بگردش چشم ساغر اگر نباشد

۶۳ - عبدالحق سمندر از متوطنین لاہور است، و بر دیگر حالش اطلاع نہ - از وست -

شبے کہ عارض او ایاغ افروزد   چنان بود کہ چراغ از چراغ افروزد

۶۴ - سید صلابت خان سید تخلص در عہد بادشاہ فرخ سیر بخدمت میر آتش سرفرازی داشت او راست -

مرا ز حلقہ بگوشان آن کمان ابرو   کسی کہ کرد جدا خانہ اش خراب شود

۶۵ - خواجہ عبداللہ ساقی - از ملازمان شاہزادہ اعظم شاہ بود و در عہد فردوس آرام گاہ بلاہور وفات نمود او راست -

شد بہار آخر و کس پنبہ ز داغم نگرفت   گل امید مرا حسرت چیدن باقی است

۶۶ - میرزا زاہد علی سخا ولد میرزا سعدالدین لاری است ہنگام اختلال سلطنت ایران حاکم لار بودہ و با افاغنہ جنگہا نمودہ دستگیر (۱۴ ب) آمدہ مدتے در صفاہان محبوس ماندہ و بعد خلاصی چندے از جانب بادشاہ افغان بحکومت بندر عباسی مقرر گشت، او اخر بہندوستان رسیدہ ہمراہ نواب سعادت خان بملازمت فردوس آرام گاہ مشرف گردیدہ منصب و جاگیر یافت و در سنہ یک ہزار و یک صد و چہل و شش (۱۱۴۶ھ) از دست زن مغنیہ مسموم شد او راست -

در شب ہجر تو شرمندۂ احسانم کرد   گریہ از بس گہر اشک بدامانم کرد

شمۂ درد دل خویش بہ بلبل گفتم   آن تنک حوصلہ رسوای گلستانم کرد

سرگذشتِ شب هجران تو گفتم با شمع — آن قدر سوخت که از گفته پشیمانم کرد
زلف او بود سخا حاصل سرمایهٔ عمر — شانه آخر ز کفم برد و پریشانم کرد
به تنم خدنگ نازش بچه کبریا نشسته — چو شکسته استخوانی که بر و بهانشسته
نیست در مشرب ما باده کم از آب حیات — گشته تا شیشه تهی پر شده پیمانهٔ ما
نشه در باده گهر در صدف و بو در گل — آنقدر لطف ندارد که تو در خانهٔ ما

۶۷ - ملا علی اکبر سودا مولدش قم است خالو الهٔ مرحوم نوشته که همراه من وارد شاهجهان آباد گردیده در زمرهٔ صلوات خوانان ملازم (۲۴۳ - الف) فردوس آرام گاه گشته در موسیقی ایران مهارت تمام داشت و با موسیقی هند هم فی الجمله ربطی بهم رسانده و طبعش به شعر و انشا بغایت مائل بود در اصفهان ملهم تخلص میکرد و در دهلی قزلباش خان اورا سودا تخلص داد اوراست -

ما آرزوی بوسهٔ بیجا نمی کنم — هیچ از دهان یار تمنا نمی کنم
از چاک دل نظر برخ یار می کنم — سیر چمن ز رخنهٔ دیوار می کنم

۶۸ - محمد احسن سامع گویند نو مسلم است از اقربای بندرابن که یکی از متصدیان بهادر شاه بوده، بیش تر در رفاقت عظیم الله خان گذرانده و مشق سخن ابتدا پیش میرزا بیدل و آخر حکیم حسین شهرت می نمود ظاهرا الحال در شاه جهان آباد است و بخوبی خلق موصوف - اوراست

چکنم خاطر صیاد عزیز است مرا — ورنه از کشمکش دام به تنگ آمده ام
از تو سر کہ می پیچد رخشِ نازجولان ده — دامنت که میگرد دست عجز بالا کن
شد خنک ز بید ر روی بزم عاشقان سامع — ناله بر آر از دل شور حشر بر پا کن

۶۹ - خدیجه سلطان بیگم بنت عم خالو الهٔ مرحوم است که هر دو را بر یکدیگر تعشقی بود (۲۴۲) و نیز مادرش اورا بخالو الهٔ مرحوم منسوب کرده تا آنکه زمان مواصلت با دای رسوم مناکحت و مزاوجت برسد بمقتضای گردش چرخ ستم گار تسلط افاغنه بر آن مملکت واقع شد و آن مستورهٔ حجاب عصمت بدستِ یکی از سردارانِ افاغنه گرفتار آمد و خالو الهٔ مرحوم نیز اسیر سلسلهٔ غربت هندوستان گردید من بعد در آتش فراق می سوختند و محروم از دیدن یکدیگر رخت سفر ازین جهان

ستند، چنانچه خانوالہ مرحوم این ماجرا را در خاتمہ ریاض الشعراء نظم و نثر مفصل نگاشتہ است،
زوست۔

من ساقیم و شراب حاضر ای عاشق تشنہ آب حاضر
آب است شراب پیش لعلم ہاں لعل من و شراب حاضر
با حسن من آفتاب ہیچ است اینک من و آفتاب حاضر

حرف الشین

۷۰ میرزا کاظم شرر اصلش از قم و از خدمہ قبور سلاطین صفویہ بودہ۔

نمی خواہد دلم زخمے کہ با مرہم بود کارش من و آسایش دردے کہ از درمان بود عارش

۷۱۔ حکیم حسین شہرت در عہد خلافت اورنگ زیب عالمگیر از شیراز بدار یہ ہندوستان (۴۳۔الف) گردیدہ بخدمت شاہزادہ اعظم شاہ میگذراند و در زمان فردوس آرام گاہ بہ حکیم الممالک مخاطب گشتہ بود، آخر عمر بزیارت کعبہ شریفہ رفتہ سعادت حج دریافتہ مراجعت کرد و در سنہ یک ہزار و یک صد و چہل و نہ (۱۱۴۹ھ) عازم دار بقا شد دیوانش قریب پنج ہزار بیت خواہد بود۔

چوں خامہ گرچہ توأم خاموشیم ولیک ایجاد کردہ اند برائے سخن مرا
از زنخدان تو می باید سراغ دل گرفت یوسف گم گشتہ ام اینجا بچاہ افتادہ است
ہر جائے می کشم از دست شہرت می کشم دل شکستہ چوں نگین از پہلوی نامیم ما
تنگ آیدم اے نالۂ دلخواہ کجائی فریادیم از دست تو ای آہ کجائی
یک نفس وا شدنی داشت دلم گل زر و برد مصرعہ نالہ زمن بود کہ بلبل زد و برد

۷۲۔ اخوند شاکرا ع طہرانی از سخنوران صاحب قدرت و شاعران عالی فطرت است عروض و قافیہ مہارتے عظیمے و در نظم شعر فکرے رسا داشت از وطن باصفہان رسیدہ ملک طلبہ علوم منسلک گردیدہ با شعراے آنجا ہم طرح بود (۴۳ ب) از واست۔

ہم چون جرس ز دوری یار یگانہ ام فریاد خیزد از در و دیوار خانہ ام

دوش از ہجوم شوق سرم مست شور بود | یا دوش بدل چو بادہ بجام بلور بود
ہر زخم کرد تشنہ لب زخم دیگرم | گویا کہ آب خنجر ناز تو شور بود
در پیش چشم من بدل مدعی نشست | این شیوہ از خدنگ تو بسیار دور بود
شاکر بنالہ کوش کہ از روز وصل یار | محروم ماند آنکہ بشبہا صبور بود

۷۳ - میرزا صالح شہادت از بلخ است و تمام عمر در ہمانجا بسر بردہ در سنہ یک ہزار و یک صد و پنجاہ و پنج (۱۱۵۵ھ) فوت شدہ او راست۔

سرو خیزد بید مجنون، لالہ خیزد سر نگون | در گلستانے کہ نخل بخت من گل می کند

۷۴ - آقا عبداللہ شغف موطنش قم است، اوائل بہ پیشۂ موزہ دوزی اشتغال داشت آخر ترک کردہ مشغول تحصیل علوم گردید بشاعری دستگاہی بہم ساند پیش از محاصرۂ اصفہان بعین جوانی وفات یافت۔

برآمد از چمن دل ہزار نخل امیدم | بیاد قد تو از بس الف بسینہ کشیدم
کس راہ چمن نہ بستہ اما | بیرون ز قفس نمی توان رفت

۷۵ - میر سید محمد شعلہ ولد (۳۴۳ - الف) میر صفی طبیب، مولدش اصفہان است و وطن اصلی وی اردستان صاحب طبیعت رسا و کم فکر و خوش گو بود، در فن طبابت ہم دستگاہی خوب داشت اما ہرزہ گرد و تماشائی و عاشق پیشہ واقع شدہ، اوقات را غیر از لہو و لعب بشغلی دیگر مصروف نمی کرد، و موسیقی را خوب می دانست و آوازے دل کش داشتہ او راست۔

آن بخت نداریم کہ ہم بزم تو باشیم | ما و سر راہ تو و آہی و نگاہے
زاہد دہدم توبہ کہ مستی نکنم | با دختر رز دراز دستی نکنم
حقا کہ بزیر تیغ بنشینم اگر | چون چشم تو ترک می پرستی نکنم
چشم تو بہ نمہ خنجر فولاد کشید | ابروت بمہر تیغ بیداد کشید
رسم است کمان کشد بآہو صیاد | اینجا آہو کمان بصیاد کشید

۷۶ - محمد علی سکاکی شکیب وطنش شیراز است پدر او کارد گری میکرد، و وجہ اشتہار

ے بسکاکی ہمین است چون بہ تحصیلِ علوم پرداختہ باندک زمانے از مشاہیر گشت کہ بسیاری
اطراف و جوانب ترکِ اوطان نمودہ خدمتش دریافتند و مستفید گردیدند خود را متلبس بلباس
ایشان میداشت (۴۴ ب) وخدمت ایشان را وسیلہ سعادتِ اخروی می انگاشت، و بہ صحبت
راء بہ غایت مائل بود چون افاغنہ خانہ اش را غارت می کردند بانہا بجنگ درپیست و بکدو کس
شتہ شہید شد از وست۔

دو عالم را جزائے قاتل من دہ خدائے من | کہ بس باشد ہمین ذوق شہادت خونبہائے من
جو نفیِ نفی اثبات است از مردن نمی ترسم | بقائے من چو شمع کشتہ باشد در فنائے من
بدن مصر و ہوا فرعون دہامان نفس من موسیٰ | خیال و وہم ہا سحر و دلیل من عصائے من
ز پیری در جوانی شد چنان آشفتہ کارِ من | کہ چون ریشش دو مو در ہم بود لیل و نہار من
چو نور و سایہ می خواہد دلم تا متصل باشد | سر من در کنار او سر او در کنار من
شکیب از آتش من ہیچ کس ہرگز نمی سوزد | بہ دشمن واشیا قوت می ریزد شرار من
بغیر از چینِ ابرو ہیچ از آن بد خو نمی بینم | چو آب موجدار از صحبت او رو نمی بینم
بگوش اہل صورت کے رسد آواز مسکینے | کہ مانند صدف دارند از در گوش سنگینے

۷۷۔ معنی یاب خان شاعر، نام او گل محمّد بود و از تلامذہ (۴۵-الف) میرزا بیدل۔
رائے صاحب خداوند آوردہ اند کہ بہ رائے آنند رام مخلص کمال خصوصیت و اتحاد داشت
و بذریعہ ایشان منصب و خطاب خانی یافتہ بود و اخرِ عہدِ فردوس آرام گاہ وفات یافت۔

غافل از نو بہارِ حسن مباش | خطِ نو رستہ سبز کردۂ اوست
مپرس قصۂ صوفی بروزِ وجد و سماع | دمے کہ می رود از خود بحال می آید
قمری سیاہ گشتہ گریبان جامہ ات | تبدیل رخت خویش نما این چہ نکبت است

۷۸۔ فروغ آفتاب سپہر امارت و اقبال، ضیائے شمع محفلِ ریاست و اجلال، نکہتِ ریاحینِ
گلزار سخاوت، آب و رنگ گل ہائے چمنِ مروّت، زیب افزائے مسندِ سخن وری، زینت
بخشائے وسادۂ ہنر پروری، رائے صاحب خداوندِ نعمت۔
رائے تن سکھ رائے متخلص بہ شوق، سلمہ اللہ تعالیٰ، خلف اصغر رائے

مجلس رائے نائب دیوانِ خالصہ شریفہ از زمرہ سای مشہور شاہجہان آباد، وعمدہ ہائے معروف آن دیار اند، چون حسب ونسب آن والانژاد، بر اکثرے از شاہ جہان آباد و اکبر آباد ظاہر و باہر است، پس تکرار چہ لازم، علوے طبع و رسائی (۵ ب) فہم و کمال ادراک و بلندی استغنا برنگ بو در گل و نشہ در مُل، و نور با خورشید و رنگینی با بہار، در طینت او مخمر گشتہ وطیبِ خلق و طریقِ تواضع و قدرشناسی و پرورشِ ارباب ہنر با آن جمعیت، ہنگام اختلال سلطنت ہندوستان بوقوعِ حادثۂ شورشِ افغان مرتبہ اولی کہ در سنہ یک ہزار و یک صد و ہفتاد (۱۱۷۰ھ) بود مع قبائل وارد اکبر آباد بود و ہمدران ایام تذکرۃ الشعراء کہ بسفینۃ الشعراء موسوم و ماخذِ شعرای اہل ہند کہ داخل این اوراق اند ہمان است تالیف می نمودند۔ جامع اوراق مدتِ یک سال و چند ماہ بخدمتِ آن مصدرِ احسان و انعام ماندہ، تفقد و تلطف زیادہ از نسبت بحالِ خود ملاحظہ می کرد رسائی طبیعت و صفاے ذہنِ ایشان ازین جا توان دریافت کہ باوجودِ عدمِ توجہ بنظمِ شعر اصلاً ہرگاہ بعدِ فراغ تالیف عنانِ شبدیزِ طبیعت بدان سو منعطف ساختند در مشقِ یک ماہ از عرصۂ پختگی و فصاحت بیرون تاختند، تا بہ این سہ ماہ دیوانے مشتمل بر ہزار و چند بیت پُر از غزلیاتِ رنگین و اشعارِ (۶ - الف) دل نشین ترتیب یافت کہ این چند شعر از ان است ۔

بے گل رویش نخواہم خندۂ مستانہ را	در فراقش کے زنم جز بر زمین پیمانہ را
آب بے بروسے کار نیامد ز گریہ ام	اے ہائی ہائی نالہ بفریاد رس مرا
آرزو دارم بکامِ دل ببر آرم ترا	دادِ ہجران تا نگیرم خوب نگذارم ترا
نے خشم و نے عتاب و نہ کین می کشد مرا	با غیر لطف میکنی این می کشد مرا
باعث خواری و بیقدریِ خود معلوم است	سببِ حرمتِ اغیار نمیدانم چیست
داد مکتوب نیازم را بدشنامی جواب	وائے آرزوئے کہ عرضِ مدعا خواہم نوشت
بر امید یک نگاہ پرسشِ آن شوخ چشم	ہم چو نرگس حاصلِ عمرم بہ بیماری گذشت
ز نعمت کے بہ یکجا می شود از چرخ دون حاصل	درخت اول دہد بر باد گل آن گہ ثمر گیرد
بر آبِ دیدہ روان است پارہ ہائے جگر	چو برگ لالہ کہ از آبشار می آید

سهل گیرد جفاے دوران را — بجفاے تو هر که خو دارد
تغیدار تو گر حرمان بیک چشمک زدن باشد — نصیبم مرگ گردد گر امید زیستن باشد
شکست عهد مگر مشق (۶ ب) می کنی ای شوخ — که نامهٔ تو بخط شکسته می آید
نماند جان به تن کس کزین نگاه یدش — کمر کشاید و شمشیر را نیام کند
نظرش کے بمن افتد که ز بے پروائی — صورت خویش در آئینه ندیدست هنوز
آن لحظه چه بر دل رود از بیم و امیدم — برخاسته چون می روی و می نگری باز
از دست حناے تو گرفتم که برم جان — خونخواری این بیڑهٔ پان را چه کند کس
بهر خدا مرا نسپاری بدست هجر — گرمی کشی بناز بکش پیش روے خویش
بقربان تو قاصد باز گو پیغام جانان را — نفهمیدم ز شادی بسکه نه دار خویشتن رفتم
دوستان صحت ما چشم ندارید دگر — خستهٔ غمزهٔ آن نرگس بیمار شدم
بوصف لعل میگون تو تا رنگین سخن دارم — که می گوید زبان برگ گلی اندر دهن دارم
شد تو تیا ز سنگ جفا استخوان من — زین بیش تر مکن بوفا امتحان من
نیست منظور چو دل دزدیدن — چیست دزدیده بسویم دیدن
بعد ازین هرگز نگردد هیچ کس بر گرد تو — گر بگویم زین جفاهائے که با ما کردهٔ
از غم هجر تن زار غبارے (۷ - نسخه: بوده است) — رفت بر باد ز یک گردش دامان کسے

حرف الصّاد

۷۹ - میر عبدالباقی صهبائی اوائل عهد اورنگ زیب عالمگیر بهندوستان بود و در انشا پردازی ید طولے داشت، اعتراضات شیدا را که بر قدسی کرده است جوابے منظوم ساخته' او راست -

هزار مرتبه بخشید جرم من کرمت — دلیر ساخته عفو تو بر گناه مرا
از کوچهٔ نے تا بدر میکده راهست — بر دعوی من ساقی و مطرب دو گواهست
خود مست و غمزه مست دو چشم از خمار مست — یک ناتوان چه کار کند با سه چار مست

زبهر دفع خمار و نه رفع رنجوری	برغم شیخ کشیدم شراب انگوری

۸۰ - محمد ماه صادق - برادرزاده محمد اکرم غنیمت است، رقعات مشتمل بر صنائع بغایت خوب و رنگین نگاشته، در وسط عهد فردوس آرام گاه وفات یافته، او راست۔

دماغ منت پروانه و بلبل کجا دارم	چراغان برنمی تابد مزارم گلفشانی هم

۸۱ - چراغ دودمان شرافت، فروغ خاندانِ کرامت، گل سرسبد حدیقهٔ صلاح و تقویٰ، دُرّ یتیم صدفِ تسلیم و رضا، خسرو اقلیم عزلت آشنای (۷۳ ب) بحر خلوت شب تاریکِ فقر را بدر منیر.
شاه اله دستگیر متخلص بہ صفی سلمهٔ الله تعالیٰ، تعداد خوبہائے ذاتِ منبع حسناتش

از قبیل ریگ بیابان بہ مشت پیمودن است، و احصاے اوصاف وجودِ مکارم آمودش بمنزله محیط را در کوزه نمودن، بہ فیضِ تاثیر تحریرِ مجاملِ خوش خُلقیش از مداد دوات برنگ نافه بوی مشک می دمد، و بہ یمنِ برکت ترقیم محاسنِ طبع تو اضع پسندش، قلم مانندِ شاخ نرگس پشت خم می گردد، و والد بزرگوارش شاه ولی محمد مرحوم مغفور، از اکابر مشائخ و اعاظم متوکلان بوده، کہ جمیع در اکبرآباد ادراکِ خدمتش را سرمایهٔ افتخار و مباهات می دانستند، بعد رحلتِ والدِ ماجدِ خود بجاایش نشسته، چتر فرمانروائی کشور عزلت بر سر افراشت و قدم همت در راهِ توکل و انزوا مردانہ گذاشت، در عین شباب صلاح و پرہیزگاری خلعتے است کہ بر قامتش زیباست، طبیعتی در نظم و نثر بغایت موزون و رنگین دارند و اکثر فکری نمایند، ازوست۔

از برائے خواب بنود حاجتِ بستر مرا (۷۴ - الف)	هم چو اخگر فرشِ سنجاب است خاکستر مرا

جام مے رفع خمارم نکند ای ساقی	منکه مدہوش ز کیفیتِ دیدار شدم

از گدازِ خویش آبی میخورم چون نخل موم	تر نگشته ریشه ام از ابر احسان دگر

نامهٔ بے خودی نگاشتنی است	خامه از چوب تاک می باید

بجاے نامه نزد یار لختِ دل فرستادم	مرا مکتوب پیغام زبانی خوش نمی آید

ہجوم درد آسان می کند ہر کارِ مشکل را	بآہے می توان وا کرد قفل خانهٔ دل را

ز لیلیٰ یادگارے نیست جز مجنون درین وادی	بجاے خود نشاند حسن آخر عشق کامل را

زبان تیشه می گوید صفی این حرف در گوشم	هماهر کس کہ اینجا نقد دل را کوہکن باشد

حرف الضاد

۸۲ - میرزا روشن ضمیر ضمیرؔ مدتے بہ متصدی گری بندر سورت اشتغال داشت و اشعارِ ہندی کہ عبارت از کبت و دُہرہ باشد خوب می گفت۔

شنید کو تہی روزم آفتاب گریخت   درازیِ شبِ من دید و ماند ماہ آنجا

۸۳ - سید ہدایت علی خان ضمیرؔ مردے بلند استعداد، عالی فطرت، صاحبِ شجاعت و سخاوت است (۸۴ ب) پیش ازین چندے بفوجداریِ پرگناتِ خالصہ شریفہ مامور بود، و در جمعیتِ قلیل دادِ خوش معاشی و میرزائی میداد، و گاہے بہ نظم شعر ہم مصروف است، او راست۔

بزورِ ناتوانی یافتم بر وصلِ او دستے   بہر گامی است از مالغزشِ پاے از دستے

حرف الطاء

۸۴ - میرزا عبدالباقی طبیبؔ از سادات صفہان است در ملازمت نادر شاہ بعلاقہ طبابت می گذراند، خانوالہ مرحوم نوشتہ کہ این ابیاتِ خود را از ایران بمن نگاشتہ فرستادہ بود، او راست۔

گر بہ تو انست غم را از دلِ بیتاب بُرد   کے تو اند کوہ را از جاے خود سیلاب بُرد

از زردے تو چون چشم خوں فشاں گردد   ز خونِ دل مژہ ام شاخِ ارغوان گردد

گرفتہ دل بہ غمش الفتے دمی ترسم   خدا نکردہ بمن یار مہربان گردد

ترسم کہ چو جانم ز تنِ زار بر آید   از خلوتِ اندیشۂ من یار بر آید

دل تنگ شدم بسکہ طبیب از غم ایام   از سینۂ من آہ بزنہار بر آید

حرف العین

۸۵ - سید مرتضےٰ اعلمؔ از احفادِ سید محمد صاحبِ تفسیر مدارک است، گویند مردے

به غایت حمیده (۹ - الف) خصال و صاحب کمال از ارباب ورع و تقوے بود و پیوسته باستفاده و افاده مشغول و مشغوف. او راست۔

کم نمی گردد ز دریا انچه بردارد سحاب	چشم من تا می توانی گریه کن دریاست دل

۸۶ - معتمد الملک علوی خان اسم او میرزا محمد ہاشم بود در سنہ یک ہزار و ہشتاد در شیراز (۱۰۸۰ھ) متولد شده، و ہمانجا تحصیل علوم نموده، در یک ہزار و یک صد و یازده (۱۱۱۱ھ) ہندوستان ورود کرد، و بخدمت محمد اورنگ زیب عالمگیر بمنصب و خلعت سرفراز شد، بعد از چندے شاہزاده اعظم شاه او را از پدر خواسته پیش خود داشت، بعد شہزاده مسطور بخدمت شاه عالم بهادر شاه می بود، و در عهد فرخ سیر بمرتبهٔ در خور منزلت یافته، و در عصر فردوس آرام گاه ترقیات نموده، بمنصب شش ہزاری ممتاز گردیده، و ہمواره مورد مراحم و الطاف می شد، نادر شاه نظر باستعداد و قابلیتش ہمراه برده بود، بعد از سالے از شاه جدا شده بزیارت مکهٔ معظمہ رفته سعادت حج دریافت، و باز مراجعت به شاه جہان آباد در خدمت فردوس (۹ ب) آرام گاه بدستور معزز و محترم بود، او راست۔

زصاف شعلهٔ حل کرده پرسازید جامم را	بجوش آرد مگر در مغز من سودائے خامم را
بجائے سبزه و گل شعله و دود از زمیں روید	فشانم گر بخاک از روی مستی دُرد جامم را
اسیر داغ حرمان را فریب دانہ کے سازد	ز تار شعلهٔ جواله باید ساخت دامم را
ہوا گردد سموم از شعلہ ہائے سوز پنہانم	گذارد در لعل غافل اگر یک دم پیامم را

۸۷ - مولانا محمد یوسف عارف گازرونی مجموعۂ کمالات بوده، و با وصف فضیلت قلندرانه بسر می برد، و خط ثلث و نسخ را خوب می نوشت، تا آخر عمر در شیراز و وطن با مستعدان و ارباب فضل آنجا محشور می بود، بعد ہنگامهٔ افاغنه وفات یافت از وست۔

بازم بسر ہوائے نگارے فتاده است	دیگر مرا ببین که چه کارے فتاده است
یارب کشایشے که ز زلفش بکار من	خوش عقدهٔ برون ز شمارے فتاده است

۸۸ - میرزا مهدی عالی از شعرائے مشاہیر است، درویش نہاد و صالح و متقی بوده، او راست۔

دل می رود سالک زان (۱۵۰) رسوائی باشد　　برون از خویش رفتن راصدائے پائی باشد

۸۹ - ملا علی عالی از متوطنانِ قریہ کوسار قریب باصفہان است، پدرش حاجی زین العابدین پیشہ معماری داشت، و وے از خوردی راغب تحصیلِ علوم گردیدہ، در مدتِ قلیل گوی مسابقت از معاصران ربودہ، در علمِ قرأت و موسیقی مہارتِ عظمیٰ بہم رساندہ، و در خوشنویسی مخصوص نقل برداشتنِ خط دستِ قدرتی داشتہ، کہ عقلِ استادانِ باریک بین، بہ تمیز یک دیگر نمی رسید، کتابتِ قرآن مجید بحفظی می کرد، اوّل اعراب بر صفحہ می گذاشت بعد از ان می نوشت، بطبقی کہ ہیچ یک اعراب بیجائی نمی افتاد، در استیلاءِ افاغنہ از محاصرہ با عیال و اطفال برآمدہ بہمدان رفت، مردم آنجا قدوم اورا از غنائم روزگاری شمردند، ہنگامے کہ لشکرِ روم ہمدان را تاراج وقتل کرد، وے ہم شہید شد، او راست۔

ضعیفان را دم مردان ز آفت پاسبان باشد　　شکوہِ نعرۂ شیران حصارِ نیستان باشد

غبارِ اشکِ من (۵۰ ب) از چشم پر آب آید برون　　سیل گرد آلود دائم از خراب آید برون

عشق وارد با دلِ سوزان ترحّم بیش تر　　خون خورد آتش چو اشکے از کباب آید برون

زپہلوی دل آتش خانہ سوزد　　چہ خرمنہا ازین یک دانہ سوزد

زیک آتش فسون سازِ محبت　　سمندر سازد و پروانہ سوزد

جمال ای شمع بے پروا برافروز　　کہ عالی سوزد و پروانہ سوزد

۹۰ - عباس قلی خان داغستانی - از مستعدانِ زمانہ بود، در اوائلِ عمر وارد ہندوستان گشتہ بملازمتِ بادشاہ افتخار حاصل کردہ، مدّتے در ایامِ پیری بلاہور بسر کرد، گویند در خوش طبعی و رنگینی بغایت نادر الوقت بود، او راست۔

یک چشم زدن سیرِ گلستان ہوسم شد　　در پردۂ ہر رنگ کہ رفتم قفسم شد

۹۱ - میرزا محمد یوسف عزیز فاضل مستعد بود و وزارت اصفہان و تبریز و گیلان تعلق داشتہ، در عرصہ سخاوت و کاروانی علمِ ناموری می افراشت، بعد از فتح اصفہان از تصرف افاغنہ روزے از اسپ افتاد، و شکستے بپالیش رسید، آخر بہمان مرض وفات یافت او راست۔

بیت (۱۵۱) جز بندگیش باعثِ ایجاد مرا　　ہست این دولت جاوید خدا داد مرا

ز آسایش دل پیوسته با حق کام می گردد | بدریا قطره چون واصل شود آرام می گردد
ترک من در رسم دلربائی نکنی | دوری ز تو مرگ است جدائی نکنی
ترسم که بمیرم و نه بینم دگرت | ای عمر عزیز بے وفائی نکنی

۹۲ - میرزا محمد علی عارف در سنه یک ہزار و یک صد و بست و سه (۱۱۲۳ھ) بهند متولد شده، و بطفولیت ہمراه پدر با یران رفته، بتحصیل مشغول گشت، و استعدادے وافی بہم رسانید و فی سنه یک ہزار و یک صد و پنجاه و ہشت باز به شاہجہان آباد ورود نموده بود از وست.

آن قدر صبح وصال تو نگردید سفید | که کسے پنبۂ داغ شب ہجران سازد
ہیچ میدانی چه باشد در حقیقت عاشقی | اندک اندک قطره را دریاے عمان ساختن

۹۳ - جے کشن عزت از برہمنان کشمیر است، مدتے بوکالت نواب اسحق خان مشتغل بوده، از وست.

خار کوی تو که از دور ہویدا گردد | آب اندر دہن آبله پیدا گردد

۹۴ - احمد علی خان عبرت - ہمشیره زاده نواب سادات خان است که بغیر زند خواندگی اختصاص داشت در صغر سن بعلوم متداوله از (۵۱ ب) شعر و انشا مهارت عظمے پیدا کرد و خط نستعلیق و شکسته را خوب می نوشت، از وست.

در خم زلف تو دل سیر دو عالم می کند | خانۂ زنجیر بر دیوانۂ ما تنگ نیست
طاقت عشق ندارد دل غم پیشۂ ما | ظرف این بادۂ پر زور نشد شیشۂ ما
برفغانم اگر دہد گوشے | نالۂ آسمان بخود بالد
عشق و عاشق برنگ شعله و شمع | این ہمی کاہد آن بخود بالد

۹۵ - علی عظیم پسر ناصر علی است، بکمال تجرد و وارستگی می گذرانده و در شاہجہان آباد می ماند و متخلص به عظیم بود، از وست.

بغارت رفت یا خون گشت یا محو تماشا شد | خداوندا چه پیش آمد دل دیوانۂ ما را
بلندی سنگ طفلان از بیابان ہیر سد مجنون | با شوبے که تو دیاز ادر رسوائی نمی گنجد

۹۶ - خواجه ناصر عندلیب مردے صاحب کمال، درویش وضع، از متوطنین شاہجہان آباد

است و گویند از اولاد خواجہ بہاء الدین نقشبند قدس سرّہ - او راست۔

یار در خانۂ خود دارم و آرامم نیست ‏ ‏ ‏ ‏ چہ کنم دیدۂ من حلقۂ بیرون در است

۹۷ - سنگھم لال عزّت اوصاف جمیلۂ آن مصدرِ خوبیہا از طیبِ خُلق و آئینِ تواضع و کثرتِ سخاوت و وفورِ مروّت (۵۲ - الف) کہ مانندِ بحر و امواج در طبعش خلقی اند عقل را چہ دست گاہ کہ احصائے آں تواند نمود، و محاسنِ حمیدۂ آن مخزنِ دانش و ہنر از رسائی ذہن و علوِ استعداد و رنگینی طبیعت و ازدیادِ قابلیت کہ چون نور و آفتاب با ذاتش فطری اند چہ امکان کہ با دراک برخی ازان تواند رسید، پیش از حدوث ہنگامۂ افغان در شاہ جہان آباد استقامت داشت، و بعد ورود اکبرآباد تشریف می دارد، استفادۂ شعر از میرزا جان جانان مظہر کردہ، و درین ایام مثنوی مشتمل بر احوالِ کرامت اشتمالِ حضرت خواجہ معین الدین چشتی قدس سرہ، در زمینِ یوسف زلیخا نظم کردہ، کہ خالی از فصاحت و رنگینی نیست، او راست۔

یاد بزم ہم صفیران می کند غمگین مرا ‏ ‏ ‏ ‏ در بلائے تازہ دارد الفتِ دیرین مرا

شورِ عشق خسرو خوبان بسر پیچیدہ است ‏ ‏ ‏ ‏ می نماید بے نمک افسانۂ شیرین مرا

دل بداں خورشید رو چون آفتابی دادہ ام ‏ ‏ ‏ ‏ نیست چون بلبل نظر بر ہر گل رنگین مرا

حرف الغین

۹۸ - میر عبد الغنی از ساداتِ تفرش است قوتِ حافظہ بغایت قوی داشت (۵۲ ب) و اشعار بسیار از اساتذۂ سلف و خلف بر زبان، در وسعتِ مشرب و حسنِ خلق عدیم البدل بود، و بہ غنی متخلص، و فاتش بعنفوان شباب واقع شدہ شیخ حزین می گفت کہ بہ سخن فہمی ہم چو او دیگری دیدہ نشدہ، او راست۔

گل گل ز بادہ چون پرِ طاؤس گشتہ ‏ ‏ ‏ ‏ آمادۂ ہزار دہن بوس گشتہ

یکبار اگر رخِ خود آں دلربا بہ بیند ‏ ‏ ‏ ‏ عاشق اگر نگردد از چشمِ ما بہ بیند

عمرے بہ رہِ وفا نشستیم عبث ‏ ‏ ‏ ‏ دل بے تو بہ دیگرے نہ بستیم عبث

در پیشِ تو قدرِ ہر سگے بیش از ماست ‏ ‏ ‏ ‏ ما این ہمہ استخوان شکستیم عبث

۹۹- محمد عاقل غیرت از ہنداست و دیگر احوالش معلوم نیست۔

بہار گر چہ گل ولالہ در نظر دارد
شکستہ رنگی ما عالم دگر دارد

حرف الفاء

۱۰۰- میرزا سید محمد فدائی اصلش از ہمدان است و بملازمت نواب برہان الملک سعادت خان در ہندوستان می بود، از وست۔

کشد جمال تو شرم از رخ نقاب ہنوز
ترا حجاب ندیداست بے حجاب ہنوز

زیک نظر کہ برآن عارض چو گل کردم
بجائے اشک ز چشم چکد گلاب ہنوز

۱۰۱- فتح علی خان داغستانی از امرایان والاشان واکابر (۵۳-الف) عمدہ ہائی مملکت ایران وعم خانوالہ مرحوم است مدتے وزارت ایجا بوے تعلق داشت، از ارباب فضل وکمال ومربیان اہل علم وہنر بودہ، خط شکستہ خوب می نوشت، او راست۔

چیزے بغیر نام نداریم چون نگین
آنہم ز دیگرے است کہ برمانوشتہ اند

ترسم آخر برخت چہرہ شود
این قدر روے بآئینہ مدہ

قدر شبہائے عزیز افزون است
ساغر از کف شب آدینہ مدہ

۱۰۲- شاہ فاتح از سلسلۂ صوفیہ بود، ہنگامۂ تسلط افاغنہ از ایران صادر ہندستان گشتہ یک سال ماندہ، بعزم زیارت بیت اللہ زادہا اللہ شرفاً، می رفت کہ متصل سورج نقد جان بدست قطاع الطریق داد، او راست۔

ہماں پروانۂ بزم حضورم من کہ می گشتم
کنون بے بال و پر برگرد سر در کنج تنہائی

۱۰۳- میرزا محمد علی فروغ از رنگین سخنان ایران است، ونسبتش بخلیفہ سلطان می رسد او راست۔

بادہ رنگیں می نماید روے تابان ترا
آبیاری می کند آتش گلستان ترا

چشمۂ آب بقا ہر چند جان بخش است لیک
کے برابری شود چاہ زنخدان ترا

چو بلبل زین چمن طرفی نہ بستم غیر ناکامی
ترا ای باغبان این گلشن ارزانی کہ من رفتم

۱۰۴- میرزا فاضل مخاطب بپادشاه نوازخان خانواله مرحوم نوشته که من و او باتفاق وارد هندوستان گردیده بودیم' بذریعهٔ نواب سادات خان شرفِ ملازمتِ بادشاه دریافته بمنصب و خطاب سرفراز گشته بود' او راست.

هزار غنچهٔ نشگفتهٔ امید مراست	که گر شگفته شود عالمے گلستان است
مشو غافل از دست بُرو نگاهش	که این دزد آواز پاے ندارد
استخوانم گداخت آتشِ عشق	خجلم از تو ای هما چه کنم
کفِ تو خواستم از خونِ من شود رنگین	هزار حیف که نزدیتی حنا نگداشت

۱۰۵- میرزا نادر الزمان فصیح برادرِ مرزا محمد امین عرفان است' بشرفِ استادیِ نواب صمصام الدوله و شاگردیِ میـرزا بیدل اعزاز داشت' و بعدِ شهادتِ نوابِ مرحوم مسطور در رفاقتِ جاوید خان معروف بنواب بهادر بسر می بُرد.

عمر بگذشت و نیا سود دل از ناله دمی	کاروان رفت و همان بانگِ درا می آید

۱۰۶- مرتضیٰ قلی فـراق (۵۴- الف) از صاحب طبعان عالی است و دیگر حالش بوضوح نه پیوسته.

بگو صبا زمن آن شوخ باده پیما را	که بے تو عیش میسّر نمی شود ما را
شبے بخواب پدر جلوه گر نشد یوسف	عزیز داشت ز لمس خاطرِ زلیخا را
مکش بیک بارم ای ظالم جدا کن بند از بندم	که هم لذت برم از درد و هم روے ترا بینم

۱۰۷- میرزا اشرف علی فغان از کوکه هائے میرزا احمد است و بگرم جوشی و خوش اختلاطی و حاضر جوابی موصوف' اکثر ریخته و گاهے شعر فارسی می گوید بعد محبوس شدنِ بادشاه مسطور' پیشِ نواب شجاع الدوله پسر ابو المنصور خان رفت' او راست.

قاصد آخر چه دیده می آئی	که گریبان دریده می آئی
دست ما کے دراز کردم من	که تو دامن کشیده می آئی
فغان از فغان تو معلوم کردم	دلِ خویش جائے گرفتار داری
بما به بین چقدر چشم تر مروت کرد	چنان گریست که ما را غریقِ رحمت کرد

۱۰۸ - میر شمس الدین فقیرؒ تولدش به شاه جهان آباد در سنه یک هزار و یک صد
: پانزده (۱۱۱۵ھ) واقع شده، در علم و فضیلت علم نام آوری (۵۴ ب) می افرازد و هم در شاعری
فنِ اشتهار بعرصهٔ استادی می تازد الحق که اکثرے از صاحب سخنان شاه جهان آباد دریں
رمان بر استادیِ او اعتراف دارند- گویند در فقه و حدیث بغایت ماهر است و بلباس
رویشان بے تکلفانه بسری برد چندسال قبل ازین سیر دکن نموده، دیوانش را هفت هزار بیت خواهد
رد، و دو مثنوی در کمال لطافتؑ فصاحت منظوم کرده، و رساله مختصر در علم عروض و قافیه
الیف نموده که نهایت مطبوع است، و در ریاض الشعرای خانواله مرحوم مندرج- او راست-

شد آن بیرنگ در رنگِ جمال دلبران پیدا چو مضمونے که لفظش گردد از حسن بیان پیدا
ز آمد آمد قاصد فقیر از خویشتن رفتم چه خواهم کرد اگر دلدار گردد ناگهان پیدا
بدل جامی دهد آئینه عکس آن پری وش را نمی دانم که باهم صلح داد این آب و آتش را
ز پهلوی خس و خاشاک آتش مایه ور گردد کند مغرور تر عجز ضعیفان طبع سرکش را
باز حال دل کند آگاه مطلوب مرا گریه از خون زد رقم عنوانِ مکتوب مرا
اگر فرهاد می دید آن سراپا ناز و تمکین را روان دریاے دی ریخت (۵۵ ا) نقد جان شیرین را
ازان زمان که ز آغوش رفته یار مرا بغیر پارهٔ دل نیست در کنار مرا
برنگ شمع شبم روز شد ز شعلهٔ آه نشاند بیتو باین روز روزگار مرا
ز رفتنم خبری نیست همدمانِ مرا چو بوی گل نبود گرد کاروان مرا
خوش است جان که شود صرف یار جانی ما دگر براے چه کار است زندگانیِ ما
چو نقش پا نتوانیم از زمین برخاست نشسته در رهِ او نقشِ ناتوانی ما
مرشدے اهل سخن را جز صفاے سینه نیست درس طوطی را کتابے بهتر از آئینه نیست
نقد جان در عوض بوسه توان کرد قبول که خریدار فقیر است تو نگر خود نیست
بیاد روے تو از صبر دل کنار کند بجز تم چو در آئی ز در چه کار کند
کم التفاتی او می کُشد مرا ای کاش بوعده هاے دروغم امید وار کند
تا نباشد طرفی شیشه می سرو قدے نشاه بے خودی عشق دو بالا نشود

از دور فقیر آن شہ خوبان چو مرا دید — گفتا بمن این راسر و کار است ببینید
ہر دم صبا ز زلف تو بوی دگر برد — این می کشد مرا کہ بسوی دگر برد
تو از کاشانہ ام تا رفتہ ای غیرت لیلیٰ (۵۵ ب) — سخن مانند مجنون با در و دیوار می گویم
سایۂ دولت بفرق اغنیاء افگندۂ — اے ہما ما نیز مشت استخوانی داشتیم
بس آمیزش آن شوخ برق و ابر را ماند — کہ می جوید کنار از من بود گر در کنار زمن
جلوہ سرو لب جو بہ گیاہے نخرد — در نظر قامت دلجوی تو دارد دیدہ
گر بجاں سودائے وصلش دست میداد مرا — رشک می بردی بحالم ہر کہ جانے داشتی
با آن کہ پارہ کردیم زنجیر عقل صد بار — ای زلف می توان بست ما را بتار موئی

۱۰۹ - محمد ثابت فائز از متوطنین اکبرآباد است، بزرگانش بعلم و فضل معروف بودہ اند برادر بزرگ وے محمد باسط پیشتر چندے بخدمت قضاے اکبرآباد اشتغال داشت و خود رنگینیِ طبع و رسائی ذہن با حسنِ خُلق و خوبیہاے دیگر جمع دارد ایں چند شعر از دیوانش کہ قریب یک ہزار بیت خواہد بود منتخب شدہ ۔

آنکہ جا در دل او بود من غمگین را — چون سرشک از نظر انداخت بیکبار مرا
پست ہمت نشود کام روا — بنود ناخن پا عقدہ کشا
بے گناہم کُش خدا را ای بقربانت روم — تا بد امانت بمحشر دست رس باشد (۵۶ الف) مرا
بیدار کند دشمنِ خوابیدۂ ما را — انیست اگر نالہ ما را اثری نیست
یاد عشاق شب آن ماہ بنیکی می کرد — برد نام من و فرمود کہ او ہم بد نیست
ہر حلقۂ زلف تو خورشید در براست — قربان شام می روم اینجا ہزار صبح
مرا کز داغہاے دوری اش رشک گلستانم — چرا طفل گلستان خوان من گاہی نمی خواہد
تغافلِ تو ہم امروز گشت قسمت غیر — جفا و جور فلک بیش ازین بما چہ کند
مرہم بداغ سینہ ام الماس سودہ شد — فانوس آستین چراغ کسے مباد
انتظار وعدۂ قتلم جگر خون کردہ است — ہر چہ با من می کند امیدواری می کند
جاے ساغر می کشد خنجر بیادم از غضب — حرف من در مجلس آن تند خو چون سر شود

نامهٔ گاه بغائرز ننوشتی شاید | نفرو شند بشهر تو قلم یا کاغذ
دل نشین من بود چون ابرو و چشم بتان | ابروی بے چشم زخم و چشم بی ابروی داغ
بلبل درین چمن اثری نیست از وفا | بستی برنگ و بوے گلشن دل هزار حیف
ترسم چو من ز منتظرانش بود مباد | خونها ز رشک حیرت تصویر می خورم
نرفتم گر بکوی او نه از اغیار می پرسم | مبادا از من دیوانه ترسد یار می ترسم
هر کجا رفته بدنبال دویم هم چو غبار | یار هرچند چو باد است گریزان از من (۵۶ ب)
در میان نبود بجز نام کمر | من سراپای تو دیدم مُو بمُو
گوئی دل سنگین تو از بو قلمونست | هر لحظه ستم می کنی ای شوخ برنگی

حرف القاف

۱۱۰- عبدالغنی بیگ قبول اصلش از بدخشان است، در کشمیر تولد یافته، و بمیرزا داراب بیگ جویا نسبت شاگردی دارد۔ در عهد شاه عالم بهادر شاه برفاقت ہدایت اللہ خاں نائب وزارت می ماند، و در سلطنت فرخ سیر همراه صلابت خاں داروغه توپ خانه می گذرانید اوائل جلوس فردوس آرام گاه رخت سفر بعالم جاودان بست، گویند شیوهٔ گرم جوشی و خوش اختلاطی را شعار ساخته بود و در شعر صاحب قدرت است و طرز ایهام را منظور می دارد از اوست۔

چشم بهی از روغن بادام نباشد | سودائی شفتالوے آن سیب ذقن را
ز من حقیقت احوال ماهر دیان پرس | که عمر طے شده در شهر ما چو سال مرا
زاهد چو سبحه یافت ز مے گشت بے نصیب | یک جا نداد چرخ بکین آب و دانه را
تا بود کشتی می بر لب جوئی ما را | غم نداریم اگر آب برد دنیا را (۵۷ ا)
نیست در سر فکر رزقی صاحب شمشیر را | باشد از ناخن کلید رزق در کف شیر را
اگر شعر خالی ز لطف و اداست | مبر نام آن را که بیت الخلاست
مانند نگینے که دعا ئیست برو نقش | در خانهٔ ما نیست بجز نام خدا هیچ
ناله ام چون دید در طفلی پدر | گفت این با با فغانی می شود

ی رسد مرغ نامہ بر امروز — باز چشم پریدنی دارد
ان از خاکساری کرد جا در دیدۂ مردم — قبول این معنی نازک مرا از سر بسر روشن شد
ز خونخواری آن چشم نفرت ندارد — کہ مخمور بے بادہ راحت ندارد
ز چشم تو حرفے کہ گویند مردم — حدیث ضعیفی است صحت ندارد
بہیچ گہ آمدہ نپرسید است احوال دلم — می کنم زین شہر ناپرسان سفر بے اختیار
ای سرو قدان ما ز ادب ہیچ نگفتیم — خود راست بگوئید شما را چہ کند کس
چو آن کسے کہ ز آئینہ خانۂ گذرد — ز سادگی گذرم ہر بتے بخانۂ خویش
خواہم رفت از کویت غلام حلقہ در گوشم — چرا می بندی از زنجیر این تہمت بپائے من
ن بت کہ ز خود برد مرا آمدن او — بے ساختہ گویم (۵۷ ب) بخدا بلکہ تو باشی
روے نیکوی ترا می خواہم — این بود معنی نیکو خواہی
مکن اندیشہ ز بیداد کہ در محشر ہم — از کسے شکوہ تیغت نبود سر زدنی

۱۱۱ - محمد پناہ قابل در علم و فضیلت استاد، و چمن درویشی و کمال فقر، سرو آزاد ، از شاگردان میرزا بیدل است در عہد سلطنت میرزا احمد وفات یافت او راست۔

دیوانہ ام سراسر آشفتہ ام سراپا — چون زلف یار دارم یک سر ہزار سودا
بقتلم اند کے ظالم تامل میتوان کردن — من از خود رفتہ ام باید کشیدن انتظار من
کے بکویش از کفم جام شراب افتادہ است — بر در ساقی نگہ کن آفتاب افتادہ است
بادہ خوردن بے گزک چندان ندارد لذتے — میکشی با غیر می، قابل کباب افتادہ است
بجز رخ تو ندیدیم چشم تا واشد — اگر بغیر تو چیزی بود ما چہ می دیدیم
دوئی را رنگ وحدت مید ہد یکتائیم قابل — دو مصرعہ گر بدیوانم نشیند فرد بر خیزد
بر جبین گلگونہ و در پا حنایش دیدنی است — سیر بالا باغ و پائیش باغ اینجا کردنی است

۱۱۲ مشتاق رائے قدرت (۵۸ - الف) از خوش فکران است او راست۔

نشد در زندگانی از تو رفع خار خار من — چہ حاصل بعد مرگم گر بگل گیری مزار من

حرف الکاف

۱۱۳- عصمت اللّٰہ کامل از تلامذۂ[1] میرزا بیدل است، ابتداء بملازمت نواب عبداللّٰہ خان و حسین علی خان سادات بارہ، و آخر برفاقت نعمت اللّٰہ خان می گذرانید، از وست

منصب حیرت آرزوی من است | شوق آئینہ داری دارم

۱۱۴- سعد اللّٰہ گلشن گویند درویشے صاحب کمال بود، از سلسلۂ نقشبندیہ قدس اللّٰہ اسرارہم و در شعر نسبت شاگردی بمیرزا بیدل می رساند مرید شاہ گل است، و بموسیقی بسیار مائل، بلکہ درین علم تصانیف دارد، منقول است کہ گاہ گاہ خرق عادت ہم از وی بظہور می پیوست، در اواسط عہد فردوس آرام گاہ رحیل دار بقا گشتہ از وراست۔

سخت جانان نیستند از چارہ سازان کامیاب | مومیائی نفع کے بخشد شکست سنگ را

بدرش رفتہ سجدہا کردم | منت پاے ماست بر سر ما

دردمندی (۸۵ ب) بخشک مغزان نیست | پاے چوبین ندید آبلہ را

سر تربین صندل درد سر شمع است و بس | چارۂ بیماری روشندلان دم دن است

فرض شد تعلیم اہل درد بر روشندلان | شمع استاد است تا پروانہ رقصی می کند

من و ابرو کمان شوخی کہ عالم گشتہ نخچیرش | چو میل سرمہ جا در چشم دلہا می کند تیرش

۱۱۵ میرزا مہدی کوکب مردے صاحب کمال از ملازمان نادرشاہ بودہ از وراست

ز سوز عشق تسکین دل بیتاب خود کردم | ز آتش چارۂ بیتابی سیماب خود کردم

شدم در پردۂ ہر ذرّہ پنہان عمرہا کوکب | کہ تاسیر فروغ مہر عالم تاب خود کردم

۱۱۶ میرزا گرامی ولد میرزا عبدالغنی بیگ قبول است، در شعر داد تلاش معنی یابی میدہد، گویند خوشامد را پیشۂ خود ساختہ بود، چنان کہ غرور امر یہ را جز روشن رائے دیوان

---

[1] در بین السطور: شاگرداں ۱۲

نواب قمرالدین خان کہ وے خود را از موحدان می شمرد قرار میداو اورا ست۔

خون عشاق بران گردن سیمین باشد — چون بیاضی کہ درو معنی رنگین باشد
گوش بر حرف کسے (۱) نیست ترا — سبزۂ خط چہ بگوشش تو دمید
نگسند این جسم زار از ناتوانی — چو تار سحہ در افواہ ما را
صیدے چو من بچنگ تو ظالم نمی فتد — غربال اگر چو دام کنی بازخانہ را
خواجہ بے فرزند گر باشد غلامش وارث است — ہرچہ دارد حق تعالیٰ از برائے بندہ است
گشت تسخیر من فلک از آہ — نالہ ام قلعۂ ستارہ گرفت
کسے کہ جوش خط یار دید گریان است — چو مور پیش بر آید دلیل باران است
کشد چون غیر را در بزم خواہد نقد جان از من — گرفتن نذر در نخچیر گہ رسم شہان باشد
دلم را داد از قیدش رہائی دلبر دیگر — اسیران را گرامی شاہ نوآزادمی سازد
بیجا نمکین نیست مسی برلب لعلت — ہر چیز کہ در کان نمک رفت نمک شد
معلم تا الف را بر زبان آورد دانستم — کہ سرمشقم بود درعاشقیہا قد رعنایش
ہر کہ ہم چون قہوہ باشد سرد و خشک — نخل عمرش را نوان کردن زبین
بحشر رو نما چشم سپیدم در رہش باشد — رعیت بہر سامل نذر آرد کوزہ شیری

نقل۔ روزے باچندے از مقلدان بخانۂ شیخ محمد علی حزین رفت۔ ایشان از صحبت وگفتگوی ایشان بغایت بیدماغ گشتہ آہستہ بیکے از مجلسیان آن قوم گفتند کہ (۱) داہ کہ (۹ ھیہ) در ہندی آید شاید ہمین است۔

حرف اللام

۱۱۷۔ لطف علی خان از امرا ے ایران و عم خانوالہ مرحوم است۔ سپہ سالاری بنادر عمان و فارس و عرم وغیرہم باو تعلق داشت۔ اورا ست۔

لہ اصل: آمد — ٹہ اصل: ڈاکہ

خانهٔ جانم زغم کردی خراب　　خوب کردی خانه ات آباد باد

مخفی نماند که ذکر این اسم که شعر بلند و دلچسپ ندارد بسبب عدم بهم رسیدن نام دیگر درین حرف نموده شد۔

حرف المیم

۱۱۸ - مهر علی خان مظهر از امرای شاه سلطان حسین صفوی بوده، او راست.

ای بخوبی شده ابروی تو طاق　　زلف تو عمر دراز عشاق

گفتنی نیست بوصل تو قسم　　آنچه دور از تو بمن کرد فراق

بسرعت می رود قاصد نمیدانم چه بنویسم　　حدیث آرزومندی بصد دفتر نمی گنجد

۱۱۹ - میرزا مجید شوستری گویند بسیار ظریف و هزال و بشاش بوده و با امرای حسن [illegible] داشت، و از ایشان بهره منفعت می ربود آخر عمر بهند نیز رسیده پیش نواب ابو المنصور خان می مانده، گاه گاهی شعر مربوط (۶۰ - الف) می گفت او راست۔

روید بجای سبزه زخاک من آفتاب　　از بسکه تخم مهر در آب و گل من است

خموشی لازم افتاده ست جویای معانی را　　که از بهر گهر غواص را باید دهان بستن

چه غم ار گردش گردون نکند یاری ما　　می کند گردش چشم تو نگهداری ما

۱۲۰ - عبد الرزاق متین اصلش عرب و مولدش اصفهان است صحبت اکثری از شعرای آنجا دریافته، ابتدای جلوس فردوس آرامگاه وارد شاه جهان آباد گردیده، غلغله شاعری انداخت، میانش و میر محمد افضل ثابت مشاجرات واقع شده، مدتی قلیل درد [illegible] مانده بسمت اوده رفت و ملازمت نواب سعادت خان اختیار کرد، بعد نواب مسطور نواب ابو المنصور خان خبرگیری وی می کرد، از تصوف بهره داشت و صحبت اهل آن را مانا [illegible] بود، [illegible] خلق و بشاشت وجه و طلاقت لسان عدیم البدل، او راست۔

[illegible] که بهنگام گفتگو　　حرف مسلسلش شده زنجیر پا مرا

[illegible] شب برق بسنا بانده، بحر می آید　　خسی باقی است پنداری ز خار آشیان من

صورتِ دردم ز احوالم چه می‌پرسی مپرس — در شبیهم خامهٔ نقاش شیون می کشد
از بهشت و حور و کوثر دوست تر دارم متین — گوشهٔ امن و شرابِ ناب و روی ساده را
چو دریائے که از موج نسیمی مضطرب گردد — کشیدم از جگر آہے و برہم خورد احوالم

پوشیده مباد که خان والہ مرحوم و خانِ آرزو مغفور و بمتابعتِ این ہر دو رائے صاحب خداوند در تذکرہ ہائے خود این اسم را عبدالرضا نوشته اند حالانکه عبدالرضا مسموع نشده چون احقر نامش از زبانِ شخصی عبدالرزاق شنیده بود ثبت نمود۔ واللّٰہ اعلم[1]

۱۲۱۔ میر سید علی مشتاق از ساداتِ اصفهان جوان خوشگو و صاحب طبع است از وست۔

بگوش پنبه نهادم بدیده میل کشیدم — بایں وسیله ترا دیدم از تو بار شنیدم
رو نیافتم از دل بسراغ حرم دوست — غافل که ازین خانه بآن خانه دری هست
برنگ نخلِ وادی میوه ام رزقِ زمین باشد — نیم بے حاصل اما طالع بیحاصلی دارم

۱۲۲۔ ولی محمد خان مسعود در ۱۱۸۱ھ (۱۷۶۷ الف) ایران است پدرش در زمانِ شاه سلطان حسین دیوانِ اعلیٰ بود وے در عهدِ شاه طهماسپ ثانی میرزائی گری کرمان و لعبه از ان حکومت لار داشت چون در آنجا ظلم و تعدی بر رعایا از حد بیش راند مردم شب را کشتندش۔ گویند خوش نویسِ خطِ شکسته و جامعِ اکثر کمالات بود۔ او راست:

بود پیچیده طوماری زبانِ شکوه آلودم — تو هم کشا سرا و را که من دانسته نکشودم
چون آهِ ضعیفی که نیاید بلب از دل — فریاد که خود را نرسانیدیم بجائے

۱۲۳۔ محمد نظام معجز از افاغنه نواحِ کابل است در خدمتِ عبداللطیف خان پٹھان دیوان آنجا می ماند بشاهجهان آباد هم رسیده در سنه یک هزار و یک صد و شصت و دو (۱۱۶۲ھ) وفات یافت او راست۔

در گریه ناله ها که بکوی تو می کنم — خس میر بادِ نخیم کہ در آب می برد

---

[1] متین کا صحیح نام عبدالرضا ہی ہے جیسا کہ معلوم ہے۔ (مرتب)

دل ہمیشہ بکوی تو می طپد در خون — چہ می شود کہ بپرسی چہ مدعا دارد
دلبران کم سخنی کم نگہی — ہر چہ وا اید برائے دل ماست

۱۲۴- آقا محمد کاشی معاف۔ از اصفہان است بہ پیشۂ شعر بافی اشتغال داشت (۱۰۰ ب)

گیرم کسے بسازد با بے وفائی تو — آخر فدات گردم کو آشنائی تو

رباعی

قانع بہ طمع بر درِ ہر دون نرود — یک گام زحدِّ خویش بیرون نرود
چون مردمِ چشم در نظرہاست عزیز — از خانہ خود کسے کہ بیرون نرود

۱۲۵- میمنت خان میمنت از کشمیر است، در سرکارِ نواب قمر الدین خان وزیر، بداروغگی عمارت مامور بود او راست:

بادہ بلعل ترا ہیچ گونہ نسبت نیست — کہ لعل تو نمکین و شراب بے نمک است

۱۲۶- آقا عبد المولیٰ اصفہانی است، بعلو طبع و وسعت مشرب وحسن خُلق و کمالِ زہد و پرہیزگاری مشہورِ زمان بل یگانۂ جہان بود، و اوائل با شعراے آنجا ہم طرح، و در غایتِ اعزاز و احترام بسر می برد، بعد از واقعۂ افغان بر آن مملکت، ترکِ مجالست کردہ انزوا گزیدہ و مشغولِ عبادات گردید او راست۔

چنین کہ تکیہ بدستارِ یار نازد گل — دگر کجا سرو برگ بہار دارد گل
بہ نیم جلوہ کہ در گلستان کردی (۱۰۱) — ہنوز در تہِ دل خار خار دارد گل
بغیر ازینکہ گریبان زرشک پارہ کند — بہ گلشنے کہ تو باشی چہ کار دارد گل
شکایت از ستمِ یار طورِ مولیٰ (۱۲۱) نیست — بہ بلبل آنچہ کند اختیار دارد گل
سرہا در آب و آتشم از اشک و آہِ خویش — درماندہ ام چو شمع بروزِ سیاہِ خویش
غم افسردگی ز آسودگانِ خاک برداری — اگر یکدم نقاب از روی آتشناک برداری
عجزِ من و غرورِ تو شد آشنا بہم — رسم نویست الفتِ شاہ و گدا بہم
پا در حریمِ محفلِ دلہا شمردہ نہ — آئینہ باش تا نزنی شیشہ ہا بہم
دلہاے داغ دیدہ ببزمِ تو چون سپند — از جا جہند و گرم نمایند جا بہم

۱۲۷۔ میرزا ہاشم محزون نواسہ میرزا طاہر وحید است، در سنہ یک ہزار و یک صد و پنجاہ و چہار (۱۱۵۴ھ) ہمراہ محمد صالح بیگ ایلچی نادرشاہ لعلاقہ وقائع نگاری در شاہجہان آباد آمدہ بود۔ او راست:

گشتم چندے چو عندلیبان بہ چمن بے عشق نیافتم گلے در گلشن
از لالہ ز داغ دل او پرسیدم گفت از دل خود بپرس حالِ دل من

۱۲۸۔ میرزا محترم خلف مرزا عبدالغنی بیگ قبول مذکور است۔ از وست:

شب پتان زادۂ بیگ ہوئے دل ز من بُرد این چہ افغان است
چشم فتّانت اگر بیمار باشد (۷۲ ب) عیب نیست محترم بادام را دیدیم آنہم خستہ است

۱۲۹۔ میرزا محمد منشی اصلش از تبریز است و در اصفہان تولّد یافتہ، خانوالہ مرحوم نوشتہ کہ مستجمع کمالاتِ صوری و معنوی و در فقہ وحدیث و حکمت و تصوّف و جفر و رمل و حساب و سیاق و موسیقی عالم و ماہر بودہ، سیزدہ قسم خطی نوشت و بہ چہار پنج زبان تکلّم می نمودہ۔ و من حقِ استادی داشت بعد خروج افاغنہ از اصفہان در خدمتِ نادرشاہ رسید و بخزانہ داری سرکارش مأمور گردید، رفتہ رفتہ در اندک فرصت مرجع جمیع امورِ مالیات گشت، بذلہ سنجی و لطیفہ گوئی و شوخی طبع و رنگینیِ صحبت و وسعتِ مشرب و طیبِ خلق باذاتش توأم بود، در شاہجہان آباد بوقوعِ اندک تقصیرے کہ فی الحقیقت از جانبش نبود نادرشاہ ہلاکش کرد، چوں در فنِ انشاء عدیم البدل بود منشی تخلص می نمود۔ او راست۔

در جیبِ غنچہ تو شد و در برگِ لالہ داغ عشقت برنگی از دلِ ہر کس ظہور کرد

نقل۔ بمقتضائے شوخیِ طبع (۷۳۔ الف) باوجود آنکہ بیش[1] نادرشاہ ہیچ کس را یارائے سخن نبود روزے گستاخانہ عرض نمود کہ بندہ را در خدائی و پیغمبری و بادشاہی ولی نعمت شبہ است امید کہ رفع فرمایند زیرا کہ اگر خدا باشد خدا را خلق ضرور است تا پرستش نمایند و پیغمبر را امّت تا تبعیتِ سنّتِ او بجا آرند، و بادشاہ را رعیّت کہ موجب نظام سلطنت اند،

---

[1] اصل: بیشتر

خداوند نعمت که رسمِ عالم کشی نبا نهاده هر روز خرمنِ زندگانی جمعی را ببرقِ شمشیر می سوزند لیقین است که باندک زمان نشانِ آدمی برروی زمین نخواهد ماند پس ازین هرسه کدام کس خواهند بود[1]، نادرشاه جواب داده بود که ما ازین هرسه هیچ یکی نیستیم بلکه قهرِ خدائیم که بشامتِ اعمالِ سیه مردم برائے عقوبتِ ایشان نازل شده ایم۔

۱۳۱۰- رائے آنند رام مخلص کهتری از اربابِ جاه و دولت واصحابِ مکنت و ثروت وہم زیب افزاے مسندِ بارگاہ سخنوری و زینت فزاے چار بالشِ صدر شہر پروری بوده، که فصاحتِ سخن و خوبیِ تلاش و رنگینیِ معانی (۲۶۳ ب) از اشعارش مانندِ بو از گل در جوش است، و لطافتِ کلام و سلاستِ الفاظ و نوی طرز از ابیاتش بسانِ آب در گهر ہم آغوش۔ خسر رائے صاحب خداوند و شاگردِ میرزا بیدل است، در انشا پردازی نیز دادِ رنگینی و متانت می داد و لغایت پاکیزه و دل چسپ می نوشت، مدتے بوکالتِ عبد الصمد خان و ذکریا خان صوبه دارانِ لاهور و ملتان روزگار می گزراند، و لبعد معاودتِ نادرشاه از هندوستان خانه نشینی اختیار کرده آمد و رفت بکلّی ترک نموده بود آخر سنۂ چهارم مرزا احمد[2] در مرضِ[3] ذات الجنب درگذشت این چند شعر منتخب دیوانش بقلم می آیند۔

الهی آب و رنگِ شورِ بلبل ده بیانم را | بخونِ دل بیارا ہم چو برگِ گل زبانم را
مبادا خواب شیرینم بشور آید پس از مردن | برون آرید از پہلو دلِ در خون طپانم را
ز آهِ سردِ عاشق نیست پروائے سرِ مویش | که باشد از دو زلفِ خود گریبان سمور او را
دل ز آهِ درد دارد اعتبار | نیست لطفی ترکشِ بے تیر را
نیست در ابروے او بِنگی[4] که ہست | قبضه میناکار این شمشیر را (۲۶۴ ا)
هیچ آہم بے سرِ شک درد نیست | لازم افتاد است پیکان تیر را

---

[1] اصل: خواهد [2] یعنی سنه ۴ جلوس احمد شاه مطابق ۱۱۶۴ھ/ ۱۷۵۰-۱۷۵۱ء

[3] اصل: درد دارد۔ بعض تذکروں میں مرض وفات نفث الدم بتایا گیا ہے۔

[4] بنگی = ابرو پر سجاوٹ کے لیے وسمہ یا افشاں وغیرہ سے بنائے ہوئے نقش۔ یہ ہندی لفظ ہے۔

ریشِ زاہد را اگر یزد از اختلاطِ شانہ نیست　　　می کشد اکثر بچو بین تختہ با پشمینہ را
بلبلِ شوریدہ ام صیّاد ای من ہندہ ہیت　　　بعد مردنہا بچوبِ گُل بسوزانی مرا
میرس انچہ کشیدم ز دستِ شمشیرش　　　شُدم غریق در آبی کہ تا گلواست مرا
میتوان در برگہاے لالہ خاکِ ما گرفت　　　کشتۂ آن چو دو مالیدہ بر دو چشم ما (کذا)
قفلِ ابجد سان گرفت از شش جہت دل تنگی ام　　　کو سخن فہمی کہ تا سازد بحرفی وا مرا
نیست دریائی ز نظم امروزی کہ در طفلی بحلق　　　می چکاندی دایہ شیر از پنبۂ مینا مرا (کذا)
وفای مخلصِ دیوانہ را بہ بین ای طفل　　　چو لالہ ساختہ ہیکل نشانِ سنگ ترا
از بس گداختم بغمِ چشمِ مستِ یار　　　جسمے چو می بشیشہ بود در کفن مرا
ناخن تمام گشت معطّر چو برگِ گل　　　بند قبای کیست کہ بکشودہ ایم ما[1]
بآن دو زلف شنیدم کہ شب خطش می گفت　　　خدا دراز کند عمرِ دوستانِ ترا
نصیبے بودہ است از سر فرازیہا فروتن را　　　زمان گیرند بر سر جاے معجر گاہ دامن را
نصیبِ صاحب جوہر ہمین رنج است از دنیا　　　نباشد از طلا قسمت بغیر از کوفت آہن را
از خونِ خویش طرح حنا می کنیم ما　　　ہنگامۂ غریب بپا می کنیم ما (۴۶-ب)
در جہان شہرت بعشقِ خوش نگاہان کردہ ام　　　نیست بے وجہ نگینِ نام بادامی مرا
شاخِ نرگس ہم بجاے خط کفایت می کند　　　مطلب اے قاصد ز مشتاقانِ دیداریم ما
باگلِ رعنا غلط کردم چو ساقی لطف کرد　　　ارغوانی بادہ و پیمانۂ زرّین مرا
بسکہ امشب لختِ لختِ دل ز چشم ترمرا　　　برگِ گل بودہ است گویا فرشِ بر بستر مرا
غنچۂ پہلوی گل چوں سیر کردم در چمن　　　خُون بجوش آمد بہ یادِ شیشۂ و ساغر مرا

---

۱ اُردو میں انعام اللہ خاں یقینؔ نے کہا ہے:

کیا بدن ہوگا کہ جس کے کھولتے جامے کے بند　　　برگ گل کی طرح ہر ناخن معطّر ہو گیا

میرؔ کہتا ہے: "آن (مخلص) ہم در سلیقۂ سرقہ یکہ بودہ است خدا داند کہ این معنی در اصل از کیست۔"

(نکات الشعراء طبع اوّل / ۱۰۸)

هم چو نرگس در جوانی قد دوتا باشد مرا | عینکی بر دیده و در کف عصا باشد مرا
خانه ام را خالی از مهمان کسی کم دیده است | در بروی خلق چون آئینه وا باشد مرا
کار با جنگ است چشم یار را | غصه باشد بیش تر بیمار را
شد ز نور حسن او بند نقاب | روکش خط شعاع آفتاب
داغ عشق اوست پنهان در دلم | هم چو آن عینک که ماند در کتاب
قابل سیر است گلگون حنائی بند اش | از دو جانب می رود گویا گلستان در رکاب
بود چین لازم ابروی خوبان | بمسجد فرش غیر از بوریا نیست
غم خوش چشم طفلان کرد پیرم | عبث از چوب با واهم عصا نیست
کند معلوم تا دل داغ واغنت | حروف بی نقط در خط ما نیست (۶۵ا)
قیاس از شیشهٔ ساعت توان کرد | که با خودها دو دل را هم صفا نیست
دل عبث منت کش دانشوری است | رو شناس آئینه از بی جوهری است
نامدار از نسبت چشم تو شد | ورنه نرگس بی نگین انگشتری است
کار نرگس نیست جا دادن ترا چون گل بفرق | بعد ازین ای تیشه سر بر سنگ زن فرهاد رفت
ما ندیدیم بچشم خود آه | گریه گویند اثر داشته است
می زند یکه بقلب دلها | چه قدر داغ جگر داشته است
شد فزون پیرانه سر ذوق تماشایت ز بس | چون نی نرگس مرا چشم از عصا گل کرده
کار دارد چشم او با سرمهٔ دنباله دار | یعنی این بیمار محتاج عصا گردیده است
دستهٔ دندان ماهی را بود ترصیع عیب | کم بدنیا التفات اهل جوهر بوده است
عکس ابروی او در آئینه نیست | مسجدی در حلب بنا شده است
چشم آن نوخط جوان مخموری گردیده است | یا غزالی در میان سبزهٔ خوابیده است
در گل آچین توان سر تا سر خاکم گرفت | قاتل رعنا جوان از گچه مالیده است
بوسهٔ هنگام خواب او مرا تعلیم کرد | آنکه پنهان از چمن پیرا گلی دزدیده است
دود شد از آتش رخ تا بالش باند | سوی تحقیر آن گل بسر پیچیده است (۶۵ ب)

دختر رز جلوه پیرا در حریر شیشه نیست
فرگلی سبزی فرنگی زادهٔ پوشیده است

از رخش مخلص گرفتی بوسه رنگ او شکست
کس باین اسلوب ظالم از چمن گل چیده است

جلوهٔ کردی زلف دادم دل صد لخت را
دستهٔ گل نذر کردن از چمن پیرا خوش است

اشک خونین زلس بمژگانست
چشم من کشتی چراغان است

هرکه دید آن رخ مخطط گفت
چه قدر خوش خط این گلستان است

پلستان پری رخان هندی
بهتر ز ولایتی انار است

چون نباشد بوی زلف آشفته طرف گردلش
بر بیاض اکثر کتابت میکنند اشعار کج

از نگاهی سازلیش تا سر بلند
پیش چشمش کرده نرگس کاسه بند

هرکس دلم بسبزهٔ خط تو دید گفت:
یارب به نذر خضر که روشن چراغ کرد

دهم جان یاد ابروش بدل هرگاه جا گیرد
بقیمت آشنا شمشیر را از آشنا گیرد

خلق را باشد طمع مانع ز استمتاع عیش
مے فروشاں بادهٔ خوش کیف خود کمتر زنند

جنگ جو چشم ترا مژگان کج بے وجه نیست
مردم کامل محرف در کمر خنجر زنند

از ادب اظهار داغ عشق دل پیشت نکرد
در حضور بادشاهان گل بسر کمتر زنند

ابرویش را نیتی از نبکی ای مشاطه ده
بیت دلچسپ است باید بر سر این صاد کرد (۱۶۶)

گر عزیز است ابر وائے ابر
طرف چشم ما نباید شد

هیچ غم چون غم جدائی نیست
با کسے آشنا نباید شد

طرف عارضش کنارے نیست
مصحفی جدول طلا دارد

من شهید کسے که زیب گلو
سبحه از خاک کربلا دارد

چو استادو ز چکیدن اشک طرح ناله افکندم
که غوغاے فتد هرگاه راه کاروان گم شد

دلم را کرد چشم نیم مست او دو نیم امشب
چو نارنجی که مخموری از و پیمانه می سازد

بند و بست مهر در کنعان ز لیخا لازم است
کاروان بوی مصر آنجا به یغما می رود

برآمد آه با لخت جگر از سینهٔ تنگم
چو آن پیری که با مکتوب از سوی حصا آید

رنگ او ز خال مستغنی است
نبود رسم نقطه در تعویذ

گره زلف او پر از مشک است ——— عطر باشد چنان که در تعویذ

مخلص از بهر آن رمیده غزال ——— می نویسم بمشک تر تعویذ

شیخ را همیان زر ز انگونه زیبد بر میان ——— کز پئے امساک کس تعویذ بندد در کمر

شهید زهر چشم کافرش را ——— بود چون غنچهٔ نرگس کفن سبز

سر خود را زند گو پسته بر سنگ ——— نخواهد شد به پیش آن دهن سبز (۶۶ ب)

میرزا یُهاش را نازم که ریخت ——— خار در پیراهن او عطر خس

ترک موزون قدے کہ من دارم ——— مصرعهٔ مغربی است شمشیرش

داغ دو پیچ رنگ ——— دل بود تکمهٔ گریبانش

بر قطرهٔ شبنم که بود بر ورق گل ——— قربان سر کیفیت دُر بلاقش

هزاران موج کز دریا شب مهتاب برخیزد ——— بقربان سر کیفیت رو پاک زنارش

می رفت جنس بوسه بدزدی ازین جهت ——— افگنده دور لعل تو طرح حصار خط

از پئے نذر شهیدان چمن ——— از طلا نرگس بکف دارد چراغ

چون غلامے کو طرف با صاحب خود می شود ——— در کمال شوخی آمد شب بروے یار زلف

عبث زحمت مکش اے ابر در ویرانی صحرا ——— که این خدمت بود بر عهدهٔ چشم تر عاشق

دعوی هم سری قد تو دارد غلط است ——— مصرع شمع کز اشک است بر و نقطهٔ شک

طرح کرد از سایهٔ مژگان خویش ——— در جواب سوزنی گویا غزل

قدر اشک آلود مژگانم باآن ——— می شود منقوط کم پیدا غزل

کند معلوم تا گم کرده ام دل ——— بجانان بے نقط خط می نگارم

میدهد از بسکه یاد از رنگ آن پان و مسی ——— غنچه هائے لاله را بسیار می خواهد دلم (۶۷ ا)

دل پر است از شکوهٔ خال و خطش ——— زین تمامی دود مان رنجیده ام

با شیخ شهر دختر رز را بکنج باغ ——— امشب بطرفه حال تباهی گرفته ایم

زلف تو خط صنمی آفت جان من شد ——— مار در سبزه نهان بود نمی دانستم

شد گمانم که دلے یار بدست آورده است ——— لیکن آن بیڑهٔ پان بود نمی دانستم

دور از آن ماه چه سازم چه کنم | ای فلک آه چه سازم چه کنم
دل و دین برد فرنگی پسرے | ہائے اللہ چه سازم چه کنم
عشق مُردم گداختم بس کن | به عبث با تو باختم بس کن
مده از وعدہائے وصل فریب | بفراق تو ساختم بس کن
مخلص استاده بر سر کویش | شب تو بودی شناختم بس کن
بصد رنگ برداشت از کف دلم | مصور بنی چهرهٔ پیرهن
ز مخلص کند از چه رو نرگسی | اگر نیست چشم تو صاحب سخن (کذا)
چو ریگی که در شیشهٔ ساعت است | شب و روز دارم سفر در وطن
شب به بزمش رفتم و تغییر شد رنگ رقیب | می شود گلچین خجل پیدا چو گردد باغبان
شکوه ام باشد بصد رنگ از نقاب تار لیک | ہیچ نتوان گفت مخلص ہست رویش درمیان (۷۰ ب)
دل شکستم زمانه مصروف است | توبهٔ موسم بهارم بین
چشم شوخ تو میان مژه است | ہست در سبزه نهسان یا آہو
اندکی چشم نمائیست ضرور | نی کشد گردن دعوے آہو
پیش لعل لبی که دارد او | از ادب غنچه ته کند زانو
بے تو چشمم ز گریه گشت سپید | بشگفد فصل برشگال کدو
از ادب سرو می کند تحریر | قبلهٔ راستان بقامت او
الفتی نیست ناتوانان را | نزند قط کسے بجامهٔ مو
ہم چو آئینه بهر او مخلص | با دو عالم نموده ام یکرد
گشت از عکس خط سبز کسی | صفحهٔ آئینه طوطی نامه
چاک زد جیب گل ہار سنگار | سرخ پوشید چو او پاجامه
بے تماشا نیست مخلص بر مژه دجله دلم | ہم چو آن سیبی که در قصد بر سر فوارهٔ
پرده برگیر از رخ ای شمع شبستان کسے | ماه تابان کسے خورشید رخشان کسے
جدول شنجرف از بهر بیاض گردن است | من بقربان سر تسبیح مرجان کسے

بے غرائب ہیچ عضوی نیست از اعضاے او | چاه سیماب از عرق باشد زنخدان کسے
چاک جیبم نیز مروارید روز است از سرشک | تکمۂ الماس دارد گر گریبان کسے
باعث آرایش حسن است در سر رنگ عشق | خونِ من سنجاف باشد سرخ دامان کسے
تیره کوکب تر زمن در جرگۂ عشاق نیست | کرد روزم شب مسی مالیده دندان کسے
یار پرسید از تجاہل کیست مخلص گفتمش | بندۂ لطف کسے ممنونِ احسان کسے

۱۳۱ - محمد لطف اللہ مفتون صدفِ علم را درکنون ہٰذا اللہ مضجعہٗ ہنگام تحریر احوا
آن شناور بحر لایزال' بمشاہدۂ حالت پرملالِ این شکستہ بال' از چشم دوات عوضِ مداد قطرا
خون چکیده' و قلم برنگِ سینہ چاکانِ غم ناک بجاے صریرآہ دردآلود از جگر کشیده' شخصی با
کہ قابلیت بہ شرفِ نسبتِ ذاتِ جامعِ کمالاتش کلاه مفاخرت بر تارک کج می نہاد' و معنی
یابی و نازک بندی در پیشِ فکر رسایش بلسانِ چاکران دست بستہ می ایستاد' سخندانی خلعۂ
بر قامتِ طبع موزونش خوشنما بود' و ہنرمندی حلیۂ کہ بر اندام خاطرِ والایش زیبا می نمود' در اقسا
شعر از غزل و مثنوی و انشا طاق' و در حسن خلق و خوش صحبتی و شگفتگی طبع یگانۂ آفاق بود' برادر
خوردِ محمد نعیم نیاز (۸۰ ب) غفر اللہ لہ' کہ عنقریب در حرفِ نون ذکرش می آید' بود. بعمر بیست دوم[24]
سالگی این جہانِ گذران را پدرود کرده داغ حسرت و اندوه بر دلِ اقرباء و احبّا گذاشت. جامع
اوراق چندی اصلاحِ شعر از ان مرحوم مغفور گرفتہ' در ترتیبِ شیوۂ تلطّف و تعقّد را مرعی داشتہ
و من غافل ازین کہ ناگاه مفارقتِ ابدی روی خواہد نمود' غیر از یک غزل کہ درین صفحہ رقم پذیرگشت
دیگر اشعار ایشان بدست نیاوردم اَسْکَنَہُ اللہُ فِی الْجَنَّۃِ وَحَشَرَہٗ مَعَ الصَّالِحِیْنَ. غزل:

بسکہ با آتش رخسار تو خوگر کردند | جوہر آئینۂ مژگان سمندر کردند
عشق را مایۂ او' بار شود زینت حسن | بخت برگشتۂ ما چون مژه ات تر کردند
طرفہ از کثرت جوہر ہمہ افگنده بدوشش | مگر از عشق تو آئینہ قلندر کردند
از دلم یاد سر زلف سیاه کہ گذشت | سینہ چون طبلۂ عطار معطر کردند

من ہماندم کہ شدم مست محبت مفتون
گردش چشم کسے دیدم و ساغر کردند

۱۳۲- سپهرِ سخنوری را مهرِ انور، میرزا جان جانان مظهر، آن کس که امروز در قلمروِ سخندانی کوسِ خلاقیش بلند آوازگی دارد و دست (۶۹- الف) و آنکه درین ایام در خطهٔ شاعری بر نقدِ سخن سکّهٔ موزونی نامش لوی و تازگی دارد، او - بنیادِ نزاکتِ معانی و ادا بندی در شهرِ سخن سنجی ریختهٔ معمارِ فکرتش، و نهالِ رنگینیِ الفاظ و حسنِ بیان در گلزمینِ چمنِ شعر پروردهٔ باغبانِ طبعِ صاحب قدرتش، مذاقِ لذّت پرستانِ خوانِ سخن درمی یابد که در اطعمهٔ اشعار ملاحت و نثارش چه قدر نمک در دریخته است - و زبانِ مزه شناسانِ مائدهٔ کلام می داند که در نعماتِ ابیاتِ حلاوت آیاتش چه قسم چاشنیِ سوز آمیخته، گوهرِ کانِ نجابت است و لعلِ بدخشانِ فصاحت و بلاغت - تا این وقت در شاهجهان آباد تمکن فرمای منصهٔ خلوت و عزلت و زیب افزاے وسادهٔ افادت و افاضت است - این چند شعرِ دیوانش لقیدِ تحریر در می آیند:

آبلے نزد برقے گران خواب بخت ما
با آنکه گریه داد به سیلاب رخت ما

مانا ز پرورتب و تابیم می خورد
چون نخل شعله آب ز آتش درخت ما

یک سره طره بدست من و یک در کف او
شانه هم زلف شود سینهٔ صد چاک مرا (۶۹- ب)

غنچه سان مظهر ز خون دل جگر پر می شود
یاد می آید چو آن لبهاے عنابی مرا

نشستم عاقبت چون آفتاب از نظر گردیها
سیه کردم باندک چشم پوشی روے دنیا را

ز بس با داغهاے دل آید بر زبان ما
شود محسوس هم چون شاخ نافرمان فغان ما

بوصف سرمهٔ دنباله دارش چون بحرف آید
چو سوسن در دهن هرگز نمی گنجد زبان ما

مظهر بجرم نیم نگاهی که می کشد
یک بار خود کنند هاد روبرو مرا

اگر این بار در سیر چمن با من دلش واشد
بگل خواهم گرفت اے بلبلان هر آشیانے را

شدی تنها به باغ از واشد گلها دلش خون شد
چرا با خود نبردی هم چو مظهر بدگمانی را

چو بو با هر گل این باغ پیوندست جانم را
ز شاخ ای باغبان آهسته بردار آشیانم را

مبادا بلبلے دیگر پس از من آشیان بندد
توان آویخت بر شاخ بلندے استخوانم را

بیکسی مشهور کرد آخر بیکتائی مرا
داد تشریف خدائی فیض تنهائی مرا

صرف عشق خوش قدان گردید نقد اشک من
کرد مفلس عاقبت این خرج بالائی مرا

یارب بیار ضعف رسید است سر مرا — اکنون بسان حلقه مکن در بدر مرا

یارب چو آن صبا که بتازد بغنچه زار — روزی بکن بلشکر دلها ظفر مرا

آن بلبلم که چون بچمن فصل گل رسید — ریزد چو برگهای خزان بال و پر مرا (د، ا)

بلبلی می گفت باصیاد کز بهر خدا — جز بدست طفل گل رخسار نفروشی مرا

خشکی سینه او سرفه رسانید بهم — زاهد آخر بچه تقریب شرابی شده است

زعمرها دل ما را شکست خوردن است — چو غنچه شیشهٔ ما را هزار پیوند است

تنبیه است نمک پاش سینهٔ ریشم — که نام آن بزبان تبان شکر خند است

برنگ دود که از شمع کشته برخیزد — بلب زجور توام آه ناتوانی هست

رسید جان بلب امانی توانم مرد — گره بکار من از لکنت زبانی هست

امشب این ماه وکتان سخن بهم ساخته اند — پیرهن در بدنت هم چو شکر در شیر است

مگوئید آه پیش من مگوئید — که معشوق کسی عاشق نواز ست

زد حنا را پشت پا و سرمه را بر خاک ریخت — از پی آزار ما ناحق در آزار بوده است (کذا)

مرد مجنون مگر ای بید که ماتم کردی — آه این موی پریشان تو بی چیزی نیست

امتحان صبر عاشق این قدر ها خوب نیست — ای بقربانت روم آخر دل است ایوب نیست

اگر ز بندگی چون منی ترا عار است — تو زنده باش خریدار بنده بسیار است

بجنگ آن دل چون سنگ می رود دل من — چه شیشه ایست باین نازکی جگردار است

آنقدر در چشم مظهر نیست شان روز حشر — آن شب هجران و آن هنگامه ها را دیده است (د، ب)

این است وفا که بعد قتلم — در کوی تو خون من روان نیست

هزار عمر فدای دمی که من از شوق — بخاک و خون طپم و گوید این برای من است

جزای آنکه بهم چون توئی وفا کردم — بهر جفا که دلت خوش شود سزای من است

کسی چو بنده ادا کرده است حق جنون — ترا بچاک گریبانم ای رفو قسم است

کجا صف های مژگان را درون دیده جا باشد — تهی از بوریا هم خانهٔ اهل صفا باشد

باین تقریب بسیم آن کف پای نگارین را — مرا ای کاش در جای زبان برگ حنا باشد

نه چون دوست بامن چون بخشم پائی نگذاری — سرت گردم همان بهتر که دشمن زیر پا باشد
زرو پاک معیشی این قدر گردیده معلومم — که شبنم را ز روے برگ گل خورشید بر دارد
یار مجروح مرا دیده دوان می آید — هم چو آن طفل که تیرش به نشان می آید
من بگرد قد او گردم و آن شوخ بمن — می شود تند که تیغش بفسان می آید
عشق بازان مرید اطفال اند — پیر این قوم نوجوان باشد
به بخت تیره ز لعلت چه فیض بردارم — که هند مسکن و تنخواه برهمن باشد
اگرچه طاقت یک گردش نگاهم نیست — خدا کند همه نازش بجان من باشد
شنیده ام بتو می گفت دوش بد خواہے — که خوب نیست که مظهر در انجمن باشد (۱۰ ل)
دل صد پاره بود باعث خون گرمی اشک — تب کند طفل چو بر گنج شهیدان گذرد
می کشد تنگ به بر آن قد نوخاسته را — لذت عالم آغوشش قبا می داند
کجا اصلاح خون عاشق از فصاد می آید — علاج سرگرانیهاش از جلاد می آید
دماغش نشگفد تا خون عاشق را نمی ریزد — انار خندهٔ او از جلال آباد می آید
کسے از تیشه مظهر چیغه بر سر کے تو اند زد — قیامت میسر زائیهاست کز فرهاد می آید
مرا کشته است و باز این مرگ با من سرگران دارد — ترا بالعش من چون دید گفت این مرده جان دارد
سوز دل از بن مویم نمایان کرده اند — این جفا جویان مرا مشب چراغان کرده اند
شب اندازم که بفرقم سر پاے که زد است — کز گل زخم سرم بوی حنا می آید
دماغ عشق نازک تر ز حسن است — ترا رنگ و مرا بو آفریدند
ازان ز دیدن روے نقاب بیزارم — که دست خود برخ یار بے حجاب رساند
ز داغهاے سراپا بخود خوشم مظهر — که جزو جزو مرا غم بانتخاب رساند
زنشان ظلم چه کم می شود که مظهر نیز — هلاک تیر نگاه هاے گاه گاه شود
سینه ام کسب صفا از خاکساری می کند — از غبار آئینه عشق بے غباری می کند
بسکه طفلان از سراپایم بشور آورده اند — ناله از هر استخوانم نے سواری می کند (۱۰ ب)
گلشن رخسارش از بیداد رنگین تر شود — این چمن را خون ناحق آبیاری می کند

نالہ کز یاران دل سوز است عمر او دراز — گاہ در شب ہاے ہجرم غمگساری می کند

چشم ہر گاہ کہ بر روے تو وا می گردد — دست فریاد مرا دست دعا می گردد

در سینہ ام کہ تیر تو پیکان بجا گذاشت — گویا برائے شکر زبانے بہم رسید

داغ ما را آسمان کے فکر مرہم می کند — آنکہ زخم گل پر از الماس شبنم می کند

کشتۂ مشکل کشائی ہائے بیداد توام — کار صد پنجاہ شمشیرت بیکدم می کند

باغ نزدیک است و من در دام و فصل گل رسید — الوداع اے ہم صفیران مرگ این بلبل رسید

این بلا ہاے سیہ را تا کے از سر وا کنم — زلف می پیچید با من از قفا کاکل رسید

بکام دل بپاے گلعذاران جبہہ می ساید — چہ بخت سبز و روے سرخ یارب این حنا دا

شور باران مرثی تا بد سر مخمور من — پنبہ بہ نہ الراز سر مینا و در گوشم گذار

نرگس از تربت من رستہ و خوبان گویند — خاک گردیدہ و چشمش نگران است ہنوز

گرد باد خاک ما ہم خالی از نداز نیست — این ہمہ بر دور داماں در از خود مناز

باغبان خانہ ات آباد آشنا خوان توام — چون صبا باد فروش گل و ریحان توام

نہ از وحشت چو مجنون نہ ز غم چون کوہکن مردم — کشیدی تیغ و چیزی زیر لب گفتی و من مردم (۱۷۲)

بیگانہ شد ز ہم چو ہمی بے وفا دلم — یارب شود بہ ہیچو توئی آشنا دلم

وادی مجنون بعہد من پر است از گرد باد — بعد عمری خاک او را بر جنون آوردہ ام

منکہ مظہر آب می شد زہرہ ام از نام ہجر — تاب این غم ہا ندانم کہ چون آوردہ ام

نداشت ہستی من از عدم سر مو فرق — کمر تو بستی و من مفت از میان رفتم

از دوا ہرگز نخواہد رفت آزار دلم — دلبری باید علاج من کہ بیمار دلم

در بلا ہا از برائے خاطرم افتادہ است — منفعل از دل خجل از دل گنہگار دلم

بخاکم آمدی و بسکہ بر گرد تو گردیدم — برقص آمد برنگ آسیا سنگ مزار من

ردم ہر صبحدم در باغ و برگ لالہ را بوسم — کہ می ماند برنگین ناخن پاہاے نگار من

بود چون بند و بست وضع ہر کس در خور شانش — زمن دل بستن و از یار برخونم کمر بستن

میتوان بست این چنین نقش تو با تصویر من — تیغ در دست تو و دست دگر زنجیر من

نشست آخر زخط گرد تیمی برعذار او | نکشتی گر مرا می آمدم اکنون بکار او
چه بدی داشت گر ای ناله اثر می کردی | از دل من بدل یار خبر می کردی
ای خدا اشک مرا قدر نه بخشیدی حیف | یاد آن روز که از قطره گهر می کردی
هردم از دغدغهٔ ہجر دلم خون می گشت | خوب کردی که بیک مرتبه آتش کردی (۲، ب)
ای محبت چقدر خانه بر انداز خودی | دل که آرام گہت بود خرابش کردی
سر آن غرور کردم که کنی چو لطف با من | سر پا زنی و پرسی که بگو چه حال داری

رُباعی

گر بندهٔ رعنائی عشق صنمی | در شق گر لیستن مکن ہیچ کمی
مظہر بخدا که غیر باران نسزد | بر یک ہتی ہوا آتوی قسلمی

ایضاً

از گرمی شوق کرده ام تب چه کنم | مشاطه رقیب کیست یارب چه کنم
من کشتهٔ خون رنگ پانم کز رشک | شد پرده بو تنت او شه لب چه کنم

۱۳۳ - میر محمد تقی میر: تخلص، ہمشیرزادهٔ خان آرزو مغفور است، اکثر اشعار ریختہ
گوید و تذکرهٔ متضمن احوال شعرای ریختہ گو نیز تالیف نموده، و ہر ہفتہ روزے بخانہ اش
جمع ریختہ گو یان و مشاعرات در ایشان می شود، آخر در شعر فارسی ہم مہارتے بیدا کرده،
شعر خود را بخط خود نگاشتہ برائے صاحب خود اوند داده بود که داخل تذکره نماید،
از آن جملہ است:

بسپاریدم بزیر خاک در راه | که من از رفتن آن یار مُردم
تاسف این زمان بر نعش من چیست | زعمرے بوده ام بیمار مُردم
فریادرس (۹۲، ا) مجز بیکسی نبود درین وادی | که چون صوت جرس بسیار دور از کاروان ماندم
وقت رحیل آه بخواب گران گذشت | تا چشم وا کنم ز نظر کاروان گذشت
شورش دل تا ثریا می رود | کار آه و ناله بالا می رود
مرا دلے است به بر چاک چاک چون شانه | زاختلاط پریشان زلف جانانه

۱۳۴ - رائے بیچے مل معنی برادر بزرگ راجہ دیا مل امتیاز مذکوراند پیش ازین تا ہنگام حیات راجہ مسطور بخدمات اکثر مکانات مشتغل بوده الحال از چند سال بسمت پورب در لشکر شجاع الدوله وغیره روزگار بسر می آرند در انشای نثر دست گاه عالی دارند و بغایت رنگین و دلچسپ می نگارند۔

ہم چو فانوسے کہ روشن پرتو شمعش کند　　برقع از نور رخش عرض تجلی داده است

حرف النون

۱۳۵ - نعمت اللہ خان - پسر روح اللہ خان میر بخشی اورنگ زیب عالم گیر بوده و در عہد فردوس آرام گاه بخدمت قراول بیگی سرفرازی داشت از وست۔

بہیچ وجہ مکدر نمی شود دل ما　　ز آب آئینہ گویا سرشتہ شد گل ما

۱۳۶ - نور اللہ بیگ نزہت - شاگرد میرزا عبد الغنی بیگ (۳۱۷ ب) قبول است برفاقت نعمت اللہ خان قراول بیگی مذکور می گزرانید در اوسط عہد فردوس آرام گاه وفات یافتہ او راست۔

ہر کہ اول از زبان نرم بغر بید مرا　　عاقبت چون خامہ نقاش رد کش می شود
ریسمان تا بیدن شاہان بچے جا کر خطا ست　　خیمہ دولت بپا از زور این اِستادہا ست
نگردد شوخی مژگان کم از بیماری چشمش　　نباشد غیر جستن چاره نبض غزالی را

۱۳۷ - رائے بھوگن مل نشاط دیوان نواب اسد خان وزیر اورنگ زیب عالم گیر از عمده ہاے مشاہیر اند کہ احتیاج تحریر نیست علم و قابلیت و جاه و ثروت در خاندانش تا حال مستقر و متمکن بوده است کہ فرزندان او و اولاد آنہا جمیعا بہ عمدگی و جمعیت روزگار می گزرانیده اند اولاً درین زمان ناپرسان کہ جوہر قدر شناسی اہل ہنر در ذات ہیچ کس بنظر نمی آید دیوانش دیده شد اما بالفعل بہ بیتی کہ بخاطر بود اکتفا نمود این است۔

رفع سودائش نمی گردد ز معجون فلوس　　شربت دینار باید بہر بیمار غرض

۱۳۸ - میرزا لطف اللہ نثار مخاطب بہ نصرت اللہ خان (۴۷ - الف) ملتش

از ایران است که یکی از اجدادش درین جا توطن گزیده بود مدتی بملازمت شاهزاده رفیع الشان بن بهادر شاه و بادشاه فرخ سیر بسر برده و در عهد فردوس آرام گاه بعد هنگامه نادر شاه بوساطت اسحاق خان بداروغگی قورخانه سرفراز گردیده بود از وست۔

رفته از دامن صحرا بیرون　　طفل اشکم چه قدر ها شوخ است

داد خاکستر ما را برباد　　سوختن بال و پرے پیدا کرد

کشتی دولت هنوز سنگ است　　بر سنگ مزاری نویسیم

توصیف جناب حسن و عشق است　　دیوان نثار می نویسیم

۱۳۹۔ میرزین العابدین نثار مولد و مسکنش اصفهان است و بخدمت استیفای مازندران افتخار داشت و خط شکسته نهایت خوش می نگاشت و در انشا پردازیش مهارتے کامل و گاه گاه بنظم شعر مائل بود و از وست۔

از غم دوست نالیم چو ما نے نیست　　کز بجاے نرسد دست گریبانی نیست

زخم تیغ تو بمشتاق ستم بخشد جان　　نکنم شکوه ز شمشیر تو تا جانی هست

نه همین روز بود حال من آشفته چو زلف (۳۰ب)　　شب هم از بخت سیه خواب پریشانی هست

۱۴۰۔ میرزا زکی ندیم اصلش اصفهان است در زمان شاه سلطان حسین بخدمت امرا مصاحبت داعزاز داشت و پس از رفع هنگامه افاغنه پیش نادر شاه تقرب بسیار حاصل کرده سیزده سال بملازمتش ماند آخر ترک نموده به نجف اشرف سکونت گزید از وست۔

برنگی ساقی امشب می بجامم دیر میریزد　　که پنداری شراب از شیشهٔ تصویر می ریزد

مضطرب پروانهٔ بزم چراغانم ندیم　　خویشتن را درمیان انجمن گم کرده ام

۱۴۱۔ محمد علی خان نژاد از امرای ایران است که بجهت سفارت از جانب نادر شاه بر شاهجهان آباد رسیده بود و وقت مراجعت در تتهٔ وفات یافت طرب یا دوست می داشت و موسیقی دان کامل بود و بار یاب این فن رعایت هائے بے حدی کرد از وست۔

گر رفیق منی ای درد و بلا بسم الله　　سفر وادی عشق است بیا بسم الله

۱۴۲۔ محمد بیگ نکهت کلانتر کرمان است ابدستی فهم و رسائی طبیعت موصوف

بوده نادرشاه اورا (۵۷ - الف) بسببے قتل کرد اوراست ۔

بخضر رشک مبر کاب زندگی دارد | با وصال که او تاب زندگی دارد

۱۴۳ - محمد رضا نائب از ظریفان روزگار بود که ہیچ یکی از ظرفا بادی و ظرافت پیش نمی برد از دست ۔

ناله پنداشت که در سینهٔ من جا تنگ است | رفت و برگشت سراسیمه که دنیا تنگ است

۱۴۴ - میرزا ناجو پسر میرزا عبدالغنی بیگ قبول است، اوراست ۔

می تراشد از لبش هرگاه خط آید برون | از تراشیدن شود این لعل را قیمت فزون

ز چشم شوخ تو مژگان چه خوشنما افتاد | که خوشنماست الف خنجری بسورهٔ صاد

۱۴۵ - میر زین العابدین نیّر برادرزاده نواب سادات خان ذوالفقار جنگ است اجدادش از سادات مازندران بودند و سے در اوسط عهد فردوس آرام گاه وارد شاه جهان آباد گردیده بخطاب شجاع خانی سرفراز گشته بخدمت عم می ماند و ہم درین جا تحصیل علوم نموده اوراست ۔

از سوز دل مجال سخن کو که مطلبم | تبخاله وار بر لب اظهار مانده است

واعظ از قول تو زاہد زمی ناب گذشت | زره عام فریبی خرت از آب گذشت

۱۴۶ - میر غلام علی نسیم (۵۷ ب) ساکن قصبه امروہه واز اولاد حضرت غوث الاعظم است رضی اللہ عنه - و در رفاقت خدا یار خان لتی میگذرانید اوراست ۔

بهر دو نشه زیاران ندیده است کسے | بسان شیشه و ساغر دو قالب و یک جان

۱۴۷ - میدان سخنوری را شهسوار یکتا تاز محمد نعیم نیاز غفر اللہ له کمال استعداد متاعی بود که در چار سوی قماش آباد قابلیت جز بکارخانه ذات معدن حسناتش یافت نمی گردید و ذکاء فطرت نقدی که در دار الضرب هنرمندی غیر از خزینهٔ ضمیر خورشید نظیرش بوصول آن نتوان رسید رنگینی کلام گلی است که در گلستان خاطرش بهزار رنگ بالیدهٔ بوده و موزونی سخن سروی که در چمنستان طبعش بغایت سنجیدگی قد کشیده فصاحت و بلاغت از حلقه بگوشان فکر رسایش، و فهم و ادراک کمینه بندگان اندیشه والایش اختر برج نجابت

است و گوهر و سنج شرافت؛ بزرگانش از عمده ہای نامور و روسای اکابر اکبرآباد بودند و بمناصب و جاگیر سرفرازی داشتہ روزگار را بعیش و کامرانی می گزرانیدند خودش (۷۶-الف) فن انشاپردازی کہ ہیچ یک از منشیان این زمان را یارای ہمسری نمی شد و ضمیمہ شاعری داشت و پیشۂ طبابت کہ دران کاردست گاه بقراط و جالینوس بود علم اشتهار می افراشت احقر را بادی رسوخ عبودیتی بوده است و خلوص عقیدتے کہ استفاده بسیار از خدمتش کرده ام؛ اصلاح شعر و انشا گرفتہ و بعضے کتب ہم دیده؛ دربنولا کہ خبر وفاتش شنیده ام از تلخی غم شربت عیش بر مذاق طبیعت ناگوار است؛ اَللّٰھُمَّ اجْعَلْ مَسْکَنَہٗ جَنَّۃَ النَّعِیْم او راست

کو جنون کز داغ رسوائی کند گلشن مرا — ہم چو گل گردد گریبان چاک تا دامن مرا

ناز پرورد نگاه گرم خوبانم نیاز — می توان کرد از حریر شعلہ پیراہن مرا

نشاء سرشار من از جا برد میخانہ را — لب بفریاد آید از بدمستیم پیمانہ را

وردماغ من ہوای قامتے پیچیده است — از سر نو کرده ام تعمیر بالا خانہ را

نہ بلبلم نہ گلم نے نسیم بستانم — غبار رہگذر انتظار خوبانم

ز بس خیال خطش در دو دیده ام جا کرد — بجای اشک زمرد چکد ز مژگانم

چنان خیال ترا در بغل کشیدم تنگ (۷۶-ب) — کہ پر شد از گل خورشید جیب و دامانم

نیست یک حسن عمل بالاتر از دیدار دوست — روی او می بینم و خود را بہشتی میکنم

احقر تاریخ وفاتش کہ از روز و ماه مطلع نشده چنین یافتہ است۔

استاد من آن حکیم نعیم — مشفق و مہربانم از جان بود

نسخۂ درک خدمتش بے شک — بعلیلان جہل درمان بود

چون ز دنیا برفت سوی جنان — یا رجب یا کہ ماه شعبان بود

حیرت از سال رحلتش ہاتف — داد خبرم "ندیم رضوان بود" (=۱۱۷۳ھ)

حرف الواو

۲۵۳- امیر میرزا مبارک اللہ واضح نواسۂ آصف خان جعفر و شاگرد محمد زمان

راسخ از ارباب فضل و کمال و اصحاب تصوف بوده در خدمت منعم خان خانان می گذرانید و در زمان سلطنت فرخ سیر وفات یافته اوراست۔

دست قضا جراحت و مرہم بہم سرشت | با پنبه رسته از جگر لاله داغها
اے خدنگ نگه آهسته ازین سینه گذر | که درین کلبه چو دل مرده بیماری هست
نیزه داران مژه برق سوار نگه اند | گردش چشم کسی آمده فوج دکن است
نیم جان دارم و حسرت کش دردم که مباد | باز این جور بجان دگری (۲،۷) خواهی کرد
بیگانه را بکشتن من متهم مکن | خونم هنوز از نگهٔ ناز می چکد
نامه را تا وانکم جان رفته است از اضطراب | حرفے اے قاصد اگر نشنیده باشی نقل کن
بکاغذ اخگری پیچیده ام یعنی دل خود را | مبادا گریه بر حالم کنی ای نامه بر رحمے

۱۴۹۔محمد معصوم وجدان پسر محمد زمان راسخ بعالی نسب خان مخاطب بود و بخدمت عبدالصمد خان و ذکریا خان صوبه داران لاهور و ملتان باعزاز و اکرام بسر می نمود در آخر عهد فردوس آرام گاه رحیل سرای جاودانی شد اوراست۔

چشم در راه طلب هر چند میداند مرا | نامه ام میخواند آن شوخ و نمی خواند مرا
زاهد برون چو رخت خود از بزم ما برد | او خیر باد گوید و رندان خدا برد
رسید ابر هوا خواه و مرحبا گفتیم | نمود بارش و ما رحمت خدا گفتیم

۱۵۰۔میرزا ابراهیم وفا از زمینداران حوالی قندهار است پیش بادشاه افاغنه بمنشی گیری می ماند اوراست۔

این ملامت بس زلیخا را که در میزان عشق | نقد یوسف را سبک سنجید و با گوهر کشید (۷،۷ ب)
ندامت حاصلے در الفت خوبان نبود | از میان بے وفایان چون وفا برخاستم

۱۵۱۔علی اصغر واضح از اصفهان است به پیشه زرکشی مشغوف بوده آخر ترک نموده بهند رسیده مساعدت از بخت نیافت که بهبودی پیدا کند در حیدرآباد وفات یافت اوراست۔

پس از یورش نداردروی ماندن ابر نیسانی | قراری میکند ارباب همت را پریشانی

۱۵۱- شرف الدین علی وقا از قم است همراه نادرشاه می ماند چو از خراسان از شاه جدا شده وارد هند گردید گویند مستجمع فضل و هنر و بغایت رنگین صحبت و خوش اختلاط بوده او راست -

جگرم سوخته از آتش غم باز امشب	شمع سان کرده ز سر سوختن آغاز امشب
تید بندم چو بے آهنگ طرب ساز کند	گر شوی با من غم دیده تو دمساز امشب
باز آمده بود بر سر مهر	بیمهری روزگار نگذاشت
وعدهٔ قتلم بفردا داد و می ترسم که او	افگند این وعده را فردا بفردای دگر
من که جان میدهم از ذوق اسیری صیاد	بسته در کنج قفس از چه پر و بال مرا
دیدهٔ اشک فشان گر نکند پرده دری	که دهد شرح وفا پیش (۷۰۱) قبے لحوال مرا

در هجو یکے از فاحشه ها گفته

آنانکه بفرجت ذکر انداخته اند	دانی ز چه خصیه بر در انداخته اند
از لطمهٔ موجه ها ے دریاے کُست	مضطر شده اند و لنگر انداخته اند

۱۵۲- نور العین واقف مولدش پنجاب و پدرش قاضی بٹاله که قصبه ایست از لاهور بوده خان آرزو مغفور نوشته اند که اشعار خود را جهت اصلاح پیش من فرستاده بود او راست -

خیال بوسه می سازد کبود آن لعل نازک را	چه بے رحمم بدندانش گزیدن آرزو دارم
کجی از مژه هایش دیدیم	که بتقریر نمی آید راست
نیزه هاے که ز دی خامه نمودیم ولیک	سطری از نسخهٔ بیداد تو تحریر شد
ای خموشم ز تو در فریادیم	تهمت صبر بما می بندی
دل محو خیال آن کمر شد	بیچاره هیچ از میان رفت
جور کم کن محتسب نازک دلم هم چون حباب	شیشه ام گر بشکنی پر می شود پیمانه ام
میرم از خجلت اگر سیلاب تشریف آورد	گریه کردن هم بجا نگذاشت در ویرانه ام

۱۵۳- صغیر گلزار بلبل رنگین سخن دانی علی قلی خان واله داغستانی از اولاد سلاطین (۷۰۱)

داغستان است کہ الخاص میرزا ابن الدار خان بادشاہ داغستان کہ پدر جدش بود حسب درخواست
شاہ عباس ماضی بخدمتش رسیدہ بفرزند خواندگی اختصاص و بخدمات عمدہ و مراتب عالیہ
امتیاز اندوختہ بود و ے در سنہ یک ہزار و یک صد و بست و چہار باصفہان تولد یافتہ
و ہمانجا بہ تحصیل علوم پرداختہ در ایامی کہ نادر شاہ بر سلطنت آنجا تسلط داشت وارد
ہندوستان گردید و بوساطت برہان الملک سعادت خان و روشن الدولہ و حکیم
معصوم علی خان بشرف ملازمت فردوس آرام گاہ مشرف و مستفید گشتہ بچہار ہزاری
منصب و دو ہزار سوار و خلعت و فیل و جاگیر و خدمت میر توزکی امتیاز و افتخار یافت
بدختر عم خود تعشق داشت و باو نام زد ہم گشتہ بود اما فلک بیداد گر نہ پسندید کہ ہر دو بیدل
بکام دل رسند یعنی ہنگامۂ افاغنہ دران ملک برپا شد و معشوقہ اش بدست حریفے دیگر
افتاد چنانچہ تمام احوال خود را از ابتدا تا انتہا در خاتمہ ریاض الشعراء کہ ماخذ صاحب
سخنان (۹۷ - الف) ایران مندرجہ این اوراق ہمان است مفصل تحریر ساختہ دیوانش
را کہ میر شمس الدین فقیر جمع کردہ است چہار ہزار بیت خواہد بود واز ان است ۔

دلدار نامروت نامہربانِ ما — ہرگز نداد گوش بآہ و فغانِ ما
نزل سگانِ یار بود لے ہما برو — باشد زیاد از دہنت استخوانِ ما
والہ چو آتشے کہ بماند ز کاروان — باشد بکوی او دل سوزان نشانِ ما
گریہ ہا در آستین داریم و خندانیم ما — محفل ایام را شمع فروزانیم را
فکر زلفے می زند جمعیت ما را بہم — روزگارے شد کزین سودا پریشانیم ما
گردون قدح ز خونِ جگر میدہد مرا — جامے نخوردہ جام و گرمی دہد مرا
آمد بہ پرسش من دل خستہ با رقیب — این زندگی ز مرگ خبر می دہد مرا
دہم بر پاے خود زان بوسہ ہر دم — کہ روزے از سر ان کو گذشتہ است
بنام خویشتن عاشق از انم — کہ روزے بر زبان او گذشتہ است
نگوی میتوان بردن بدامن — زہر راہے کہ آن بدخو گذشتہ است
اگرچہ دل فریب افتادہ ہر دو — ولے از آن کمر گیسو گذشتہ است

نه هشیاراست چشم مست آن شوخ — دلی خود را چنین وا می نماید (۹۷ ب)
نمیدانم چرا در قتل من یار — همین امروز و فردا می نماید
جانان بسر مزارم آمد — آخر مردن بکارم آمد
بی تو بفلک رسد فغانم — شاید بتو هم رسیده باشد
در غیرتم از فلک که ترسم — قدش زغمت خمیده باشد
واله بتو یار سرگران است — حرفی زکسی شنیده باشد
گردن کشد زبیضه در عندلیب زاده — صبحی که یار گل بهوا گوش می زند
نشیند تا بگردن سرو در خاکستر قمری — خرامان در چمن گردد اگر شمشاد نوخیزش
زیبد اگرش کعبهٔ عشاق بخوانند — پیراهن بشرنگ و دل چون حجر ستش
کاتب صنع منتخب دید چو بیت ابروت — کرد رقم زمشک چین پهلوی آن یکی نقط
نیست پیدا چو دهانت زانزدست — خال در کنج ت نقطهٔ شک
از جور یار می کنم امشب شکایتی — یاران حذر کنید که طوفان آتشم
نیست در ملک عقل تحفهٔ درد — روم از کشور جنون آرم
سوختم و سوزش من هیچ کس آگه نشد — در جهان هم طالع شمع مزار افتاده ام
آن مه خورشید طلعت گشته تا گرم خرام — سایه سان دنبال او بی اختیار افتاده ام (۹۸ ا)
حرفیست در افواه که ماند بتو خورشید — من گوش بافسانهٔ افواه ندارم
بند و بکسان عقد طرب در همه محفل — از دختر رز بی سبب اکراه ندارم
زان شکرلب زقصهٔ شیرین — نمکین تر فسانهٔ دارم
دل فراموش کرده ام پیشش — باز کردم بهانهٔ دارم
خاک ره گشتم که برمن بگذری — خود تو اکنون دامن افشانی بمن
شد بهشت هند واله چون جحیم — در غم یار صفاهانی بمن
شمعم به بزم هستی و آه است دود من — جز اشک نیست حاصل نخل وجود من
وادم ز دست مایهٔ دین و دل و خرد — بازارگان عشقم و این است سود من

با سایه ترا نمی پسندم　　عشق است و هزار بدگمانی

حرف الهاء

هدا میرزا ابوعلی هاتف نواسه میرزا اسمٰعیل ایما است که در حرف الف مذکور شده در صغر سن همراه پدر خود از اصفهان صادر هندوستان گردیده آخر بملازمت نواب صفدر جنگ می ماند گاه گاهی شعری خوب از زبانش سر برمی زد و از وست۔

شب به یاد آن گل رخسار اشکی ریختم　　می دمد بوی گلاب از جیب و دامانم هنوز (۸۰ب)

بدور خط بتان منعم از فغان مکنید　　درین بهار ز کف رفته اختیار مرا

حرف الیاء

۱۵۶۔ احمد یار خان یکتا ولد الله یار خان بزرگانش از ترکستان بهند رسیده بحکومت بهکر سرفرازی داشتند و وے در سنه عزیمت نادرشاه باین سمت در عظیم آباد وفات یافت. گویند با وجود فتور در سماعت بشنیدن شعر رغبت کمال داشت و صحبت اهل آنرا عزیز می انگاشت او راست۔

سر و سامان چه میپرسی ز من عمر یست چون کاکل　　سیه بختم پریشان روزگارم خانه بر دوشم

۱۵۷۔ یحییٰ خان از طائفهٔ افشار است که قومی است از مغل در سنه یک هزار و هفتاد و نه (۱۰۷۹ھ) بلاهور تولد شده به بیست سالگی بایران رفته تحصیل علوم کرده بعد هفت سال مراجعت بهندوستان کرد و ملازم شاهزاده اعظم شاه گردید و در عهد فرخ سیر بخدمت قوس بیگی و در زمان فردوس آرام گاه اول بمیرمنشی گری و بعد ازان بدیوانی خالصه شریفه سرفرازی داشت در سنه یک هزار و یک صد و شصت (۱۱۶۰ھ) وفات یافت گاه گاه بندرت شعر می گفت از وست۔

ز فیض (انه ق) رعشهٔ پیری بوجد آید ایاغ من　　برنگ گل ز باد صبح روشن شد چراغ من

چو شخص تعینک چشم حباب می بینم　　بنای خانهٔ هستی بر آب می بینم

۱۵۸- محمدؐ حنیف خان یاؔر رائے صاحب خداوند نگاشتہ کہ استاد رائے اندر رام مخلص بود کہ ایشان اکثر کتب متداولہ ازوی دیدہ بودند۲ او راست۔

تو عندلیب بمان سالہا درین گلزار　　　　که از نوای تو هنگامهٔ چمن گرم است

۱۵۹- محمدؐ اشرف یکتاؔ از کشمیر است و در عہد فردوس آرام گاہ وفات یافتہ است۲ او راست۔

کسے ترک سجدهٔ تو بتِ دلربا کنم　　　　کارے که کافری نکند من چرا کنم

از غیر برده بود دل و داد و اپس　　　　شکر خدا که خاطر ما را نگاه داشت

خاتمہ الحمدُ للہ کہ این لالی دلپذیر گرانمایہ و دُرشاہوار گرامی اشعار اندازکہ دُرة التاج خلافتِ خرد و فراست اند بسعی بازوی غواص قلم از اصدافِ کتب برآمدہ درکمال زیبائی و مرغوبی بسلک تالیف و تسوید منسلک گردیدند و این گلہائے خندان دل کشا و از بار شگفتگی آثار راحت افزای ابیات رنگینی سمات کہ زیب دوکان (۱۰ ب) گل فروش دانش و تمیز اند بدستاری گل چین خامہ از چمنستان دواوین بدامن شوق جمع شدہ در نہایت رعنائی و محبوبی برشتہ تحریر و ترتیب زینت انتظام یافتند۔ ہمانا این حلیہ دلفریب جواہر معانی پیرایہ بروش شاہدان حسن آباد سخنوری کہ قیمت شناسان لعل و یاقوت کان علم ۲ آنست کہ اگر گوہری ازین سلک شایستہ آویزہ و ہیکل گوش و گردن معشوقہ خاطر یابند۔ بضاعت این متاع والا را کہ بے رنج و تعب بر انسلاک دست نیافتہ از دعاے خیر فراموش نسازند و توقع از لطف تماشائیان حدائق دانشوری کہ نکہت گیر یاسمن و ریحان باغ سخن اند آن کہ چون گلی ازین گلدستہ قابل استشمام مشام ذوق (دارند) گلچین افسردہ خاطر را کہ در چیدن آنہا چہ قسم خار تردد در پاے دل شکستہ بفاتحہ یاد آرند (۸۲-الف) برین بود و نابود آغاز اعتماد بقاے یک دم نشاید و برہستی نیستی انجام تکیہ حیات یک ساعت نباید کُلّ مَنْ عَلَیْہَا فَانٍ وَّیَبْقٰی وَجْہُ رَبِّکَ ذِی الْجَلَالِ وَالْاِکْرَام - الٰہی از قبول خاطر ارباب فضل و ہنر آبرویش بخشاد و بآبیاری نگاہ پسند اصحاب دانش و علم سیرابیش دہاد۔

قطعه لمؤلفه

شکر حق بر مراد دل بشگفت	این گل تازه از بهار سخن
نه گلے بلکه خود گلستانی است	پر ز ریحان و لاله زار سخن
هر یکے مصرعه رسالیش بود	سرو موزون جویبار سخن
سنبلستان نثر زیب افزا	هم چو گیسوست بر عذار سخن
دی این باغ عاشقان نگهی	جلوه ها می کند نگار سخن
ورق با صفاش هم چو صدف	حامل در شاهوار سخن
حیرت امید من همه این است	پیش هر صاحب عیار سخن

دهدش آب و تاب حسن قبول

کرم آفریدگار سخن

بتاریخ بست و پنجم شهر جمادی الثانی سنه یک هزار و دو صد و بست و هفت هجری علی صاحبها و آله صلوٰة متکاثرة و تحیات متوافرة لا یحصیها فهمنا و لا یدرکها وهمنا من الله تعالیٰ روز جمعه بدستخط عقیدت آئین امام الدین این نسخه به پیرایهٔ اتمام (۸۲ ب) رسید اتمام تسوید و کسوت اختتام ترقیم پوشید - الحمد لله علیٰ ذٰلک حمداً متوالیاً کثیراً کثیراً ط -

نورالحسن ہاشمی

کلیاتِ تواریخ از رائے سُناتھ سنگھ بیدار

(تعارف)

رائے سُناتھ سنگھ بیدارؔ، میر و مرزا کے زمانے کے فارسی گو شاعر تھے، لیکن صرف تاریخیں
تے تھے۔ ابتدائی تعلیم و تربیت دلّی میں پائی ۔ وہ اپنا وطن گورکھپور بتاتے ہیں جس کی تصدیق
ہے کے ایک دوست بھگوان داس مصنّف سفینۂ ہندی (نظر ثانی ۱۲۱۹ھ) نے اس طرح
ہے: " از قرابتیانِ راے بھوگ چند پیشکار خالصۂ شریفہ فردوس آرام گاہ ۔ مولدش
رکھپور و منشاء او شاہجہان آباد ......" لیکن ان کے ایک دوسرے دوست ابو طالب اپنے
رہ خلاصۃ الافکار میں لکھتے ہیں کہ راے سُناتھ سنگھ بیدار دلّی کے رہنے والے تھے ۔ مگر
میں ایک موضع ضلع گھورکھپور میں جاگیر ملا تھا ۔ اس لیے وہیں توطن اختیار کر لیا تھا۔
کی پوری عبارت یہ ہے :-

" رائے سُناتھ سنگھ بیدارؔ برادر زادۂ رائے بھوگ چند محمد شاہیست ۔ تولدش
در ..... شاہجہان آباد ..... و در خدمتِ خلاصۂ مشائخ و مشاہیرِ آں بلدہ
چون شیخ محمد عظیم گوالیاری و شیخ محمد زبیر سرہندی و خواجہ میر درد و آرزو و غیرہم
گردانیدہ بود ۔ بعد انقلابِ سلطنت ازان طرفہا آوارہ شدہ بتقریبِ قلیل
جاگیر و مسکن چند نفر از اقوام بمروت شریہ در موضع سکندر پور اموده که از
قصباتِ معروفہ سرکارِ گورکھپور است، سکونت ورزیده ۔ اما دہقانان از
تمرد و دوریہ طمع آں قدر زمین پیوستہ وے را در رنج دارند و در سنِ کہولت و
فقدانِ طاقت مجبورش نموده، بدر بارِ وزیر و عمالِ آں سرکارات می دوانند۔
لغایت تحریر که سنہ ہجری بہ ہزار و دو صد و شش رسیده، آن پیر فقیر در
سلکِ احیاء انتظام و ہمدران طرفہا مقام دارد ۔ دیوانے متضمن چہار پنج ہزار

بیت از سخنانش تدوین یافتہ کہ سرتاپا مشتمل بر فنِ تاریخست ودریں صفت
دے را ملکہ و مہارتے است کہ بیانِ آں متحمل بر اغراق نمی شود، چنانکہ چند نثر
و قصائدِ طولانی وا لفست کہ با مناسبت معنوی و رعایتِ لفظی و مقامی از ہر
فقرہ و مصرع آں مادۂ تاریخ بہم می رسد........"

اگرچہ یہ اُردو کے شاعر نہ تھے۔ مگر میر حسن نے اپنے تذکرۂ شعرائے اُردو میں ان کے
حالات لکھے ہیں[1] اور اس زمانے میں ان کی عمر ستّر سال بتائی ہے۔

میر حسن کا تذکرہ ۱۱۸۰ھ اور ۱۱۹۲ھ کے درمیان لکھا گیا۔ گویا اس اثنا میں بیدار کی
عمر ستّر برس کی تھی۔ ابوطالب نے لکھا ہے کہ وہ ۱۲۰۶ھ تک بقیدِ حیات تھے اور سفینۂ ہندی
(۱۲۱۹ھ) میں ہے کہ "چند سال است کہ وفات یافت" اس کے معنی یہ ہوئے کہ انھوں نے
نوّے سال سے زیادہ بلکہ سو کے لگ بھگ عمر پائی ہوگی، صحیح تاریخ وفات معلوم نہ ہو سکی۔

بیدار نے تمام عمر صرف تاریخیں کہیں اور انھیں یکجا کر کے مجموعے کا نام کلیات تواریخ"
رکھا۔ اس کا قلمی نسخہ لکھنؤ کے ایک قدیم مدرسے میں دریافت ہوا (یہ مجھے اپنے رفیق سید
شبیہہ الحسن صاحب کی وساطت سے دیکھنے کو مل سکا۔ اس کے لیے میں ان کا بہت ممنون ہوں)۔

اس نسخے[2] کی ابتدا میں ایک مقدمہ ہے جس میں مصنّف نے کچھ اپنے اور کچھ اپنی تاریخ
گوئی سے متعلق ذکر کیا ہے۔ اسی میں اپنا توطن موضع سکندر پور آمودہ مضافات سرکار گورکھپور

---

[1] میر حسن کے تذکرہ (مطبوعہ ۱۹۴۰ء انجمن ترقی اردو ص ۳۸) میں ان کا نام رلیناتھ سنگھ درج ہے۔ غالباً
میر حسن نے ان کا لقب "رائے" اور نام یکجا کر کے "رالیناتھ سنگھ" لکھا ہوگا جو بعد کو "رلیناتھ" ہو گیا۔ البتہ
میر حسن نے اپنے تذکرے کی ترتیب چونکہ حروف تہجی کے اعتبار سے کی ہے، اس لیے تعجب ہے کہ انھوں نے
بیدار کی رعایت سے ان کا ترجمہ ب کے تحت کیوں نہیں لکھا، بلکہ ت میں لکھا۔ شاید "ثناتھ سنگھ" نام
سمجھے ہوں یا بعد کے کاتبوں نے تصحیح فرما دی ہو۔ بعض جگہ ان کا نام "سیانانھ سنگھ" بھی لکھا ملتا ہے۔ خود
جناب حبیب الرحمٰن خاں شروانی مرتب نے اپنے مقدمۂ تذکرۂ میر حسن میں ان کا نام "سیاناتھ سنگھ" لکھا ہے۔
(ص ۲۲) یہ سب نام غلط ہیں اور "شناتھ سنگھ" اگرچہ غیر معمولی نام ہے مگر صحیح یہی ہے۔

[2] اس میں ۹۳ صفحات ہیں، ۵ اسطری۔ تاریخوں کی تعداد ڈیڑھ یا دو ہزار کے قریب ہوگی۔ آخری صفحے سے پہلے کے
دو چار صفحے نذارد ہیں۔

ملک سردار" بتایا ہے۔ اپنی تعلیم و تربیت سے متعلق لکھا ہے کہ ابتدائی تعلیم دہلی میں شیخ محمد عظیم گرالیاری کی خدمت میں پندرہ مہینے حاصل کی۔ انھیں کی صحبت میں کچھ شعر و سخن سے واقفیت بہم پہنچائی۔ پھر خواجہ محمد ناصر اور ان کے بیٹے خواجہ میر درد اور سراج الدین علی خاں آرزو اور مرزا جان جاناں مظہر وغیرہ کے فیضانِ صحبت سے مستفید اور مستفیض ہوئے اور انھیں تاریخ گوئی کا شوق پیدا ہو گیا۔ پہلے کچھ تاریخیں کہہ کر حضرت شیخ محمد زبیر سرہندی کو دکھائیں اور جب انھوں نے پسند فرما کر دعائیں اور بشارتیں دیں، تو یہ شاہجہان آباد کے مشاعروں میں اپنی تاریخیں سنانے لگے۔ یہ تاریخیں لوگوں نے اس قدر پسند کیں کہ بیاضوں میں لکھی جانے لگیں اور باہر بھیجی جانے لگیں۔ سلاطین و امرا و مشائخ و فقرا فرمائش کر کے ان سے تاریخیں لکھواتے۔ جب ان کا ذخیرہ بہت ہو گیا، تو چند قدر دانوں کی تحریک پر ان کے بیٹے منشی جیون لال آگاہ نے انھیں ۱۱۸۱ھ میں ترتیب دینا شروع کر دیا۔ بد قسمتی سے آگاہ کا ۱۱۸۴ھ میں انتقال ہو گیا اب بیدار نے دلی چھوڑ دی اور تلاشِ معاش میں اودھ، پٹنہ ہوتے ہوئے مرشد آباد پہنچے۔ وہاں رائے سندر سنگھ کی استدعا پر یہ کلیات پھر مرتب کیا اور دہلی، لکھنؤ اور پٹنہ میں جو تاریخیں کہی تھیں، یا ان میں سے جو یاد آئیں اس میں درج کر دیں۔ اس کے بعد یہ اودھ واپس آ گئے اور ہر سال اس مجموعے میں جدید تاریخوں کا اضافہ کرتے رہے۔ فیض آباد، لکھنؤ اور پٹنے میں یہ کتنا عرصہ رہے، اس کا کچھ ذکر نہیں ہے، یا مرشد آباد سے سکندر پور کب واپس آئے یہ بھی تحریر نہیں ہے۔ اس کلیات میں ۱۲۰۴ھ تک کی تاریخیں مل جاتی ہیں۔ چونکہ ۱۱۸۱ھ میں اس کلیات کی ترتیب شروع ہوئی تھی۔ ۱۲۰۶ھ میں "نتائج الافکار" کے مؤلف نے انھیں موضع سکندر پور میں موجود بتایا ہے، ممکن ہے اس سے بہت پہلے یہ یہاں آ گئے ہوں، کیونکہ میر حسن نے انھیں ۱۱۸۸ھ اور ۱۱۹۲ھ کے درمیان لکھنؤ میں دیکھا ہے۔ یہ اپنی جاگیر کے بندوبست کے سلسلے میں لکھنؤ آتے جاتے رہتے تھے۔ ممکن ہے، یہیں انھوں نے کلیات کی نقل کسی رئیس کو دی ہو۔ کلیات کے آخر میں جو ترقیمہ ہے، یہ اگرچہ ایک طرف سے کٹا ہوا ہے، لیکن اتنی عبارت صاف پڑھی جاتی ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ کتاب خود ان کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہے:

"بندۂ ہیچمداں راے سناتھ سنگھ بیدار تخلص۔ ایں چند اجزاے نقلِ کلیات تواریخ طبع زادِ خود راکہ .... لالہ رام پرساد ...... بینا تخلص لالہ صاحبان مہربان ...... لعل صاحب ...... جلد اصل نسخہ آوردہ بنا بر مقابلہ و تصحیح و .... فرستاد .... ہر چہ درست و مقرون بہ صحت توانست بعمل آوردہ ...."

مقدمۂ کتاب کی عبارت یہ ہے:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم، رب یسر و تمم بالخیر

"حمد بے عدد و ثنا ے بے عدد مرحضرتِ تاریخ آفرینے راسزد کہ تاریخ روز و ماہ و سال آغازِ آفرینش و ابتداے مخلوقات را بہ دو حرف کن نوع موزوں فرمودہ کہ معانی غامضش بہ فہم و ادراکِ ہیچ آفریدہ درنیاید و اسرار ازل و ابد در چند حروف مفرداتِ ابجد بقسمے تودیع و تعمیہ نمودہ کہ بر کدام مخلوقے نکشاید دریں صورت بندۂ خاکسار سناتھ سنگھ المتخلص بہ بیدار متوطن سکندر پور امودھ مضافِ سرکارِ گورکھ پور ملک سروار، زباں را بہ ستایش و نیایش او تعالیٰ کشودن کمالِ نادانی و بے خردی دانستہ بخدمتِ سخنورانِ بلاغت اساس و مورخانِ دقیقہ شناس ملتمس می گردد کہ ہر چند ایں ہیچدانِ بے جوہر و کج مج زبان بے ہنر را آں قدر استعداد ہنوز بر کتبِ تصانیفِ اساتذۂ متقدمین و متاخرین دست نداوہ و ہم از ممانعتِ والدِ بزرگوار مہارت و مزاولت بہ شعر و شاعری بہم نرسیدہ کہ فقرۂ شایستہ و مصرعۂ برجستہ شایانِ پسندِ اربابِ فضل و کمال تواند نگاشت، لیکن از انجاکہ بہ یمنِ تربیت و تعلیم پانزدہ ماہہ مولاناے مقبولِ جنابِ باری، شیخ محمد عظیم گوالیاری رضی اللہ عنہ، شمۂ بار بطِ کلام و تشریح الحروف آشنائی و تمیز نیک و بدِ سخن حاصل ساختہ عمرے بہ فیضِ صحبتِ کیمیا خاصیتِ جنابِ مستطاب قطب الاقطاب، خواجہ دین و دنیا محبوبِ خدا،

امام العارفین امیر المحدثین حضرت خواجہ محمد ناصر، مالکِ طریقۂ محمدیہ، صاحبِ
تصنیفِ شریف نالۂ عندلیب، قدس اللہ سرہ، و جامعِ کمالاتِ صوری و معنوی
بہ عالمِ عرفان و روشن دلی یکتا و فرد، نور الناصر خواجہ میر درد، مدّ اللہ ظلال افضالہٗ
مصنّفِ نسخۂ واردات و علم الکتاب و اسرار الصلوٰۃ و دیوان فارسی و ریختۂ
سراپا حضور آمیختہ و رباعیاتِ بے نظیر و رسالہ دردِ دل و شمع محفل و نالۂ درد
و آہِ سرد وغیرہ تصانیف آنجناب کرامت مآب، سعادت اندوزِ دارین بود،
و گاہ بگاہ بملازمتِ خان صاحب سر حلقۂ سخنورانِ جہاں، صائبِ عصر،
خاقانیِ زماں، سراج الدین خان آرزو و میرزا صاحب کرم گستر شاہ جان جاناں
مظہر و دیگر سخن سنجانِ عصر مستفیدی گردید و از اشعار و تاریخاتِ بلند اربابِ
کمال، زمانِ سلف و حال حظِ وافر برداشتہ شوق تاریخ گوئی بہم رسانید و در
ابتدائے مشق چند قطعۂ تاریخ تولد از نظرِ کرامت اثر قطب الاقطاب محبوب
بارگاہِ صمدی حضرت شیخ محمد زبیر سرہندی و آل خواجۂ امام العارفین علیہم الرحمہ
گذشتہ مقبولِ طبع مقدس و موجبِ بشارتِ قبول و اشتہار گردید۔ چنانچہ در مجالس
مشاعرہ دار الخلافہ شاہجہان آباد ہر تاریخ تازہ کہ بہ تکلیفِ دوستاں خواندہ می شد
سامعان احسنت و آفرین گویاں نقلِ آں در سفینہ ہائے خود می بردند و ہم اکثر
قطعات و فقراتِ تواریخ بہ نظرِ سلاطین و امرائے نامداری گزشت و بسا مردم
آشنا و مشائخ و فقراء و غربا و اغنیا بہ فرمائشِ تاریخ مکلّف شدہ بدون
سرانجام دادن نمی گزاشتند و آنچہ گفتہ و نوشتہ می شد، فرزندِ ملکی خصال، منشی و
مورخِ بے مثال، سعادت مندِ دارین، ستودہ افعال، آگاہ تخلص جیون لعل
کہ بفکرِ نثر متین و اشعارِ آبدار دستگاہ کلی و مہارتِ تام داشت، چنانچہ
انشائے چمنستان و باغستانِ او مصداقِ ایں مقال است، ایں ہمہ مزخرفات
را بہ تحریک و تشویقِ یاران و مشفقان مثل را دسروپ سنگھ انس تخلص مصنّف
نسخۂ لہو و لعب و دیوان و مثنوی و رباعیاتِ نادر کہ شاگردِ رشید جامع کمالات

خان آرزو بود و ہم عرا ے اتحاد پیرا ے برادر بجاں برابر راے سو بدھ راے
یکمل خلف عموی صاحب راے بھوگ چند پیشکار خالصہ شریفہ و محمد حسن خاں
مرحوم سر حلقۂ شاگردان شیخ محمد علی حزیں، بطریق دیوان مروت ترتیب دادہ
می خواست کہ نقل آں بہ مشتاقان و طالبین بلاد ارمغان فرستد۔ اما چوں
پیش از سرانجام ایں کار بحسب مشیت و تقدیر خداوند قدیر و کمال بطالعی فقیر
سراپا جرم و تقصیر شب بست و چہارم روز پنجشنبہ ماہ شعبان سنہ یک ہزار
و یک صد و ہشتاد و چہار ہجری داغ جدائی او بر دلم رسید۔ قطعہ:

آہ از واقعۂ جیون لعل — کہ جہاں در نظرم تیرہ بود
سال تاریخ وفاتش ہاتف — بیست چہارم مہ شعباں فرمود

(۱۱۸۴ھ)

فقیر غیر از ترک دنیا و مہاجرت از جماعہ غم زدگان خانہ نشینی را وبال جان فہمیدہ
بحسب آبخورد وارد بلدۂ مرشد آباد شدم، و دراں جا برخوردار سعادت آثار راے
سدرسنگھ استدعاے نقل ایں ہمہ مزخرفات نمودہ۔ آں چند ورق را کہ سواے
آں ہمہ در ایام نوائب شاہجہاں آباد از دست رفتہ بود و از بر نداشتم، مع
تاریخہاے تازہ کہ در بلدۂ اودھ و عظیم آباد بموجب فرمودۂ شاہ صاحب مہربان
قدیم شاہ عز الدین فیض رقم در مرشد آباد براے نواب معلی القاب فیض گستر
محمد رضا خاں خانخاناں بہادر مظفر جنگ ناظم آں صوبہ و دیگر صاحبان آنجا گفتہ
بودم، برطبق ایماے برخوردار مذکور بایں ترتیب تازہ کہ تاریخ ہر کار یکجا یافتہ
شود، بہ تقسیم ہفت باب بر صفحۂ یادگاری نگارم و چند مبارک بادہا کہ در فقرات
نثر ہم عدد نام مکتوب الیہ بقیۂ تاریخ ترقیم یافتہ بود، نیز دریں مجموعہ اندراج
می سازم زیرا کہ در ہر فقرہ دماغ سوزی بسیار نمودہ ام و خالی از لطف نیست
و تاریخہاے کہ تا بقیۂ حیات گفتہ شود آں ہم دریں ہر باب داخل نمودہ خواہد
شد، انشاء اللہ تعالی۔ و مراسلاتے کہ بہ فقرات ہم عدد نام بہ تحریر آمدہ بود اگر
کلیات دیگر از آں ترتیب می یافت، دفتر طویل الذیل می گردید۔ دریں مجموعہ موقع

نہ بود۔ توقع از ناظران و خوانندگان آں دارم کہ بہ نظرِ تعمق و انصاف و اصلاح ملاحظہ فرمایند و ہر ہر جا کہ مصرعہ و فقرہ و مادۂ تاریخی پسندِ خاطرِ دشوار پسند افتد، بندہ را بدعاے عافیت بخیر کہ علتِ غائی و فائدۂ ایں ہمہ ہرزہ درائی مربیک عمر ہمانست و بس، یاد آیند۔

و ایں کہ مورخان سلف بفکرِ چند ابیات بر مصرعِ تاریخ تصنیف توشیح و منقوط و غیر منقوط و مارغ سوزی و جگر کاویہا نمودہ شہرۂ آفاق گردیدہ اند و بندۂ بے استعداد بر جادۂ آں مردم باکمال قدم جسارت و سعی نزدم، وجہش ظاہر و باہر است کہ آں رجال از قدردانی امرا و سلاطینِ وقت خویش تمتع وافر برداشتہ مایۂ توکل و بفکری بقیہ عمر بدست آوردہ، از حزن و ملالِ اہل و عیال فارغ البال می بودند و دریں زمانِ قحط الرجال و کساد بازاری ہنر و کمال غیر از دردِ سر بے فائدہ و تضیعِ اوقات عمر گرامایہ نتیجۂ دیگر نا متصور، چنانچہ اگر بعضی از ماجراے قدردانی و تمناے قبولِ صلہ بخشیِ اربابِ دولِ عصر خود بر زبانِ قلم آید، باعثِ تضحیک بسواریِ خر بہ شہر شاں گردد و ایں معنی مناسب نمی نماید۔ و از جناب حضرت فردوس آرامگاہ محمد شاہ بادشاہ و شاہِ عالمگیر ثانی شہیدِ مظلوم بجلدوے دو تاریخ ہاے بدیہہ فرمایش کہ موردِ احسنت و آفریں گردیدہ بہ عطاے انعام منصب تا ہزار پانصدی و خطاب راے مورخ و راجگی سرفراز شدہ بودم، خود را لیاقتِ ایں ندیدہ مشہور بآں نساختم و صلۂ ماہوار ہزار روپیہ و فیل و خلعت و گوشوارۂ مروارید بخشیدۂ نواب صفدر جنگ در شادیِ طوے شجاع الدولہ بہادر داشت و خلعت رعایت نواب عمدۃ الملک امیر خاں بجلدوے تاریخ نہر و خانہ باغ و تالاب بگرفتم زیرا کہ از حصول نقدی ہاے بیش قرار خود و فرزندی منشی جیون رام (کذا ۔لال) آگاہ تخلص مواجب مددگاران آں ذی تحریر ریاست سرکارِ دالاحتاج بآں چیز ہا بنودم، بنا براں بہ آں صنائع مذکور فکرِ جاں فرسا نمودم، اگرچہ می توانستم چند بیت بدستورِ آں مردم موزوں کرد۔

تاریخ دانانِ خواقین در تواریخ اکبر و شاہجہان و اکثر سلاطین سلف دیدہ باشند کہ در تعریف یک یک بیت و مصرعہ و مادۂ تاریخ لفظی و معنوی یعنی تاریخے کہ دراں روز و ماہ و سال و وقت باشد و اعداد آں در شمار برابر سنہ ہجری ظاہر شود، ورقہا سیاہ کردہ اند، وازیں ہیچمداں صدہا بہتر ازاں سرانجام شدہ۔ چنانچہ در ہر ہفت باب ایں مجموعہ قلمی می گردد۔ اما صد حیف کسے بداد نرسید و قدر دانی نہ فہمید۔ بہرکیف اللہ بس باقی ہوس۔ لاحول ولا قوۃ الا باللہ۔

قطعہ

بیدار پیشِ اہلِ سخن ہرزہ گوئیم — گرچہ تمام مزخرفات است فی المثل
لیکن اگر ز دیدۂ انصاف بنگرند — گویند آفریں و بدانند بے خلل
رشکِ مورخانِ معاصر بجا بود — زیں رہ کہ من بعرصۂ ایں فن شدم مثل
جستم چو سالِ ایں ہمہ ترتیب در دلش — ہاتف ز غیب گفت "تواریخ بے بدل" (۱۱۸۱ھ)

از لفظ تواریخ حروف بدل کم کردہ باید شمرد۔

اس کے بعد کلیات ہے جو سات ابواب پر مشتمل ہے۔ ہر باب کی ابتدا میں چند تعارفی اشعار سرخ روشنائی سے لکھے ہیں۔ پہلے باب کا تعارف اس طرح کرایا ہے:

بنائے بابِ اول چوں نہادم — جہاں را از ولادت مژدہ دادم
بیا بشنو نویدِ سالِ فرزند — کز و گردد دل و جانِ تو خورسند
تامل کن بہ ہر تاریخِ ایں کار — چنیں گفتن بود بے شبہ دشوار

یعنی پہلے باب میں انھوں نے تاریخ ہائے ولادت لکھی ہیں۔ دوسرے اور تیسرے ابواب کے وہ اوراق جن پر یہ تعارفی اشعار لکھے تھے، پیشِ نظر نسخے سے غائب ہیں بقیہ اوراق موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سے ایک مذہبی تیوہاروں مثلاً عید الفطر عید الضحیٰ، ہولی، دیوالی، نوروز، سلونو وغیرہ سے متعلق تھا، دوسرا شادیوں کی تاریخوں سے متعلق۔ چوتھا باب خطاب و منصب و جنگ و فتح علالت و شفایابی کی تاریخوں کی بابت ہے، اس کا تعارف یوں کرایا گیا ہے:

باب ششم متفرق در ایجادات و واقعات دلچسپ

۱۔ تاریخ اختراعات حضرت خواجہ کوس رحمت اللہ علیہ :

(ا) تاریخ ایجاد پرتلہ و دوال : دریاب کرامت الہیت (۱۱۹۶ھ)

(ب) تاریخ ایجاد وسادہ : بداں وسادۂ آرام ہر فقیر و امیر (۱۱۷۰ھ)

(ج) تاریخ ایجاد عرشہ : شہ نشین از بہر ہر یکجا بداں (۱۱۹۹ھ)

(د) تاریخ ایجاد بازی ہوش افزا : ایں چہ بازلیست عقل و ہوش افزا (۱۱۵۵ھ)

(ح) تاریخ ایجاد حربۂ ناصری : نصرت از چوب ناصری بطلب (۱۱۵۲ھ)

۲۔ دستار بدل شدن عماد الملک با شجاع الدولہ : دیدم دو برادر ندہ ستار بدل (۱۱۷۳ھ)

۳۔ گزرانیدن جھاڑ روشنی بدرگاہ نظام الدین قدس سرہ :

ملہم غیبش بشب از روے ماہ + ساختہ روشن شجر شمع طور (۱۱۶۸ھ)

۴۔ زیارت درگاہ بہرائچ : مقصدم آنچہ بود حاصل گشت (۱۱۹۴ھ)

۵۔ دان تلاوقت کسوف ماہ برلب گنگا : مبارک باد ایں وزن تولا دان (۱۱۸۶ھ)

۶۔ تاریخات شکار شیر و فیل برائے نواب وزیر (آصف الدولہ) :

(۱) گفتا شکار گور و گوزن و پلنگ و پیل (۱۱۸۲ھ)

(۲) فیل جنگل شکار کرد وزیر (۱۱۹۱ھ)

(۳) پنج و سہ فیل مگر در گرفت (۱۱۹۱ھ)

(۴) فیل یک حلقہ بزنجیر در آورد وزیر (۱۲۰۳ھ)

(۵) پنجہ و پنج شکار شیراں (۱۲۰۳ھ)

۷۔ تاریخ کشتہ شدن فیل سر حلقہ در صحرائے بہرائچ بشکار از دست شاہزادہ جہاندار شاہ :

گفت از روے آفریں ہاتف + والی ملک پیل صحرا کشت (۱۱۹۹ھ)

۸۔ تاریخ خشک سالی و قحط عظیم : آبروے من نگہدار و خدا (۱۱۹۸ھ)

۹۔ تاریخ ہاے شنیدن مرثیۂ امام در عاشورۂ محرم اول فرمایش خواجہ باسط مرحوم :

جنت بحسین باد و لعنت بہ یزید (۱۱۶۴ھ)

(چھ سات تاریخیں اس سلسلے کی مختلف سنین کی لکھی ہیں۔ آخری ۱۱۹۸ھ کی ہے)

باب ہفتم در تاریخ ہائے رحلت

۱ - تاریخ وصالِ قطب الاقطاب شیخ محمد زبیرؒ :

بخاک زد سرِ خود آسمان و کرد ندا   کہ آفتاب بزیرِ زمیں نہاں گردید (۱۱۵۲ھ)

۲ - وصالِ امیر المحمدیین حضرت خواجہ محمد ناصر قدس سرہ :

(۱) گفت، ترحیلِ امام العارفین (۱۱۷۲ھ)

(۲) فرمود، آفتابِ جہاں قطبِ وقت بود (۱۱۷۲ھ)

(۳) قریبِ شامِ دوم ماہ شعبان (۱۱۷۲ھ)

(۴) ناصرِ دینِ محمد بود، محبوبِ خدا (۱۱۷۲ھ)

۳ - وصالِ حضرت شاہ گلشن سعد اللہ قدس سرہ :

ہاتف از اوج فلک دادش خبر   بدرِ دین و گلشنِ اسرار بود (۱۱۵۰ھ)

۴ - وصالِ اول المحمدیین حضرت خواجہ میر درد : ہائے بود آدینہ و لبست و چہارم از صفر (۱۱۹۹ھ)

۵ - تاریخ وفات میر کلو صاحب خویش حضرت درد : گشتہ مقام میر کلو بہ بہشت (۱۱۹۶ھ)

۶ - وصالِ میر سید محمد صاحب علیہ الرحمہ : دوم از ماہ جمادا لثانی و یوم الاحد (۱۱۵۴ھ)

۷ - شاہ مبارک آبرو تخلص گوالیاری :

ہاتف از دیدہ آب ریختہ گفت (۴)   آبرو بود آبروے سخن (۱۱۵۰) (۱۱۴۶ھ)

۸ - ارتحالِ فردوس آرامگاہ محمد شاہ غازی بادشاہ : ہائے رفت از جہاں محمد شاہ (۱۱۶۱ھ)

۹ - انتقالِ نواب نظام الملک : در بہشت آسود آصف جاہ، تاریخش بگفت (۱۱۶۲ھ)

۱۰ - شہادت نواب اعتماد الدولہ قمر الدین خاں : بیست و دوم روزِ آدینہ ربیع الاول است (۱۱۶۱ھ)

۱۱ - تاریخ فرزند جنگ غازی الدین خان، فرمایش میرزا جانجاناں مظہر :

بگفتا، غازیِ دنیا و دیں بود (۱۱۶۵ھ)

۱۲ - تاریخ صمصام الدولہ پسر نواب خاں دوران : حیف بست و چارم شوال بود (۱۱۶۹ھ)

۱۳ - تاریخِ نواب صفدر جنگ فرمایشِ میر لطف اللہ : جنت آرامگہِ صفدر جنگ (۱۱۶۷ھ)

۱۴- تاریخ نواب شجاع الدولہ بہادر:

ہاتف از روے الم سالش گفت مہر پنہاں بزمیں شد یہیہات (۱۱۸۸ھ)

۱۵- تاریخ شہادتِ نواب عمدۃ الملک امیر خاں: مسکنِ آلِ نبی خلد بریں (۱۱۵۹ھ)

۱۶- تاریخ حکیم علوی خاں محمد شاہی:

ہاتف از روے الم سالش گفت رفت افسوس فلاطونِ زماں (۱۱۶۱ھ)

۱۷- تاریخ رفیقۂ حیات خود (بیدار): مرا رفیقۂ ہمدم نماند صد افسوس (۱۱۷۱ھ)

۱۸- تاریخ وفاتِ رانی مہاراجہ تکیت رائے بہادر: دھام بیکنٹھ یافتہ مسکن (۱۲۰۳ھ)

بیدار واقعی بڑے پایہ کے تاریخ گو تھے۔ عموماً صاف ستھری تاریخیں بغیر کسی تعمیہ یا تخرجہ کے نکالنے کا فن انھیں بخوبی آتا تھا۔ کہیں کہیں یہ بھی کمال دکھایا ہے کہ ممدوح کی تعریف میں پورا قصیدہ کہہ گئے ہیں اور ہر مصرعے سے تاریخ نکالی ہے، یا کسی کی شان میں موقع ذیل کی مناسبت سے متعدد نثری فقرات لکھ دیے ہیں اور ہر فقرے سے تاریخ نکلتی ہے۔ اگر کہیں تعمیہ یا تخرجے سے کام لینا پڑا ہے، تو اسے بھی نہایت خوبی سے نباہا ہے۔

ان کی تاریخوں کی تواریخی اہمیت زیادہ ہے کیونکہ ان کے کلیات میں بعض ایسی اہم تاریخیں مل جاتی ہیں۔ جو کتب تواریخ میں عموماً نہیں ملتیں۔ خواجہ میر درد کے خاندان سے جو انھیں عقیدت تھی، اس کی رعایت سے خواجہ محمد ناصر عندلیب اور درد کے حالات اور کارناموں سے متعلق جو تاریخیں لکھی ہیں، وہ اُردو ادب کے طلبہ کے لیے بھی مفید ہو سکتی ہیں۔ اگر ان کی یہ کتاب ضروری حواشی کے ساتھ شائع ہو سکے، تو اردو کے مستند ماخذی ادب میں ایک اہم اضافہ ہو سکتا ہے۔

سید شہاب الدین دسنوی
مالک رام

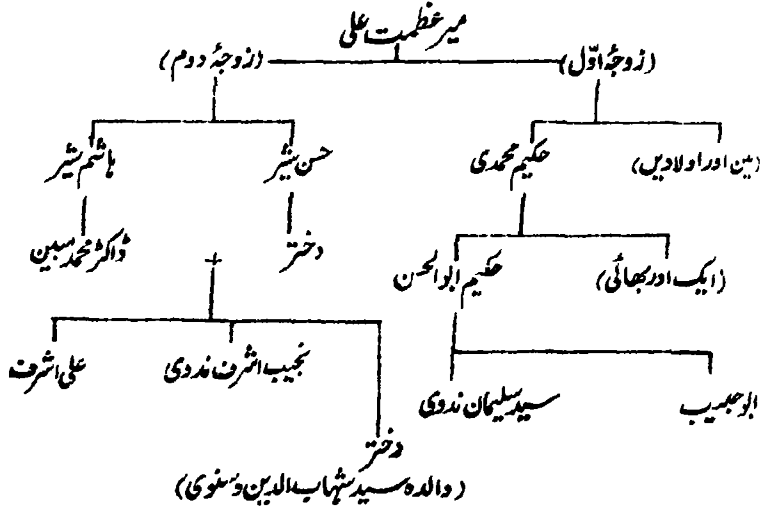
وفیات

سید نجیب اشرف ندوی - ان کے والد سید محمد مبین ولد سید محمد ہاشم شیر پیشے کے لحاظ سے ڈاکٹر تھے۔ ان کا خاندان پدری اور مادری سلسلے میں میر صدر الدین کے واسطے سے رضوی سادات کا تھا۔ بہار شریف سے تقریباً سات میل مشرق میں ایک بستی ولیسنہ نامی ہے، وہیں یہ خاندان آباد تھا۔

ڈاکٹر سید محمد مبین کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی، اس کے بعد ڈاکٹری کی تعلیم کلکتہ میڈیکل اسکول میں پائی۔ سرکاری ملازمت میں بیشتر زمانہ وسط ہندوستان (سابقاً سی پی) میں گذرا۔ وہ مدتوں ناگپور، آرموری، بھنڈارہ، بلودہ وغیرہ میں مقیم رہے۔ ۱۹۳۵ء میں ملازمت سے سبکدوش ہوکر راے پور میں مستقل سکونت اختیار کر لی اور نجی طور پر کام کرنے لگے۔ ۲۸ جولائی ۱۹۳۲ء کو اللہ کو پیارے ہوئے۔ مرحوم بلند قامت، گورے چٹے، نہایت وجیہہ آدمی تھے۔ سر سید احمد خاں جیسی لمبی سپید ڈاڑھی رکھتے تھے۔ وضعدار، شائستہ اور خوش اخلاق انسان تھے۔ ڈاکٹری کے پیشے کو جلبِ منفعت کے بجاے خدمتِ خلق کا ذریعہ سمجھتے تھے، چنانچہ سردی کے موسم میں بھی وہ باہر برآمدے میں سویا کرتے کہ کہیں ایسا نہ ہو، کوئی مریض رات کو آئے اور ملازم ان کے آرام میں خلل انداز نہ ہونے کے خیال سے انھیں بیدار نہ کرے۔ اگر کوئی مریض ایک بار گھر پر بلا تا تو اس کے دوسرے تیسرے دن خود فیس لیے بغیر اس کے گھر جاتے اور دریافت حال کرتے جہاں بھی رہے، انتہائی عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھے گئے۔ تصوف سے بھی گہرا لگاؤ

تھا اور اپنے چچا زاد بھائی (مولانا سید سلیمان ندوی کے والد ماجد) حکیم ابوالحسن کے ہاتھ پر ابوالعلائی سلسلے میں مرید تھے۔

سید سلیمان ندوی مرحوم سے رشتے کی وضاحت کے لیے شجرہ درج ذیل ہے:



ڈاکٹر محمد مبین کی سات اولادیں ہوئیں۔ ان میں سے چھوٹے بیٹے علی اشرف مرحوم کی شادی سید سلیمان ندوی مرحوم کی صاحبزادی سے ہوئی تھی۔

نجیب اشرف ندوی ۱۷ جون ۱۹۰۱ء کو آرموری (ضلع چاندہ۔ سی پی) میں پیدا ہوئے تھے۔ ابتدائی تعلیم اُردو، فارسی، عربی اپنے والد ماجد سے حاصل کی، پھر ایک مدرسے سے مراٹھی پڑھی اور مراٹھی ہی کے پرائمری اسکول میں داخل ہو کر چوتھی جماعت میں کامیاب ہوئے۔ مولانا سید سلیمان ندوی کے بھتیجے مولوی ابوظفر ندوی (مصنف تاریخ گجرات وغیرہ) کی شادی کے موقع پر ڈاکٹر سید محمد مبین صاحب بھی اپنے خاندان سمیت دیسنہ گئے، نجیب اشرف بھی ساتھ تھے۔ ان دنوں ندوۃ العلماء لکھنؤ کا بڑا چرچا تھا۔ دیسنہ کے تین طلبہ وہاں زیر تعلیم تھے، اور خود مولانا سید سلیمان وہاں مدرس تھے۔ ایک دن نجیب اشرف کو دیکھ کر انھوں نے ڈاکٹر سید محمد مبین سے کہا: "نجیب اشرف کا کوئی بڑا بھائی نہیں ہے، اور میرا کوئی چھوٹا بھائی نہیں ہے، انھیں

آپ میرے ساتھ کر دیجیے مگر ڈاکٹر صاحب نے اسی وقت فرمایا: "لے جاؤ"۔ چنانچہ ۱۹۰۹ء میں نجیب اشرف ندوۃ العلما کے دار العلوم میں داخل ہو گئے اور ساڑھے تین سال تک وہاں تعلیم حاصل کی ۔ ۱۹۱۳ء میں سید صاحب ندوہ چھوڑ کر الہلال، کلکتہ کے عملے میں چلے گئے۔ ۱۹۱۳ء ہی میں مولانا شبلی مرحوم سکتری کے عہدے سے مستعفی ہو گئے، اور طلبہ نے ہڑتال کر دی۔ نجیب اشرف بھی ندوہ چھوڑ کر پٹنہ چلے گئے، اور وہاں انگریزی تعلیم کی خاطر اینگلو سنسکرت ہائی اسکول میں داخلہ لے لیا۔ یہیں سے درجۂ اوّل میں دسویں درجے کی سند پائی اور وظیفہ بھی حاصل کیا۔ اسی طرح ۱۹۱۹ء میں انٹر میں بھی درجہ اوّل پایا۔ جب سیاسی تحریک کا آغاز ہوا تو وہ پٹنہ کالج میں بی اے کے طالب علم تھے، یہ بھی ترک موالات پر کاربند ہو کر کالج چھوڑ، گھر چلے آئے۔ اس کے بعد قومی تحریک کے سلسلے میں مختلف مقامات کا دورہ کرتے رہے۔ مولانا سید سلیمان ندوی بھی تحریک میں پیش پیش تھے، اور پنڈت موتی لال نہرو اور پنڈت جواہر لال نہرو وغیرہ ان سے بہت قربت رکھتے تھے۔ سید صاحب مولانا شبلی مرحوم کی وفات کے بعد اعظم گڑھ آ گئے تھے، اور وہاں انھوں نے دار المصنّفین قائم کر دیا تھا، نجیب اشرف کو بھی انھوں نے وہیں بلا لیا۔ یہاں انھوں نے خلافت اور کانگریس کے کام کے ساتھ ساتھ تصنیف و تالیف کا مشغلہ بھی شروع کر دیا۔ انھوں نے مہاتما گاندھی کی تصنیفات سوراج A GUIDE TO HEALTH (رہنمائے صحت) اور NON-CO-OPERATION IN OTHER COUNTRIES کا ترجمہ اسی زمانے میں کیا۔ جب سیاسی تحریک ۱۹۲۳ء میں ختم ہو گئی، تو پھر انھیں اپنی تعلیم کے مکمل کرنے کا خیال آیا، لیکن جب داخلے کے لیے پٹنہ کالج گئے، تو پرنسپل نے یہ شرط لگا دی کہ یہ توبہ نامہ لکھ کر دیں، جس سے انھوں نے انکار کر دیا۔ ان کے چھوٹے بھائی علی [illegible] اس زمانے میں کلکتے میں تھے۔ انھوں نے انھیں کلکتے بلا لیا اور وہیں کالج میں داخلہ دلا دیا۔ چنانچہ ۱۹۲۴ء میں انھوں نے بی اے (فارسی آنرز) میں فرسٹ کلاس لیا اور اس کے بعد ایم اے میں بھی یہی امتیاز قائم رکھا، اور بہت سے انعامات بھی پائے۔

تعلیم کی تکمیل کے بعد وہ مشہور مؤرخ سر جدو ناتھ سرکار کی نگرانی میں رقعات عالمگیری کی ترتیب و تدوین کا کام کرتے رہے، جو دار المصنّفین نے انھیں تفویض کیا تھا۔ ۱۹۲۶ء میں وہ

مستقلاً اعظم گڈھ چلے گئے، اور سو روپے کے قلیل معاوضے پر دارالمصنفین میں 'رفیق' کی حیثیت سے کام کرنے لگے۔

۱۹۳۰ء میں ان کی گجرات کالج، احمد آباد میں لکچرر کے عہدے پر تقرری ہوئی۔ یہاں وہ سال ایک سے زیادہ نہیں رہے، لیکن اس مختصر زمانہ میں انھوں نے قدیم اُردو کے سلسلے میں تحقیقاتی کام کیا، اسے علمی حلقوں میں بہت دلچسپی اور احترام سے دیکھا گیا۔

۱۹۳۱ء میں حکومت نے بمبئی میں اسماعیل یوسف کالج قائم کیا، تو وہ یہاں اُردو کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ اس کے بعد انھوں نے ملازمت کا پورا زمانہ اسی کالج میں گذارا، اور یہیں سے ۱۹۵۵ء میں سبکدوش ہوئے۔

مرحوم بمبئی میں 'ندوی صاحب' کے نام سے مشہور ہوئے۔ وہ بمبئی یونیورسٹی کے فیلو، اس کے مختلف بورڈوں کے رکن، ایس ایس سی بورڈ کے ممبر، ٹکسٹ بک کمیٹی کے ممبر، ہندستانی کمیٹی کے رکن کے علاوہ بیسیوں اور اداروں اور کمیٹیوں سے متعلق رہے۔

انجمن اسلام، بمبئی نے ۱۹۴۸ء میں اُردو میں پوسٹ گریجویٹ تعلیم اور ریسرچ کی غرض سے اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ قائم کیا، تو نجیب اشرف ندوی مرحوم اس کے اعزازی ڈائرکٹر مقرر ہوئے۔ جب ۱۹۵۵ء میں سرکاری ملازمت سے سبکدوش ہوئے، تو اس سے باضابطہ وابستہ ہوگئے۔ وہ آخر تک اس انسٹی ٹیوٹ میں کام کرتے رہے۔ اس کا تماہی رسالہ نوائے ادب بھی انہی کی ادارت میں نکلتا رہا۔

ندوی صاحب کی ادبی زندگی کا آغاز زمانہ (کانپور) میں ایک مضمون سے ۱۹۱۹ء میں ہوا، اس کا عنوان تھا: شیر شاہ سوری۔ دارالمصنفین سے وابستگی کے بعد انھوں نے کئی تاریخی علمی اور ادبی موضوعات سے متعلق مضمون لکھے۔ ان کے تبصرے اور بعض تنقیدی مضامین معارف اور بعض دوسرے رسالوں میں 'سنان' کے قلمی نام سے بھی شائع ہوئے۔ معارف کے ابواب 'اخبارِ علمیہ' اور 'تنقید و تبصرہ' بھی انھیں کے ذمے تھے۔ سید سلیمان ندوی مرحوم کی غیر حاضری میں وہ کبھی کبھی شذرات بھی لکھتے رہے۔ ان کی تصنیفات میں رقعات عالمگیر اور مقدمہ رقعات عالمگیر بڑی وقیع کتابیں ہیں۔ افسوس کہ زمانے کی ناسازگاری نے انہیں مقدمے

کی دوسری جلدوں کی تکمیل کا موقع نہ دیا۔ ابھی دو برس ہوئے، انھوں نے گجری زبان کی لغات مرتب کرکے شائع کی تھی۔

پچھلے دو تین برس سے ان کی تندرستی خراب رہنے لگی تھی، بلکہ جب ان کی بیوی کا انتقال ہوا، تو اس کے بعد سے وہ بجھ سے گئے تھے، لیکن اس کے باوجود ان کا چشمۂ فیض بدستور جاری رہا۔ طلبہ اور ضرورت مند حضرات ان کے پاس آتے اور روشنی حاصل کرتے۔

وہ ایک پھوڑے کے اپریشن کے لیے نرسنگ ہوم میں گئے تھے۔ اتوار، یکم ستمبر کو اپریشن ہوا، جو بظاہر بالکل کامیاب رہا۔ پیر، منگل اور بدھ تین دن بالکل ٹھیک رہے۔ جمعرات پانچ ستمبر ۱۹۶۸ء کو تقریباً بارہ بجے دوپہر انھیں انیما دیا گیا اور اسی وقت حرکت قلب بند ہو گئی۔ ان کی وفات کی خبر آناً فاناً شہر میں پھیل گئی۔ دوست اور مداح بڑی تعداد میں جمع ہو گئے۔ اسی رات وہ اپنی مرحومہ بیوی کے پہلو میں 'ارلا' کے قبرستان میں سپردِ خاک ہوئے۔ خدا مغفرت فرمائے۔

(شہاب الدین دسنوی)

شفا گوالیاری، سید محمد حسن - ان کے والد سید عوض علی طبابت کا پیشہ کرتے تھے۔ یہ خاندان دراصل قائم گنج (ضلع فرخ آباد، یوپی) کا رہنے والا تھا، جہاں سے ان کے جد امجد نقل مکان کرکے گوالیار میں جا بسے تھے۔ سید محمد حسن یہیں گوالیار میں پیر کے دن ۱۲ رمضان ۱۳۳۰ھ (۲۹ اگست ۱۹۱۲ء) کو پیدا ہوئے، تاریخی نام مظہر علی تھا جس سے ۱۳۳۰ برآمد ہوتے ہیں۔

سید عوض علی اچھے طبیب تھے، لیکن اس سے بھی زیادہ کٹر مسلمان تھے۔ وہ بیٹے کو عالم دین اور فقیہ شہر بنانا چاہتے تھے۔ چنانچہ چار برس ہی کی عمر میں یہ ایک مولوی کے سپرد کر دیے گئے اور قرآن سے تعلیم کا آغاز ہوا، اس کے بعد فارسی کا بھی اضافہ ہو گیا۔ اگر ۷ ۱۳۳ھ (۱۹۱۹ء) میں ان کے والد کا (بعمر ۵۰ سال) انتقال نہیں ہو گیا ہوتا تو یقین ہے کہ یہ عربی فارسی کے عالم بن کر کسی دینی درسگاہ میں مدرس بن جاتے، لیکن جب اس کم عمری میں والد کا سایہ

سر سے اٹھ گیا، تو ان کے بہنوئی (مولوی احمد زمان) نے انھیں اپنی نگرانی میں لے لیا۔ اس کے بعد ان کی تعلیم زیادہ باقاعدگی سے ہونے لگی۔ عربی ختم ہو گئی، اور یہ اُردو فارسی کے ساتھ انگریزی اور مراٹھی بھی پڑھنے لگے۔ اب انھوں نے میونسپل اسکول لشکر گوالیار میں داخلہ لے لیا، حتیٰ کہ دسویں درجے کی سند حاصل کر لی۔ چونکہ نجی حالات اعلیٰ تعلیم جاری رکھنے میں مانع تھے، اس لیے انھوں نے طبی سند (ایچ اے) حاصل کی اور ریاست گوالیار کی ملازمت میں داخل ہو گئے۔ تقسیم ملک تک وہ گوالیار ہی میں تھے۔ ۱۹۴۷ء میں جب یہاں کی فضا مکدّر ہو گئی، تو ہجرت کرکے بھوپال چلے گئے۔ یہاں "شفا میڈیکل ہال" کے نام سے اپنا مختصر ذاتی مطب اور دواخانہ کھولا، اور یوں عزت آبرو سے بسر کرنے لگے۔

انھیں تفکراتِ دنیا اور بڑے کنبے کی پرورش کے بار نے پریشان حال رکھا۔ جسم بھی منحنی اور اکہرا تھا، اس پر تنفس اور سُعال کے پُرانے مریض تھے۔ آنتوں کی بیماری بھی لاحق تھی اور اسی کے علاج کے لیے بھوپال کے ٹی ٹی ہسپتال میں داخل ہوئے تھے۔ منگل کے دن ۲۳ جولائی ۱۹۶۸ء کو سات بجے شام ہسپتال ہی میں انتقال ہوا۔ جنازہ اگلے دن صبح اُٹھا، اور دوپہر کے قریب قبرستان بڑے باغ میں سپردِ خاک ہوئے۔

بسمل زلالی کا قطعۂ تاریخ وفات ہے:

شستہ گو، پختہ گو، امیرِ سخن
بزمِ سیماب کا مہِ طلعت
وقت آنا تھا یہ بھی اے بسمل!
"دردِ دل دے کے ہو شفا رخصت"

مرحوم نے شاعری ۱۹۲۴ء میں شروع کی۔ ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات، بہت جلد ان کا کلام پسند کیا جانے لگا، جس سے انھیں ۱۹۳۵ء میں ایک مختصر مجموعہ "گلدستۂ شفا" کے نام سے چھاپنے کی جرأت ہوئی (شمسی پریس، گوالیار)۔ اس میں صرف ۳۲ صفحات اور ۲۳ ہی غزلیں ہیں۔

ابھی تک وہ کسی کے شاگرد نہیں ہوئے تھے، گو مشقِ سخن جاری تھی۔ بالآخر کئی

دروازوں پر دستک دینے کے بعد وہ ۱۹۴۰ء میں سیماب اکبرآبادی کے حلقۂ تلمذ میں داخل ہو گئے۔ پانچ سال بعد اپریل ۱۹۴۵ء میں استاد نے نہ صرف فارغ الاصلاح قرار دے دیا بلکہ دوسروں کے کلام پر اصلاح دینے کی اجازت بھی عطا فرمائی۔ گوالیار کا ماحول جو کچھ تھا (اور اب بھی ہے) اس میں کسی کی علمی و ادبی یا شاعرانہ صلاحیتوں کے نمایاں ہونے اور ترقی کرنے کا موقع کم ہی تھا۔ لیکن جب یہ ۱۹۴۷ء میں بھوپال منتقل ہو گئے، تو یہاں کا گردوپیش سراسر ان کے سازگار ثابت ہوا۔ شہر میں اچھے ادیبوں اور شاعروں کی بھی کمی نہیں تھی۔ ذکی وارثی (ف ۱۹۵۰ء) اور محمد یوسف قیصر بھوپالی (ف ۱۹۶۸ء) جیسے اساتذہ یہاں موجود تھے۔ شفا بھی ان حضرات کے ہاں جانے آنے لگے اور انھیں خود اعتراف تھا کہ میں نے ان سے بہت استفادہ کیا ہے۔

بھوپال ہی میں انھوں نے اپنے متعدد مجموعے شائع کیے: آیاتِ شفا (غزلیات: ۱۹۵۱ء)، نبضِ حیات (غزلیات: ۱۹۵۵ء)، شاخِ زیتون (رباعیات)، پرچمِ اُردو (رباعیات اور نظمیں)، رگِ حیات (نظمیں)، زخمِ گل (غزلیات: ۱۹۶۲ء)۔ اب بحیثیت شاعر ان کی ہر جگہ قدر ہوتی تھی۔ ان کی فنی معلومات بھی بہت وسیع تھیں، خاص طور پر عروض سے بہت اچھی واقفیت رکھتے تھے۔ ان کا حلقۂ تلمذ کوئی ۳۰۰ شاگردوں پر مشتمل ہوگا۔

اتنی معنوی اولاد کے ساتھ مرحوم دنیوی لحاظ سے بھی خوش قسمت تھے، دو بیویوں سے آٹھ بیٹے اور ایک بیٹی اپنی جسمانی یادگار چھوڑے۔

(مالک رام)

وریں بابِ چہارم گر در آئی	سرورِ جان و دل حاصل نمائی
کہ تاریخِ خطاب و منصب و فیل	ہم از خدمت وراں باشد بتفصیل
دگر از آمد و رفت و عزیمت	ز جنگ و آشتی فتح و ہزیمت
دگر سالِ شفا یابی بیمار	وریں درج است و دیگر انہ و سکار

پانچویں باب میں تعمیرات کی تاریخیں ہیں ان کا سرنامہ یوں نظم کیا ہے:

بہ بابِ پنجمیں بشنو بشارت	کہ دارد سالِ ہر قسمِ عمارت
ز باغ و نہر و حوضِ آب و تالاب	ز حمام و حویلی و پلِ آب
دگر از باولی و مسجد و چاہ	ز مجلس خانہ و در ہائے درگاہ
زخطِ خواندن و گنج نو آباد	حصار و روضۂ فرخندہ بنیاد
مکانِ ماتمِ عامِ اماین	خداوندانِ شاہنشاہِ دارین
بیا بکشا طلسمِ قفلِ ایں باب	خدارا لطف ہر تاریخ دریاب
شوم قربانِ حکمِ خواجۂ خویش	کہ تاریخاتِ ایں بیدار درویش
پسندِ خاص و عامِ ہر بلاد است	قبولِ حق شب و روزم مراد است

چھٹے باب میں چند اختراعات اور دلچسپ واقعات کی تاریخیں ہیں۔ ان کی سرخی یوں قائم کی ہے:

وریں بابِ ششم تاریخ ہر کار	دہد خوانندہ را تفریح بسیار
بیا سیرش کن اے یارِ سخن سنج	کہ ایں مجموعہ باشد بہتر از گنج

ساتویں اور آخری باب میں لوگوں کی وفات کی تاریخیں درج کی ہیں۔ اس کی سرخی یوں نظم کی ہے:

بود ایں بابِ ہفتم جائے عبرت	کہ دارد کثرتِ تاریخِ رحلت
چو ہر مخلوق را گر ذی حیات است	ز تقدیرِ خدا آخر وفات است
خوشا مردے کہ از قیدِ خودی رست	دل و جاں را بہ تسبیحِ خدا بست
بہ ایں و آں نباید بست دل را	بقائے نیست جسمِ آب و گل را
ازیں دارِ فنا ہر کس کہ بشتافت	سوئے باقی حیاتِ جاوداں یافت

الٰہی بخش توفیقے چنانم | کہ از یادت دمے غافل نمانم
بماند در جہاں تازندہ بیدار | بذکر و فکر خود یارب نگہدار

ہر باب میں متعدد تاریخیں ہیں اور ہر قطعۂ تاریخ کا عنوان نیز عددِ تاریخ سرخ روشنائی سے لکھا گیا ہے۔

اب ہر ایک باب کی خاص خاص تاریخوں کے عنوانات مع مادہ ہائے تاریخ درج کیے جاتے ہیں۔ (ان میں ہر ایک کی باقاعدہ جانچ میں نے نہیں کی ہے)۔

باب اوّل۔ (تاریخ ہائے ولادت)

۱۔ قطب الاقطاب حضرت شیخ محمد زبیر قدس اللہ سرہٗ: مخدوم زمانہ قطب الاقطاب آمد (۱۰۹۳ھ)

۲۔ حضرت امیر المحدثین خواجہ ناصر الدین محمدی: (۱) وارث علم امامین و علی (۱۱۰۵ھ)

(۲) آیت رحمت الٰہی (۱۱۰۵ھ)

۳۔ حضرت خواجہ میر، درد تخلص مدظلہ العالی: آمد بوجود نقشبند ثانی (۱۱۳۳ھ)

۴۔ حضرت محمد میر، اثر تخلص مدظلہ العالی: آمدہ نور شمع امامت (۱۱۳۸ھ)

۵۔ میاں صاحب، صاحب میر سلمہ اللہ تعالیٰ: بداں ماہ تاباں برج ولایت (۱۱۵۲ھ)

۶۔ میاں احمد میر فرزند صاحب میر، سلمہ اللہ تعالیٰ: صبحگاہ ششم از ماہ ربیع الاول (۱۱۷۰ھ)

۷۔ میر محمد حسن فرزند دوم میاں صاحب سلمہٗ: ہژدہم روز سہ شنبہ از مہ شعبان رسید (۱۱۷۲ھ)

۸۔ میر عبدالحی صاحب ولد خواجہ احمد یار خان (ابن عم حضرت خواجہ میر درد) مرحوم:

برآمد آفتاب برج حیدر (۱۱۵۸ھ)

۹۔ پسر دوم خان مرحوم: قرۃ العین علی و فاطمہ آمد، بگفت (۱۱۵۷ھ)

۱۰۔ میر عبدالقیوم پسر سویم خان موصوف: گفت، سرو گلشن امت دمید (۱۱۶۵ھ)

۱۱۔ فرزند شاہ عالم بادشاہ: زد رقم، مہر سپہر تیمور (۱۱۶۸ھ)

۱۲۔ فرزند نواب عماد الملک وزیر: بشگفت گل از حدیقۂ آصف جاہ (۱۱۶۷ھ)

۱۳۔ پسر محمد سعید خان نائب وزارت عماد الملک: یارب خلف سعید ماند ابدا (۱۱۶۷ھ)

۱۴ - فرزند نواب مہدی خاں بہادر : راحتِ جانِ اہلِ بیتِ نبی (۱۱۷۳ھ)

۱۵ - فرزندِ سید نورالحسن خان بہادر : آیتِ مصحفِ دولت مندی (۱۱۷۲ھ)

۱۶ - فرزند نواب سعادت علی خان بہادر سلمہ اللہ تعالیٰ : دمیدہ آفتابِ گیتی آرا (۱۱۸۹ھ)

۱۷ - فرزندِ سیدِ نورالحسن خان بہادر : برآمد آفتابِ عالم افروز (۱۱۹۶ھ)

۱۸ - نواب شجاع الدولہ : برآمد آفتاب از مطلعِ نور (۱۱۴۴ھ)

۱۹ - تاریخ سالگرہ نواب انتظام الدولہ خانخاناں بہادر : بادعمرت ہزار سال فزوں (۱۱۹۹ھ)

۲۰ - تاریخ سالگرہ نواب عماد الملک مقرب سلطنت : گرۂ سالِ تو یارب بود افزوں ز حساب (۱۱۷۳ھ)

۲۱ - تاریخ مکتب نشینی نواب آصف الدولہ بہادر : گفتنِ اقرا باسم ربک سالش بداں (۱۱۷۷ھ)

۲۲ - تاریخ مکتب فرزند دوم نواب شجاع الدولہ بہادر : از طفیلِ بخت از علم باد کامیاب (۱۱۷۲ھ)

۲۳ - تاریخ ختنۂ فرزند وزیر الممالک نواب آصف الدولہ بہادر : زہے برسنتِ خلیل افزود (۱۱۹۹ھ)

۲۴ - تاریخِ شادیِ میاں صاحب محمد میر اثر کہ در حویلی میر سید محمد صاحب در شب شادی

بدیہہ گفتہ بنظرِ جناب اقدس خواجۂ دین و دنیا گزرانیدہ بود : درشبِ نیک قران السعدین (۱۱۹۱ھ)

۲۵ - شادی نواب عماد الملک وزیر با دخترِ علی قلی خان فرمایش راسے اندرہ راست :

اتصالِ دو نجمِ عالم تاب (۱۱۹۶ھ)

جلوۂ مشتری بمنزلِ ماد (۱۱۹۹ھ)

۲۶ - شادی نواب آصف الدولہ با صبیۂ انتظام الدولہ : فرزود نور قمر از فر ابنۂ بادی گفت (۱۱۸۴ھ)

۲۷ - شادیِ اول کنور سنگھ فرزند راجہ ٹکیت رائے بہادر : تزویجِ دو گوہرِ دُربیش بہا (۱۱۹۷ھ)

بابِ سوم - تواریخ جلوسِ شاہاں و تواریخِ نوروز و بسنت و عید وغیرہ

۱ - جلوسِ احمد شاہ بادشاہ : آمد بشارت از غیب سلطانِ ہفت کشور (۱۱۶۱ھ)

۲ - جلوسِ شاہ عزیز الدین عالم گیر : بود رفاہ بمردم بدولتِ عالم گیر (۱۱۶۷ھ)

۳ - مسند آرائی نواب آصف الدولہ بہادر فرمایش ایلچ خاں : مسندِ دولت جاوید بیاراست

۴ - تاریخ عید الفطر و عید الضحیٰ دہم تاریخ بسنت دہولی و نوروز و دسہرہ :

روز بسنت بادہ مبارک

۵ - تاریخ بسنت برائے نواب آصف الدولہ بہادر : صد ہمایوں بود سرور بسنت (۱۱۹۹ھ)

۶ - نیز تاریخ ہولی : تماشا ہولی مبارک باد و نوروز (۱۱۹۷ھ)

۷ - عید برائے شاہ عالم بہادر شاہ : عید ہر صبح از مبارک باد گویان تو باد (۱۱۹۷ھ)

۸ - برائے عماد الملک وزیر عالمگیر ثانی : نوروز ترا بود مبارک جاوید (۹۱ . ،)

۹ - برائے احمد شاہ بادشاہ : شاہ را عید مبارک باشد (۱۱۶۱ھ)

۱۰ - برائے جناب حضرت امام العارفین امیر المحدثین خواجۂ دنیا و دین :

عید ماہ صیام باد افرخ (۱۱۵۹ھ)

۱۱ - بہ مرشد زادۂ حضرت صاحب میر مدظلہٗ : شکر خدا کہ ہاتف شایاں داب عالی

عید الضحیٰ مبارک در گوش من بفرمود (۱۱۹۶ھ)

۱۲ - برائے نواب امیر الدولہ بہادر : گفت' عید الضحیٰ مبارک باد (۱۲۰۳ھ)

باب چہارم متعلق تواریخ حصول خطاب و منصب نیز جنگ و فتوحات وغیرہ

۱ - تاریخ نظامت صوبجات دکن بہ شاہزادہ عالی جاہ : فرق اعدالیش جدا کردہ سروشم مژدہ داد

شاہ عالی جاہ بادشاہ شاہان دکن (۱۱۷۱ھ)

۲ - صوبہ داری بنگالہ نواب جعفر علی خاں نائب شاہزادہ : یافت رونق دیار بنگالہ (۱۱۷۰ھ)

۳ - صوبہ داری صوبہ اودھ بہ نواب آقتدار الدولہ : (۱) یافتہ صوبہ رونق دیگر (۱۱۸۹ھ)

(۲) صوبہ داری ترا مبارک باد (۱۱۸۹ھ)

۴ - دیوانی تن راجہ ناگر مل : شکر اللہ کہ جاں بتن آمد (۱۱۶۱ھ)

۵ - وزارت نواب آصف الدولہ : تاریخ آں وزارت ہندوستان رسید (۱۱۹۰ھ)

۶ - نیابت نواب آصف الدولہ بمختار الدولہ مرتضیٰ خاں : فزود زینت دیگر بمال و ملک وزیر (۱۱۸۹ھ)

۷ - خطاب راجگی بہ راے رایان ناگر مل : کرد ز تیغش سر حاسد جدا

گفت' مہاراجہ بجا شد خطاب (۱۱۶۷ھ)

۸ - خلعت و تاج از حضور شاہ عالم بہادر بادشاہ بہ شاہزادہ جہاندار شاہ' فرمایش

مرزا مغل و بارگہ قلی خان : ہمایوں بود تاج شاہنشہی (۱۱۹۹ھ)

تحریر

علمی مجلس دِلّی کا تماھی رسالہ

سالانہ ۱۲ روپے
ایک شمارہ: ۵ روپے مرتب مالک رام



جلد (۲)	۱۹۶۸ء	شمارہ (۴)

فہرست

مالک رام	ملاحظات	۲
احمد حسین سحر	تذکرہ بہار بےخزاں (مرتبہ نعیم احمد)	۵
ضیاء الدین ڈیسائی	بارھویں صدی ہجری کی ایک دکنی نظم	۱۴۱

ملاحظات

یہ سالِ رواں کا چوتھا اور دوسری جلد کا آخری شمارہ ہے۔ علمی حلقوں نے تحریر کا جس گرمجوشی سے خیر مقدم کیا اور جس دریا دلی سے اس کی خدمات کا اعتراف کیا، اس کا شکریہ ادا نہ کرنا کفرانِ نعمت ہوگا، لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ پرچہ ہنوز مالی پہلو سے خودکفیل نہیں ہو سکا ۔ یہ صورت حال تشویشناک ہے اور تحریر کے قدردانوں کے لیے قابلِ توجہ۔

اس شمارے میں ایک اور تذکرہ "بہارِ بیخزاں" جو آج تک غیر مطبوعہ تھا، پہلی مرتبہ مکمل شامل کیا کیا جارہا ہے۔ یہ احمد حسین سحر کی تالیف ہے اور آج تک اس کے صرف ایک بنیادی خطی نسخے کا علم ہو سکا ہے ۔

غالب کی سو سالہ برسی ۱۵ر فروری ۱۹۶۹ء کو ہوگی ۔ ۱۵ فروری سے ۲۲ر فروری تک ہفتہ بھر ملک بھر میں مختلف قسم کی تقریبیں منعقد کی جائیں گی۔ اس کے لیے راجدھانی نئی دلّی میں حکومتِ ہند کی سرپرستی میں وسیع پروگرام بنایا گیا ہے، اس موقع پر علمی مجلس کی طرف سے تقریباً تین سو صفحات کی ضخامت کا ایک مجموعۂ مضامین شائع کیا جائیگا ۔ یہ تحریر کے خریداروں کو ۱۹۶۹ء کے پہلے شمارے کی جگہ پیش ہوگا۔

مالک رام

تذکرۂ

بہارِ بےخزاں

تالیف

احمد حسین سحر

ترتیب

نعیم احمد ایم اے پی ایچ ڈی

علمی
مجلس
دِلّی

سلسلہ مطبوعات علمی مجلس (۱۷)

بہارِ بےخزاں

مصنف : احمد حسین سحر

مرتب : نعیم احمد ایم اے پی ایچ ڈی

مطبع : کوہ نور پرنٹنگ پریس دہلی ۶

سال اشاعت : ۱۹۶۸ء

ملنے کا پتہ : علمی مجلس، ۲۹۴۱ اچھتہ نواب صاحب
فراشخانہ دہلی ۶

قیمت : (مجلد) پانچ روپے

مقدّمہ

(۱)

"بہار بےخزاں" کا مصنّف احمد حسین سحر لکھنوی ہے۔ اس کے حالات کا پتہ نہیں چل سکا۔ تذکرے کے اختتام پر تاریخ تصنیف مندرج ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تذکرہ ۱۲۶۱ھ (۱۸۴۵ء) مکمل ہوا۔

سحر نے اس کے علاوہ ایک تذکرہ "طورِ معنی" کے نام سے بھی لکھا تھا۔ "طورِ معنی" میں ایران کے فارسی گو شعرا کا حال بیان کیا گیا ہے۔ "بہار بےخزاں" اور "طورِ معنی" دونوں ایک ہی جلد میں ہیں۔ "بہار بےخزاں" کے مخطوطے کا سائز ½۸ × ½۹ ہے۔ اس میں ۹۴ صفحات ہیں۔

اس تذکرے کا صرف ایک خطّی نسخہ موجود ہے۔ یہ نسخہ ندوۃ العلماء، لکھنؤ کے کتب خانے میں ہے۔ میں نے اسی نسخے کی بنیاد پر یہ متن تیار کیا ہے۔ اسی خطّی نسخے کی ایک نقل مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ میں ہے۔

سحر نے جس زمانے میں یہ تذکرہ لکھا، اسی عرصے میں درج ذیل تذکرے بھی لکھے گئے:

(۱) گلشن بےخار۔ مولفہ نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ۔ ۱۲۵۰ھ (۱۸۳۴ء)

(۲) انتخاب دواوین مولفہ امام بخش صہبائی ۱۲۶۰ھ (۱۸۴۴ء)

(۳) مدائح الشعرا مولفہ عنایت حسین خاں مہجور ۱۲۶۰ھ (۱۸۴۴ء)

(۴) گلدستۂ نازنیناں مولفہ کریم الدین ۱۲۶۱ھ (۱۸۴۵ء)

(۵) گلستانِ بےخزاں مولفہ قطب الدین باطن ۱۲۶۱ھ (۱۸۴۵ء)

(۶) خوش معرکہ زیبا مولفہ سعادت خاں ناصر ۱۲۶۲ھ (۱۸۴۶ء)

(۷) طبقات الشعرائے ہند مولفہ فیلن اور کریم الدین ۱۲۶۳ھ (۱۸۴۷ء)

(۸) سراپا سخن مولفہ محسن علی محسن ۱۲۶۹ھ (۱۸۵۳ء)

(۹) یادگار شعرا مولفہ اشپرنگر ۱۲۶۹ھ (۱۸۵۳ء)

(۱۰) گلشن ہمیشہ بہار مولفہ نصر اللہ خاں ۱۲۷۱ھ (۱۸۵۴ء)

(۱۱) گلستان سخن مولفہ قادر بخش خاں صابر ۱۲۷۱ھ (۱۸۵۴ء)

(۲) تنقیدی مطالعہ

سحر نے لکھا ہے کہ اس کا شعری مذاق نہایت نفیس تھا۔ اس کا حافظہ بھی بہت اچھا تھا۔ اس لیے اس کو بعض اچھے شاعروں کے دل پذیر اشعار یاد ہو گئے تھے۔ اس کے حافظے کے اسی خزانے نے اس کو تذکرہ لکھنے پر اکسایا۔ اس نے اس تذکرے کا نام "بہارِ بےخزاں" رکھا اور اس میں وہ تمام اشعار شامل کر دیے جو اس کے حافظے میں محفوظ تھے۔ اس کی تکمیل ۱۲۶۱ھ میں ہوئی۔

سحر اس شعر کو اچھا سمجھتا ہے جس میں لطیف معنی کی تلاش، بامزہ فکر، دل خراشی یا تازہ فکر ہو وہ کہتا ہے کہ جس شعر میں فکر تازہ کا لطف نہ ہو اسے درج کرنے سے کیا فائدہ؟ اس کا دعویٰ ہے کہ "میں نے اس تذکرے میں کوئی ایسا شعر شامل نہیں کیا جس میں کوئی لفظ دل چسپ نہ ہو یا جس کی بندش رکیک ہو"

سحر کے بہ قول "بہارِ بےخزاں" کی تالیف کا سبب شاعروں کی نغز گوئی کا اظہار اور باذوق حضرات کی تفریحِ طبع کے لیے دل پذیر اشعار کی فراہمی ہے۔ اس نے اس سلسلے میں یہ دلیل دی ہے کہ "میرے اس قول کی تصدیق کا ثبوت اس تذکرے کا ہر شعر ہے"

سحر کے اس پاکیزہ شعری ذوق نے اس تذکرے کو حقیقتاً ایک دل چسپ گل دستہ بنا دیا ہے "بہارِ بےخزاں" میں مندرجہ اشعار کے تجزیے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں کل ایک ہزار نو سو چونتیس اشعار ہیں (تذکرے کی تاریخ کے دو شعر ان کے علاوہ ہیں۔ ان اشعار کا متن سے کوئی تعلق نہیں)۔ ان اشعار کی کیفیت یہ ہے:

آتش ۴۳۴ اشعار، غالب ۱۲۰، زکی ۸۵، گویا ۷۶، مصحفی ۱۰۱، میر ۱۹۵، ناسخ ۲۰۱، مذاق ۱۷۵ گویا آٹھ شاعروں کے ۱۳۶۳ اشعار ہیں۔ اس کے علاوہ:

انشا ۱۴ اشعار، برق ۲۲، جرأت ۲۱، میر حسن ۲۰، سودا ۱۳، شہیدی ۴۲، عیشی ۴۴، مومن ۳۹ اشعار، آٹھ شاعروں کے ۲۰۹ اشعار ہیں۔ باقی ۱۳۶۴ اشعار ۱۰۰ شعرا کے ہیں۔

اس تجزیے سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ سحر کا مقصد شعرا کا حال لکھنا یا اپنے تذکرے کو شعرا کے ناموں کا مجموعہ بنانا نہیں بلکہ ایسے اشعار پیش کرنا تھا جو دل و دماغ پر ایک کیفیت

طاری کردیں۔

اس حقیقت کے باوجود سحر نے بعض شعرا کے کلام پر بڑی جچی تلی رائے دی ہے بعض جگہ اس نے انشا پردازی کا مظاہرہ بھی کیا ہے۔ ان عبارتوں سے یہ پتہ چلتا ہے کہ وہ فارسی زبان سے بخوبی واقف تھا۔ مثلاً آتش کے ترجمہ میں لکھتا ہے:

" ید بیضائے موسیِ طور سخن دانی وحسن آرائے یوسفِ مصرِ نکتہ دانی ..... جیب ودامانِ کلامش بے تصنّع ہم چو رخسار پری شمائلے است کہ از خم وپیچ طرۂ عنبر فشانش سودازدگانِ دیوانہ مزاج را وحشت آموز رسوائی ہا است .. ..."

اسی طرح مصحفی کے بارے میں:

" پیشِ بلندی رتبۂ شاعریش اوج فلک بہ منزلۂ پستی زمین است، وسلک نظم گہربارش رشکِ عقدِ ثریا وخوشۂ پروین۔ کلیم طور سینائے سخن دانی وہنگامہ گرم کن دو دمانِ معنی بودہ .... وچاشنی کلام شکر ینش بہ مذاق تلخ کاماں کام قند مکرر ساختہ ....."

میر کے کلام پر:

" تاثیر کلام قیامت نظامش تاثیرے دارد کہ ہم چو خدنگ خارا شگاف از سینہ بردن می جہد"

سحر نے کم وبیش ۳۵ شعرا کے کلام کے بارے میں اپنی رائے ظاہر کی ہے تذکرہ نگاری کی روایت کے مطابق اس نے اپنے خیالات بہت مختصر الفاظ میں پیش کیے۔ جیسا کہ اوپر تجزیہ کیا جا چکا ہے اس کے محبوب شاعروں کی تعداد صرف ۱۶ ہے۔ باقی ۱۰۰ شاعروں کے اسے چند یا ایک دو شعر پسند آگیے تھے، اس لیے ان پھولوں کو بھی اس گلدستہ میں سجا لیا گیا۔ اسی وجہ سے اسے اس نے کسی کے کلام پر نکتہ چینی نہیں کی۔ آتش اور غالب ہوں یا مصحفی و ناسخ تمام مندرج شاعروں کے کلام سے اس نے شہد اور عطر نکال لیا ہے۔ اس نے اس رد و قبول میں بڑی دقت نظر اور وسعت مطالعہ سے کام لیا ہے۔ سحر کے بیان کے مطابق:

" ..... (میں نے) سن تمیز کی ابتدا سے اب تک کلامِ موزوں کی تلاش میں

زندگی بسر کی مجھے اور اس زمانے کے اکثر شعرا سے (میری) دوستی رہی ہے
فارسی اور اُردو کے پچاس سے زائد تذکروں کا مطالعہ کیا ......"
مصحفی کے کلام کے بارے میں لکھتے ہیں :
" فقیران کے ساتویں دیوان سے جوان کی فکر کا خلاصہ ہے چند اشعار نقل
کر کے کتاب کے صفحے کو تصویر معنی کا مرقع بناتا ہے"
گویا سحر نے مصحفی کے تمام دواوین کا مطالعہ کیا تھا۔
اسی مطالعہ اور غور و فکر کی وجہ سے اس کی تنقیدی اصطلاحیں بڑی جاندار ہیں
اس نے درج ذیل اصطلاحیں استعمال کی ہیں :
دقت آفریں، نزاکت بنداں (غالب)
معنی بنداں (انشا)
شوخیٔ الفاظ، چستیٔ بندش، تازگی مضمون (انوار)
جادو بیان، بندشِ معنیٔ نازک، کلام سوز انگیز، لطافت (جرأت)
خوش فکر (جینا بیگم)
تلاشِ مضمون، بندش شعر خوش (حشر)
خوش فکر، خوش مذاق (حسین)
کلام معجز نظام (درد)
مضمون لطیف، پاکیزہ گو (دولھا)
کلام چوں گفتگوے محبوباں شیریں، اداے سخن طرازی ہم چو اداے دل فریب
ملیحاں نمکین (زکی)
زبان آرائی، سحر پردازی، خوش فکر (سلیمان شکوہ)
خوش فکر، عالی طبع (شرر)
مضامین تازہ (طور)
یکہ تازِ میدان معنی، شہ سوارِ عرصۂ سخن وری (گویا)
فکر بامزہ و موزوں (گنا بیگم)

مقدمہ بہارِ بےخزاں

مضامینِ رنگین، مضمونِ تازہ (مہر)
خوش گو (ملال)
موزوں طبع (معروف)
الفاظ شوخ، بندش چست (ناسخ)
معنی یاب (نظیر اکبرآبادی)
فکر دل نشین، سخن رنگیں (وزیر)
تلاش معنی ہائے تازہ (مذاق)
معانی لطیف (سحر)

"بہارِ بےخزاں" کی ایک اور اہم خصوصیت یہ ہے کہ سحر نے ذوق، غالب اور مومن کے تراجم اور ان کے اشعار کی نقل میں ذوق پر غالب ہی نہیں مومن کو بھی ترجیح دی ہے۔ وہ ذوق کے بارے میں لکھتا ہے:

"... ملقب بہ خاقانیٔ ہند، شاعرِ والا رتبہ، بلند پایہ گاہ، کہنہ مشق است۔ بہ استادی بادشاہِ دہلی سرمایۂ اعزاز حاصل کردہ، استادِ فن و عالی طبع است۔"

اس کے بعد ذوق کے ۱۰ اشعار

مومن کا ترجمہ:

"...... امروز بہ شاہ جہاں آباد جملہ سخن جان از گل چینانِ بہارِ معنیٔ او بودہ، صفحۂ نظم خویش بہ یمن آب یاریِ لطافتِ طبعش رشکِ گلزار می کند۔ از گل افشانی ہائے جامۂ بہارینِ رقمش مشام جانِ معنی آشنایان عطر بیز است، و بوصفِ سخن آفرینی ہائے لطافت زایش مداحان سخن طراز گہر ریز، مردم دہلی بہ استادیش افتخارہا دارند و درحقیقت مومن خان باعثِ مباہاتِ شہر و شہریان است۔

غالب کا ترجمہ:

"..... در این زمان بہ دارالخلافہ شاہ جہان آباد سکہ بہ نامش می زنند۔ در اوائل

بہ مقتضاے طبع دشوار پسند بہ طرزِ بے دل دقت آفرینی ہا در شعر کردہ د آخر
بران طریقہ پشت پا زدہ ہم چو نظیری طرزِ خاص ایجاد کردہ - دیوانے مختصر
بعد از ترتیب و تکمیل مرتب ساختہ، اشعار قابلِ انتخاب منتخب کردہ -
بہ حضورِ والا بس نزاکت بندان زانوے ادب تہ می کنند - درین زمانہ
قدرِ سخن چون آب گوہر ریختہ ....."

ان بیانات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ سحر کو ذوق کے کلام میں کوئی خوبی نظر نہیں آتی - وہ صرف ان کی کہنہ مشقی اور استادیٔ فن کا معترف ہے - اس کے برخلاف وہ مومن اور غالب کے کلام کی معنوی خصوصیات کو خراجِ تحسین پیش کرتا ہے - اس وقت ذوق کا طوطی بول رہا تھا - سحر کا ان کے کلام سے صرف دس شعر نقل کرنا اور مومن اور غالب کے اتنے زیادہ اشعار درج کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ وہ مومن اور غالب کو ان سے بڑا شاعر سمجھتا تھا۔ ۱۸۵۷ء کے بعد آزاد کی پرخلوص کوشش کے باوجود مومن اور غالب کے زندہ اور تھرکتے ہوئے اشعار کے مقابلے میں ذوق کے مصنوعی اور کاری گرانہ اشعار کا چراغ نہ جل سکا - سحر ایک ایسا تنقیدی شعور رکھتا تھا جس نے لفظی بازی گری کے اس دور میں ہی اس کو یہ عرفان بخشا تھا کہ اعلیٰ اور زندہ رہنے والی شاعری کی خصوصیات کیا ہوتی ہیں ؟

سحر نے نظیر اکبر آبادی کے کلام پر بھی عام روش سے ہٹ کر رائے دی ہے اور اسے "شاعرِ معنی یاب" قرار دیا ہے۔

میر حسن نے مثنوی "سحر البیان" میں لب و لہجہ کا جو جادو جگایا ہے سحر اس کا معترف ہے - اس نے یہ انکشاف کیا ہے کہ میر حسن نواب سردار جنگ خلف نواب سالار جنگ کی حرم سرا میں دن رات آیا جایا کرتے تھے اور ان کے خاندان کی عورتوں سے بے تکلف بات چیت کیا کرتے تھے - ان کی مثنوی کا لب و لہجہ اسی میل جول کا نتیجہ ہے -

سحر نے میر کی زندگی کے اس پہلو کو بھی بے نقاب کیا ہے جس پر بڑا دبیز پردہ پڑا ہوا تھا - میر کے دل کھونے، رسوا ہونے اور خاک اڑانے کے بارے میں کلام کے داخلی شواہد کی بنا پر اندازے لگائے جاتے رہے ہیں - سحر اس باب میں بڑی قطعی اور مستند خبر دیتا ہے - اس نے میر کو مجنون بہار حسن لیلاے دل فریبی، فرہادِ تلخ کام شیرین نوایان"

قرار دیتے ہوئے لکھا ہے :

"مشہور ہے کہ وہ اپنے شہر (اکبر آباد) میں کسی پری تمثال سے درپردہ محبت کرتے تھے۔ یہ پری تمثال ان کے اپنے ہی خاندان سے تعلق رکھتی تھی۔ آخر ان کا عشق مشک کی طرح چھپائے نہ چھپ سکا اور انھیں یہ خوف ہو گیا کہ کہیں وہ بدنام اور ان کی محبوبہ رسوا نہ ہو جائے۔ اس لیے وہ عشق کی تشہیر اور عزیزوں کی لعنت ملامت سے ڈر گیے اور اکبر آباد چھوڑ کر مختلف مقامات کو ہوتے ہوئے لکھنؤ پہنچے ۔ وہ جب تک زندہ رہے محبت کا طوق ان کی گردن میں رہا اور جنون کی زنجیر ان کے پیر میں پڑی رہی...."

(۳)

اس تذکرے کے متن کی تصحیح میں حتی المقدور کوشش کی گئی ہے۔ سحر نے مختلف شعرا کا جو کلام درج کیا تھا اس میں کاتب نے کافی ردّ و بدل کر دیا۔ بہت سے اشعار تو ناموزوں ہو گیے۔ اس لیے اشعار کی تصحیح میں کلیات و دواوین اور تذکروں سے مدد لی گئی ہے۔ سحر نے میر، آتش اور مومن وغیرہ کے چند ایسے اشعار بھی لکھے ہیں جو ان کے کلیات میں موجود نہیں۔ اس طرح اس نے ہمیں ان شاعروں کے کچھ نئے اشعار دے دیے۔

یہ تذکرہ علمی مجلس دلّی شائع کر رہی ہے۔ مجھے اس کی ترتیب کی طرف جناب نثار احمد فاروقی نے متوجہ کیا تھا اور جناب ظل عباس عباسی نے اس کی طباعت کی تمام ذمہ داریاں اٹھائیں۔ میں اپنے دونوں دوستوں کا مشکور ہوں۔

بسم الله الرحمن الرحیم
و به نستعین

تجلی افروزی‌هائے طورِ سینائے خیال به‌ثنائے اعجاز پردازی ست که دمسازان سرد نفس از یمین افضالش صبح صفاپرست دعوی دلگیری دارند و جگرکاوی‌هائے خارخار اندیشه به فکرِ مداحی ممدوحی است که کام فرسایان وادی معرفت به مراحلِ شوقِ بے پایانش آبله پا گرد دیده به سر فتاده اند و دل باختگی‌هائے مذاق معنی پرستان به عشقِ حسنِ صورت آفرینی است که خمخانه برانداز ان بے سر و پایش سررشتهٔ اختیار از دست داده دل از دنیا و مافیها برداشته اند و محشر انگیزی‌هائے ولولهٔ شوق شوریده مزاجانِ به ترانه سنجی اوصاف نغمه سنجی است که بے نوایان بے ساز سامانش صدائے آه و نالهٔ بسمل از زرا کمتر از پرده‌هائے ارغنون نه پنداشته محامد و ثنایش از حوصله و ارادهٔ قوتِ بشری بیرون است و گزیدِ سپاسِ نعمت‌هائے الوانش از طاقتِ انسانی خارج ـ از اعلیٰ ترین نعمتِ دولتِ دارینِ او یکے این است که برائے روشن گری انجمن شهود در ایجادِ خلقتِ ذاتِ خجسته صفاتِ نبی العربیِ المکی الهاشمی محمدِ نِ المصطفیٰ شافع روز جزا و حضرات ایمه و اہل بیت و خلفائے راشدین ساخته که به نور افشانیِ پرتوِ انوارِ فیوضِ ایشان بینائے خورشید عالمتاب حکم ذره گرد آلود یافته و عالمے را از ظلمت کدهٔ کفرستان به مشعل افروزی ایمان هدایت کرده صیقل گری آئینهٔ مکدر تیرهٔ درونان به دلایل و معجزات روشن تر از آفتاب ساخته

صلوٰۃ اللہ علیہ وسلم در نعت و توصیفش ناطقہ دم در گو گرہ زدہ را ماند و در ثناے وممدوت طرازی
از زبان خامۂ آشفتہ رقم بہ رنگ موئے آتش دیدہ لامحالہ دریں وادی پاے کم آوردہ وقدم
نہ گذاشتہ۔ قصہ دیگر می سنجم شکستہ دل آشفتہ سر فرق تا قدم داغ برشتہ جگر احمد حسین
متخلص بہ سحر در مذاقِ شعر طبع پریشاں ساختہ و خاطر شگفتہ و خنداں بہ حسن پرستی ہائے گل
رخاں معنی تازہ افروختہ اکثر در ایام عمر ضایع رفتہ بہ تلاش معنی ہاے لطیف پرداخت و
از فکرِ بامزۂ معنی سنجانِ نادرہ فہم سروکارے داشتہ اشعارِ دل پذیر ایشاں بہ سینہ سپرد۔ اکنوں کہ
جرعہ کشی ہائے صہبائے ایں مذاقِ منضبطہ دل گرم کردہ سرمستی آوردمی خواست کہ کتابے
بہ طورِ تذکرۂ شعراے ریختہ گویاں ترتیب دادہ دلے خالی کند، فرصت وقت دست نہ می
داد و بہ تالیف تذکرۂ فارسی ہمت مصروف داشت چوں صورتِ اختتامش حسبِ دل خواہ
جلوہ گر شد ایں تذکرہ لطیف راکہ ہمچو اشعارِ رنگینِ خود رو کش بہار است "بہارِ بیخزاں" نام نہادہ
بہ تالیفش پرداخت و ہر قدر اشعارِ شعرا کہ دمِ تحریرِ تذکرہ بہ یاد داشت داخل تذکرہ ساخت
و فصلے جداگانہ در خاتمۂ کتاب براے ذکرِ اشعارِ شعراے باقی ماندگان کہ نام و تخلص ایشاں
بلا ترتیبِ حروفِ تہجی باشد افزود۔ از تماشائیانِ ایں گلستانِ بہار فریب و از نظارگیانِ
ایں مہوشانِ غارت گرِ قرار و شکیب توقعے دارم کہ بہ چشمِ انصاف و دیدۂ حقیقت بیں و نظرِ
دشوار پسند بہ ترتیب ایں تذکرہ نگاہے کردہ و مضمونِ ہر شعرِ دل خراش او وا رسیدہ تماشا
کنند کہ ہر قدر اشعار دریں تذکرہ جمع کردہ ام خالی از لطفِ فکرِ تازہ نہ بودہ اند۔ شعرے بیکار
نوشتن چہ معنی است ؟ لفظے کہ در شعرِ دل چسپ نہ دیدہ ام و بندشِ شعر رکیک دانستہ ام
از شعر درگذشتہ تحریرش دریں اوراق کہ ہر ورقش بہ رنگِ ورقِ گل و معنی رنگین چوں بو در گل
است گوارہ نہ کردہ برعکسِ تذکرہ ہاے مبسوطِ دیگر شعرا کہ طوالت و بسط بہ جمع کلام رطب و
یابس محض بہ اظہارِ سخن طرازئ خود و بیانِ پرگوے شعر ناپسندیدہ افسانہ خوانی کردہ اند۔ ایں طرز
مطبوعِ خود نہ پنداشتہ بلکہ غایت از تالیفِ تذکرہ اظہارِ نغز گوئیِ شعرا و جمع اشعارِ دل پذیر
براے تفریحِ خاطرِ قدر شناسانِ سخن انگاشتہ براے تصدیقِ قولِ من ہر شعرِ مولفۂ ایں
کتاب دیدنی دارد۔ امید از انصاف پرستانِ معنی فہم آں ست کہ بعد از تماشاے ایں گلزارِ

تازہ بہارکہ بہ حضورش حرفِ گلشنِ خلد کہنہ فسانہ ایست و پیشِ کلامِ نمکین حسنِ ملیحانِ سبزہ رنگ بے نمک تراز خندۂ دیوانہ برائے درمانِ دردِ دل پروراین خستہ جگر بہ جنابِ چارہ سازِ دردمنداں دعاہا فرمایند کہ ہمیں آرزو است۔

آتش تخلص، خواجہ حیدر علی نام یدِ بیضائے موسیٰ طورِ سخندانی و حسن آرائے یوسفِ مصرِ نکتہ دانی است۔ نظمِ سحر پردازش فسونے بہ دلِ وارفتگانِ اداے سخن دمیدہ کہ نقدِ جان و دلِ شاں بہر نثارِ ہر لفظ و معنیش چوں متاعِ رایگاں ست و فکرِ معانیِ رنگین روکشِ فصلِ بہاری است کہ گل چینانِ گلزارِ سخن را بہر لحظہ گل ہائے تازہ نصیبِ جیب و داماں؛ کلامش بے تصنع ہمچو رخسارِ پری شمائے است کہ از خم و پیچِ طرۂ عنبر فشانش سودازدگانِ دیوانہ مزاج را وحشت آموزِ رسوائی ہا است جبینِ خورشید رخسارے از افشاں آراستہ اند کہ بہ تماشایش جگرِ ماہ پُر داغ گشتہ از بد اختران آمادہ دل برداشتگی ہا گویا آئینہ بہ دستِ خود آرائے افتادہ کہ محو آرایشِ خود است و حنا بہ دستِ شاہدے بستہ کہ پنجہ بہ دامانِ شفق می زند۔ ہر لفظے کہ از زبانِ کلکِ جادو طرازش ریختہ ناخن بہ دل می شکند و ہر شعرے کہ از فکرِ رنگینش موزوں گشتہ چارہ سازِ دردِ دل کم افتد۔ چنیں نکتہ پرداز کم کہ نازد بہ او لفظ و معنی بہم کہ فقیر نظرِ لطف و عنایت دارد۔ چند غزل از دیوانِ رشکِ گلستانش رقم زدۂ ایں سفینۂ دل آویز است ؎

حباب آسا میں دم بھرتا ہوں تیری آشنائی کا — نہایت غم ہے اس قطرے کو دریا کی جدائی کا
اسیر اے دوست تیرے عاشق و معشوق دونوں ہیں — گرفتار آہنی زنجیر کا ہے، وہ طلائی کا
دکھایا حسن سے اعجازِ موسیٰ کلکِ قدرت نے — یدِ بیضا بنایا پورِ انگشتِ حنائی کا
نہیں دیکھا ہے لیکن تجھ کو پہچانا ہے آتش نے — بجا ہے اے صنم گر تجھ کو دعویٰ ہے خدائی کا

ولہ

وحشت آگیں ہے فسانہ میری رسوائی کا — عاشقِ زار ہوں ایک آہوے صحرائی کا
مصرعۂ سرو میں لاکھوں ہی نکالوں شاخیں — باندھوں مضمون جو قدِ یار کی رعنائی کا
وہ تماشا ہے ترا حسنِ پر آشوب اے ترک — آنکھوں کی راہ سے دم نکلے تماشائی کا
اک پری کو بھی نہ شیشہ میں اتارا میں نے — یاد کیا آئے گا اس گنبدِ مینائی کا

شہر میں قافیہ پیمائی بہت کی آتش
اب ارادہ ہے مرا بادیہ پیمائی کا

ولہ

ہے جب سے دستِ یار میں ساغر شراب کا
کوڑی کا ہو گیا ہے کٹورہ گلاب کا

صیاد نے تسلیِ بلبل کے واسطے
کنجِ قفس میں حوض بھرا ہے گلاب کا

بچھوائیے نہ چاندنی میں بام پر پلنگ
منحوس ہے قران مہ و آفتاب کا

اک ترک شہسوار کی دیوانی روح ہے
زنجیر میں ہماری ہے لوہا رکاب کا

اللہ رے ہمارے تکلف شبِ وصال
روغن کے بدلے عطر جلایا گلاب کا

پاتا ہوں ناف کا کمرِ یار میں مقام
چشمہ مگر عدم میں ہے گوہر کے آب کا

ولہ

رویا کا حال یار کے آگے کہوں گا میں
یہ [illegible] لطف ہے تعبیرِ خواب کا

غنچہ کا عقدہ اس کو سمجھ تو نہ اے صبا
ٹوٹا طلسم بند جو ٹوٹا نقاب کا

کیا کیا دراز دستِ توسن جلاد نے بھرے
بوسہ لیا جو اس نے تڑپ کر رکاب کا

ولہ

آنکھوں میں میرے چاہنے والے کے داغ ہے
شبنم پسند ہووے گا حسن آفتاب کا

پروانہ سے لڑایا ہے بلبل کو رات بھر
شمعوں کو عطرِ یار نے مل کر گلاب کا

ولہ

قدِ صنم سا اگر آفریدہ ہونا تھا
نہ سروِ باغ کو اتنا کشیدہ ہونا تھا

ولہ

خانہ میں مل کے بھی ہیں اس کو نہ دشمن سمجھا
گردشِ چرخ کو اک گردشِ دامن سمجھا

چھوڑتا میرے گریباں کو نہیں دستِ جنوں
کیا یہ شب کو کسی محبوب کا دامن سمجھا

سینہ سے مثلِ چمن میں نے لگایا جو اسے
داغِ سودا کو مرا دل گلِ سوسن سمجھا

زلفیں سنبل ہیں تو پھر نرگسِ شہلا آنکھیں
جس نے دیکھا ترے مکھڑے کو وہ گلشن سمجھا

ولہ

غم نہیں گو اے فلک رتبہ ہے مجھ کو خار کا
آفتاب ایک زرد پتا ہے مرے گلزار کا

اس پری رو کے جو کوچہ کا گذرتا ہے خیال
بن کے جن سایہ لپٹتا ہے مجھے دیوار کا

بوئے گُل آتش کہیں ہوتی ہے محبوس نظر　　　افزا ہے روزِ محشر یار کے دیدار کا

ولہ

دمکتا ہے بدن کندن سا جو ہر ایک حلقے سے　　　ترے جالی کے کُرتے میں ہے عالم کا مدانی کا
رسائی غیر نے پائی کہیں قصہ نہ برپا ہو　　　مری نیند اڑ گئی ان کو شوق ہے جب سے کہانی کا

ولہ

دیدہ و دل جب سے او فرہاد یک بیں ہو گیا　　　ہم نے جس قہر کو دیکھا نفسِ شیریں ہو گیا
پھول جھڑتے ہیں ترے منہ سے جدائے شیریں دہن　　　کہ جہیں آیا تری محفل میں گلچیں ہو گیا

ولہ

تصوّر ہر نفس ہے پیشِ چشم اس روئے روشن کا　　　نگہباں برق کو میں نے کیا ہے اپنے خرمن کا
کیا قتل اس نے کہنے سے رقیبِ تیرہ باطن کے　　　رکھا گردن پہ اپنی دوست نے احسان دشمن کا
چمن کا عالم آتا ہے نظر کنجِ شہیداں میں　　　قدم بادِ بہاری ہے مرے قاتل کے توسن کا

ولہ

یہ انفعالِ گناہ سے میں آب آب ہوا　　　کہ میرا کاسۂ سر کاسۂ حباب ہوا

ولہ

حشر کو بھی دیکھنے کا اس کے ارماں رہ گیا　　　دن ہوا پر آفتاب آنکھوں سے پنہاں رہ گیا
چال ہے مجھ ناتواں کی مرغِ بسمل کی تڑپ　　　ہر قدم پر ہے یقیں یاں رہ گیا، واں رہ گیا
شامِ ہجراں صبح بھی کر کے نہ دیکھا روزِ وصل　　　سانپ کو کچلا پہ آتش گنج پنہاں رہ گیا

ولہ

تیری کاکل میں پھنسا ہے دل جوان و پیر کا　　　سیکڑوں آزاد ہے پابند اک زنجیر کا
باغ میں شب باش ہو کر لالہ رو جلوانہ شمع　　　داغ بلبل کو نہ دے دکھلا کے منہ گلگیر کا
روز و شب پیشِ نظر چشمِ سیاہِ یار ہے　　　کام لیتا ہوں تصوّر سے میں آہو گیر کا
عمر بھر مضموں طلائی رنگ کے بندھتے رہے　　　سرنوشت اپنی بھی نسخہ تھا کوئی اکسیر کا
گوشِ گل رخسار لالہ چشم نرگس سرو قد　　　باغ کا تختہ ہے یہ صفحہ تیری تصویر کا

چار ابرو میں ترے حیراں ہیں سارے خوش نویس — کس قلم کا قط ہے یہ کاتب تری تقدیر کا
اس پری رو طفل کا دیوانہ ہوں آتش جسے — کھیل ہے اک توڑنا سودائی کی زنجیر کا

ولہ

بلبل گلوں میں دیکھ کے تجھ کو بگڑ گیا — قمری کا طوق سرو کی گردن میں پڑ گیا
چیں بر جبیں نہ اے بتِ چیں رہ غرور سے — تصویر کا ہے عیب جو چہرہ بگڑ گیا
کھینچی جو میری طرح سے قمری نے آہِ سرد — جاڑے کے مارے سرو چمن میں اکڑ گیا
شیریں کے شیفتہ ہوئے پرویز و کوہ کن — شاعر ہوں میں یہ کہتا ہوں مضمون لڑ گیا
اللہ رے شوق اپنی جبیں کو خبر نہیں — اس بت کے آستانے کا پتھر رگڑ گیا
اللہ رے بانکپن ترے کشتے کا بعدِ مرگ — تختے پہ غسل کے جو لٹایا اکڑ گیا

ولہ

سبزہ بالائے ذقن دشمن ہے خلق اللہ کا — رہ روؤں کی موت ہے خس پوش ہونا چاہ کا
مایلِ معشوقۂ خسرو ہوا ہے کوہ کن — شیر کے جھوٹے کا کھانا کام ہے روباہ کا
نزع میں آیا نہ بالیں پر میری یار اس لئے — آخر ہر ماہ ہے معمول چھپنا ماہ کا
شعر کہتا ہوں میں اے آتش خدا کی حمد میں — میری ہر اک بیت میں عالم ہے بیت اللہ کا

ولہ

اگرچہ پاسِ محبت سے ترکِ شیون تھا — بہ رنگِ شمع خموشی میں حال روشن تھا
خفا ہوا جو ہوئے نیل گال بوسوں سے — چمن اداس مری جان بغیرِ سوسن تھا

ولہ

تن سے بارِ سرِ آمادۂ سودا اترا — شکر ہے خنجرِ قاتل کا تقاضا اترا

ولہ

جبکہ رسوا ہوئے انکار ہے سچ بات میں کیا — اے صنم لطف ہے پردے کی ملاقات میں کیا
کوئی اندھا ہی تجھے ماہ کہے اے خورشید — فرق ہوتا نہیں انسان سے دن رات میں کیا
ایسی اونچی بھی تو دیوار نہیں گھر کی ترے — رات اندھیری کوئی آوے گی نہ برسات میں کیا

آتش مست جو مل جائے تو پوچھوں اس سے — تو نے کیفیت اٹھائی ہے خرابات میں کیا

ولہ

دل شہیدِ رہِ داماں نہ ہوا تھا سو ہوا — ٹکڑے ٹکڑے جو گریباں نہ ہوا تھا، سو ہوا
ہو گیا دیکھ کے قاضی بھی طرفدار اس کا — بے گنہ خونِ مسلماں نہ ہوا تھا، سو ہوا
عرق آلودہ جبیں دیکھ کے دل ڈوب گیا — شبنمِ باغ سے طوفاں نہ ہوا تھا، سو ہوا

ولہ

خیال آیا جو عشقِ زلف میں دل کی تباہی کا — بندھا نکرِ رسا سے یک قلم مضموں سیاہی کا
خدا بھی خوب صورت کو نہایت دوست رکھتا ہے — ارادہ کون سے در پر کرے ہیں داد خواہی کا
فرشتوں سے لحد میں گفتگو یاں کون کرتا ہے — شہادت نامہ پڑھ لیں چار مومن کی گواہی کا
بستانِ سنگ دل کی صورت آتش کاٹے کھاتی ہے — ارادہ کنجِ عزلت میں ہے اب یادِ الٰہی کا

ولہ

کون وارفتہ نہیں تیری طرحداری کا — حوصلہ سب کو ہے یوسف کی خریداری کا
سبزہ رنگوں سے بہت تنگ ہوں بتلا اے موت — مجھ کو دروازہ تو اس گنبدِ زنگاری کا
دل میں آتا ہے گلا کاٹیے در پر اس کے — بوالہوس حوصلہ پھر کر نہ سکے یاری کا
اس نے دکھلائی مجھے صورتِ ابرِ رحمت — میں تو آتش ہوں غلام اپنی سیہ کاری کا

ولہ

کشتہ ایک عالم ہے چشمِ لعبتِ خودکام کا — استخواں میری سگ پاتے ہیں شکِ بادام کا
نشۂ مے میں ہوا بیہوش میں برگشتہ بخت — تردماغی میں مرض پیدا کیا سرسام کا
اے تپِ غم گور میں لے چل جوانی میں مجھے — دوپہر ہے موسمِ گرما میں وقت آرام کا
تختۂ میت فراقِ یار میں معراج ہے — وحی آنا جانتا ہوں موت کے پیغام کا
اے صنم عاشق سے ملتیں ہی نہیں آنکھیں تری — نشہ اللہ رے شرابِ حسن کے دو جام کا
گیسوؤں نے کر دیا دہ چند حسنِ روئے یار — نور ہوتا ہے زیادہ تر چراغِ شام کا
زخمِ کاری کے جو کھانے کو مرا دل دوڑا — ولہ — سر بکف میں طرفِ کوچۂ قاتل دوڑا

ناتوانی نے یہ حالت مری پہنچائی ہے
دو قدم بھی جو چلوں سینکڑوں منزل دوڑا

ولہ

زخم دل بھرتا ہے جلوہ چہرۂ پرنور کا
چاندنی میں یاں اثر ہے مرہم کافور کا
دیں نہ ارباب صفا ہرگز کسی کے دل کو رنج
گوشۂ دامن سے الجھا جھاڑ کب بلّور کا
تشنۂ خوں ہی گیا مجھ ناتواں کا تیر یار
گرسنہ مہمان پھر جاتا ہے بے مقدور کا
کون سے دن سینکڑوں عاشق ترے مرتے نہیں
مشک سے سوداگراں ہے آج کل کافور کا
بادہ کا دھوکا دیا اس میں پسینے نے مجھے
نافِ ساقی پر ہوا شک ساغرِ بلّور کا
یار کے دل میں کب ایسے راہ پیدا ہو سکے
آہ میں میری ہے عالم گردنِ مغرور کا

ولہ

زلفِ پیچاں سے پریشاں حالِ سنبل ہوگیا
گل ترے آگے چراغِ لالہ و گل ہوگیا

ولہ

صاف آئینے سے رخسار ہے اس دلبر کا
یہ خدا کا ہے بنایا تو وہ اسکندر کا
چرخ کے پار گذر جاتی ہے آہِ عاشق
سقف کو توڑتا ہے دود میرے مجمر کا
کیا اثر ہو مری آہوں سے بتاں کے دل میں
صدمہ کھینچے نہ رگ سنگ کہیں نشتر کا

ولہ

دردِ دل سے اس قدر کا ہیدہ میں غمگیں ہوا
جسمِ زار آخر کو تارِ بسترو بالیں ہوا
اپنے خوں کی بو ہمیں آتی ہے تجھ سے اے نسیم
ہاتھ مہندی سے کسی محبوب کا رنگیں ہوا
مرگیا سنتے ہی اس کے نالۂ مرغِ سحر
وصل کی شب مرے حق میں سورۂ یٰسین ہوا

ولہ

آنکھیں عاشق کو نہ تو اے گلِ رعنا دکھلا
پتلیوں کا کسی ناداں کو تماشا دکھلا
اے جنوں تجھ سے مری آنکھ نہ جھپکے گی کبھی
قید خانہ تو دکھایا مجھے صحرا دکھلا
باغباں کون سی صورت مرے دل لگنے کی
ایک تو مجھ کو قدِ یار سا بوٹا دکھلا
دھیان آتا ہے جو چوٹی کا کسی کافر کی
کہتی ہے زلفِ رسا باندھ کے جوڑا دکھلا

ولہ

تیرے کشتوں سے جو صورت آشنا ہو جائے گا ۔۔۔ زندگی سے دمِ مسیحا کا خفا ہو جائے گا

ولہ

رشک کے مارے زمرد خاک میں مل جائے گا ۔۔۔ سبزہ پر اس گوش کے فیروزہ ہیرا کھائے گا

ولہ

گوشت کھا کر استخواں میری نہ اے صیاد پھینک ۔۔۔ دام میں رکھ دے انہیں زندہ ہما ہاتھ آئے گا

ولہ

فریبِ حسن سے گبر و مسلماں کا چلن بگڑا ۔۔۔ خدا کی یاد بھولا شیخ بت سے برہمن بگڑا

قبائے گل کو پھاڑا جب مرا گل پیرہن بگڑا ۔۔۔ بن آئی کچھ نہ غنچے سے جو وہ غنچہ دہن بگڑا

نہیں بے وجہ ہنسنا اس قدر زخمِ شہیداں کا ۔۔۔ تری تلوار کا منہ کچھ نہ کچھ اے تیغ زن بگڑا

ارادہ میرے کھانے کا نہ اے زاغ و زغن کیجو ۔۔۔ وہ کشتہ ہوں جسے سونگھے سے کتوں کا بدن بگڑا

لگے منہ بھی چڑانے دیتے دیتے گالیاں صاحب ۔۔۔ زباں بگڑی تو بگڑی تھی خبر لیجے دہن بگڑا

اثر اکسیر کا یمن قدم سے تیرے پاتا ہے ۔۔۔ جذامی خاکِ رہ مل کر بناتے ہیں بدن بگڑا

ولہ

چمن میں شب کو جو وہ شوخ بے نقاب آیا ۔۔۔ یقین یہ گیا شبنم کو آفتاب آیا

ان انکھڑیوں میں اگر نشۂ شراب آیا ۔۔۔ سلام جھک کے کروں گا جو پھر حجاب آیا

ہماری قبر سے آوے گی یہ صدا تا حشر ۔۔۔ یہ مژدہ آیا کہ مجھ پر کوئی عذاب آیا

اسیر ہونے کا اللہ رے شوق بلبل کو ۔۔۔ جگایا نالوں سے صیاد کو جو خواب آیا

کسی کے محرمِ آبِ رواں کی یاد آئی ۔۔۔ حباب کے جو برابر کوئی حباب آیا

شبِ فراق میں مجھ کو سلانے آیا تھا ۔۔۔ جگایا میں نے جو افسانہ گو کو خواب آیا

چکورِ حسنِ مہ چاردہ کو بھول گیا ۔۔۔ مراد پر جو ترا عالمِ شباب آیا

محبتِ مے و معشوق ترک کر آتش ۔۔۔ سفید بال ہوئے موسمِ خضاب آیا

ولہ

ہنگامِ نزع محو ہوں تیرے خیال کا ۔۔۔ مشتاق ہوں فرشتۂ صاحب جمال کا

شانہ بنیں گے بعدِ فنا اپنے استخواں ۔۔۔ عقدہ کھلے گا گیسوؤں کے بال بال کا

جگر خوں پان کھا کر کر چکے لعلِ بدخشاں کا ملو مہندی جو پھیرا چاہتے ہو پنجۂ مرجاں کا
شبِ مہتاب میں منہ کھول کر وہ شوخ سوتا ہے ستارہ آج کل چمکا ہوا ہے ماہ تاباں کا
دل اس کا ہے خیالِ یار اگر تشریف فرما ہو قدم آنکھوں کے اوپر، سر کے اوپر اپنے مہماں کا

ولہ

کفش تو پہنے ہوئے روندے ہے گلشن زیرِ پا اور جوانانِ چمن کہتے ہیں دشمن زیرِ پا

ولہ

وہ نازنیں یہ نزاکت میں کچھ یگانہ ہوا جو پہنی پھولوں کی بدّھی تو دردِ شانہ ہوا
شہیدِ ناز و ادا کا ترا زمانہ ہوا اٹھایا مہندی نے دل چور کا بہانہ ہوا
شب اس کے افعی گیسو کا جو فسانہ ہوا ہوا کچھ ایسی بندھی، گُل چراغِ خانہ ہوا
بھرا ہے شیشۂ دل کو مئے محبّت سے خدا کا گھر تھا جہاں، واں شراب خانہ ہوا
ہوا جو دن تو ہوئی اس کو پاسِ رسوائی جو آئی رات تو پھر نیند کا بہانہ ہوا
نہ پوچھ حال مرا چوبِ خشکِ صحرا ہوں لگا کے آگ مجھے کارواں روانہ ہوا
خدا دراز کرے عمرِ چرخِ نیلی کو یہ بے کسوں کے مزاروں کا شامیانہ ہوا
غرورِ عشق زیادہ غرورِ حسن سے ہے اِدھر تو آنکھ پھری، دم اُدھر روانہ ہوا

ولہ

عشق رکھتے تھے ہم ایک نیمچۂ ابرو کا صورتِ زخم نہ ہوتا دمِ آخر

ولہ

ذکرِ گل آیا تھا گلشن میں جو اس مہ رو کا حسن بے ساختہ دیکھا جو اس گل رو کا

ولہ

عالمِ منطق مصوّر ہو تری تصویر کا منہ کتابی، قطبی ہے خط، حاشیہ ہے میر کا
ہر شبِ آدینہ آتا ہے وہ طفلِ شمع رو اپنا تعویذِ لحد بھی نقش ہے تسخیر کا
رتبہ پہنچا ہے خموشی سے یہ مجھ دلگیر کا جو کوئی دیکھے اسے شک ہو گئی تصویر کا
ہجر کے صدمے سے خوبی عشق کی ظاہر ہوئی زخم کے جوہر سے جوہر کھل گیا شمشیر کا

کیسی کیسی صورتوں کے اپنے دل میں نقش ہیں — اس مرقع میں بھی ہے کیا کیا ورق تصویر کا
روک منھ پر وار قاتل کا سپر کی طرح سے — مرد کے چہرے کا زیور زخم ہے شمشیر کا
رتبۂ موسیٰ نمازِ پنج گانہ نے دیا — پانچ وقت اللہ سے موقع رہا تقریر کا

ولہ

سودائی ہے جو تیرے خطِ سبزہ رنگ کا — رہتا ہے اُس کو آٹھ پہر نشہ بنگ کا
دریائے حسن چہرہ ہے اس شوخ شنگ کا — مژگاں نہیں ہے آرہ ہے پشتِ نہنگ کا
ہشیاری رنج دیتی ہے قیدِ فرنگ کا — دیوانگی نشانہ بناتی ہے سنگ کا
کلمہ پڑھیں گے دونوں میری خانہ جنگ کا — زاغ ہو اس میں کہ طوطا تفنگ کا
رخسار صاف چاہیے نظارے کے لیے — آئینہ ہو حلب کا دیا ہو فرنگ کا
بعدِ فنا بھی رنگِ طبیعت نہ جائیگا — تربت سے میری پیڑا اوگے گا پتنگ کا

ولہ

فصدوں سے تو سودا نہ گیا حسنِ بتاں کا — دانتوں سے مگر کاٹنا باقی ہے زباں کا
تشبیہ نہ دوں ترے گیسوے رسا کو — اترا ہوا چلّہ کہوں ابرو کی کماں کا
لہرا کے نہ اُلجھے مژۂ یار سے گیسو — سوزن نہیں دے سکتی ہے زنجیر کا ٹانکا
ایک آبلہ پک پک کے خموشی سے ہوئی ہے — کیا شعر کہوں قافیہ ہے تنگ زباں کا
تفتیش جو کرتے ہیں مری حالتِ دل کی — در پردہ پتہ پوچھتے ہیں تیرے مکاں کا
پیری میں جوانی کے کہاں چہچہے آتش — اب اپنی غزل خوانی ہے غل برگِ خزاں کا

ولہ

پیری میں مجھ کو عشقِ حسین جواں ہوا — بارِ دگر کبادہ میں زورِ کماں ہوا
خوش چشموں کے فراق میں کھایا یہ پیچ و تاب — شاخِ غزال اپنا ہر ایک استخواں ہوا
انصاف میں نے عالمِ اسباب میں کیا — بنوائی چاندنی جو میسّر کتاں ہوا

ولہ

بلائے جاں مجھے ہر ایک خوش جمال ہوا — چھری جو تیز ہوئی پہلے میں حلال ہوا

وصیان آیا ہے جو اس خورشید رُو کا خواب میں
تر ہوا ہوں میں پسینے میں شب مہتاب میں

آج تک حالِ دلِ بے تاب سے واقف نہیں
یار کو جھنکواؤں گا ایک دن چہ سیماب میں

ولہ

مرے دل کو شوقِ فغاں نہیں، مرے لب تک آتی دعا نہیں
وہ دہن ہوں جس میں زباں نہیں، وہ جرس ہوں جس میں صدا نہیں

ولہ

چاند سے منھ کو ترے یاد کیا کرتے ہیں
شبِ مہتاب میں فریاد کیا کرتے ہیں

صاحبِ حسن وہ صانع نے بنایا ہے تجھے
حسرتِ بندگی آزاد کیا کرتے ہیں

ولہ

اُلجھا ہے دل بتوں کے گیسوئے پُرشکن میں
اُگتی ہے جائے سبزہ کنگھی مرے چمن میں

شیریں زباں ہوئی ہے فرہاد کے دہن میں
لیلیٰ پکارتی ہے مجنوں کے پیرہن میں

عطرِ گلاب مل کر حلقہ میں یار بیٹھا
بلبل پکڑنے آیا صیّاد انجمن میں

آیا تھا بُلبلوں کی تدبیر میں، گلوں نے
ہنس ہنس کے مار ڈالا صیّاد کو چمن میں

دو روزہ ہے یہ لُطفِ عیش و نشاطِ دُنیا
بوئے شبِ عروسی مہماں ہے پیرہن میں

بازارِ مصر میں چل یوسف کا سامنا کر
کھوٹے کھرے کا پردہ کُھل جائیگا چلن میں

بعدِ فنا رہے گا علم اپنا اپنے ہمرہ
مضمونِ مردہ ہم کو یاد آئے گا کفن میں

سنبل سے بال اس نے جس روز سے بڑھائے
کنگھی دوا کی خاطر ملنے لگی چمن میں

ولہ

خدا بخشے، صنم یہ کہہ کے مجھ کو یاد کرتے ہیں
دعائے مغفرت میرے لیے جلّاد کرتے ہیں

خدا جانے یہ آرائش کرے گی قتل کس کس کو
طلب ہوتا ہے شانہ، آئینے کو یاد کرتے ہیں

خیالِ خط خیالِ بوسہ میں ہرگز نہیں رہتا
عبارت بھول جاتے ہیں جو مطلب یاد کرتے ہیں

کڑے پن کو ہماری خاکساری نے کیا زائل
وہ جوہر ہے یہ جس سے کشتۂ فولاد کرتے ہیں

عجب نعمت عطا کی ہے خدا نے اہلِ غربت کو
عجب یہ لوگ ہیں غم کھا کے دل کو شاد کرتے ہیں

ولہ

صدمے پہنچے ہیں ہمارے بازوؤں پر سیکڑوں
گم ہوئے ہیں اپنے یوسف سے برادر سیکڑوں

وہ رگِ سودا ہوں میں دستِ جنوں کے درمیاں
ٹوٹ کر رہ گئے ہیں جس میں نشتر سیکڑوں

ولہ

تیری خوش چشمی کا افسانہ سناتا ہوں میں
خوابِ خرگوش سے آہو کو جگاتا ہوں میں

ساقیا جام کو اللہ سلامت رکھے
یہ قدح میرا ہے، خیر اس کی مناتا ہوں میں

ولہ

گیسوؤں کا ترے سودا، شعرا رکھتے ہیں
یہی باعث ہے جو یہ فکرِ رسا رکھتے ہیں

دہنِ یار کو ہم تو نہ کہیں جوہرِ فرد
منطقی اس میں جو حجت کریں جا رکھتے ہیں

ولہ

مزا تجھ بن ہوا ہے تلخ عیش و زندگانی کا
ہوا لبریز مے سے جام میری زندگانی کا

جگر بھنتا ہے یک سو، یک طرف کو زخم پکتے ہیں
تردد خانۂ دل میں ہے غم کی مہمانی کا

دہانِ زخمِ دل کے قہقہے منظور ہیں آتش
تصور ہے مجھے کس کے لباسِ ارغوانی کا

ولہ

مرے اشکوں سے فلک تک موجزن سیلاب تھا
ہالۂ مہ کی جگہ حلقۂ گرداب تھا

شب چمن میں کیں کفِ پا سے یہ نور افشانیاں
جو ترا نقشِ قدم تھا، سو گلِ مہتاب تھا

بزم میں تجھ بن جو پاسِ پوشی تھا مجھے
مثلِ رنگِ گل رواں اشکوں سے خونناب تھا

ایک جھٹکے میں جدا حلقے سے حلقہ ہو گیا
جوشِ وحشت، خانۂ زنجیر کو سیلاب تھا

ل کہیں دیکھا نہ میں نے داغِ حسرت کے سوا
میرے اشکوں سے مگر داغِ جہاں شاداب تھا

بح کرنے میں مرے آتش ہوا قاتل کو رنج
پنجۂ نازک میں اس کے خنجرِ بے آب تھا

ولہ

تی جو اے صنم ترے سیبِ ذقن کی شاخ
بڑھ چل نہ سکتی ایک نہالِ چمن کی شاخ

خالِ عنبریں ہے وہ ایک مشکِ نافہ ہے
آنکھیں تری ہرن ہیں بھویں ہیں ہرن کی شاخ

ولہ

تصور سے کسی کے میں نے کی گفتگو برسوں
رہی ہے ایک تصویرِ خیالی روبرو برسوں
چمن میں جا کے بھولے سے خیالِ غنچہ کرا ہا تھا
کیا کی گل سے بلبل، حیلۂ دردِ گلو برسوں

ولہ

بلبل کو خار خارِ دبستاں ہے ان دنوں
ہر طفل کی بغل میں گلستاں ہے ان دنوں
کافر ہو اے صنم جو خریدے نہ تو اسے
مہندی کے مول، خونِ مسلماں ہے ان دنوں

ولہ

دین و دنیا تجھے حاصل ہے جو منظور ہے ہاں
یہاں پری ہے تیری خدمت کے لیئے حور ہے ہاں

ولہ

شرف بخشا گہر کو صرف کر کے تو نے زیور میں
نگیں کو نام نے تیرے بٹھایا خانۂ زر میں
یہ کیفیت اسے ملتی ہے، ہو جس کے مقدر میں
مئے الفت، نہ خم میں ہے، نہ شیشے میں، نہ ساغر میں
رہا کرتا ہے نظمِ شعر کا سودا مرے سر میں
عروسِ فکر ان روز دل لدی رہتی ہے زیور میں
کریں گے سیر شب کو کیمیا گر تیرے کوچے میں
بھگوویں گے فتیلے روغنِ گو گردِ احمر میں
نکل کر کنجِ عزلت سے کرے ہنگامہ افروزی
شرر یاقوت کا ہم سنگ ہے جب تک ہے پتھر میں
تفنگِ یار کے چھرّوں کی عالم کو تمنا ہے
یہ لوہے کے چنے ہیں دیکھیے کس کے مقدر میں

ولہ

بہار آئی ہے عالم ہے گل و نسرین و سوسن پر
جوانانِ چمن نازاں ہیں اپنے اپنے جوبن پر
کریں گے اس سے صید ایک نہ ہائے تیغِ قاتل کو
رگوں کا جال یاں پھیلا ہوا ہے اپنی گردن پر
دکھائی دخترِ رز نے یہ مے خانے میں نیرنگی
دُمِ طاؤس کا عالم ہوا مینا کی گردن پر
ادب آموز ہے ہر ایک ذرہ اپنی وادی کا
نہیں ممکن کہ گرد اڑ کر پڑے رہ رو کے دامن پر
سیہ چشم اکثر آتے ہیں تماشا دیکھنے اس کا
کمندِ آہوئے شہری ہے سبزہ اپنے مدفن پر
نقاب الٹے جو تو رخسارِ آتش رنگ سے اپنے
پرِ پروانہ سے آلے چلیں شمعوں کی گردن پر
فنا ہو کر بھی چھوٹے گی نہ خوں نظارہ بازی کی
ہماری خاک کے ذرّے کریں گے قبضہ روزن پر

جنوں لے چل بیاباں کو، میں باز آیا گلستاں سے — خوش آتی کس کو ہے چشمک زنی نرگس کی سوسن پر
عروجِ حسنِ بازاری، پسند دل نہیں ہوتا — مجرد ہوں مگر رغبت نہیں، قحبہ کے جوبن پر
ہر اک مصرعہ میں یہاں مضموں ہے آتش دود داری کا — ہمارے شعر کا انصاف ہے، انصافِ دشمن پر

ولہ

نہیں جو روز و شب و ماہ و سال سے واقف — وہی ہے خوب زمانے کے حال، سے واقف
خدا کرے نہ تمہیں میرے حال سے واقف — نہ ہو مزاجِ مبارک ملال سے واقف
قلم نے چہرۂ حسینوں کے لوح پر لکھ کر — کچہریوں کو کیا خط و خال سے واقف
نہ ہوتا تل ترے رخ پر نہ اے صنم ہوتا — بلال کعبے سے، کعبہ بلال سے واقف

ولہ

ستم اس بت کی پگڑی کا ہے ہر پیچ — غضب اللہ کا اس پر ہے سر پیچ

ولہ

پھیلائے پانو سوتا ہے، عاشق کا ڈر نہیں — بارہ برس کا سن ہے ابھی کچھ خبر نہیں

ولہ

ملکِ دل میں جہاں پناہ ہو تم[1] — خوب صورت ہو، بادشاہ ہو تم

ولہ

خاک میں مل کے بھی ہوں گا نہ غبارِ دامن — کمر یار سے اٹھتا نہیں بارِ دامن

ولہ

بیدِ مجنوں دور سے خم ہو گیا تسلیم کو — سر گیا سرو قد اٹھا مری تعظیم کو
شانۂ گیسوے جاناں میں صفا حاصل ہوئی — آئینہ حاضر ہے ناز و غمزہ کی تعلیم کو

ولہ

سرمہ منظورِ نظر ٹھیرا ہے چشمِ یار کو — نیلگوں گنڈا پنہایا مردمِ بیمار کو
حسنِ بے پردہ کا عالم جلوہ گر پاتا ہوں میں — دم پھڑک جاتا ہے عریاں دیکھ کر تلوار کو
بھول جاتے عالم اپنی چال کا طاؤس مست — نشۂ مے میں اگر دیکھے تری رفتار کو

[1] مطبوعہ دیوان میں: ع غیرتِ مہر رشکِ ماہ ہو تم

بوٹیاں اپنے کفِ پاکی جو صحرا میں اُٹھیں — رتبۂ سیخ کباب آتش ملا ہر خار کو

ولہ

چشمِ بیمار کا یارب کوئی بیمار نہ ہو — زلف کے جال میں دشمن بھی گرفتار نہ ہو
حسن تکلیفِ لبِ بام اسے کرتا ہے — شرم سمجھاتی ہے سایہ پسِ دیوار نہ ہو

ولہ

ترے سوا کوئی ترکیب دل پسند نہ ہو — جو برقِ طور بھی چمکے تو آنکھ بند نہ ہو
زیادہ بوت سے دشنام میں حلاوت ہے — وہ زہر ہے یہ کہ جس سے لذیذ قند نہ ہو
برابر اس کے کھڑا ہو کے سرو اکڑتا ہے — الٰہی قد بھی کسی کا بہت بلند نہ ہو
زباں وہ گنگ ہو جس سے نہ آفریں نکلے — وہ گوش کر ہو جو آتش سخن پسند نہ ہو

ولہ

کھائے گا خنجرِ جلاد کا جر کا پہلو — زخمِ پہلو کو مبارک ہو جگر کا پہلو
ہدفِ تیرِ نگہ ہیں جگر و دل دونوں — دیکھیے ہووے اب آباد کدھر کا پہلو
نالۂ صبح شبِ وصل دلاتا ہے یاد — خالی ہوتا ہے مگر مرغِ سحر کا پہلو

ولہ

رشکِ آئینہ ہے اس رشکِ قمر کا پہلو — نظر آتا ہے اِدھر صاف، اُدھر کا پہلو
بڑھ چلا لاکھ قدِ یار کی موزونی سے — مصرعِ سرو میں نکلا نہ کمر کا پہلو
زخم کاری ہے مری جان جدائی تیری — دل نکل جائے گا، پہلو سے جو سرکا پہلو
یاد آتا ہے تِل اس سیبِ زنخداں کا مجھے — نظر آجاتا ہے داغی جو ثمر کا پہلو

ولہ

سامنے آنکھوں کے پہروں ہی بٹھایا یار کو — مال مارا ہم نے، لوٹا دولتِ دیدار کو
کیا ہوا نادم دکھا کر آئینہ میں یار کو — تپ چڑھ آئی، دیکھ اپنی نرگسِ بیمار کو
وقتِ آخر عشقِ پنہاں یار پر ظاہر ہوا — نزع میں عیسیٰ نے پہچانا مرے آزار کو
دستِ قدرت نے بنایا حسن کا مجھ کو گدا — آنکھوں کے کاسے دیئے دریوزۂ دیدار کو

چہرۂ رنگین کی دکھلائی تصور نے بہار
بند آنکھوں کو کیا، کھولا درِ گلزار کو

روگ سے الفت کے دق اور سل کو کچھ نسبت نہیں
درجۂ اوّل میں آخر کرتا ہے بیمار کو

حسن کے جلوے سے روشن ہوں گے آنکھوں کے چراغ
کورِ مادرزاد دیکھیں گے ترے دیدار کو

پھر گیا آنکھوں میں آتش، گورِ تیرہ کا گڑھا
خاک اڑائی میں نے، جب سوچا مآلِ کار کو

ولہ

دلایا یاد شب اس نے جو تیری ساقِ سیمیں کو
رلایا صبح تک ہنس ہنس کے میں نے شمعِ بالیں کو

ہزار افسوس ہے اے بے مروّت تو نہیں آتا
غش آجاتا ہے اکثر، ترے بیماروں کی تسکیں کو

تماشا دیکھتا ہوں گھر میں بیٹھے ہفت کشور کا
بنایا ہے مرا دل توڑ کے جامِ جہاں بیں کو

ولہ

یارب آغازِ محبت کا یہ خیر انجام ہو
شیشہ میں اترے پری پختہ جنوں کا خام ہو

چال وہ چلتے ہو دل پستے ہیں جس پر ہر قدم
کام وہ کرتے ہو جس میں نہ کسی [illegible] کام ہو

کچھ تکلّف چاہیے، دولت سرائے یار میں
نقرئی دیوار و درہو و بن، طلائی بام ہو

ولہ

بے قراری میں مری، یار اثر پیدا ہو
سر کو دیوار سے ٹکراؤں تو در پیدا ہو

جوہرِ پاک سے پاکیزہ گہر پیدا ہو
صلبِ یعقوب سے یوسف سا پسر پیدا ہو

میرے اشعار گل اندام پڑھیں اے آتش
فکرِ رنگیں میں مری، رنگِ اثر پیدا ہو

ولہ

خوشا وہ دل کہ ہو جس دل میں آرزو تیری
خوشا دماغ جسے تازہ رکھے بو تیری

شبِ فراق میں اک دم نہیں قرار آیا
خدا گواہ ہے، شاہد ہے آرزو تیری

دماغ اپنا بھی اے گل بدن معطر ہے
صبا ہی کے نہیں حصّے میں مشک بو تیری

شبِ فراق میں اے روزِ وصل تادمِ صبح
چراغ ہاتھ میں ہے اور جستجو تیری

یہ چاک جیب کے حق میں دعائے مجنوں ہے
نہ ہو وہ دن کہ درستی کرے رفو تیری

جو ابر گریہ کناں ہے تو برق خندہ زناں
کسی میں خو ہے مری اور کسی میں خو تیری

وہ گل ہوں میں کہ ترا رنگ جس سے ظاہر ہے
وہ غنچہ ہوں کہ بغل میں ہے جس کی بو تیری

زمانے میں کوئی تجھ سا نہیں ہے سیف زباں
رہے گی معرکے میں آتش آبرو تیری

ولہ

دیکھتا ہوں حسن کے عالم کو میں زیور کے ساتھ
مجھ کو بھاتی ہے بناگوشِ صنم گوہر کے ساتھ

سبزۂ خط کو دکھا کر تو نے مارا ہے جنہیں
حشر ان لوگوں کا ہوگا خضرِ پیغمبر کے ساتھ

پر کترتا ہے میرے صیاد تو کاٹ اس طرح
حسرتِ پرواز بھی اڑ جائے بال و پر کے ساتھ

اس قدر شیریں دہن لے دلربا ہوتا نہیں
شیر دایہ نے پلایا ہے تجھے شکر کے ساتھ

جس قدر نفرت ہے اس سے مجھ توکل پیشہ کو
اس قدر ہوگی نہ قاروں کو محبت زر کے ساتھ

ولہ

مجھ سے ہر بات میں قرآن وہ اٹھواتا ہے
گردنِ یار میں شاید ہے حمائل بھاری

ہم رہِ غیر گیا چاندنی میں سیر کو یار
ہو گیا مجھ کو ستارہ، مہِ کامل بھاری

آتش ان سے نہیں نظارے کا لپکا چھٹتا
میری آنکھوں کو ہے شاید کہ مرا دل بھاری

ولہ

رشکِ پنجۂ مرجاں، پنجۂ حنائی ہے
صاف ہیرے کی ترشی یار کی کلائی ہے

ولہ

مہندی سے اس کے ہاتھوں کی گل دست (کذا) گیا ہے
چوٹی کے پیچ پیچ سے سنبل سسک گیا ہے

لبریز کر پیالے کو ساقی اس ابر میں
افیوں نہ سنگ ہو کے کوئی مے پرست گیا ہے (کذا)

ولہ

پیمبر میں نہیں عاشق ہوں جانی
سنی ہے موسیٰ ہی سے یہ لن ترانی

وہ خط ہے یادگارِ حسنِ رفتہ
وہ سبزہ ہے گلستاں کی نشانی

لیے ہیں بوسۂ رخسارۂ صاف
پیا ہے ہم نے آئینے کا پانی

سلاتی ہے دل آتش طور کی طرح
کسی پردہ نشیں کی لن ترانی

بے رخِ یار مجھے جان سے بیزاری تھی
ولہ
چاندنی رات نہ تھی گور کی اندھیاری تھی

بوسۂ لعلِ لبِ یار کی حسرت ہی رہی — یا نکلتی ہی نہیں یا تو وہ بیزاری تھی
چھوٹ کر عشق کے پھندے سے ہوں تنگ اے آتش — مجھ کو آزادی سے بہتر وہ گرفتاری تھی

ولہ

اگر آپ سے اپنی کارروائی ہوتی — آبِ آئینہ سے دیوار گرائی ہوتی
پنڈلیوں تک تری چوٹی کی رسائی ہوتی — کل جو آنی تھی بلا آج ہی آئی ہوتی
تم نے آئینے سے گر آنکھ لڑائی ہوتی — رات بھر میری طرح نیند نہ آئی ہوتی
آستیں سے تری باہر جو کلائی ہوتی — شمع فانوس کے باہر نکل آئی ہوتی
تارِ سنبل کوئی کہتا ہے، رگِ گل کوئی — کمرِ یار جو ہوتی تو دکھائی ہوتی
بزمِ رنگیں میں تری سبز قدم رہنے نہ پائیں — گھاس اکھڑتی جو چمن کی تو صفائی ہوتی
ان عذاروں کی جو پاتی یہ صباحت آتش — یاسمیں باغ میں پھولی نہ سمائی ہوتی

ولہ

کوئے جاناں چمن سے بہتر ہے — اس کا کتا ہرن سے بہتر ہے
بازو اس کا مکانِ شکم اس کا — دھکدھی نورتن سے بہتر ہے
ہنسنے والا نہیں ہے روتے پر — ہم کو غربت وطن سے بہتر ہے
مانگئے کیا خدا سے چشمۂ خضر — کیا صنم کے دہن سے بہتر ہے

ولہ

تصویر کھینچی اس کے رخِ سرخ فام کی — یک صفحہ میں قلم نے گلستاں تمام کی
اللہ رے تکلفِ ساقی بہار میں — شیشے کی گلابیاں ہیں مرصع کے کام کی
سر لوٹے محتسب کا جو اس میکدے میں آئے — جامِ آتشیں صراحی ہے سنگاب رخام کی
اصلاح لینے آتے ہیں رنگیں خیال لوگ — خدمت ہے اس چمن میں مجھے انتظام کی
اللہ رے پھڑکنا اسیرانِ تازہ کا — صیاد خیر مانگتا ہے اپنے دام کی
استادہ دیکھتا ہوں گلستاں میں سرو کو — آزادی سے بھی خو نہیں بدلی غلام کی
فرقت کی شب میں گرمی ہے روزِ قیام کی — مُردوں کی نیند نالوں نے میرے حرام کی

گذرا مجاز سے تو حقیقت کھلی مجھے
قرآں کا سامنا تھا جو ابجد تمام کی

ولہ

آتشِ نالۂ بلبل سے دھواں ہوتا ہے
سیرِ گلزار سے مجھ کو خفقاں ہوتا ہے

حسن کو داغ لگا دے گی یہ سیرِ گلزار
آپ پر حورِ بہشتی کا گماں ہوتا ہے

ولہ

چمن کا رنگ تجھ بن اپنی آنکھوں میں مبدّل ہے
چراغِ لالہ چشمِ غول ہے، گلزار جنگل ہے

ہزاروں حسرتوں کے روز و شب ہوتے ہیں خوں اس میں
نہیں معلوم دل ہے یا مرے پہلو میں مقتل ہے

بنایا ہے اسے شاید کہ دودِ روغنِ گل سے
ہزاروں گل کھلاتا یار کی آنکھوں کا کاجل ہے

جو روتا ہوں تو دو دو دن مرے آنسو نہیں تھمتے
بجرمِ یاس سے ابرِ مژہ ساون کا بادل ہے

وہی عالم ہے اب تک خاکسارانِ محبت کا
وہی نقشِ قدم کی خاک پیشانی کا صندل ہے

بہار آئی ہے ہنگامِ جنوں ہے کپڑے پھٹتے ہیں
مسلسل ہوں میں دیوانہ، درِ زنداں مقفل ہے

ولہ

زاہد فریفتہ ہیں مرے نونہال کے
عاشق بزرگ دل ہیں اس خورد سال کے

ہر شب، شبِ برات ہے، ہر روز، روزِ عید
سوتا ہوں ہاتھ گردنِ مینا میں ڈال کے

شان و شکوہ نے ہمیں برباد کر دیا
مثلِ حباب اُڑ گئے خیمہ نکال کے

ولہ

تنگ دنیا کے خرابے میں ہوں نازک خو سے
دردِ سر ہونے لگا فاختہ کی کوکو سے

لبِ جاں بخش سے ہے چشمِ فسوں گر کا سوال
زندہ اعجاز سے ہو جائے جو مرے جادو سے

غسل کرنے یہیں دریا میں نہانے کو نہ جا
مچھلیاں لپٹیں گی اے یار ترے بازو سے

ولہ

شہرۂ آفاق مجھ سا کون سا دیوانہ ہے
ہند میں میں ہوں پرستاں میں مرا افسانہ ہے

بیچتا ہوں دل کو جو محبوب چاہے مول لے
بوسہ قیمت ہے توجہ کی نظر بیعانہ ہے

عالتِ آئینہ رکھتا ہے صفا سے دل مرا
آشنا سے آشنا، بے گانے سے بے گانہ ہے

اب نہیں اے یار جوبن کو ترے بیم زوال
خطِ مشکیں حسن کی جاگیر کا پروانہ ہے

ولہ

آتی ہے کس کے گیسوئے عنبر شمیم سے
گلزار ہو رہے ہیں معطر نسیم سے
بیدار بخت ہوں میں وہ موذن ہیرے لیے
آتی ہے حور خواب میں باغِ نعیم سے
کشمیری طوسی لے گئے آکر دوشالہ باف
کچھ پشم جھڑ گئے تھے ہمارے گلیم سے
کھلوایا بیڑہ عیسیٰ سے کھائے جو اس نے پان
بندھوائی مہندی پاؤں میں دستِ کلیم سے

ولہ

برق بے پردہ اگر چہرۂ نورانی ہے
پردہ پوشی تری تلوار کی عریانی ہے

ولہ

روئے خورشید سے روشن رخ نورانی ہے
صبح صادق سے کشادہ تری پیشانی ہے
ایک عالم ہے صنم بسکہ ترا فریادی
عرصۂ حشر جلو خانۂ سلطانی ہے
تابِ نظارہ کہاں اور کہاں دیدۂ شوق
صورتِ یار میں آئینے کو حیرانی ہے
زندگانی میں ہوں مردے سے بدتر آتش
نقش تعویذِ لحد کا خطِ پیشانی ہے

ولہ

معشوق بھی کوئی نظر آتا نہیں ٹھنڈا
اوقات بسر ہوتے ہیں کشمیر میں میرے

ولہ

خود بہ خود جی مرا اداس نہیں
دل لگی جس سے تھی وہ پاس نہیں
مجھ کو چھوڑا تو غیر کو بھی
اس سوا اور التماس نہیں

ولہ

سنگ پھینکے ہے مری گور پہ گل کے بدلے
گالیاں دے ہے پس از مرگ وہ قل کے بدلے

ولہ

گیسوئے مشکیں رخ محبوب تک آنے لگے
چشمۂ خورشید میں بھی سانپ لہرانے لگے
دور کروایا پسینے نے نقابِ گل عذار
قطرۂ شبنم بھی دیوارِ چمن ڈھانے لگے
رشیۂ یعقوب سے کنعاں میں آئی برشگال
قطرۂ شبنم بھی دیوارِ چمن ڈھلنے لگے (دکنا)

ولہ

جانبِ کنجِ قفس ہونا روانہ یاد ہے　　ہم کو گلزارِ عدم کا آشیانہ یاد ہے

ولہ

توڑوں وہ گل جو سرخ ہو روئے نگار سے　　کاٹوں میں سرو کو جو بڑھے قدِ یار سے
عشرت کدہ ہے تیغ سے قاتل کی قتل گاہ　　زخموں کی بدھی نکلتی ہے پھولوں کے ہار سے
واقف ہوئی خزاں نہ ہماری بہار سے　　بدلا نہ رنگ نشے نے اپنے خمار سے

ولہ

حسرتِ جلوۂ دیدار لیے پھرتی ہے　　پیشِ روزن پسِ دیوار لیے پھرتی ہے
تو نکلتا نہیں شمشیر بکف اے قاتل　　موت میرے لئے تلوار لئے پھرتی ہے
کسی فاسق کے تو منھ کو نہ کرے گی کالا　　کیوں سیاہی یہ شبِ تار لئے پھرتی ہے

ولہ

موت لکھی ہوئی قسمت میں جو تلوار کی تھی　　شیرِ مادر میں حلاوت نئی ہر دھار کی تھی

ولہ

یہ کس رشکِ مسیحا کا مکاں ہے　　زمیں جس کی چہارم آسماں ہے
تکلف سے بری ہے حسنِ ذاتی　　قبائے گل میں گل بوٹا کہاں ہے
سحر ہووے کہیں شبنم کرے کوچ　　گل و بلبل کے دریا درمیاں ہے
خدا پنہاں ہے، عالم آشکارا　　نہاں ہے گنج، ویرانہ عیاں ہے
چمن کی سیر پر ہوتا ہے جھگڑا　　کمر میری ہے، دستِ باغباں ہے
ہوا ہے اس کی خوشبو سے ظاہر　　کسی گل رو کا غنچہ عطرداں ہے

ولہ

شبِ برات جو زلفِ سیاہ یار ہوئی　　جبیں سے صبحِ مہ عید آشکار ہوئی
یہ سرخ نشے میں چشمِ سیاہِ یار ہوئی　　زیادہ تر شفقِ شام سے بہار ہوئی
گذر ہوا جو کہیں مرقدِ غریباں پر　　گھٹائیں پھوٹ کے روئیں برق بیقرار ہوئی

سنا ہے قصۂ مجنوں و وامق و فرہاد
کسی کی دوستی آتش نہ سازوار ہوئی

ولہ

گنگ ایمائے لبِ یار سے گویا ہووے
تلوے آنکھوں سے ملے کور تو بینا ہووے
چھپ سکی بادِ صبا سے نہ تری زلف کی بو
مشک کا چور یقیں ہے یہ کہ رسوا ہووے

ولہ

شبِ فرقت میں یار جانی کی
دردِ پہلو نے مہربانی کی
منہ دکھاؤ بہت رہی تکرار
ارِنی اور لن ترانی کی
لبِ جاں بخش کے قریب وہ خط
شرح ہے متنِ زندگانی کی
کمر یار ہو گئی غایب
سن کے دھوم اپنی ناتوانی کی
ہو گیا عشق حسن سے ناگاہ
پوچھتے کیا ہو ناگہانی کی
جس کو کہتے ہیں چودھویں کا چاند
تیری تصویر ہے جوانی کی
مجھ کو بٹھلا کے یار سوتا ہے
عاشقی کی، کہ پاسبانی کی

ولہ

نفسِ شقی روح کے ہم راہ تن میں ہے
یوسف کے ساتھ گرگ بھی اس پیرہن میں ہے

ولہ

رہ گئے مشتاق، طالب جلوۂ دیدار کے
مار ڈالا اس پری پیکر نے جھرمٹ مار کے
حلقۂ چشمِ پری روزن ہیں قصرِ یار کے
جن چڑھے سائیں جو ٹھہرے تیری دیوار کے
بلبلوں کا نکہتِ گل سے معطر ہے دماغ
غنچے کیا چٹکے ہیں، شیشے ٹوٹے ہیں عطار کے
دیکھ کر آئینہ کہتا ہے وہ آرایش پسند
طرّے کے قابل ہے سر گردن ہے بادِ بہار کے
چھوڑ کر ہم نے امیری، کی فقیری اختیار
بوریے پر بیٹھے ہیں تالیں کو ٹھوکر مار کے

ولہ

بندِ نقابِ عارضِ دلدار توڑیے
باغِ مرادِ عشق کی دیوار توڑیے
وہ دردِ دوست ہیں جو خدا کم زخم دے
سو بار ٹانکے لگائیے، سو بار توڑیے

ولہ

کچھ نظر آیا نہ پھر جب تو نظر آیا مجھے — جس طرف دیکھا مقامِ ہُو نظر آیا مجھے
روئے گل بے چشم و بے ابرو نظر آیا مجھے — سروِ باغ اک قدِ بے بازو نظر آیا مجھے
اس نے ٹکوایا گریباں میں جو فیتہ بہر زینت — دو تو تھے ہی تیسرا ابرو نظر آیا مجھے
دل شبِ فرقت رہا سینے میں (مُردے) کی طرح — گور کا پہلو مرا پہلو نظر آیا مجھے
تیرے دانتوں میں دکھائی دی جو مسّی کی لکیر — اے پری دُرِّ نجف میں مُو نظر آیا مجھے
یہ اشارہ کر رہی ہے اس کی چشمِ سرمہ گیں — جو کبڑی بھولا اگر آہو نظر آیا مجھے
اس قدر ہے بوسۂ لب کا مزا مرغوبِ طبع — رال ٹپکی ہے جو شفتالو نظر آیا مجھے

ولہ

روح دو روز کو قالب میں ہے مہماں آئی — موت کو سمجھے رہیں گبر و مسلماں آئی

ولہ

یہ آرزو تھی تجھے گل کے روبرو کرتے — ہم اور بلبلِ بے تاب گفتگو کرتے
پیام بر نہ میسّر ہوا تو خوب ہوا — زبانِ غیر سے کیا شرحِ آرزو کرتے
جو جانتے کہ وہ چن چن کے ہم کو توڑیں گے — تو گل کبھی نہ تمنّائے رنگ و بو کرتے

ولہ

بانکی ادا سے قتل انھوں نے کیا ہمیں — مہندی لگا کے پاؤں میں پنجوں کے بل چلے

ولہ

ساغرِ لالہ ساقیا بھر دے — باغ کو رشکِ مے کدہ کر دے

ولہ

جوبن سے اپنے زیب دے باغ ڈھل چلے — رنگ ان گلوں کے چار ہی دن میں بدل چلے
تڑپا جو میں فشارِ لحد کے عذاب سے — گھبرائی گور قبر کے تختے نکل چلے
ثابت ہوا جو کشتۂ دندانِ یار ہوں — ہنس ہنس آ کے میری قبر پہ موتی اگل چلے
آئے جو کیفِ مے میں وہ گل گشتِ باغ کو — غنچے سے ٹوپی لالے سے پگڑی بدل چلے
خط یادگار چھوڑ چلے گیسوانِ یار — یہ سانپ چلتے چلتے بلا زہر اگل چلے

ولہ

مجھ سے مستی میں جو ہوں شیشہ و ساغر ٹکڑے ساقیا کیجیو میرے بھی برابر ٹکڑے
موسم گل ہے جنوں خیز بہارِ گل ہے اُڑتے پھرتے ہیں گریباں کے ہوا میں ٹکڑے
آشنا صورتِ ہفتاد و دو ملت سے ہوں میں آئینۂ دل کا ہے پہلو میں بہتر ٹکڑے
زخم کاری کا جو سایل ہوا کسی ترک سے میں یہ گدائی کا اثر ہو کہ ہو خنجر ٹکڑے
دلِ صد پارہ کو ڈھونڈا جو تیرے کوچے میں ہاتھ آئے ہیں مجھے شیشے کے اکثر ٹکڑے
ستم و قہر و غضب ہے روشِ مستانہ شیشۂ دل کو کرے گی تری ٹھوکر ٹکڑے

ولہ

خام کو شادی ہے غم پختہ کو ہے احسان سے کشت کو نفع ہے خرمن کو ضرر باران سے

ولہ

الٰہی مجھے گیسوے دل ستاں کاٹے اجل کہیں میرے پاؤں کی بیڑیاں کاٹے
کبھی جو آئینہ دیکھے وہ غیرتِ یوسف اِدھر تو آپ اُدھر عکس انگلیاں کاٹے

ولہ

پری زادوں کے کوچے میں ہوئے ہیں گرد آلودہ ہمارے پاؤں کو دھوئیں گی حوریں آبِ کوثر سے

اسد

مرزا نوشہ اسد اللہ خاں اسدؔ تخلص از خاندانِ عالی است، پیشتر غالبؔ می کردہ دحالا اسدؔ کردہ[1]۔ دریں زماں بہ دار الخلافہ شاہ جہاں آباد سکہ بہ نامش می زنند۔ در اوایل بہ مقتضاے طبع دشوار پسند بہ طرزِ بیدلؔ دقت آفریں ہا در شعر می کردہ د آخر براں طریقہ پشت پا زدہ ہمچو نظیریؔ طرزِ خاص ایجاد کردہ، دیوانے مختصر بعد از ترتیب و تکمیل مرتب ساختہ، اشعارِ قابلِ انتخاب منتخب کردہ۔ بہ حضورِ والا بس نزاکت بندداں زانوے ادب تہ می کنند۔ دریں زمانہ قدرِ سخن چوں آبِ گوہر ریختہ۔ از مغتنمات است۔

---

[1] "پیشتر اسدؔ می کردہ دحالا غالبؔ" ہونا چاہیے۔

نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا — کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

جذبۂ بے اختیارِ شوق دیکھا چاہیے — سینۂ شمشیر سے باہر ہے دم شمشیر کا

کاوکاوِ سخت جانی ہائے تنہائی نہ پوچھ — صبح کرنا شام کا، لانا ہے جوئے شیر کا

بسکہ ہوں غالب اسیری میں بھی آتش زیرِ پا — موئے آتش دیدہ ہے حلقہ مری زنجیر کا

ولہ

شوق ہر رنگ رقیبِ سروساماں نکلا — قیس تصویر کے پردے میں بھی عریاں نکلا

زخم نے داد نہ دی تنگیٔ دل کی یارب — تیر بھی سینۂ بسمل سے پر افشاں نکلا

بوئے گل، نشۂ مل، دودِ چراغِ محفل — جو تری بزم سے نکلا وہ پریشاں نکلا

دل میں پھر گریے نے ایک شور اٹھایا غالب — آہ جو قطرہ نہ نکلا تھا، سو طوفاں نکلا

ولہ

محرم نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا — یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

رنگِ شکستہ صبحِ بہارِ نظارہ ہے — یہ وقت ہے شگفتنِ گل ہائے ناز کا

تو اور سوئے غیر نظر ہائے (تیر تیز) — میں اور دکھ تیری مژہ ہائے دراز کا

کاوش کا دل کرے ہے تقاضا کہ ہے ہنوز — ناخن پہ قرض اس گرہِ نیم باز کا

ولہ

شب کہ برقِ سوزِ دل سے زہرۂ ابر آب تھا — شعلۂ جوالہ ہر ایک حلقۂ گرداب تھا

واں خود آرائی (کو) تھا موتی پرونے کا خیال — یاں ہجومِ اشک میں تارِ نگہ نایاب تھا

یاں سرِ پرشور بے خوابی سے تھا دیوار جو — واں وہ فرقِ ناز محوِ بالشِ کمخواب تھا

یاں نفس کرتا تھا روشن شمعِ بزمِ بیخودی — جلوۂ گل واں بساطِ صحبتِ احباب تھا

ولہ

بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا — آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

گریہ چاہے ہے خرابی مرے کاشانے کی — درو دیوار سے (ٹپکے) ہے بیاباں ہونا

وائے دیوانگیٔ شوق کہ ہر دم مجھ کو — آپ جانا اُدھر اور آپ (ہی) حیراں ہونا

جلوہ از بسکہ تقاضائے نگہہ کرتا ہے — جوہر آئینہ بھی چاہے ہے مژگاں
عشرتِ قتل گہِ اہلِ تمنا مت پوچھ — عیدِ نظارہ ہے شمشیر کا عریاں
لے گئے خاک میں ہم داغ تمنائے نشاط — تو ہو اور آپ بہ صد رنگ گلستاں
کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ — ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں
حیف اس چارہ گرہ کپڑے کی قسمت غالب — جس کی قسمت میں ہو عاشق کا گریبار

ولہ

گر نہ اندوہِ شبِ فرقت بیاں ہو جائے گا — بے تکلف داغِ مہ مہر دہاں ہو جائے
زہرہ گر ایسا ہی شامِ ہجر میں ہوتا ہے آب — پرتوِ مہتاب سیلِ خانماں ہو جائے
دل کو ہم صرفِ وفا سمجھے تھے کیا معلوم تھا — یعنی یہ پہلے ہی نذرِ امتحاں ہو جائے
فائدہ کیا سوچ آخر تو بھی دانا ہے اسد — دوستی ناداں کی ہے جی کا زیاں ہو جائے

ولہ

گلہ ہے شوق کو کیا دل میں تنگیٔ جا کا — گہر میں محو ہوا اضطراب دریا
غمِ فراق میں تکلیفِ سیر (باغ) نہ دو — مجھے دماغ نہیں خندہ ہائے بے جا
ہنوز محرمیٔ حسن کو ترستا ہوں — کرے ہے ہر بنِ مو کام چشمِ بینا
دل اس کو پہلے ہی ناز و ادا سے دے بیٹھے — ہمیں دماغ کہاں حسن کا تقاضا
نہ کہہ کہ گریہ بہ مقدارِ حسرتِ دل ہے — مری نگاہ میں ہے جمع و خرج دریا
فلک کو دیکھ کے کرتا ہوں اس کو یاد اسد — جفا میں اس کی ہے انداز کارفرما

ولہ

جب بہ تقریبِ سفر یار نے محمل باندھا — تپشِ شوق نے ہر ذرے پہ اک دل باندھا
اہلِ بینش نے بہ حیرت کدہ شوخیٔ ناز — جوہرِ آئینہ کو طوطیٔ بسمل باندھا
نہ بندھے تشنگیٔ شوق کے مضموں غالب — گرچہ دل کھول کے دریا کو بھی ساحل باندھا

ولہ

وہ مری چینِ جبیں سے غمِ پنہاں سمجھا — رازِ مکتوب بہ بے ربطیٔ عنواں سمجھا

شرحِ اسبابِ گرفتاریِ خاطر مت پوچھ • اس قدر تنگ ہوا دل کہ میں زنداں سمجھا

ولہ

شب کو وہ مجلس فروزِ خلوتِ ناموس تھا — رشتۂ ہر شمع خارِ کسوتِ فانوس تھا
مشہدِ عاشق سے کوسوں تک جو اگتی ہے (حنا) — کس قدر یارب ہلاکِ حسرتِ پابوس تھا
حاصلِ الفت نہ دیکھا جز شکستِ آرزو — (دل) بہ (دل) پیوستہ گویا یک لبِ افسوس تھا

ولہ

عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا — درد کا حد سے گذرنا ہے دوا ہو جانا
اب جفا سے بھی ہیں محروم ہم اللہ اللہ — اس قدر دشمنِ اربابِ وفا ہو جانا
دل سے (مٹنا) تری انگشتِ حنائی کا خیال — ہو گیا گوشت سے ناخن کا جدا ہو جانا
ہے مجھے ابرِ بہاری کا برس کر کھلنا — روتے روتے غمِ فرقت میں فنا ہو جانا
گر نہیں نکہتِ گل کو ترے کوچے کی ہوس — کیوں ہے گردِ رہِ جولانِ صبا ہو جانا
تاکہ تجھ پر کھلے اعجازِ ہوائے صیقل — دیکھ برسات میں سبز آئینے کا ہو جانا

ولہ

گلشن میں بندوبست بہ رنگِ دگر ہے آج — قمری کا طوق حلقۂ بیرونِ در ہے آج
آتا ہے ایک پارۂ دل ہر فغاں کے ساتھ — تارِ نفس کمندِ شکارِ اثر ہے آج

ولہ

حسن غمزے کی کشاکش سے چھٹا میرے بعد — بارے آرام سے ہیں اہلِ جفا میرے بعد
تھا میں گلدستۂ احباب کی بندش کی گرہ — متفرق ہوئے میرے رفقا میرے بعد
کون ہوتا ہے حریفِ مئے مرد افگنِ عشق — ہے مکرر لبِ ساقی پہ صلا میرے بعد
آئے ہے بیکسیِ عشق پہ رونا غالب — کس کے گھر جائے گا سیلابِ بلا میرے بعد

ولہ

فلک سے ہم کو عیشِ رفتہ کا کیا کیا تقاضہ ہے — متاعِ بردہ کو سمجھے ہوئے ہیں قرض رہزن پر
اسد بسمل ہے کس انداز کا قاتل سے کہتا تھا — کہ مشقِ ناز کر خونِ دو عالم میری گردن پر

ولہ

آئینہ دیکھ اپنا سا منھ (لے کے) رہ گئے — صاحب کو دل نہ دینے پہ کتنا غرور تھا

ولہ

نہ گلِ نغمہ ہوں، نہ پردۂ ساز — میں ہوں اپنی شکست کی آواز
تو اور آرایشِ خمِ کاکل — میں اور اندیشہ ہائے (دُور) دراز

ولہ

وہ فراق اور وہ وصال کہاں — وہ شب و روز و ماہ و سال کہاں
فرصتِ کار و بارِ شوق کسے — دولتِ نظارۂ جمال کہاں
دل تو دل، وہ دماغ بھی نہ رہا — شورِ سودائے خط و خال کہاں
تھی وہ اک شخص کے تصور سے — اب وہ رعنائیِ خیال کہاں
فکرِ دنیا میں سر (کھپاتا) ہوں — میں کہاں اور یہ وبال کہاں

ولہ

نالہ جز حسن طلب اے ستم ایجاد نہیں — ہے (تقاضائے) جفا شکوۂ بے داد نہیں
کم نہیں جلوہ گری میں ترے کوچے سے بہشت — یہی نقشہ ہے ولے اس قدر آباد نہیں
(کرتے) کس منھ سے ہو غربت کی شکایت غالب — (تم کو) بے مہریِ اربابِ وطن یاد نہیں

ولہ

ہے بزمِ بتاں میں سخن آزردہ لبوں سے — تنگ آئے ہیں ہم ایسے خوشامد طلبوں سے

ولہ

کرتا ہے بسکہ باغ میں تو بے حجابیاں — آنے لگی ہے نکہتِ گل سے حیا مجھے

ولہ

سادگی پر اس کی مر جانے کی، حسرت دل میں ہے — بس نہیں چلتا کہ پھر خنجر کفِ قاتل میں ہے
دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا — میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے
گرچہ ہے کس کس برائی سے ولے با ایں ہمہ — ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اس محفل میں ہے

بس ہجومِ ناامیدی خاک میں مل جائے گی | یہ جو اک لذت ہماری سعیِ بے حاصل میں ہے

ولہ

دل سے تری نگاہ جگر تک اتر گئی | دونوں کو اک ادا میں رضامند کر گئی
شق ہو گیا ہے سینہ، خوشا لذتِ فراق | تکلیفِ پردہ داریِ زخمِ جگر گئی
وہ بادۂ شبانہ کی سرمستیاں کہاں | اٹھیے بس اب کہ لذتِ خوابِ سحر گئی
دیکھو تو دل فریبیِ اندازِ نقشِ پا | موجِ خرامِ یار بھی (کیا) گل کتر گئی
مارا زمانے (نے) اسد اللہ خاں تمہیں | وہ ولولے کہاں، وہ جوانی کدھر گئی

ولہ

پھر کچھ اک دل کو بے قراری ہے | سینہ جویائے زخمِ کاری ہے
پھر جگر کھودنے لگا ناخن | آمدِ فصلِ لالہ کاری ہے
وہی صد رنگ نالہ فرسائی | وہی صد گونہ اشکباری ہے
پھر اسی بے وفا پہ مرتے ہیں | پھر وہی زندگی ہماری ہے
بے خودی بے سبب نہیں غالبؔ | کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے

ولہ

پیکرِ عشاق سازِ طالعِ ناساز ہے | نالہ گویا گردشِ سیارہ کی آواز ہے
دستگاہِ دیدۂ خوں بارِ مجنوں دیکھنا | اک بیاباں جلوۂ گل فرشِ پا انداز ہے

ولہ

کب وہ سنتا ہے کہانی میری | اور پھر وہ بھی زبانی میری
خلشِ غمزۂ خوں ریز نہ پوچھ | دیکھ خوں نابہ فشانی میری
کیا بیاں کر کے مرا روئیں گے یار | مگر آشفتہ بیانی میری
دہن اس کا جو نہ معلوم ہوا | کھل گئی ہیچمدانی میری
کر دیا ضعف نے عاجز غالبؔ | ننگِ پیری ہے جوانی میری

چاہیے اچھوں کو جتنا چاہیے | ولہ | یہ اگر چاہیں تو پھر کیا چاہیے

منحصر مرنے پہ ہو جس کی امید — ناامیدی اس کی (دیکھا) چاہیے
چاہتے ہیں خوب رویوں کو اسد — آپ کی صورت تو دیکھا چاہیے
غافل ان مہ طلعتوں کے واسطے — چاہنے والا بھی اچھا چاہیے

ولہ

رونے سے اور عشق میں بے باک ہو گئے — دھوئے گئے ہم اتنے کہ بس پاک ہو گئے

ولہ

مانعِ دشت نوردی کوئی تدبیر نہیں — ایک چکّر ہے مرے (پانو میں) زنجیر نہیں

ولہ

تم وہ نازک کہ خموشی کو فغاں کہتے ہو — ہم وہ عاجز کہ تغافل بھی ستم ہے ہم کو

ولہ

مے سے (غرض) نشاط ہے کس روسیاہ کو — اک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہیے

ولہ

ہو کے عاشق وہ پری رخ اور نازک بن گیا — رنگ کھلتا جائے ہے جتنا کہ اڑتا جائے ہے

ولہ

کہتے ہیں جیتے ہیں امید پہ لوگ — ہم کو جینے کی بھی امید نہیں

ولہ

جس جا نسیم شانہ کشِ زلفِ یار ہے — نافہ دماغ آہوے مشکِ تتار ہے
چھڑکے ہے شبنم آئینۂ برگِ گل پہ آب — اے عندلیب وقتِ وداعِ بہار ہے
(پیچ) آپڑی ہے وعدۂ دلدار کی مجھے — وہ آئے (یا) نہ آئے پہ یاں انتظار ہے
بے پردہ سوئے وادیٔ مجنوں گذر نہ کر — ہر ذرّہ کے نقاب میں دل بے قرار ہے
اے عندلیب یک کفِ خس بہرِ آشیاں — طوفانِ آمد آمدِ فصلِ بہار ہے

ولہ

آئینہ کیوں نہ دوں کہ تماشا کہیں (جسے) — ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں (جسے)

ولہ

مشکل ہے زبس کلام میرا اے دل — سن سن کے اسے سخنوران کامل
آسان کہنے کی کرتے ہیں فرمائش — گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل

ولہ

ہے جو صاحب کے کفِ دست پہ یہ چکنی ڈلی — زیب دیتا ہے اسے جس قدر اچھا کہیئے
خامہ انگشت بہ دنداں کہ اسے کیا کہیئے — ناطقہ سر بہ گریباں کہ اسے کیا کہیئے
مسی آلودہ سر انگشتِ حسیناں کہیئے — داغِ طرفِ جگرِ عاشقِ شیدا کہیئے
خاتمِ دستِ سلیماں کے مشابہ لکھیئے — سرِ پستانِ پری زاد سے مانا کہیئے
اختر سوختۂ قیس سے نسبت دیجیئے — خالِ مشکینِ رخِ دل کشِ لیلیٰ کہیئے
صومعہ میں اسے ٹھہرائیے گر مہرِ نماز — مے کدے میں اسے خشتِ خُمِ صہبا کہیئے
حجرالاسودِ دیوارِ حرم کیجیئے فرض — نافہ آہوئے بیابانِ ختن کا کہیئے
وضع میں اس کو اگر سمجھیئے قافِ تریاق — رنگ میں سبزۂ نوخیزِ مسیحا کہیئے
کیوں اسے قفلِ درِ گنجِ محبت لکھیئے — کیوں اسے نقطۂ پُرکارِ تمنا کہیئے
کیوں اسے گوہرِ نایاب تصور کیجئے — کیوں اسے مردمکِ دیدۂ عنقا کہیئے
کیوں اسے تکمۂ پیراہنِ لیلیٰ لکھیئے — کیوں اسے نقشِ پئے ناقۂ سلمیٰ کہیئے
بندہ پرور کے کفِ دست کو دل کیجیئے فرض — اور اس چکنی سپاری کو سویدا کہیئے

انشا

انشاء اللہ خاں انشا تخلص در قصیدہ و ہجو گوئی بلائے روزگار بود۔ محاوراتِ اردو از زبانِ دانانِ عصرِ خویش نیکومی دانست۔ کتاب "دریائے لطافت" کہ بہ تحقیقِ ایں زبان گفتہ شاہدِ ایں مقالہ است۔ قصاید در زمین ہائے مشکل ہجو مرزا رفیع السودا گفتہ۔ طرزِ گفتگویش از دیگر معنی بنداں جداست و بہ حاضر جوابی و بدیہہ گوئی ہم لاجواب بودؔ:

تنہا نہ اس کو دیکھ کے بلبل نے غش کیا — اپنی بھی جان فوت ہوئی دل نے غش کیا

کھڑے پاس کے صرف نہ بلبل نے غش کیا
صحنِ چمن میں ہیں گل و سنبل نڈھال سے

چٹ پٹ بلائیں غنچوں نے لیں، گل نے غش کیا
یاں کس کے عاشق، رخ و کاکل نے غش کیا

ولہ

دھوم اتنی ترے دیوانے مچا سکتے ہیں
کہ ابھی عرش کو چاہیں تو (ہلا) سکتے ہیں

ق

کرکے جھوٹا نہ دیا جام اگر تو نے تو چل
(دبارے، غیرت سے) ہم افیون تو کھا سکتے ہیں

ہم نشیں تو جو یہ کہتا ہے کہ قلقل ہے بہت
اپنی آواز وہ کب تجھ کو سنا سکتے ہیں

اپنی نہ آواز سنائیں مجھے در تک آکر
اپنے پانو کے کڑوں کو تو بجا سکتے ہیں

ولہ

کہتے ہو تم تو دم لے پرے ہٹ ابھی نہیں
اور آنہ جائے کوئی، مرے جی میں جی نہیں

خلوت میں یوں جو چاہئے کہہ لیجئے مگر
لوگوں میں لیکن آپ کی میری ہنسی نہیں

ولہ

ترے غم میں ہم نے دی جان تڑپ، ارے تیرا خانہ خراب ہو
پسِ مرگ بیٹھے ہیں اس لئے، اسے گور میں بھی عذاب ہو

ولہ

بھری وہ آتشِ عشق اس دلِ فگار میں ہے
کہ لاکھ برق نہاں جس کے ہر شرار میں ہے

مزا جو آپ کے سینے کے کچھ ابھار میں ہے
نہ سیب میں، نہ بہی میں، نہ وہ انار میں ہے

ولہ

ہے یہ دھڑکا جو کہیں دیدۂ حیراں تر ہو
عرقِ شرم سے شاید رخِ جاناں تر ہو

بابِ پنجم کی مجھے سیر سے رقت آئی
کہیں ایسا نہ ہو سعدی کی گلستاں تر ہو

ولہ

نیند مستوں کو کہاں اور کدھر کا تکیہ
خشتِ خم خانہ ہے یاں اپنے تو سر کا تکیہ

سر تو چاہے ہے مرا، ہووے میسر تیرے
ہاتھ کا، بازو کا، زانو کا، کمر کا تکیہ

یہ تو حاصل ہے کہاں بھیج دے لیکن مجھ کو
جس میں بالوں کی ہو بو تیرے ہو ترے سر کا تکیہ

شوق سے سوئیے، سر رکھ کے مرے زانو پر — اس کو مت سمجھیں کچھ خوف و خطر کا تکیہ
جب تلک آپ نہ جاگیں گے رہے گا یوں ہی — سر کے گا تب ہی کہ جب کھینچے گا سر کا تکیہ

ولہ

سبزہ کیا خاکِ شہیداں سے ترے خاک اگے — جائے گل چاہیے واں سے دلِ صد چاک اگے
جس جگہ پھوٹ بہے زخمِ جگر کا انگور — سیکڑوں کوس تلک واں شجرِ تاک اگے

ولہ

پئے تعظیم اشک اس طرح آہِ سرد اٹھتی ہے — کہ جیسے قطرہ افشانی سے بوسے گرد اٹھتی ہے
گرہ حسرت کی ہر تارِ نفس میں پڑ گئی جب سے — یہ کیسی ہوک ہر دم لے دلِ پر درد اٹھتی ہے

ولہ

کیسی ہی کیوں نہ ہم میں تم میں لڑائیاں ہوں — جب کھِل کھِلا کے ہنس دو (باہم) صفائیاں ہوں

ولہ

گرچہ مے پینے سے کی توبہ ہے میں نے ساقی — بھول جاتا ہوں ولے تیری مدارات کے وقت
موسمِ عیش ہے یہ عہدِ جوانی انشاؔ — دور ہیں تیرے ابھی زہد و عبادات کے وقت

ولہ

حیف ایّام جوانی کے چلے جاتے ہیں — ہر گھڑی دن کی طرح ہم تو ڈھلے جاتے ہیں
ہاتھ کیا پھیرو ہو عارض پہ ابھی کیا ہے وہاں — خط کو کچھ دخل نہیں، گال ملے جاتے ہیں

ولہ

تفضلات نہیں، لطف کی نگاہ نہیں — معاملہ ابھی مطلق وہ رو براہ نہیں

ولہ

راتوں کو نہ نکلا کرو دروازے سے باہر — شوخی میں دھرو پانو نہ اندازہ سے باہر

ولہ

سچ یہ آفت تری یہ دھج، یہ خوش اندامی ہے — کہ نظر بھر کے تجھے دیکھیں تو بدنامی ہے

ولہ

گالیاں سیکڑوں دیں، پانو جو داب ہم نے — محنتیں خوب سی کیں، خوب سے انعام لیے

ولہ

صاحب کے ہرزہ پن سے ہر ایک کو گلہ ہے — میں جو نباہتا ہوں، میرا ہی حوصلہ ہے
دیں گالیاں بہت سی، سن مطلع اس غزل کا — کہنے لگا کہ انشا اُس کا یہی صلہ ہے

ولہ

یاں سینہ ہے مدینہ اور دل نبی کی مسجد — کیوں قبلہ ہے پہنچتی اس کو کسی کی مسجد
گچ کی بٹ اور اودی انگیا، انس پہ سنہری گوٹ لگی — چاند ابر سے نکلا برق کا ٹکڑا، چاند کے دل پر چوٹ لگی

ولہ

دُرِ یتیم جو اس نازنیں کے کان میں ہیں — نہ ویسے بحر میں دیکھے سنے، نہ کان میں ہیں
بھلا میں کیوں کہ کہوں آپ پاک دامن ہیں — اگرچہ قسمیں ہزاروں تری زبان میں ہیں
لگاتے دم نہیں، منھ زرد اور آنکھیں نیچی ہیں — مزے سمائے ہوئے سارے جسم و جان میں ہیں
یہ سب غلط سہی آئینے میں تو اک ذرا — لبوں کو دیکھو مسی و پان میں ہیں

ولہ

نہ شیشے ہیں نہ ساغر ہیں، نہ ساقی متوالا — سرک جا سامنے سے ہٹ، ترے بدلے کذا کالا

آزردہ

آزردہ تخلص، مولوی صدر الدین خاں، صدر الصدور شاہ جہاں آباد، بہ انواع فضائل و فنون مہذب است۔ فکرِ نظم و نثر از ادنیٰ کمالات و جوہر ذاتی اوست:

یہ چھیڑ دیکھ مجھ سے شبِ وصل میں کہے — تو اجنبی ہے بندِ قبا (کیوں کہ) وا کروں

آرام

آرام تخلص:

خون آنکھوں سے نکلتا ہی رہا — دل کا فوّارہ اُچھلتا ہی رہا

آشوب

آشوب تخلص، امیر الدین نام۔ از شاگردانِ غلام علی عبرت بودہ:

ناوکِ غم سے چھنایاں تک تن اس ناکام کا — استخواں پر ہے گماں میری ہما کو دام کا

آشفتہ

آشفتہ تخلص، سید تہور علی نام - از مشاہیر دہلویاں ست:

ابھی دلربائی کو کیا جانتا ہے ستم کو وہ بدخو ادا جانتا ہے
ہے جلاد کی سادگی میں بھی شوخی مرے خون کو رنگِ حنا جانتا ہے

اثر

اثر تخلص، نواب حسین علی خاں خلف الصدق مرزا حیدر بیگ خاں - از بلند نامی ہا که داشت محتاج به شرح نیست:

آہ کی برق جو سینے میں چمکتی دیکھی طفلِ اشک آکے چھپے دامنِ مژگاں کے تلے

ولہ

بسکہ وردِ آٹھوں پہر نام اس مہ تاباں کا ہے بن گیا اختر مری تسبیح کا جو دانہ تھا

اثر

اثر تخلص، سید محمد برادرِ خواجہ میر دردؔ علیہ الرحمۃ - کلامِ شاں از غایتِ سوز و گداز دل پذیر و مثنوئ شاں شہرتے دارد:

جی میں ہے از سرِ نو جور ترے یاد کریں تو سنے یا نہ سنے نالہ و فریاد کریں
ہم اسیروں کی اسے چاہئے خاطر داری اور الٹے نہ کہ ہم خاطرِ صیاد کریں

ولہ

یہاں تغافل میں اپنا کام ہوا تیرے نزدیک یہ جفا ہی نہیں

احسان

احسان تخلص، حافظ عبدالرحمن خاں - از سخن طرازانِ عہدِ شاہ عالم بادشاہ است:

کہتے ہو کیا رقیب کو بھیجوں بتا صلاح لعنت ہی بھیجئے گا یزیدِ لعین کو

ولہ

کہتے ہیں پلٹ گیا وہ رہ سے تقدیر اُلٹ گئی ہماری
کیا کام کسی سے ہم کو احساں ہم اور یہ بے کسی ہماری

ولہ

مرنے کے بعد آن کے کٹوائیں بیڑیاں　　　آج آپ اپنے کشتے کی منت بڑھا چلے

احسن

احسنؔ تخلص، مرزا احسن علی - از تلامذۂ مرزا رفیع بودہ - دربداہت حال پرتوے از میر منؔیا ہم گرفتہ، اما ذرہ اش خورشید از و نہ گشتہ:

شب کو محفل میں ہر اک مہ پارہ گرم لاف تھا　　　صبح وہ خورشید رو نکلا تو مطلع صاف تھا

ولہ

سجدہ گہ ہے خاکِ احسنؔ اب تو ساری خلق کی　　　جان دی تھی اُس نے کس کی حسرتِ پابوس میں

آمان

آمانؔ تخلص، غالباً نامش ہمیں باشد - نصرانی بودہ - اصلش از فرنگ، و ولادتش بہ ہند اتفاق افتادہ:

خط کا بھی جواب ہے، جو لکھا کبھی خط　　　کر ڈالونگا اک دم میں ترے آن کے ٹکڑے

امین[1]

امینؔ تخلص، امین الدین عظیم آبادی ست:

ہم کو کیا گر بہار آتی ہے　　　دل وہ غنچہ نہیں جو وا ہوگا

اثر

اثرؔ تخلص سید آل نبی - از سادات بلگرام بودہ است - مرد لیست آزاد وضع و از اکثر در علوم رسمیہ مہارتے دارد و در خطِ نستعلیق ہم دستگاہے - اشعارش یادشد، کذا

تیری تلوار کا کیوں کر کہوں احساں نہ ہوا　　　سر مرا شکر ہے منت کش طفلاں نہ ہوا

دعوائے ہمسریِ قدِّ قیامت کے لیے　　　سرو نکلا تھا مگر وہ بھی خراماں نہ ہوا

بت پرستی کے سوا دہر میں آ کر تجھ سے　　　اے اثرؔ! اور کوئی کارِ نمایاں نہ ہوا

---

[1] اصل: آمین

انوار

انوار تخلص، انوار حسین نام - از رؤسائے قصبہ سہسوان است - از مشق تازۂ خویش آب و رنگِ سخنِ معنی طرازانِ کہنہ مشق بہ خاک ریختہ - شوخیٔ الفاظ و چستیٔ بندش و تازگیٔ مضمون از ہر بیتِ او می تواں یافت - کمتر بفکرِ شعر می پردازد دحشت طبعش عارض و مزاجش (بہ) سخن پرستی مایل است - تذکرۂ شعرا جمع کردہ و دادِ سخن (آفرینی ہا) دادہ - با راقم السطور اتحادِ دلی دارد و مارا ہم بامزاج و طبعِ او نسبتے حاصل است - چند اشعارش کہ ایں وقت بہ یادِ فقیر (است) تحریرش صفحۂ کاغذ را گلستاں می کند و اکنوں تسلیم تخلص می کند۔

رو رو کے اشک روکے ہیں چشمِ پُر آب میں ۔۔۔ دریا کو ہم نے بند کیا ہے حباب میں

دہانِ حسن کو جو ہوگی ترقی شباب میں ۔۔۔ یہ نور پھر رہے گا کہاں آفتاب میں

ولہ

تل نہ سرمے کا لگا تو ابروے خمدار میں ۔۔۔ کم بہا ہوتی ہے وہ جھالا ہو جس تلوار میں

ہوشِ مرغانِ چمن ایسے اڑے اس گل کو دیکھ ۔۔۔ نالہ جو منقار میں تھا، رہ گیا منقار میں

ولہ

غیر کے بوسوں کے اب تک نیل ہیں رخسار پر ۔۔۔ دیکھو شرماتے نہیں منھ پہ کھاتے ہو تم

بیدار

بیدار تخلص، میر محمدی - در اکبر آباد طرحِ اقامت می انداخت و در کسبِ باطن ہم اشتغال داشت - از خدمتِ مولانا فخر الدین خرقۂ خلافت در بر کردہ، نسبتش درست داشت - دیوانے مشہور دارد۔

ہم تری خاطرِ نازک سے خطر کرتے ہیں ۔۔۔ ورنہ یہ نالے تو پتھر میں اثر کرتے ہیں

ولہ

نہ گئی تیری سرکشی ظالم ۔۔۔ ہم نے ہر چند جبہہ سائی کی

بقا

بقا تخلص، محمد بقاء اللہ - از لکھنؤ بودہ - اکثر بہ شعرائے لکھنؤ معارضات کردہ کہ نوبت

بہ ہجوگوئی دیگراں نسبتِ او و از نسبت بہ دیگراں رسیدہ۔

یاد میں تڑپے ہے دل کس ابروئے خمدار کے — آہ کچھ ناخن بہ دل ہے آج اس بیمار کے

برق

برق تخلص، مرزا محمد رضا۔ کلامش صاعقۂ افگنِ خرمنِ ہوش و خرد است۔ بہ شاگردانِ ناسخ ہجو بیتِ ابرو انتخاب است بلکہ باعثِ شہرت و افتخارِ استاد۔ بہ حسنِ اخلاقِ ظاہر و لطافتِ معنی آراستہ۔ نظمِ ہوش ربایش کمتر از ناسخ۔ فی زماننا از عمدہ سخن سنجانِ لکھنؤ است و بہ سلکِ ملازمان بہ اختصاصِ بادشاہی سرفرازی با دارد۔

سب پہ ثابت ہے کہ وہ خورشید رو مہ پارہ ہے — سیر کو کیوں کر نہ نکلے کوکب سیارہ ہے
سال ہا مجھ کو جھلاتا ہے وہ اک اک بات میں — آمد و شد یار کے گھر کی نہیں گہوارہ ہے
باغِ عالم میں دلیلِ غم سمجھ شادی کو تو — یاں صدائے خندۂ گل کوچ کا نقارہ ہے
برگِ گل آنکھوں کے پردے بن گئے دیدار سے — جیبِ گل خوشبو سے اپنا دامنِ نظارہ ہے
سامنے آنکھوں کے اک رشکِ چمن رہتا ہے برق — دامنِ گل چیں ہمارا دامنِ نظارہ ہے

ولہ

پرتوِ عارض سے روشن اس کے کاشانہ ہوا — جس مکاں میں جا کے بیٹھا آئینہ خانہ ہوا
لہر زلفوں کی جو آئی، سم ہوئی مجھ کو شراب — حلقۂ مارِ سیاہ گردش میں پیمانہ ہوا
زخم بھر آیا، نگاہِ مستِ ساقی کے سبب — بادۂ انگور سے لبریز پیمانہ ہوا
جب ہوا اس طور طوفاں دیکھنا آنسو بہے، — نالہ ہم کرنے لگے جب آگ برسانا ہوا

ولہ

ہو گیا مجھ کو جنوں جب ترا زیور چمکا — زرِ گل دیکھ کے داغِ دلِ مضطر چمکا
جب ستارہ سا ترے (کان) کا گوہر چمکا — سامنے اس کے (کذا) بھی نہ فلک پر چمکا
حسن کہتے ہیں اسے صورتِ شمعِ فانوس — نورِ چھن کر تری دیوار سے باہر چمکا
کھل گئے نشے کے عالم میں جو پستاں اس کے — سمجھے مے خوار کہ بلور کا ساغر چمکا
برق گھبرا نہ شبِ ہجر کی اندھیاری سے — وصل اس [illegible]

موجِ نسیم کاکلِ مشکیں جو چھل گئی — مجھ شیفتہ کے سودے کی حالت بدل گئی
جھونکے سے لال لال ترے گال ہو گئے — غازہ نسیم چہرہ نازک پہ مل گئی
میں اضطرابِ حسرتِ دیدار کیا کہوں — مثلِ نگاہ آنکھ سے پتلی نکل گئی
عریاں جو رات تپِ فرقت سے میں رہا — ہر بار میرے جسم کی پوشاک جل گئی
کیفیتِ بہار جو یاد آئی زیرِ خاک — داغِ جنوں سے اپنی طبیعت بہل گئی
کیں چکنی چکنی باتیں جو اس نے شبِ وصال — بے اختیار اپنی طبیعت پھسل گئی

ولہ

قمر کی وہ خورشید تصویر ہے — گلے میں ستاروں کی زنجیر ہے
عجب کیا جو وہ دشمنِ جاں ہوا — عداوت محبت کی تاثیر ہے
مرقع کہے کیوں نہ عالم تجھے — ترا عضو ہر ایک تصویر ہے
مسیحا ہے قرباں فدا سامری — ترا عضو ہر ایک تصویر ہے (کذا)

ولہ

صدقے حور و جن و لبشر میرے یار کے — پانی بھریں فرشتے بھی اس پر سے وار کے

ولہ

یوسف کو نہ لوں میں تری تصویر کے بدلے — خاکِ درِ جاناں نہ دوں اکسیر کے بدلے

تسکین

تسکین تخلص، میر حسین نام۔ از مومن خاں دہلوی بہ درستیٔ اشعار پرداختہ:

ہر صبح نئے ڈھونڈے وہ تازہ خریدار — صورت مری ہر صبح بدل جائے تو اچھا

ولہ

ہم کو ہر دام میں لازم ہے پھنسانا دل کا — سیکھے ہیں تیری لگاوٹ سے لگانا دل کا

ولہ

خوبصورت نہ ہو کوئی تو نہ ہو بد نامی — سچ تو یہ ہے کہ برا ہوتا ہے اچھا ہونا

ولہ

زلفِ پُر پیچ کھولا ہے یہ کس نے یارب — کہ مرے پاؤں کی زنجیر کئے دیتے ہیں

تمنّا

تمنّا تخلص، نامش معلوم نیست،

کل تلک سوزِ دروں سے دل مرا بیتاب تھا ‏ ‏ آج جو دیکھا تو (گویا) کشتۂ سیماب تھا

ولہ

رات تیرے صدفِ پا کے تصور میں مرا ‏ ‏ جو سرشک آنکھوں سے نکلا دانۂ عناب تھا

ثابت

ثابت تخلص، مرزا معز الدین

سحر ہونے کے دھڑکے سے ہمارا ہے بدن ٹھنڈا ‏ ‏ کہ تیرا ہار موتی کا ہوا ہے سیم تن ٹھنڈا

جرأت

جرأت تخلص، قلندر بخش نام۔ شاعرے جادو بیان بودہ، بندشِ معنی نازک نصیبِ کلامِ سوز انگیز گردیدہ۔ مضمونِ نظمِ دلفریبش سراسر دلربا ست و سخنِ سحر آفرینِ وہوش ربا۔ ہر شعرش از لطافت خالی نیست و از اختلاطِ شوخ دلبرانہ خبر می دہد۔ بہ مصاحبتِ رنگین ادایانِ خوش لہجہ تربیت یافتہ پنداشت کہ از دودمانِ شعلہ روے بودہ و چون نظارہ را صرفِ تماشائے آفتاب رویاں کردہ بود آخر کار از بصارت دست بر داشت، روے نیکویاں بہ حسرت نتوانست دید۔ بہ ایں ہمہ از نظمِ معنی روشن کہ سرمۂ دیدۂ اہلِ بصیرت است، سرو کارے داشتہ۔ ہمچو ظہور اللہ خاں نوا دو واسوخت او (و) دیگر افکارِ آبدارش شہرتے دارد کہ محتاجِ بیان نیست:

طپش سے اس کی سب اعضا بدن کے جلتے ہیں ‏ ‏ جو ہم سے دل کوئی بدلے، تو ہم بدلتے ہیں

ہزار غم کھول، پر ہوں بتاں نہ چشم پُر آب ‏ ‏ سنا نہیں ہے کہ پتھر کہیں پگھلتے ہیں

صفا و خوبیٔ رخسارِ یار کیا کہیے ‏ ‏ کہ لیں خیال میں بوسے تو لب پھسلتے ہیں

غرض کہ صدقے ہیں اس حالتِ تمنّا کے ‏ ‏ کہ جس میں آہ قیامت قد ایسے ڈھلتے ہیں

عیاں ہے سوزِ دل اپنا کہ شکلِ گلخن آہ ‏ ‏ دہن سے جائے زباں، شعلے ہی نکلتے ہیں

جو قبر پر ہیں ترے کشتگانِ یاس کی نخل ‏ ‏ نہ پھولتے ہیں وہ موسم میں اور نہ پھلتے ہیں

زبسکہ مرتے ہیں اک سبزہ رنگ پر جرأتؔ — یہ شعر کہتے نہیں، زہر ہم اُگلتے ہیں

ولہ

[illegible]رق ہے یا کڑا چمکتا ہے — پاؤں میں کیا پڑا چمکتا ہے

ولہ

سوتے [illegible] جو اٹھ جاتی ہے انگڑائی میں — چاند بدلی سے نکلتا ہوا یاد آتا ہے

ولہ

وصل کی شب کو پوچھتے کیا ہو، جیسے پچھلی رات کی شمع — تھوڑے تھوڑے ہونے لگے ہم جب تھوڑی سی رات رہی

ولہ

[illegible] — دل لگتے ہی خدا نے جدائی نصیب کی

ولہ

[illegible] رات — بلائیں ہاتھوں کی لیتا رہا میں ساری رات

ولہ

[illegible] سمجھئے یا [illegible] نہ جانئے — آئیں گے جی آئیں گے، اب تو طبیعت آ گئی

ولہ

اب چلے تیرے آستاں کو چھوڑ — بد زباں اب تو اس زباں کو چھوڑ

ولہ

چھپ کے ہم نے سیر دیکھی، کل جو لے کر آئینہ — دیکھتا تھا عالم اپنے وہ مسی اور پان کا
یعنی پہلے دیکھ ہر سو، ہو کے پھر بے اختیار — آپ ہی بوسہ لے لیا، اپنے لب و دندان کا

ولہ

لاش پر میری ہوا صبح جو خلقت کا ہجوم — آن کر دیکھنے وہ ترک ستمگار لگا
جب جنازہ لگا اٹھنے تو یہ بولا کوئی — ہاتھ اپنے تو ذرا تو بھی ستمگار لگا
ہنس کے کہنے لگا، ڈرتا ہوں گر یہ بیمار — جی اٹھے تو مرے دل کو وہی آزار لگا

ولہ

(ملال) دل پر نہ ہو کیوں کر بھلا اس کی جدائی کا — ملے سے جس کے حاصل ہوا مزا ساری خدائی کا

ولہ

پڑی ہے بزم میں جس شخص پر نگاہ تری — تو منھ کو پھیر کے کہتا ہے بس پناہ تری

جانی

جانی تخلص، بیگم نام، مشہور بہ بیگم بنت نواب قمرالدین خاں زوجہ نواب آصف الدولہ بودہ۔ درحالتِ شدتِ مرض ہمدم نام خواجہ سرا بہ پرسشِ وے آمد۔ بدیہہ ایں مطلع برخواند۔ وگاہ گاہے بفکرِ شعرِ خاصہ می پرداخت:

کیا پوچھتا ہے ہمدم اس جسمِ ناتواں کی — ہر رگ میں نیشِ غم ہے کہیے کہاں کہاں کی

جینا بیگم

جینا بیگم، حالشؔ معلوم نیست۔ اسم بہ مقتضائے ستر و ستر عورت اوست۔ نیز فکرے بود بگفت:

یہ کس کی آتشِ غم نے جگر جلایا ہے — کہ تا فلک مرے نالے نے سر اٹھایا ہے

جوشش

جوشش تخلص، شیخ محمد روشن۔ از عظیم آباد است:

بیکسی سے بھی گلہ ہے مجھے — تھام لیتی ہے دستِ قاتل کو

ولہ

جی میں جس وقت کہ مضمونِ کمر آتا ہے — بسکہ نازک ہے مجھے باندھتے ڈر آتا ہے

جنوں

جنوں تخلص۔ نامش از تخلصِ او مشہور تر نیست:

جو ہاتھ ہار تھا مری گردن کے واسطے — تکیہ بنا ہے وہ سرِ دشمن کے واسطے

چن چن کے کاٹ ڈالتے ہیں اس کو باغباں — جو شاخ ڈھونڈتا ہوں نشیمن کے واسطے

مرنا بھی فائدے سے نہیں خالی اے جنوں — ہوتا ہوں خاک دیدۂ دشمن کے واسطے

حسن

حسن تخلص، میر غلام حسن خلف میر غلام حسین ضاحک تخلص است و مرزا رفیع اما جی

رکیکہ برائے او نظم کردہ۔ تولدش بہ دہلی و نشو و نمایش در فیض آباد اتفاق افتادہ۔ بہ سرکارِ نواب سردار جنگ خلفِ نواب سالار جنگ کامیاب بودہ۔ لہجۂ زبانِ بیگمات از حسنِ صحبت پردگیانِ آئینہ رو، کہ از سرادقِ عصمتِ نواب نامدار بودند و بے حجابانہ لیل و نہار بہ ایشان چشم دو چار می داشت، بہم رسانیدہ و تکلفاتِ امارت و اختراعاتِ طرزِ دلبری و دلداری زنانہ ازاں کہ در مثنوی "سحر البیان"، کہ مشہور بہ "قصۂ بدرِ منیر و بے نظیر" است، بہ مبالغہ گفتہ بہ چشم سر دیدہ۔ جائے کہ غمزہ پامالِ نگاہ و عشوہ صرفِ تماشائے ہر ادا بود، سرِ تلاشِ مضمونِ دل فریب داشتہ۔ القصہ آں جا کہ در ہر کرشمہ صد ادا و در ہر غمزہ ہزار سحر و بلا نمایاں بودند، مضمونے کہ می جُست دست بستہ پیشِ خودی یافت، گویا مضمونِ حاضر را بہ تکلف نسبتہ وداد سخنوری دادہ۔ تا ایں زماں بہ ایں ہمہ کہ شعرائے ہر عصر کوس لمن الملکی نواختہ اند بجنبِ یک داستانِ سحر البیان حکایتے موزوں کردن نتوانستند، چہ مقام آں کہ حرف ترتیب بر زبان آرند۔ در مقامے کہ کلکِ سحر نگارش فسوں کاری کردہ، دقیقہ از طرزِ لطافت و نزاکت فرو نہ گذاشتہ۔ الحق سراپا مثنوی حکمِ مرقع دارد کہ ہر یک داستانش تصویرِ دل پذیر است و ہر پیکرِ شش بہ رنگے کہ زیبائی می خواست بہ اصناف قدرتے داشتہ۔

شبِ وصل صنم ہے آج اے ہمدم کسی ڈھب سے
گریبانِ سحر کو ٹانک دینا دامنِ شب سے

ولہ

یا تو غیروں ہی کا ہو یا کہ وہ دلبر اپنا
آج قصہ ہی چکا لیتے ہیں چل کر اپنا

اپنے شایق کو وہ جب دیکھے ہے تب
تیغِ ابرو تری دکھلاتی ہے جوہر اپنا

غیر کے ہاتھ سے لگوائی جو اس نے مہندی
آج تو خون (رہے) مقرر اپنا

ولہ

اس کے کوچے سے صبا گر ادھر آجاتی ہے
دل کے نالوں کی مفصل خبر آجاتی ہے

گرچہ اس زلف سے کچھ کام نہیں اب تو لیے
سانپ کے کاٹے کی سی اک لہر آجاتی ہے

ولہ

منہ کہاں ہے کہ کہوں جائیے اور سو رہیے
خیر اگر نیند ہے تو آئیے اور سو رہیے

آج کی چاندنی وہ ہے کہ کسی شوخ کے ساتھ کھول آغوش لپٹ جائیے اور سو رہیئے
غم ہوا تھا مرے رونے کا تمھیں کس کس دن منھ مرا آپ نہ کھلوائیے اور سو رہیئے
یوں تو ہرگز نہیں آنے کی تمھیں نیند مگر مجھ سے قصہ مرا کہوائیے اور سو رہیئے
اس ادا کا ہوں میں دیوانہ کہ انگڑائی لے مجھ سے کہتا ہے کہیں جائیے اور سو رہیئے

ولہ

دیکھنے بیٹھا جو وہ مہ اپنے گھر کی چاندنی جب تلک بیٹھا رہا تب تک نہ سرکی چاندنی
اُجلے کپڑوں میں یوں ہے جلوہ گر اس کا بدن دھوپ جیسے شام کی ہو اور سحر کی چاندنی
سیکڑوں عالم دکھاتی ہے حسنؔ دلبر کے ساتھ ٹھنڈی ٹھنڈی باد اور پچھلے پہر کی چاندنی

ولہ

اس کے یہاں رات میں خفا ہو کر لگ کے رونے لگا جو کونے کو
مجھ پہ جھنجھلا کے یوں لگا کہنے کیا کہوں تیرے غصے ہونے کو
منھ پہ آنسو دھرے ہی رہتے ہیں آگ لگ جاوے ایسے رونے کو

ولہ

دروازہ گو کھلا ہے اجابت کا پر حسنؔ ہم کس کس آرزو کو خدا سے طلب کریں

ولہ

تیرے ہم نام کو جب کوئی پکارے ہے کہیں جی دھڑک جاتا ہے مرا کہ کہیں تو ہی نہ ہو

ولہ

ساتھ دیکھوں ہوں کسی کے جو کسی دلبر کو میں بھی جی رکھتا ہوں، مجھ کو بھی ہوس آتی ہے

حسنؔ

حسنؔ تخلص، خواجہ حسن نام خلف خواجہ ابراہیم۔ نظر بہ تصوف داشتہ و صوفی مشرب بودہ، در موسیقی سلیقہ اش دل خواہ، مردِ باکیفیت و دردمند بودہ۔ در فنونِ نظم شاگردِ جعفر علی (حسرت) است و بایکے از طوائفاں کہ بہ بخشی موسوم بود، تعلقِ خاطر داشت:

کیا قتل اور جان بخشی بھی کی حسنؔ اس نے احساں دوبارہ کیا

ولہ

تم نے ایذا نئی صنم بخشی — یہ بھی آپ کی کرم بخشی

حشر

حشر تخلص، رسول بخش نام، باشندۂ خاص بدایوں است۔ در بدایوں از ہنگامۂ شاعریٔ خود قیامت برپا کردہ۔ تلاشِ مضمونِ شاں نسبتِ بندشِ شعر خوش است:

زخمی ہوا ہوں ابروسے پُرخم کو دیکھ کر — رکھنا ہمارے زخم پہ مرہم کو دیکھ کر
یاد آگیا وہ کان کا موتی کسی کا حشر — برگِ سمن پہ قطرۂ شبنم کو دیکھ کر

حسین

حسین تخلص، نواب غلام حسین خاں۔ در شاہ جہاں آباد از رؤسائے عظام است۔ قطع نظر (از) گدازیٔ طبع و مزاجِ عاشقانہ کہ دارد در نظمِ اشعارِ فارسی و ہندی دستگاہے کامل دارد و نہایت خوش فکر و خوش مذاق است۔ ہنگامِ تحریرِ ایں اوراق چند شعرِ ایشاں بیادِ فقیر بودند:

آسماں سے اب بلا نازل زمیں پر چاہیئے — ایڑیوں تک تیری چوٹی اے ستمگر چاہیئے
ڈال کر گردن میں باہیں، تیری آنکھیں چوم لوں — ساقیا مجھ کو نہ شیشہ (اور) نہ ساغر چاہیئے

ولہ

تو بھی دکھلائے جو شوخی تری مژگان میں ہے — خونِ سودا زدگاں رات سے ہیجان میں ہے
کانٹے کھاتا ہے مجھے، راہ میں کیوں کر کاٹوں — جادہ میرے لیے افعی سا بیابان میں ہے

خلیل

خلیل، شاہ جہاں آبادی الاصل۔ از ارشد تلامذۂ خواجہ حیدر علی آتش است۔ برِ شتۂ آتشیں نفس را کلامش کارِ گلزارِ ابراہیم می کند:

پھر کہاں جوشِ جنوں ہے اور پھر کہاں زنجیر ہے — پاؤں میں مجنوں کے دو دن میہماں زنجیر ہے
تو نکل جاتی ہے یا نکل جاتے ہیں ہم — آج میرا اور تیرا امتحاں زنجیر ہے
دیکھ اُسے موسم مجھے یاد آتا ہے برسات کا — سن سنی کرتی گھٹا، برقِ طپاں زنجیر ہے

آسماں بھی ہے گرفتارِ بلا میری طرح
طوق گردن میں ماہِ نو اور کہکشاں زنجیر ہے

ولہ

رعب بٹھلایا ہے قاتل تو نے کس کو مار کے
خم سرِ مرغ ہے آگے تری تلوار کے

خادمؔ

تخلص خادمؔ، خادم حسن نام:

اللہ ری نزاکت کہ ہوا غنچۂ سوسن
بوسے کے تصوّر میں جو اس لب پہ پڑی آنکھ

خالقؔ

خالقؔ تخلص، عبدالخالق نام - مردِ سیاحت پیشہ، جہاں دیدہ است - چندے بہ حضورِ نواب نظیر الدولہ والیٔ بھوپال خوش گذرا یندہ - نہایت خوش گو است - در اکبرآباد فقیر ملاقی گردید، از اتفاقِ ملاقات یکدیگر چندے خوش گذشت:

حنائی پنجۂ رنگیں نہیں، سونے کا پتر ہے
مزا کا ملکہ لوکا برق وش وہ طفلِ زرگر ہے

یہاں تو رشتۂ جاں، اس کا گیسوئے معنبر ہے
غرض ہے سیرِ سنبل سے، نہ مطلب نکہتِ گل سے

رضائی آسمانی ہے، شفق کا رنگ استر ہے
بجائے پنبہ لازم تھا کہ بھرتے چاند کا گالا

کہ مہدِ عافیت جس کے لیے آغوشِ دلبر ہے
دلِ ناداں بھی اپنا کم نہیں لڑکوں کی خصلت سے

گہر ہے بوند پانی کا، عقیقِ لعل پتھر ہے
جواہر سے بھلا اس کے لب و دنداں سے کیا نسبت

نہایت فکر روشن ہے، طبیعت گو مکدر ہے
غزل کیا صاف لکھی، مثالِ آئینہ خالقؔ

خلیقؔ

خلیقؔ تخلص، میر مستحسن نام بن میر حسن صاحبِ "مثنویِ بدرِ منیر" است:

کس کے خرامِ ناز کا پامال ہوں خلیقؔ
لگتی ہے چوٹ دل کو مرے ہر قدم کے ساتھ

خیالؔ

خیالؔ تخلص، غلام حسین نام - دیوانے دارد، مرتب صد ہزار بیت، آبایش از عمائد بودہ اند:

مژگاں کی یہ کاوش نہیں، ناوک فگنی ہے
ابرو کی اشارت نہیں، شمشیر زنی ہے

ولہ

تیرا شگفتگی پہ دل آیا ہے اے خیال   اے غنچہ فسردہ تجھے بھی ہوا لگی

درد

دردؔ تخلص، خواجہ میر علیہ الرحمۃ خلف خواجہ محمد ناصر متخلص بہ عندلیب کہ از احفادِ شیخ بہاؤالدین نقشبند بودہ۔ فضایلِ صوری و معنوی وے خارج از حدِ رقمِ قلم است۔ کلامِ معجز نظامش سراسر عرفان است۔ از مذاقِ تصوف بہرہ حد کامل داشتہ۔ چہار رسالہ مختصر موسوم بہ "آہِ سرد" و "نالۂ درد" و "شورِ عندلیب" و "سوزِ پروانہ" در تصوف تصنیف کردہ:

ان لبوں نے نہ کی مسیحائی   ہم نے سو سو طرح سے مر دیکھا

ولہ

ہم تجھ سے کس ہوس کی فلک جستجو کریں   دل ہی نہیں رہا ہے جو کچھ آرزو کریں

ولہ

تردامنی پہ شیخ ہماری نہ جائیو   دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں

ولہ

دامن دشت ہے پُر لالہ و گل سے یارب   خونِ عاشق بھی کہیں ہووے بہارِ دامن

ولہ

ہر چند نہیں صبر تجھے دردؔ ولیکن   اتنا بھی نہ ملیو کہ وہ بدنام کہیں ہو

آپ تو تھیں ہی پر اس کا بھی کیا خانہ خراب   دردؔ اپنے ساتھ آنکھیں دل کو بھی لے ڈوبیاں

دولہا

دولہاؔ تخلص، نظیر الدولہ جہانگیر محمد خاں والیٔ بھوپال بہ صورت نیکو و بہ معنی دل جوست۔ ہیچو او امیرے خوش انداز و خوش سلیقہ خلق نہ گردیدہ۔ طبعِ نازکش مضمونِ لطیف سبیلے و مناسبتے تمام دارد، ازیں حالت کہ خود ہم پاکیزہ گوست:

بوسہ جو لیا خواب میں اک غنچہ دہن کا   داغوں میں ہے عالم مرے گل ہائے چمن کا

ہے چادرِ مہتاب، پھولوں کی سی چادر — ہے رنگ یہ آنکھوں میں ترے گل سے بدن کا
چھوٹی ہوئی مہندی ترے پانو کی جو ہاتھ آئے — ہوتا ہے تدارک ابھی یہاں دل کی جلن کا
نکہت نہ جہاں گیر ہو دولہا تری کیوں کر — ہے تجھ میں رچا رنگ عروسانِ چمن کا

ولہ

خاک اپنی ہو گئی جو کرئی دلبر سے جُدا — دیدۂ تر سے جُدا شکوہ ہے صرصر سے جُدا

ذوقؔ

ذوقؔ تخلص، شیخ محمد ابراہیم نام، دہلوی، ملقب بہ خاقانیِ ہند، شاعرِ والا رتبہ بلند پایگاہ، کہنہ مشق است۔ بہ استادیِ بادشاہِ دہلی سرمایۂ اعزاز حاصل کردہ۔ استادِ فن و عالی طبع است:

ہم ہیں اور سایہ ترے کوچے کی دیواروں کا — کام جنت میں ہے کیا ہم (سے) گنہ گاروں کا

ولہ

دیکھا دمِ نزع دل آرام کو — عید ہوئی ذوقؔ مگر شام کو

ولہ

خط پڑھ کے اور ہوا وہ اضطراب میں — کیا جانے لکھ دیا اسے کیا اضطراب میں

ولہ

زباں پیدا کروں، جوں آسیا سینے میں پیکاں سے — دہن کا ذکر کیا یہاں سر ہی غائب ہے گریباں سے

ولہ

یہاں تک ناتواں ہیں ہم گذر جائیں اگر جاں سے — اٹھائے مور لاشے کو ہمارے دستِ مژگاں سے

ولہ

مقابل اس رخِ روشن کے شمع گر ہو جائے — صبا وہ دھول لگائے کہ پھر سحر ہو جائے
ہمارے سینے میں وہ آتش ہے ذوقؔ — کہ برق دیکھے تو فی النار و السقر ہو جائے

ولہ

ذبح ہونے کا مزا جانے جو صیدِ حرم — آپ گردن پہ چھری پھیر کے بسمل ہوتا

ہوتی گر صرفِ چمن خاک مری مٹھی بھر — تو جہاں غنچہ ہے گلشن میں، وہاں دل ہوتا
گر سیہ بخت ہی ہونا تھا نصیبوں میں مرے — خال ہوتا ترے رخسار پہ یا تل ہوتا

رغبت

رغبتؔ تخلص، میر ابوالمعالی۔ از لکھنؤ است:

یاد آتا ہے رات کو چھپ چھپ کے وہ آنا تیرا — چٹکیاں میرے دے دے لے کے جگانا تیرا

رقت

رقتؔ تخلص، مرزا قاسم علی۔ اصلش از مشہد مقدس است و در بلدۂ لکھنؤ شاگردِ جرأتؔ بود:

خط وہ بھیجے رقیب کا لکھا — یہ بھی اپنے نصیب کا لکھا

رنگین

رنگینؔ تخلص، سعادت یار خاں خلف محکم الدولہ طہماسپ بیگ خاں۔ در فنونِ سپاہ گری و چابک سواری مہارتے تامہ داشتہ۔ مردِ خوش صحبت و خوش اختلاط بودہ، چند دیوان بہ اصنافِ سخن نظم کردہ، مجموعۂ خود را بہ نورتن موسوم کردہ۔ در اوائل در عیاشی عمر سے بسر کرد و کمالے بہم رسانید۔ آخر الامر بہ صلاحیت وضع پرداختہ، بہ ریاضت و عبادت خوش می گذرانید و ملازم سرکار نواب باندہ بود۔ از غرائب ایں کہ قبل یک سال از انتقال خود می گفت کہ دریں سال رختِ سفر بہ عدم آباد می کشم۔ چوں سبب پرسیدند گفتہ۔ سالہا ست کہ بے خواست مصرعۂ تاریخ فوتِ خود بر زبان جاریست کہ از مرگِ من در سالِ آیندہ خبر می دہد و آخر ہمچناں اتفاق افتاد:

دیکھتے ہیں ان کو ہو جاتے ہیں شادی مرگ ہم — ان کو پاتے ہیں تو پھر ہم آپ کو پاتے نہیں

ولہ

دم بہ دم بسکہ ترا حسن فزوں ہے ظالم — اور جی میں ہے کہ کھچوائیے تصویر نئی

ولہ

نہ اس سے صحبت کس طرح کچھ کہہ نہیں سکتے — وہ ہرجائی اور بن شغل ہم بھی رہ نہیں سکتے

روشن

روشن تخلص، روشن شاہ نام۔ از بریلی است:

دل کی طپش سے گرمیٔ خورشید سرد ہے — سینہ اگر یہی ہے تو دوزخ بھی گرد ہے

زکی

زکی تخلص، مہدی علی نام، مرادآبادی است۔ بمصفقۂ فکرش زنگ آئینۂ خاطرِ معنی پرستاں صافی طبع می رباید و گل بہ مقابلۂ مضمونِ رنگین گریبان چاک زدہ خود را بہ بادمی دہد۔ کلامش چوں گفتگوے محبوباں شیریں است و ادائے سخن طرازیش ہمچو ادائے دل فریبِ ملیحاں نمکیں۔ در شہرِ لکھنؤ، فقیر ملاقی شد، دیوانِ خود را برائے انتخابِ اشعار داد۔ چوں سراسر منتخب بود، اما بہ ایں نظر کہ قندِ مکرر باشد، بعض اشعارش انتخاب کردم۔ شعرائے لکھنؤ او را استادِ مسلم می دانستند:

یہ کیا سبب ہے جو تکلف ہے مہربانی کا — تپاک سے ترے دھڑکا ہے بدگمانی کا
گیا شباب کہ اُڑتی ہے خاک سی منہ پر — غبار چھوڑ گیا، قافلہ جوانی کا
سدا جلے گا دل اپنا کہ گم ہوا چھلا — ہمیشہ داغ رہے گا تیری نشانی کا
نہفتہ رکھتے ہیں رنجش جو عاشق و معشوق — دلوں میں لطف اٹھاتے ہیں بدگمانی کا

ولہ

امرِ سوال ہے نہ اشارہ جواب کا — خانہ خراب صحبتِ شرم و حجاب کا
ہوگا سحر کو تذکرۂ بزمِ خواب — پیری میں یاد آئے گا عالم شباب کا
بسمل تری نگہہ کے تڑپتے نہیں کبھی — پانی بھی مانگتے ہیں تو خنجر کے آب کا

ولہ

کاٹ ہی کرتا رہا ظالم دلِ افگار کا — آسماں ہے کوئی پھاہا مرہمِ زنگار کا
اس کی آنکھوں میں کیا اندازِ شوخی بے اختیار — بے طرح پرہیز چھوڑا مردمِ بیمار کا
ڈھبڈھبائیں وہ خماریں انکھڑیاں آئیں نظر — غسلِ صحت آج دیکھا نرگسِ بیمار کا
رات کو دکھلائے ہے سیرِ شعاعِ آفتاب — اس کے گیسو میں اُلجھنا طرۂ زرتار کا

کیا مزا دیتا ہے ساغر کا چھلکنا اے زکی　　لطف رکھتا ہے بہکنا ساقیِ سرشار کا

ولہ

گل کھائے (تن) یہ چھوٹ کے آغوش یار سے　　زخموں کی بدھیاں ہوئیں پھولوں کے ہار سے
جب یہ سنا کہ پانو میں مہندی لگی وہاں　　لوہو ٹپک پڑا نگہِ انتظار سے
ہر قطرہ تن پہ لگتا ہے چھکا سا یار بن　　چنگاریاں برستی ہیں ابرِ بہار سے

ولہ

نہیں خیال کچھ اس گل کی بے وفائی کا　　بہار پر ہے مزہ تازہ آشنائی کا
جگر کا داغ بنے شکلِ ہلال روز افزوں　　خورش ہے یہ کسی ناخنِ حنائی کا
ہمارے حال پہ لازم ہے رحم او صیاد　　کہ پر شکستہ ہیں اور شوق ہے رہائی کا

ولہ

ہوائے غم نے بگولا مرا غبار کیا　　مثالِ تخت ہوا، تختۂ مزار کیا
دکھائی رات اس افشاں نے بہار　　کہ ماہتاب کی چادر کو زرنگار کیا
تپاک دل نے مرے اشتیاق کے کھوئے　　نگاہِ سوختہ نے خوب انتظار کیا
تڑپ تڑپ کے ہوا خو پذیر بیتابی　　دلِ ستم زدہ نے جبر اختیار کیا

ولہ

شب جو موزوں وصلِ حسن و عشق کا افسانہ تھا　　ایک مصرع شمع، ایک مصرع پرِ پروانہ تھا
دیکھ کر آئینے کو اس نے اتارا اور کہا　　گال کے پھولوں کا سبزہ، سبزۂ بے گانہ تھا

ولہ

تاب کچھ اور ہی تھی جس کا میں دیوانہ تھا　　دل لگی کے لیے وحشت بھی اک افسانہ تھا
حسنِ دل خواہ کا آخر ہوا انجام بخیر　　ہم نے آغازِ خطِ یار سے پہچانا تھا
آتشِ حسن کبھی برقِ جہاں سوز نہ تھی　　آفتِ جان زکی دل ہی کا آجانا تھا

ولہ

کیا کہا میں نے کہ جھڑکی کا سزاوار ہوا　　بات کیا منھ سے نکالی کہ گنہ گار ہوا

بال بھیگے ہوئے، ہاتھوں سے نچوڑے اس نے — شعلۂ رنگِ حنا اور دھواں دھار ہوا
بلبلِ نغمہ سرا تھا، چمنستاں میں زکی — جاکے کوچے میں ترے صورتِ دیوار ہوا

ولہ

اک پری وش پر دل ان روزوں جو ہے آیا ہوا — ہر طرف پھرتا ہوں دیوانہ سا، گھبرایا ہوا
اُڑتی ہیں چنگاریاں دل سے، جو آجاتا ہے یاد — وہ بھبوکا سا بدن کافر کا گدرایا ہوا

ولہ

جو اشک نہ ہوں، خوں مرے دامن پہ نہ آئے — جو شمع نہ ہو گل مرے مدفن پہ نہ آئے
جلدی ہے جو کافر کو شبِ وصل، سحر کی — چوٹی کو یہ قدغن ہے کہ، گردن پہ نہ آئے
اس مہر تجلّی سے لڑا آتا ہے نگاہیں — آشوب کہیں دیدۂ روزن پہ نہ آئے
مسی جو لگائی ہے تو منہ کھول نہ زنہار — تا بات کوئی غنچۂ سوسن پہ نہ آئے

ولہ

بھتے حنائی جو ہاتھ قاتل کے — شعلے اٹھتے ہیں خوں سے بسمل کے
آج ہوگا وہ شعلہ رُو ساقی — پھول جھڑتے ہیں شمعِ محفل کے
عکسِ روئے صنم، مجال یہ کیا — منہ تو دھو آئیں، آئینے دل کے
یاد آیا جو رنجِ تنہائی — روئے سائے سے اپنے مل مل کے
ہاں خبردار، ہوشیار زکی — کشتی پہنچی قریب ساحل کے

ولہ

سینے غربال ہوئے کتنے دل افگاروں کے — دل ہزاروں کے، ہزارے ہوئے، فوّاروں کے

ولہ

یہ رنگ وصف سے ابرو کے آشکار ہوا — کہ خامۂ دو زباں شکلِ ذوالفقار ہوا

ولہ

ان کے بوسے کی طلب، خاموش دلبر ہوگیا — خوبیٔ قسمت سے گویا لعل پتھر ہوگیا

ولہ

بلکہ اس خورشید عارض سے مقابل ہوگیا — کان کے بالے کا حلقہ ماہِ کامل ہوگیا

جب تصوّر کا نشہ مجنوں کا کامل ہو گیا — مردمک لیلیٰ بنی اور دیدہ محمل ہو گیا
اس کے ہاتھوں کی صفائی پر دلِ پر خوں کی شکل — طایرِ رنگِ حنا بھی مرغِ بسمل ہو گیا

ولہ

اس کے عکسِ تن سے ہو گا چنپئی جوڑا سفید — چاندنی کا کھیت، کشتِ زعفراں ہو جائے گا

ولہ

جلوۂ دستِ نگاریں جو بسا آنکھوں میں — شمعِ فانوس ہوا، رنگِ حنا آنکھوں میں
بُو ہے غنچے میں نہاں، یا ترے ہونٹوں میں ہنسی — بند شیشے میں پری ہے کہ، حیا آنکھوں میں
شفقِ صبح پہ ہے شانِ صبوحی ساقی — سرخ ڈورے ہیں کہ، چھایا ہے نشہ آنکھوں میں
عکس ہونٹوں کا ترے لب ہے سیہ مستی کو — اے مسی زیب تو سرمہ نہ لگا آنکھوں میں
اب سبب کیا ہے جو کانٹا سا کھٹکتا ہے زکی — یہ وہی دل ہے کہ رہتا تھا سدا آنکھوں میں

ولہ

صبح تک وہاں آرایش کا ساماں رہ گیا — لب پہ مسّی رہ گئی، ماتھے پہ افشاں رہ گیا
چل بسے اہلِ جنوں، خالی بیاباں رہ گیا — جا بہ جا الجھا ہوا کانٹوں میں داماں رہ گیا

ولہ

عشق سے کیا یاد مزا رہ گیا — دل ہی جب ارمان بھرا رہ گیا
دیکھنے آیا نہ دمِ مرگ یار — اس کو قلق، مجھ کو گلہ رہ گیا
دامنِ آغوشِ زکی میں صنم — کھول کے کیوں بندِ قبا رہ گیا

ولہ

دم الٹتا ہے تپاکِ دلِ ناشاد کے ساتھ — الٹی ہچکی مجھے آتی ہے تری یاد کے ساتھ
دامِ الفت کے گرفتار نہیں، رستہ بپا — آپ سے آپ اڑے پھرتے ہیں صیاد کے ساتھ

ولہ

شمعِ فانوس نے گل کھائے ہیں پروانے پر — واہ کیا نور برستا ہے پری خانے پر
ہوئے ساقی سے خجل، واہ ری کم ظرفیٔ دل — بوسۂ لب کی طلب پہلے ہی پیمانے پر

۹ - پیش خیمہ محمد شاہ بدافعہ احمد درّانی بہ سرہند بموجب حکم حضور گفتہ شد:

دیدم تاریخ فتح شاہنشاہی (۱۱۶۰ھ)

۱۰ - کوچ دفتح نواب صفدر جنگ بمقابلۂ افاغنہ و روہیلہ: نوید فتح وزیر مجھم مبارک باد (۱۱۶۴ھ)

۱۱ - فتح عماد الملک وزیر برقطب خان افغان: سر طرف باد فتح آصف جاہ (۱۱۶۹ھ)

۱۲ - برآمدن شاہ عالم بہادر از محاصرۂ حویلی جعفر خان بکشتن چند کسان عماد الملک:

گفت سلطاں نمود کار رستم (۱۱۷۱ھ)

۱۳ - اخراج قوم روہیلہ بعد کشتن حافظ رحمت خان: اخراج روہیلہ ابد آباد ہمایوں (۱۱۸۸ھ)

۱۴ - مصالحت نواب صفدر جنگ با عماد الملک بعد جنگ شاہجہان آباد وقت رخصت صوبہ:

گفت الصلح خیر قال اللہ (۱۱۶۶ھ)

۱۵ - تشریف آوردن حضرت صاحب میر مدظلہ العیض آباد: کحل دیدۂ بینا باد خاک پائے تو (۱۱۹۱ھ)

۱۶ - مراجعت نواب سعادت علی خاں بہادر از مشرق: بدر کامل برآمد از مشرق[1] (۱۱۹۳ھ)

۱۷ - نابینا شدن شاہ عالم بہادر: گفت آہ از صدقہ برآورد چشم شاہ (۱۲۰۲ھ)

چند صحت یابی کی تاریخیں بھی اسی باب کے آخر میں شامل کر دی گئی ہیں۔ ان کے نمونے بھی ذیل میں درج کیے جاتے ہیں:-

تاریخ صحت نواب آصف الدولہ بہادر از عارضہ دوبارہ ...... دریک سال:

یافت عمر دوبارہ آصف جاہ (۱۱۹۹ھ)

تاریخ صحت برائے ہلاس رائے: بگفت ساقی برحق شفائے عاجل داد (۱۲۰۵ھ)

بیدار نے اردو میں تاریخیں نہیں کہیں، لیکن ان سے (راجہ کرن سنگھ نے) کسی کی تاریخ نوجداری گورکھپور کی اردو میں فرمائش کی۔ افسوس کہ یہ دو شعر کی تاریخ کرم خوردہ ہے جو کچھ پڑھا جا سکا وہ یہ ہے:

امودھا میں تمھارے آونے کی　　　سنی تاریخ جب چارو برن نے

کہا بیدار نے سب کوں مبارک　　　.......... راجہ کرن نے

---

[1] ایک کے تخرجہ کے ساتھ

باب پنجم متعلق تعمیرات ہر قسم

۱ - تاریخ باغیچہ خواجہ منظور اسحاق خان کہ متصل لال دروازہ دار الخلافت ساخت بموجب مرضیِ حضرت خواجہ میر درد گفتہ شد و بعد یک سال وقتِ کتابہ بر سنگِ سفید در اسنادِ آن قدم غلطی سہو ظاہر شد بیت دوم سر انجام یافت مقدور من بے ہنر ہیچمدان نبود محض لعنایت الٰہی و بہ یمنِ حکم آں جناب بخاطر رسید :

بموجب فرمایشِ اول : ہست تاریخ بنا ے ایں باغ + رشکِ فردوس قدم گاہِ علی (۱۱۵۱ھ)

بموجب فرمایشِ دوم : ہست تاریخ بنا ے ایں ریاض + جنت الاقصی قدم گاہ رسولؐ (۱۱۵۲ھ)

۲ - تاریخ باغ و نہر و تالاب نواب عمدۃ الملک امیر خان ، در تخرجہ :

تاریخ بنا ے باغ و نہر و تالاب بے شبہہ نعیم ز کوثر و تسنیم است (۱۱۵۹ھ)

۳ - تاریخ نور افشاں باغ فرمایش ایلچ خاں مرحوم : تواں نوشت بآب طلا ریاض نعیم (۱۱۸۱ھ)

۴ - تاریخ تعمیرِ حسن باغ نائب وزیرِ آصف الدولہ بہادر : (۱) گفت ، رشک جہاں ہمیشہ بہار (۱۱۹۲ھ)

(۲) خضر آمد و گفت ، باغ آصف جاہی (۱۱۹۳ھ)

۵ - باغِ راجہ ٹکیت رائے : گفت ، بیکنٹھ عالم است ہمیں (۱۱۹۳ھ)

۶ - محل کرنیل مارٹن بہادر لبِ دریا ے گومتی ، لکھنؤ :

کارِ فرنگ کردہ ہویدا دریں مکاں + کل نل کلود زندہ انگریز مارٹین

۱۱۹۷ھ ۱۱۹۷ھ

۷ - تالاب و چاہ و نہر و حوض درگاہ حضرت شاہ مرداں فرمایشِ نواب بہادر جاوید خان :

بگفتا ، چشمۂ شیریں بر آمد (۱۱۶۵ھ)

۸ - تعمیراتِ باغ و باولی و حمام و آئینہ محل و حویلی و بارہ دری آصف الدولہ :

جنت بجہاں ہمیں مکانست (۱۱۹۰ھ)

۹ - مسجد درگاہِ شاہِ مرداں دہلی : عبادت خانۂ جاوید آباد (۱۱۶۵ھ)

۱۰ - مسجد سعید الدولہ فرمایش سراج الدین خان آرزو : بیتِ معمورِ مطلعِ انوار (۱۱۶۵ھ)

۱۱ - تاریخِ خطبہ در مسجد طلائی جاوید خان ، پیش قلعہ : خطبہ در مسجد نو بادا مبارک بجہاں (۱۱۶۳ھ)

۱۲-مسجد و امام باڑہ نواب وزیر آصف الدولہ بہادر : ہست بیت اللہ دایم مسجدِ اہلِ جہاں (۱۲۰۰ھ)

۱۳-تاریخ مسجدے کہ جنابِ اقدس قدس اللہ سرہٗ (خواجہ محمد ناصر) تعمیر فرمودہ بودند و بندہ

بدیہہ عرض کردہ : سال ایں قبلۂ دین و دنیا ست مسجدِ خواجہ محمد ناصر (۱۱۵۵ھ)

۱۴-تاریخ حیدر گنج ، فرمایش شاہ عبداللہ کابلی : (۱) رونقِ گنجِ حیدر است دوام (۱۱۶۳ھ)

(۲) رونقِ دہلی ز گنجِ حیدر است (۱۱۶۳ھ)

۱۵-تاریخ عالمگیر گنج کہ پیش از احداث آں بنا برامتحان بدیہہ گوئی لتقید نام حکم کردہ بسیر

مہتاب باغ متوجہ شدند و بوقت مراجعت چوں در صحنِ دیوانِ خاص مصرعِ تاریخ بنظر

گزشت ، بکلماتِ نوازش فرمودند : "بہتر از صد ہزار تاریخ است ، فکر دگر نخواہی کرد ،

موردِ عنایات خواہی شد" :

خسروِ عالم چو بہر راحت و آرام خلق عزمِ آبادیِ ایں گنجِ نکو بنیاد کرد

بندۂ بیدار حسب الحکم تاریخش بگفت شاہ عزیز الدین عالمگیر گنج آباد کرد (۱۱۷۱ھ)

۱۶-روضۂ منورہ حضرت شیخ محمد زبیر رحمۃ اللہ علیہ کہ در بلدۂ سرہند تعمیر شدہ ، زیارت گاہِ

عالم است : الفا شدہ ، روضۂ حبیبِ سبحان (۱۱۵۴ھ)

۱۷-تعمیر مزارِ لامع الانوار امامِ عارفین امیر المحدثین حضرت خواجہ ناصر ، صاحب نالۂ عندلیب ،

رحمۃ اللہ علیہ : (۱) شیر دیں اینجاست می باید ادب (۱۱۷۳ھ)

(۲) بر آستانۂ قدسی بکن زمیں سائی (۱۱۷۳ھ)

۱۸-دروازۂ امام باڑہ مرشد آباد ساختہ نواب مظفر جنگ خانخاناں بہادر :

بابِ فیضِ امام باڑہ کشاد (۱۱۸۵ھ)

۱۹-حویلی اول راجہ تکیت رائے صاحب بہادر : گفت ، دار السرورِ عیش مکاں (۱۱۹۳ھ)

۲۰-حمام راج محل تعمیر نواب وزیر آصف الدولہ : گفت ، بے مثل ہست ایں حمام (۱۱۹۹ھ)

تاریخ تصنیفِ تازہ جناب......حضرات سخنورانِ عصر

۱) (خواجہ محمد ناصر کی کسی تصنیف پر نام درج نہیں) نُسخے معارفِ نصرت شمار از غیب لے سیلہ (۱۱۵۲ھ)

(ب) علم الکتاب از حضرت خواجہ میر درد علیہ الرحمہ : الہام شد معارفِ خاصِ محمدی (۱۱۸۴ھ)

(ج) نسخۂ واردات از حضرت خواجہ میر درد : بگفتا "واردات درد عارف" (۱۱۷۱ھ)

(د) رسالہ درد دل (حضرت خواجہ میر درد : 'درد دل' جلوۂ اثر دارد (۱۱۹۶ھ)

(س) رسالہ شمع محفل (حضرت خواجہ میر درد) : شمع محفل باد روشن جاوداں۔ (۱۱۹۶ھ)

(ہ) رسالہ نالۂ درد (حضرت خواجہ میر درد) : نالۂ درد است ایں باید شنید (۱۱۹۷ھ)

(و) رسالہ آہ سرد (حضرت خواجہ میر درد) : آہ سرد است اینکہ آمد آں ز درد دل بلب (۱۱۹۶ھ)

(ز) نسخۂ 'چمنستان' انشائے بندہ زادہ منشی جیون رام آگاہ : چمنستاں بود ہمیشہ بہار (۱۱۸۴ھ)

(ح) تاریخ اتمامِ تحریرِ کلام اللہ برائے نواب قدسیہ محل فرمایش عصمت اللہ خوش نویس :

خرد بگوشِ دلم "حسن خاتمہ" فرمود (۱۱۶۴ھ)

(ط) تاریخ سفینۂ صاحبہ محل' فرمایشِ بسنت خاں خواجہ سرا احمد شاہی :

بیاضِ دلکشا' سالش رقم شد (۱۱۶۸ھ)

(ی) تاریخ نور الانشا تصنیف لالہ لکھم رام (کنا) منشیِ سید نور الحسن خاں :

بیدار بگفت نورِ حسنِ انشاست (۱۱۸۶ھ)

(ک) تاریخ رسالۂ نجوم تصنیفِ جامع کمالات ہر علوم لالہ بھگونت رائے جیو :

بابِ شرحِ قواعدِ تنجیم (۱۱۹۷ھ)

(ل) تاریخ مثنوی لالہ پتّن لعل آفرین تخلص الہ آبادی کہ در تعریفِ بلدۂ بنارس بخوبی اشتہار

یافتہ : بشنو از ابتدائے بسم اللہ + مدح و تعریف بلدۂ کاشی (۱۱۹۲ھ)

(م) تاریخ الانشا فرمایش سرب سکھ رائے ہمراہیِ راجہ صورت سنگھ :

گوش کن داستانِ دہ یار است (۱۱۹۷ھ)

(ن) تاریخ مرقع (اسدانند) : تحفۂ نادر از نگار قلم (۱۱۹۶ھ)

(س) تاریخ تذکرۂ بھگوان داس ہندی تخلص کہ آں را حدیقۂ ہندی می گویند :

(۱) نامِ خوش بس حدیقۂ ہندیست (۱۱۹۹ھ)

(۲) چمنستان ز لالۂ ہندیست (۱۱۹۹ھ)

اب یہ سوجھی کہ بناوٹ کی لگاوٹ ہے تری　　مدتوں بھولے رہے ہم ترے یاد آنے پر

ولہ

خوں ہو گئی ہے آہ دلِ بے قرار میں　　بجلی گری ہے ٹوٹ کے پارے کی کان پر

ولہ

سوفِ مہ کا دھوکا ہے، خطِ رخسارِ جاناں پر　　ستاروں کا گہن ثابت، مسی مالیدہ دنداں پر
ئیاں ہے ان نشیلی انکھڑیوں سے شانِ خونریزی　　کہ حکمِ ہالۂ خورشید ہے آغوشِ مژگاں پر
طِ عارض لیے جاتا ہے آب و تابِ خوبی کو　　مسافر کاروانِ حسن ہے چاہِ زنخداں پر

ولہ

شمیمِ زلف ہے دوشِ صبا پر　　کہ ہے کالی پری تختِ ہوا پر
سیاہی ہے جو سرخی پر نمایاں　　دھواں ہے شعلۂ رنگِ حنا پر
ہزاروں کو جو دیکھا ہے ہوا خواہ　　دماغ نکہتِ گل ہے ہوا پر
جگر خوں ہے کہ ناحق خونِ دل سے　　کہیں طوفان اٹھے رنگِ حنا پر
تغافل پر ترے جی لوٹتا ہے　　کہ غش کرتا ہوں فہمِ مدعا پر

ولہ

مہ ہو جائے حنائی، لے جو دلبر ہاتھ میں　　صورتِ ہدہد نظر آئے کبوتر ہاتھ میں
ثِ رو ہر آن رہتا ہے، حجاب و شرم سے　　آئینہ کیا بن گیا سدِ سکندر ہاتھ میں
مدنِ دستِ نگاریں کا ہوا روشن جو عکس　　آفتاب آیا نظر، شیشے کا ساغر ہاتھ میں

ولہ

ششِ وحشت ہوا ور دامانِ دلبر ہاتھ میں　　پانو میں بیڑی ہو اور زلفِ معنبر ہاتھ میں

ولہ

بسمل ترے کوچے میں تڑپتا ہووے　　تو بھی ہو گرمِ تماشا تو تماشا ہووے
دہ دکھلائے تو ہو رونقِ بازارِ بہار　　زلف کھولے تو خریدار کو سودا ہووے

ولہ

اری آہ سے ہوتا ہے دل میں تنگ ہنوز　　ہوا سے لڑتا ہے وہ ترکِ خانہ جنگ ہنوز

صفائے تن سے تری تھا گمانؔ صفائی کا　　جو سینہ دیکھا تو سمجھے کہ دل سنگ ہے ہنوز

ولہ

جلوہ گر صبح کا تارا ہے شبِ تار کے پاس　　وہ درِ گوش ہے یا طرۂ طرار کے پاس
اس کی آنکھوں سے گمانِ نظرِ بد ہے مجھے　　نرگسِ چشم نہ آویں دلِ بیمار کے پاس
دلِ مجنوں سے ہم آغوش ہے لیلیٰ کا خیال　　شورِ خلخال ہے زنجیر کی جھنکار کے پاس
اب تلک جیتے رہے دردِ جدائی میں زکی　　شرم آتی ہے کہ کیا جائیے دلدار کے پاس

ولہ

مسی نہ اپنے دانتوں میں اے سیم تن لگا　　پھبتی کہیں گے سب مہ نو کو گہن لگا

زارؔ

زارؔ تخلص، چشم و چراغ میر تقی میرؔ:

کون گل بہر سیر آتا ہے　　باغ پھولے نہیں سماتا ہے
اوچھی پڑتی ہے جب کوئی تلوار　　دہنِ زخم مسکراتا ہے
لاکھ تقلید کیجیے گر زارؔ　　پر کب انداز میرؔ آتا ہے

سرورؔ

سرورؔ تخلص، اعظم الدولہ نواب میر محمد خاں - از ارکینِ شاہ جہاں آباد است - تذکرہ دارد مشتمل بر اشعارِ ریختہ گویاں و صاحبِ دیوان است:

نامہ کس سوختہ جاں کا یہ لیے جاتا ہے　　بازوؤں سے جو ہلاتا ہے کبوتر پنکھا

ولہ

غیر لایا اسے یاں (اہر) تماشاۓ دمِ نزع　　دوستوں سے نہ ہوا وہ جو ہوا دشمن سے

ولہ

عبث سے نامہ و پیغام کی امید مجھے　　ہزار مرتبہ قاصد جواب لایا ہے

سعادتؔ

سعادتؔ تخلص، سعادت علی نام - از مردمِ امروہہ است: ۔

یار سے جو رقیب لڑتے ہیں — یہ بھی اپنے نصیب لڑتے ہیں

سعید

سعید تخلص، قاضی سعید الدین خاں خلف قاضی نجم الدین علی خاں۔ بہ جمیع اوصافِ صوری آراستہ و پیراستہ، سیرتِ ہمت وجود وفضائلکش ہمچو آفتابِ عالم تاب است۔ از مردمِ انتخابِ عالم است، پیوستہ بہ عمدہ روزگاری لبسر کردہ۔ در فنِ شعر ہم رتبۂ عالی دارد:

قفس سے اڑنے کا یاں تک تو ننگ وعار رہا — کہ رنگ کے بھی یہاں اڑنے سے شرمسار رہا

ہمارے ہاتھ نہ آیا کبھی ہزار افسوس — مدام وقفِ حنا پنجۂ نگار رہا

ولہ

زہد میں بھی یاں تلک رغبت مجھے صہبا سے ہے — رشتۂ تسبیح میرا پنبۂ مینا سے ہے

ولہ

بے دماغی اسے کیوں کر نہ ہو ملنے سے مرے — کہ پری کو نہیں خوش آتی ہے انسان کی بو

سلیمان

سلیمان تخلص، مرزا سلیمان شکوہ شاہ زادۂ گردوں وقار، قدر شناسِ معنی طرازاں بودہ۔ در سنہ یک ہزار، دو صد و چہار و پنج ہجری در بلدۂ اکبر آباد بہ سیرِ عالمِ جاوداں رخصتِ سفرِ ہستی لبستہ، نہضت کرد۔ زبان آرائی و سحر پردازئ بیانش از ہر شعرِ او مترشح است، بہ مرتبۂ کمال خوش فکر بودہ:

صدمہ فلک جو دیتا ہے یہاں میری جان پر — روتے ہیں دیکھ دیکھ ملک آسمان پر

ہے لطف پان کھانے کا اس وقت مہرباں — رکھ کر اگال دو مجھے اپنی زبان پر

جو بات ہے وہ قند و شکر سے کم نہیں — مرتا ہوں میں تو اس تری شیریں زبان پر

بیمارِ عشق کی ترے نبضوں کو دیکھ کر — عیسیٰ بھی اپنے ہاتھوں کو رکھتا ہے کان پر

سرمہ لگا کے دیکھے اگر اس طرف کو تو — برقِ نظر نہ کیوں کے گرے اصفہان پر

بے اختیار چونک پڑا، عین خواب سے — رکھا جو میں نے ہاتھ ذرا اس کی ران پر

نالے شبِ فراق کے سنتے رہے سبھی — کھایا نہ رحم ایک نے مجھ ناتواں پر
سر کھول کر نہ مانگ فلک کو دکھائیے — آفت نہ آئے دیکھو کہیں کہکشاں پر
ہر دردِ دل کی تم ہو مجرّب دوا علی — رکھیے شفا و خیر سلیماں کی جان پر

ولہ

جنازہ تیرے دیوانے کا اس توقیر سے اُٹھا — کہ شورِ نالہ ہر اک خانۂ زنجیر سے اُٹھا

سپہر

سپہر تخلص، نامش درم تحریر از یادِ فقیر رفت، شاید میر محمد باشد، اشعارش از نغمہ سرائی ترانہ سنجانِ لکھنؤ شہرتے یافتہ اندکہ ہر غزلش ورد زباں:

مثلِ آئینہ ہوں حیرانِ روئے جاناں دیکھ کر — دل پریشاں ہے مرا زلفِ پریشاں دیکھ کر
یہ تمنّا ہے کہ قاتل پھر نمک افشاں کرے — زخم کا ٹانکا ہر اک ٹوٹا نمک داں دیکھ کر
ٹکڑے ٹکڑے رشک سے لعلِ بدخشاں ہو گیا — اے پری رُواں لبوں پر سرخیٔ پاں دیکھ کر
اے سپہر اللہ سے اپنی یہی ہے التجا — جان نکلے روضۂ شاہِ شہیداں دیکھ کر

ولہ

بیت ابرو کو ہلالی کا نہ دیوان پہنچے — رُوئے گلگوں کو نہ سعدی کی "گلستاں" پہنچے
گئے گلگشت کو تصویرِ رخِ یار لیے — ہاتھ میں ہم لے کے گلستاں پہنچے

سودا

سودا تخلص، مرزا رفیع۔ در قصیدہ گوئی عرفی و در غزل نظیریِ وقتِ خویش بودہ۔ طرز قصیدۂ او بہ زبانِ ریختہ کم از طرزِ قصیدہِ فارسیِ عرفی نہ باشد۔ در ہجو نیز دستگاہے داشتہ۔ مولدش شاہ جہاں آباد و نشو و نمایش در بلدۂ لکھنؤ[1]۔ از مقربان و مخصوصانِ نواب آصف الدولہ بودہ۔ دماغ سودائیاں طرہ مشک تابِ کلامش از عطربیزی مضامین روکشِ نافۂ ختن است و پردۂ گوش از صدائے رنگینیِ بیانش غیرت دہِ بہارِ گلشن۔ جملہ شعرائے ایں زماں اورا استادِ مسلم الثبوت می دانستند:

جی تک تو دے کے لوں کہ تو ہو کارگر کہیں — اے آہ کیا کروں نہیں بکتا اثر کہیں

[1] یہ درست نقطہ ہے۔

نامہ لکھا تھا یار کو، میں یہ سمجھ کے ہے — عالم میں رسم نامہ و پیغام ہر کہیں
اڑتا پھرے ہے نامہ گلی میں، کسی طرف — دھڑ سے جدا پڑا ہے سرِ نامہ بر کہیں
یارو خدا کے واسطے انصاف تو کرو — آتا ہے ایلچی پہ زوال اس قدر کہیں
ہوتی نہیں ہے صبح، نہ آتی ہے مجھ کو نیند — جس کو پکارتا ہوں، سو کہتا ہے مر کہیں

ولہ

ثابت ہو مرا حق وفا روزِ قیامت — گر آنکھ لڑاوے نہ تو محشر کے حکم سے

ولہ

سودا کے جو بالیں پہ گیا شورِ قیامت — خدام ادب بولے ابھی آنکھ لگی ہے

ولہ

بلبل چمن میں کس کی ہیں یہ بدشرا بیاں — ٹوٹی پڑی ہیں غنچوں کی ساری گلابیاں

ولہ

چمن میں اٹھ کے جب اس جنگ جُو کا نام لیا — صبا نے تیغ کا آبِ رواں سے کام لیا
بسانِ طائرِ رنگِ حنا قدم لے کر — ہر ایک کبک نے پیار سے ترا خرام لیا
ادھر شروع ہوا صبح نغمۂ بلبل — اودھر بہار سے ہر ایک گل نے جام لیا
معاشِ اہلِ چمن جائے رشک ہے سودا — کہ زندگی کا انھوں نے مزا تمام لیا

ولہ

کیفیتِ چشم اس کی مجھے یاد ہے سودا — ساغر کو مرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں

ولہ

خانہ پروردِ چمن ہیں آخر اے صیاد ہم — اتنی رخصت دے کہ ہولیں گل سے ٹک آزاد ہم
خندۂ گل بے نمک، فریادِ بلبل بے اثر — اس چمن سے آہ جا کر کیا کریں گے یاد ہم
ذبح تو کرتا ہے ٹک فرصت گلے لگنے کی دے — عیدِ قرباں ہے تجھے دے لیں مبارک باد ہم

ولہ

پونچھ کر چشم کریں ہم جو فشاں دامن — باج خواہاں ہو رگِ ابر سے تارِ دامن

پوچھتا کیا ہے کہ تو کون ہے اُف ہم بھی ہیں / خاکِ راہِ بتِ بے رحم و نثارِ دامن

آتشِ عشق جو ذرہ ہو کسی دل میں بھسر / کرتی ہے جنبشِ مژگاں تری کارِ دامن

ولہ

مژہ اس چشم کا کھٹکے ہے دلِ مفتوں میں / نیشتر پیرے ہے لوہو کی پڑی جیحوں میں

سبقِ ناز لیا کن نے چمن میں کس کے / جنبشِ لب نے لٹائے ورقِ گل خوں میں

موسمِ گل ہے جہاں میں تو ہمیں کیا سودا / اپنے جی سے یہ عداوت ہے کہ دلِ گردوں میں

ولہ

شب کو خاطر میں اگر قصد صبوحی ہووے / نمکِ صبح ملا دے وہ، مئے گلگوں میں

ولہ

بلبلِ تصویر ہوں جوں نقشِ دیوارِ چمن / نے قفس کے کام کا ہرگز نہ درکارِ چمن

کیا گلہ صیاد سے کریے یوں ہی گذری ہے عمر / اب اسیرِ دام ہیں، تب تھے گرفتارِ چمن

لختِ دل گرتے خزاں میں جاے برگ اے عندلیب / ہم اگر ہوتے تری جا گہ دلِ افگارِ چمن

فصلِ گل آخر ہے یارو دیکھ لو نرگس کو ٹک / باغ میں مہماں کوئی دن ہے یہ بیمارِ چمن

ولہ

اتنا تو یوسف سے مشابہ کہ عدم سے / پردے میں چھپا اس کے تئیں تجھ کو نکالا

ولہ

سود جوں شمع نہیں گرمیٔ بازار مجھے / ہوں میں وہ جنس کہ آتش دے خریدار مجھے

ولہ

نے ضررِ کفر کو، نے دین کا نقصاں مجھ سے / باعثِ دشمنی اے گبر و مسلماں مجھ سے

ولہ

ہزاروں نیش زن پاتا ہوں یاں میں کام میں اپنے / ترے گھر سے تو ظالم خانۂ زنبور بہتر ہے

سوز

سوز تخلص، میر محمد نام۔ از لکھنؤ است۔ بہ خواندنِ اشعار بہ طرزِ مطبوع مشہورِ جہاں است:

میں اگر قیدِ حیات سے چھوٹوں ناصحا تیری بلا سے چھوٹوں

سحرؔ

سحرؔ تخلص کاتب الحروف احمد حسین - از ابتدائے سنِ تمیز تا ایں دم بہ تلاشِ کلامِ موزوں عمرے بسر کردہ و با اکثرے از شعرائے فی زماننا سرگرمِ اتحاد پرستی ہا بودہ و از سخن پردازئ ہر یک بہرۂ بر داشتہ - تذکرہ ہائے مبسوط در زبانِ فارسی و ریختہ زاید از پنجاہ جلد دیدہ - انچہ از طبعِ نارسا بہ انتخاب درآمد تلمش بر داشتہ و از شاعرے کہ ملاقات دست دادہ از زبانش انچہ سامعہ نواز گردیدہ بہ حکمِ مکتبہ از کتابے و ذرہ از آفتابے بہ تالیفِ ایں تذکرہ پس از مدتِ دراز پرداخت دلم خواست کہ بہ سلکِ منتسبان و منتظمانِ ایں معنی خودرا بہ اتہامِ شعرگوئی شہرہ دہد و چوں اتفاقِ موزوں کردنِ اشعار شاذ و نادر افتادہ بہ مقتضائے النادر کالمعدوم، نیز مناسب نہ می دانست کہ شعرے از موزوں کردۂ خود داخلِ تذکرہ کند - لیکن بعض یارانِ طریقت کہ از فکرِ ناقصِ ایں ننگِ خلایق آگاہی داشتند، بہ گذاشتند کہ ازیں معرکہ دست کشیدہ پا بیروں گذاردہ، لاجرم محض بہ تحریرِ یک غزل کہ سراسر ہزل است، اکتفا کردہ، گویا برائے تصدیقِ قولِ خویش شاہدے آوردہ است - ازیں پیش آشفتہ تخلص می کرد، اکنوں بہ نظرِ ایں کہ خوشہ چینِ خرمنِ استفادۂ استادی غلام میا ساحرؔ ہستم، سحرؔ تخلص پسندیدہ ام:

ہے نگاہِ آتشیں، برقِ شرر افشاں نہیں شعلۂ بے دود ہے، رخسارہ تاباں نہیں
شامِ غربت ہے ہماری، گیسوئے جاناں نہیں صبحِ روزِ عید ہے، اس کا رخِ خنداں نہیں
ہے خمِ تیغِ ہلالی، ابروئے جاناں نہیں یہ سخ ہے لختِ دلِ بریاں کی وہ مژگاں نہیں
قطرۂ شبنم ہوئے ہیں، غنچۂ سوسن میں جمع یہ مسی آلودہ اس گل کے لب و دنداں نہیں
جلوۂ مہتاب کا عالم نمایاں ہے یہاں شمع بے فانوس ہے، وہ سیم تن عریاں نہیں
پردہ داری میں کہاں نشو و نمائے حسن ہے تیغ کا جوہر ہے پنہاں، جب تلک عریاں نہیں
جلوہ گر یک جا شفق کے پردے میں ہیں دو ہلال تیرے او خورشید رو ہونٹوں پہ رنگِ پاں نہیں
ہے نظر کو خیرگی اس روئے آتشناک پر یہ شعاعِ مہر ہے، جبینِ حسنِ جاناں نہیں

ساعدِ سیمیں سے کچھ رتبہ نہیں الماس کو — پنجۂ رنگیں سے بہتر، پنجۂ مرجاں نہیں
خط نکل آنے پہ بھی اب تک دماغ حسن ہے — کاروانِ حسن لٹتا ہے، یہ جنس ارزاں نہیں
آتشِ گل سرد ہے، دیکھ اس کی گرمیٔ شباب — آفتابِ صبحِ گلشن ہے، گلِ خنداں نہیں
بحرِ مواجِ لطافت ہے وہ رشکِ نوبہار — ہے حبابِ آبِ گل، اس شوخ کے پستاں نہیں
یہ نکلتا ہے پسینہ، یا کہ کھچتا ہے گلاب — گرمیٔ سیرِ چمن سے وہ عرق افشاں نہیں
سحر ایسا کون سا ہے جو ترے جوہر کو دیکھ — مثلِ آئینہ وہ از سرتا بہ پا، حیراں نہیں

شہیدی

شہیدی تخلص، کرامت علی نام، وارستۂ مزاج و آنادہ وضع، از گنجینۂ طبع معنی ہزار معنیٔ تازہ بروں انداختہ۔ گاہے بہ مقتضائے سخن پرستی و شوریدہ سری تعلق خاطر بہم رسانید۔ در شاعری و نادرہ بیانی اُو ہمہ را اتفاق است۔ در آخر عمر از ہدایتِ باطنِ مصفا بے اطلاع یارانِ خویش بہ زیارتِ حرمین شریفین رختِ سفر بستہ تا عرصۂ دراز مفقود الخبر بود۔ چوں نیتِ مستحکم و عزمِ مصمم داشت از حسنِ عقیدتِ خویش بہ زیارتِ بیت اللہ مشرف گردیدہ و مناسکِ حج ادا کردہ بہ عارضۂ شدید مریض گردید۔ در عینِ شدتِ مرض کہ قطعِ امیدِ ہستی کردہ بود، بہ کمالِ غلوے شوق عزیمتِ مدینۂ منورہ کرد و می خواست کہ بہ زیارتِ قبۂ شریفۂ روضۂ منورۂ مزارِ مصطفوی صلی اللہ علیہ وسلم جلاے نورِ بصر کردہ جان جاں آفریں را تسلیم کند۔ چوں از یمنِ حسنِ ارادت خاتمہ اش بہ خیر بود۔ بہ ایں ہمہ کہ از مسافتِ بعید بہ سببِ تشددِ عارضہ، چشم وا کردن ہم از شدتِ ضعف اورا گراں می آمد۔ ہرگاہ کہ گنبدِ روضۂ مطہر از دور بہ نظرِ مردم جلوہ گر شد، مشتاقاں را بہ مصداقِ ایں کہ ؎

وعدۂ وصل چوں شود نزدیک — آتشِ شوق تیز می گردد

انبساط و سرورِ خاطر یا کہ رو نمود، خارج از حصرِ بیان ست و مردماں بہ آوازِ بلند گفتند کہ "اینک گنبدِ مزارِ شریف است"۔ شہیدی کہ چشم بہ انتظارِ مشاہدۂ لقاے گنبد پر نور بود، دفعتہً چشم وا کرد و شاعرِ شوق از دیدۂ دلش ہمگر بیست۔ و پس ازاں چشم از نظارہ بربست و جاں داد۔ ہم گناں ازیں واقعہ دستِ تاسف مالیدہ، نعشِ او بہ مدینۂ منورہ آوردند۔

شریفانِ مدینہ در جوارِ روضہ اش جا دادند و دفن کردند:

سروِ قد سے اٹھا ہاتھ جو انگڑائی کو
مستزاد اس لے کیا مصرعِ رعنائی کو
کیا گلا کاٹ، سرِ شام فراغت پائی
ہم نے اک لحظہ میں کام شبِ تنہائی کو

ولہ

تیری جمعیت کا شیرازہ، دلِ مضطر کھلا
آج گندھوانے کو شاید اس پری کا سر کھلا
چاندنی میں سیر تھی، کترے ہوئے مقیش کی
طرفہ گورے رنگ پر الماس کا زیور کھلا
چوم کر دفتیں کرشمہ ابروے خمدار کا
بول اٹھی مشاطہ آج اس تیغ کا جوہر کھلا
آسماں کے ہاتھ سے درشد خلافِ عقل ہے
اے شہیدی رازِ بیراخلق پر کیوں کر کھلا

ولہ

خطِ مشکیں، لبِ رنگیں، رخِ تاباں ہوگا
ناز و شوخی میں نہ تجھ سا مہِ کنعاں ہوگا
کرتے ہو نیم نگہ پر مرے دل کا سودا
نہ خریدو یہ ابھی اور بھی ارزاں ہوگا

ولہ

سپیدی چشم کی زائل ہو دیدارِ عزیزاں سے
اڑایا ہم نے یہ نسخہ بیاضِ پیرِ کنعاں سے

ولہ

بلا سے رہے اس کا زمستاں میں یہ کہنا شبِ وصل
نہ اترتی، نہ میری ہوتی حمایل ٹھنڈی

ولہ

چاند نکلا تھا کدھر، کیا ترے جی پر آیا
شام کے وقت جو تو آج مرے گھر آیا
جب گیا غیر تری بزم سے دل شاد گیا
جب میں آیا ترے کوچے سے مکدر آیا
جلد انصاف چکا خلق کا اے داورِ حشر
پھر قیامت ہے جو وہ شوخ ستمگر آیا
نام میت کا سنے غش جسے آ جاتا ہو
وہ شہیدی کے جنازے پہ مقرر آیا

ولہ

پاؤں رکھتے کوچۂ قاتل میں سر جاتا رہا
تھوڑی جرأت میں بہت دردوں کا ڈر جاتا رہا
وصل کی تدبیر کا خواہاں رقیبوں سے ہوا
تیری فرقت میں مرا ہوش اس قدر جاتا رہا

سکر میں بھی کم نمازِ جمعہ کی میں نے قضا — میکدے سے سوئے مسجد دوش پر جاتا رہا

ولہ

چودھویں رات کا چاند نکلا پھیلی گھر گھر چاندنی — رنج دے گی آج ہجوروں کو شب بھر چاندنی
دل شکستہ مستحق تر ہیں ترے انوار کے — آتی ہے ٹوٹے محل میں پہلے اکثر چاندنی

ولہ

میرے زخموں پر نمک سے مشک بہتر مشک سے — سودۂ الماس بہتر سب سے بہتر چاندنی
ذبح کرتی ہے مجھے بے تیغ و خنجر چاندنی — کس قدر بے رحم ہے اللہ اکبر چاندنی

ولہ

کھل گیا رازِ چھپی چاہ سب محفل پر — نام لے کر جو مرا اس سے پکارا نہ گیا
جان کیوں دی ہے برائے عوض لے طائرِ دل — تو تو صدقے بھی کسی روز اتارا نہ گیا
عید کے روز سبھی اس سے گلے مل آئے — نہ گیا ایک تو میں رشک کا مارا نہ گیا

شیفتہ

شیفتہ تخلص، نواب مصطفیٰ خاں، صاحب تذکرہ گلشن بےخار۔ از مشاہیر و اعیانِ شاہ جہاں آباد است۔ جوہر قابلیت و کمالش از مشاہدہ نظم و نثر تذکرہ اش می تواں دریافت کلکِ آشفتہ رقم یارا سے تحریر توصیفش نہ دارد:

ہے خراشِ ناخنِ غم میں بھی کیا بالیدگی — جو ہلالِ غرہ تھا سو، ماہِ کامل ہو گیا
ہاتھ اٹھایا اس نے قتلِ بے گنہ سے میرے بعد — طالعِ اغیار سے جلّاد عادل ہو گیا

ولہ

شعلہ رو یار و شعلہ رنگ شراب — کام یہاں کیا ہے دیدۂ تر کا
نقشِ تسخیرِ غیر کو اس نے — خوں لیا تو مرے کبوتر کا

ولہ

تاب لجے کی کسے دیں بھی وہ اب شیفتہ اگر — کر چکی کام یہاں لذتِ دشنام اپنا

ولہ

ہائے اس برقِ جہاں سوز پہ آنا دل کا — سمجھے جو گرمیٔ ہنگامہ جلانا دل کا

ولہ

پھر بھی کھوگئے چھیڑنے کی ، اپنی خو نہیں   عطر سہاگ ملتے ہو وہ جس میں بو نہیں
ہرجائی اپنے وحشی کو کس منہ سے کہتے ہو   کیا آپ کا نشانِ قدم کو بہ کو نہیں

ولہ

دعوے ہیں بوالہوس کو عجب مال وجاہ میں   الماس ریزے فرش ہیں خواب گاہ میں

ولہ

کرتا ہوں میں تعریف زبس اس کے دہن کی   لیتے ہیں مرے لب مری تقریر کے بوسے

شاد

شادؔ تخلص - از نام و نشانش آگہی نیست :

لب ہلا دے کبھی بس ایسی بھی رعنائی کیا   کام آئے گی قیامت کو مسیحائی کیا

شعوری

شعوریؔ ، از دورۂ سابقین است :

پھرتا رہے ہے چارپہر مضطر آفتاب   روشن ہے یہ کہ محو ہوا تجھ پر آفتاب

شکستہ

شکستہؔ تخلص ، مرزا یوسف علی خلف نواب شجاع الدولہ بودہ است :

خرامِ ناز ترا بس مری نظر میں رہا   تمام عمر ہی بیٹھا میں رہ گذر میں رہا

ولہ

پروانہ دار جل کر گو خاک ہوگئے ہم   پر شمع رو نہ چوکا اپنی شرارتوں سے

شرر

شررؔ تخلص ، علی بخش نام - از رئیسانِ قصبہ بدایوں است - بسیار خوش فکر و عالی طبع است -

صاحب

در تذکرہ "گلشنِ بے خار" مرقوم است کہ بیگمے است مشہور بہ صاحب جی - مثنوی

"قولِ غمیں" مصنفہ مومن خاں شرحِ نسخۂ حسن و جمال اوست۔ بہ فیضِ صحبتِ خاں مشارٌ الیہ صاحب تخلص امۃ الفاطمہ نام دلش بہ شعر و شاعری میل کرد۔ از موزونیِ قامت بہ موزونیِ طبع گرائید و از آرایشِ زلفِ پریشاں بہ موشگافیِ اشعار پیچید۔

کھولے ہیں اس نے پیرہنِ یوسفی کے بند — تکرار کے نسیم سے کہہ دو قبائے گل

ولہ

جو خطِ جبیں کا مرے کاتب ہے اسی کو — دکھلا تو مرا نامۂ اعمال الٰہی

طور

طورؔ از تلامذۂ برقؔ است۔ تجلیٔ طور بافکر روشن او ہم جیب است۔ بشعرائے معنی فہم بہ مقابلۂ مضامینِ تازۂ او چشم از نظارۂ اشعارِ دیگراں فروبستہ حرفِ لن ترانی برزبان دارند۔ فی زمانا در لکھنؤ ہنگامہ گرم کنِ شاعری ست۔

یار کے رخ کے نظارے زیست کے آثار ہیں — ہم کو آنکھوں سے زیادہ روزنِ دیوار ہیں

سر خیالِ چشم و ابرو میں اٹھا سکتا نہیں — مست دو کھینچے ہوئے سر پر مرے تلوار ہیں

بر سرِ پلنے سے ہیں تابت ہوا اے ماہ وش — تیری جوتی کے ستارے کوکبِ سیّار ہیں

در اگر در یاں نہ ہو لیں گے تو ڈالیں گے اکھیڑ — طورؔ ہم بھی تو غلامِ حیدرِ کرار ہیں

ولہ

طوق و زنجیر پہنے طفلی میں — عشق تو بھی گلے کا ہار رہا

ولہ

نشہ اس کی آنکھوں میں آیا تو یہ کہنے لگا — میں وہ مے کش ہوں کہ میرا مست پیمانہ ہوا

اس کے پستاں کے تصور میں جو رو دیا میں لہو — اشکِ رمّانی انارِ خلد کا دانہ ہوا

آنکھیں دکھلانی ہوئیں منظور تو سرمہ دیا — ہاتھ رنگیں کر لیے گر رنگ کچھ لانا ہوا

ظفر

ظفر تخلص مرزا ابو ظفر بادشاہ دہلی بہ فنِ شعر میلے تمام دارد۔ ابراہیم ذوقؔ از مخصوصانِ حضرت است و اشعار ایشاں بہ اصلاحِ او چو گوہر آبدار اند:

ہمارے آگے ہے ذکر اگلے دوستداروں کا پرانے مردوں کی وہ ہڈیاں اکھاڑتے

ولہ

اب بھی وہ آنکھ تری آئینہ رو ہے کہ نہیں اگلے طوروں پہ خدا جانے تو ہے کہ نہیں

ولہ

دیدِ گل کے تجھے پڑ جائیں گے لالے بلبل پڑ گئی گر کسی صیاد کے پالے بلبل
باغ میں خانۂ صیاد سے اُڑ کر آئی بارے پھر تونے پر و بال نکالے بلبل

عاشق

عاشق موسوم بہ آغا حسین قلی خاں، صاحبِ تذکرہ "نشترِ عشق" کہ فارسی گفتہ،
بدحواسی ہے یہاں تک پہونچنے کو اشک کے چشم کو بھول کر رکھتا ہوں سر پر آستیں

ولہ

بجز رفاقتِ تنہائی آسرا نہ رہا سوائے بےکسی اب کوئی آشنا نہ رہا

عشق

عشق تخلص، حکیم عرف اللہ خاں دہلوی است:
تم غیر کے گھر بیٹھ کے دل شاد کرو گے ہم کون ہیں صاحب، ہمیں کیوں یاد کرو گے

ولہ

کل رونے کی آمد سے گھٹا جائے تھا دم ہائے ہوتی ہے بلا موسمِ برسات کی گرمی

عشق

عشق تخلص، شیخ غلام محی الدین کہ مبتلا ہم تخلص دارد، از سکنائے میرٹھ است:
کہے ہے سن کے وہ مبتلا کے قصے کو کہ خوابِ ناز کو یہ تازہ اک فسانہ ہوا

عیشی

عیشی تخلص، طالب علی خاں نام، لکھنوی است۔ چہرہ شاہد نظم و نثر بہ مشاطگی طبع معنی
آفریں ہر صفت کردہ و نظم دیبج طرۂ مضامینِ رنگیں پر عذار دل فریب اشعار آراستۂ اوست
بہ فارسی و زبان ریختہ شعر می گفت دہر دو دل پذیر و مطبوعِ زباں داناں بودہ۔ در عہدِ شش

جملہ شعرا فصیح اللسان اور امی گفتند۔ دیوانے مشہور دارد، شایقان معنی حرز جانش کردہ اند۔

یاد اگر یارانِ رفتہ کی کوئی دم کیجیے
روئیے ایسا کہ دامانِ فلک نم کیجیے

یاد کرتا ہے کسی کو کوئی بعد از مرگ دوست
دے فلک مہلت تو اپنا آپ ماتم کیجیے

کشتۂ فرقت ہوں، تربت پہ مری کرنا یہ نقش
ربط جتنا ہو سکے احباب سے، کم کیجیے

ولہ

محمل سے پرے قیس کو کہہ دے کوئی ہٹ جائے
صدمے سے جگر ناقۂ لیلیٰ کا نہ پھٹ جائے

آہستہ ہنسے گل بر بالیں پہ ہماری
تنہائی کی شب ہے نہ کہیں نیند اچٹ جائے

وہ نخلِ حنا ہوں کہ یہاں سر بھی جو کٹ جائے
خوں دست بہ دست اپنا حسینوں ہی میں بٹ جائے

ولہ

گل غرق کرے اب خجالت میں تن اپنا
گلشن کی اگر سیر میں ہو گل بدن اپنا

سوزِ طپشِ دل سے کبھی کی تھی شکایت
پُر آبلہ سارا ہے اسی سے بدن اپنا

ولہ

جونہی لیلیٰ نے دیکھا قیس کو محمل کے پردے سے
اٹھے لاکھوں ہی نالے گرم اس کے دل کے پردے سے

ولہ

دام میں بال و پرِ طایرِ گلشن ٹوٹے
جورِ صیاد پہ برقِ شرر افگن ٹوٹے

ایک آئینے کا افسوس ہے تجھ کو ظالم
ہاتھ سے تیرے ہزار دل دلِ روشن ٹوٹے

بادمِ سرد یہ کہنے لگی لیلیٰ جس دم
پائے مجنوں بہ گرانباریِ آہن ٹوٹے

ایسے دیوانے کو زنجیر کیا تھا یارب
دستِ آہن گرو دندانۂ سوہن ٹوٹے

ولہ

گر مرغِ گلستاں مری گفتار اڑا لے
ہر بات میں رنگِ رخ گلزار اڑا لے

پوچھی جو خبر ہم نے اسیرانِ قفس کی
پر توڑ کے صیاد نے دو چار اڑا لے

پرواز کی طاقت نہیں زنہار پروں میں
اللہ یہ گلستان کی دیوار اڑا لے

تو ہاتھ نامہ و پیغام سے سیلی
قاصد کبھی تا نہ لذتِ دیدار اڑا لے

سلجھتے ہی نہیں موئے سرِ زلف اس کے شانوں سے | الجھتے ہیں نکجی رکھتے ہیں کیوں ہم ناتوانوں سے
سکتا کوئی، زخمی کوئی اور بسمل کوئی قاصد | گلی کو اس کی تو پہچان لینا ان نشانوں سے

ولہ

اثر میں ہو گئی عشاق کی دعا الٹی | الٰہی کیسی چلی عرش پر ہوا الٹی
نہ پہنچی ضعف سے وہاں تک تو پھر چلی آخر | گلو سے جانبِ دل آہ نارسا الٹی

ولہ

کام جب گریہ سے یہ دیدۂ تر لیتا ہے | قاصدِ اشک ثریا کی خبر لیتا ہے
دل گرفتہ ہوں کروں گا ہو کے میں آزاد کیا | مجھ کو یکساں ہے چمن کیا، خانۂ صیاد کیا
زخمِ کاری جسم پر کشتوں کے جانِ تازہ ہے | آبِ حیواں میں بجھا تھا خنجرِ فولاد کیا

غریب

غریبؔ تخلص، شخصے متوطنِ مراد آباد ست:

گھر چھوٹا، شہر چھوٹا، لیک نہ چھوٹا غمِ عشق | ہم تو غربت کی اسی بات کے دیوانے ہیں

غافل

غافلؔ تخلص، رائے سنگھ نام:

وصف کرتا ہے ان لبوں کا جب | غافلؔ اس وقت لعل اُگلتا ہے

غافل

غافلؔ تخلص، نامش معلوم نیست۔ از لکھنؤ است و از تلامذۂ مصحفی

چمنِ کو چۂ جاناں سے یہ کیا آتی ہے | ناز کرتی ہوئی جو بادِ صبا آتی ہے
کس کے میں دستِ نگاریں کا ہوں کشتہ یارو | ہر گلِ زخم سے جو بوئے حنا آتی ہے
صبح کس طرح سے ہوگی شبِ تاریکِ فراق | نہ تو نیند آتی ہے مجھ کو نہ قضا آتی ہے

فضل

فضلؔ تخلص، فضلِ مولیٰ خاں نام۔ از سرزمینِ لکھنؤ است۔ بہ شاہ جہاں آباد رفتہ، قصیدہ بہ مدحِ اکبر شاہ گفتہ، خطابِ وحیدِ عصر افضل الشعرا یافت۔ حیف است کہ نوجوان مرد۔

اور دی مسّی وہ اس کی کہ مینے پہ حرف ہے — لب وہ کہ لعل کے بھی نگینے پہ حرف ہے

فصیح

فصیح تخلص، مرزا جعفر علی - از شعرائے لکھنؤ است و از تلامذۂ ناسخ

مجھ میں اک عیب بڑا ہے کہ وفادار ہوں میں — تم میں دو وصف ہیں، بدخو بھی ہو، مغرور بھی ہو

فغاں

فغاں تخلص، اشرف خاں کوکہ احمد شاہ بادشاہ - از اعیان شاہجہاں آباد بودہ:

ممکن نہیں کہ غیر نہ ہوئے رکاب میں — تجھ کو خدا نہ لائے ہمارے مزار پر

ولہ

نہ کھولیے ترے بند قبا تو کیا کیجے — دلِ گرفتہ کو ظالم کبھی تو وا کیجے

فرخ

(کذا) فرخ تخلص، فرخ بخش نام - از مردم شوخ بازاری است و بادل دادہ خویش سرگرم دلدہی و دلداری:

ہمارے قتل کی تدبیر بہ تقصیر ہوتی ہے — نگاہِ پاک کی شاید یہی تاثیر ہوتی ہے

قایم

قایم تخلص، قیام الدین نام - از تلامذۂ رفیع السودا است:

غیر سے ملنا تمھارا سن کے گو ہم چپ رہے — پر سنا ہوگا کہ تم کو اک جہاں نے کیا کہا

ولہ

تا بہ فلک نالہ تو پہنچا تھا رات — میں ہی کچھ اللہ کا ڈر کر گیا

ولہ

کوچہ گردی دل مجنوں نے مرے کی ایجاد — مبتذل جان کے ڈھب بادیہ پیمائی کا

ولہ

طوفانِ گریہ کی ہے مرے حد اک عمرِ نوح — دریا نہیں کہ آج چڑھا کل اتر گیا

ولہ

دو چیز ہیں یادگار دوراں — تیرا ستم، اپنی جاں فشانی

ولہ

کس دل پہ داغِ غم نے نہ تیرے بہار کی　　اللہ رے دھوم اب کے برس لالہ زار کی

قدرت

قدرت تخلص، قدرت اللہ نام - از رام پور است :

لاکھوں جِلائے مُردہ صد سالہ آن میں　　فیضِ دمِ مسیح ہے اس کی زبان میں

انصاف بھی ضرور ہے، یہ ظلم تا کجا　　کتنوں کے گھر تو جاتے رہے امتحان میں

قاسم

قاسم تخلص، قاسم علی خاں نبیسۂ عطا حسین خاں، تحسین تخلص، صاحبِ "نو طرز مرصع"

آج دعویٰ اس کی یکتائی کا باطل ہو گیا　　بحث کرنے کو جو آئینہ مقابل ہو گیا

کیوں نہ ہووے عالم اس کا تختۂ مشقِ ستم　　وقتِ بسم اللہ معلّم جس کا بسمل ہو گیا

کلیم

کلیم تخلص، شیخ کلیم اللہ، ساکنِ شیر کوٹ :

جلوۂ طور رخِ یار سے پیدا ہووے　　خجل اعجازِ تکلّم سے مسیحا ہووے

کرم

کرم تخلص، شیخ غلام ضامن، تلمیذِ مومن خاں است :

تیر خوردہ ہمارشک سے کیا کیا تڑپا　　استخواں میں مرا دیکھ کے پیکاں تیرا

ولہ

زلف مژگاں سے لپٹتی ہے خدا خیر کرے　　مشک آلودہ کہیں خنجرِ براں ہوگا

ولہ

اس کو شہرت کی تمنّا، مجھے رسوائی کی　　ہر کوئی آرزوئے نشو و نما رکھتا ہے

گویا

گویا تخلص، فقیر محمد خاں، یکہ تازِ میدانِ معنی و شہسوارِ عرصۂ سخنوری - از امرائے ذی شوکت و جاہ است - اکثر از علماء و شعرا ذلہ ربائے [illegible] بانش ہستند. از دیوانش

مطبوعش چند اشعارِ ریختہ، خامہ معنی طراز است:

وصف لکھتا ہے کس گل تر کا | ہر رگِ گل ہے تارِ مسطر کا
آہِ موزوں کے ساتھ نالہ کروں | خوب مصرعہ ہے یہ برابر کا
یادِ دنداں میں ہم جو رو دیں کبھی | اُٹھے طوفان آبِ گوہر کا

ولہ

واہ ری تلووں کی رنگت نقشِ پا گلگوں ہوا | ہائے لیے قد سرو جس کے سائے سے موزوں ہوا
تذکرے سے رُخ کے گویا صاف تھے آثارِ صبح | ہو گئی شب پھر جو ذکرِ گیسوئے شب گوں ہوا

ولہ

ہلال نعل بنا، چرخ نعل بند ہوا | سمندِ یار کو تس پر بھی نا پسند ہوا
نہ آئے آپ میں ہم، یار پھر گیا آ کر | مزاج اپنا یہ خود رفتگی پسند ہوا
یہ ان دنوں مرے یوسف کا گرم ہے بازار | قدم رکھا جو خریدار نے سپند ہوا

ولہ

گھر میں اک ماہ لقا کے ہے گزارا اپنا | ان دنوں برجِ قمر میں ہے ستارا اپنا
قبر کو دیکھ کے اس ماہ نے منہ پھیر لیا | کیوں فلک اب بھی ہے گردش میں ستارا اپنا

ولہ

کب کہتا وہ نوجواں آ بیٹھے ہم پیروں کے بیچ | جو کماں کو بھی نہیں رکھتا کبھی تیروں کے بیچ
تیر جو میرے لگا ہے سو لبِ معشوق ہے | اس لیے ہے ناز مجھ کو سارے نخچیروں کے بیچ
تشنہ کام ایسا ہوں اے قاتل کہ میرے واسطے | جوہروں سے موجزن ہے آبِ شمشیروں کے بیچ

ولہ

کیا ہی افشاں ہے جبین دابروئے خمدار پر | ہے چراغاں آج کعبے کے درو دیوار پر
نقش پا سے پنج شاخہ قبر پر روشن کرو | مر گیا ہوں میں تمھاری گرمیِ رفتار پر

ولہ

ہے ترے رخ سے آفتاب خجل | کف پا سے ہے ماہتاب خجل

آگے گویا کے منفعل بلبل — تجھ سے اے رشکِ گل گلاب خجل

ولہ

رہتے ہیں پامال، مثلِ سایۂ دیوار ہم — تس پہ بھی ہیں خاطرِ گردونِ دوں پر بار ہم
ہم تو کیا ہیں حضرتِ عیسیٰ بھی دیکھیں تو کہیں — عینِ صحت ہے جو ان آنکھوں کے ہوں بیمار ہم

ولہ

منھ ڈھانپ کے میں جو رو رہا ہوں — اک پردہ نشیں کا مبتلا ہوں

ولہ

دماغ اور بھی پاتے ہیں ان حسینوں میں — یہ ماہ وہ ہیں نظر آئیں جو مہینوں میں
ہمارے ماہ کو یہ زاہدوں نے سجدے کیے — ستارے بن گئے گٹے جو تھے جبینوں میں
بجھایا شمع کو فانوس میں لگا دی آگ — کلائیاں جو تیری دیکھیں آستینوں میں

ولہ

کیوں کر نہ خوش ہو سر مرا اس کے وار میں — کیا پھل لگا ہے نخلِ تمنائے یار میں
چاہا بہت ولے نہ موا ہجرِ یار میں — محبوب کیا اجل بھی نہیں اختیار میں
آؤں نہ آپ میں جو وہ آئے کنار میں — رکھوں جو اپنی [illegible] انتظار میں
آنسو بہاؤں آنکھوں سے [illegible] — [illegible] یار کے پہلو کے پار ہیں
مثلِ حنا ہے غیر کے ہاتھوں میں بہار — سرسبز اگرچہ ہوں [illegible] میں
اللہ رے صفائی رخِ یار دیکھنا — حیراں ہے آئینہ کہ یہ آئینہ دار ہیں
گر پیشوائے خلق ہے زاہد تو کیا ہوا — تسبیح کا امام [illegible] شمار میں

ولہ

منھ پھیر کے وہ اپنی زلفیں سنوارتے ہیں — آئینے پتھروں پر سر دے دے مارتے ہیں
ساقی کی ابروؤں پر دل اپنا وارتے ہیں — اس طاق پر سے شیشے صدقے اتارتے ہیں
کرتے ہیں چاندنی کا مہرو گمان اس پر — جس شب وہ اپنی میلی پوشاک اتارتے ہیں

ولہ

جو ہم وہ مصحفِ رو دیکھ کر فریاد کرتے ہیں — تو کافر عقل کے کیا کہتا ہے قرآں یاد کرتے ہیں

ولہ

ہم مر گئے ہیں دیکھ کے ساقی عذار کو — زیبا ہے شمع طور ہمارے مزار کو

بلبل وہ ہوں جو سمجھوں گُسے عکسِ اشکِ غیر　　رہنے نہ دوں چمن میں کبھی آبشار کو

ولہ

نیم بسمل کیا ادا ہے یہ　　عاشقو لوٹنے کی جا ہے یہ
دل کو کیوں پائمال کرتے ہو　　نہ تو سبزہ ہے، نے حنا ہے یہ
طاقِ ابروئے یار کو دیکھوں　　عین کعبے میں التجا ہے یہ

ولہ

کس قدر مجھ کو ناتوانی ہے　　بارِ سر سے بھی سرگرانی ہے
سارے قرآں سے اس پری رو کو　　یاد اک لفظِ لن ترانی ہے
ناصحا عاشقی میں رکھ معذور　　کیا کروں عالمِ جوانی ہے
مینھ نے گھر میں مرے رکھا اس کو　　یہ بھی تائیدِ آسمانی ہے
دل بھی اس سے اٹھا نہیں سکتے　　ناتوانی سی ناتوانی ہے
قدِ موزوں کے عشق میں گویا　　رات دن شغلِ شعر خوانی ہے

ولہ

شرم سے اس چشم میں آنسو نظر آیا مجھے　　گردنِ آہو میں یا گھنگرو نظر آیا مجھے
آئینے سے بھی زیادہ جسمِ جاناں صاف ہے　　ایک ہی جانب سے پُشت و رُو نظر آیا مجھے

ولہ

محبت بھی نہیں قاتل کی خالی ہے عداوت سے　　اشارہ بھی جو کرتا ہے تو انگشتِ شہادت سے
میں دیوانہ ہوں مرہم فایدہ مجھ کو نہ بخشے گا　　اگر اچھے بھی ہوں گے زخم تو سنگِ جراحت سے
وہ مجھ سے بے طرح روٹھا تھا لیکن میں نے اے گویا　　منایا لاکھ منت سے، خوشامد سے، سماجت سے

ولہ

تم وفا کا عوض جفا سمجھے　　اے بتو تم سے بس خدا سمجھے
ہاتھ اٹھا کر لگا جو کوسنے وہ　　واہ رے ہم اسے دعا سمجھے

ولہ

ابر ہے، آبِ رواں ہے، لغزشِ مستانہ ہے　　گردشِ گرداب ساقی، گردشِ پیمانہ ہے

ہے وضو بہنا لہو کا، قتل ہونا ہے نماز
سر جھکانا زیرِ خنجر، سجدۂ شکرانہ ہے

ولہ

گم ہوا ہوں نظروں سے ایسی ناتوانی ہے
اب اُدھر سے ارنی ہے یہاں سے لن ترانی ہے

وہ لگاتے ہیں مہندی، ہم بھی ہیں لہو روتے
وہاں ہے مشقِ خونریزی، یہاں بھی جانفشانی ہے

ولہ

دہن ہرگز نہیں ہے تس پہ یہ معجز بیانی ہے
ہزاروں منھ سے بہتر ایک تیری بے دہانی ہے

محبت اس کو کہتے ہیں اسے کہتے ہیں یک رنگی
ہرے ہیں زخم یاں، پوشاک واں قاتل کی دھانی ہے

سفید اپنے ہوئے ہیں بال، کاکل ہے سیہ تیری
یہ میری صبحِ پیری وہ تری شامِ جوانی ہے

سراسر اس میں تیغِ ابروئے قاتل کے مضموں ہیں
مرا دیوان یہ کاہے کو ہے شمشیر خوانی ہے

نہایا یار جو دیکھو اثر کندن کی رنگت کا
کہ پانی جس قدر دریا میں ہے سونے کا پانی ہے

ہماری خاک پر آتے ہوئے جو تم مکدر ہو
عوض پھولوں کے تربت پر مگر تیوری چڑھانی ہے

مرا لے جا کے نامہ تو جوابِ غیر لاتا ہے
یہ قاصد خط رسانی ہے و یا ایذا رسانی ہے

تری تصویر اگر کھینچے، دہن کی جا لکھے مانی
خدا ہے عالم الغیب اور یہ سرِّ نہانی ہے

ولہ

اے جنوں ہاتھ جو وہ زلف نہ آئی ہوتی
آہ نے عرش کی زنجیر ہلائی ہوتی

مری تربت پہ نہ روئے تو ذرا ہنستے تم
مینھ نہ برسایا تو بجلی ہی گرائی ہوتی

خاکساری کے اگر رتبے سے آگہ ہوتا
اے فلک تو نے زمیں سر پہ اٹھائی ہوتی

ولہ

نہ گل ہیں اب نہ وہ ساقی، نہ مے پرستی ہے
چمن میں مینھ کے عوض بے کسی برستی ہے

ہمیں تو قتل کیا بس اسی نزاکت سے
کہ وہ اٹھاتے ہیں تیغ اور نہیں اکستی ہے

وہ حسیں اپنے ابرو دکھا کے کہتا ہے
یہ وہ ہے تیغ، اشاروں ہی میں جو کستی ہے

چہ خوش بود کہ برآید بیک کرشمہ دو کار
صنم بغل میں ہے، دل محوِ حق پرستی ہے

ولہ

پھر کہیں چھپ چھپ کے ہم جانے لگے
لوگ کچھ کہہ کہہ کے سمجھانے لگے

ساتھ سونا اس کے، پھر یاد آگیا　　پھر ہمیں اب غش پہ غش آنے لگے
پھر کسی گل پر طبیعت آ گئی　　نالے پھر بلبل کے خوش آنے لگے

ولہ

بہرِ گلگشت جب اس گل کا گذر ہوتا ہے　　سروِ گلزار کے اک دردِ جگر ہوتا ہے

ولہ

بے زباں کوئی ہے کہتا کوئی بے ہوش مجھے　　باتیں سنواتے ہیں کیا کیا لبِ خاموش مجھے

گنا بیگم

گنا بیگم، زوجہ نواب عماد الملک نظام تخلص، دخترِ علی قلی خاں والہ داغستانی بودہ۔ بہ عہدِ خویش در حسن و جمال نظیرے نہ داشت۔ شہرتِ حسن و لطافتِ او عالمے را فرا گرفتہ وامرائے دیار بہ خواستگاریش نقدِ دل و جان پیشکش می کشیدند و پیش ازاں کہ ایں گل رعنائی چمن دلبری، غنچۂ ناشگفتہ و گل جیبِ نادیدہ بود، ہر یکے را ہوائے وصالش بہ مشامِ جان گرفتہ آخر نواب موصوف از دولتِ وصالش سرمایہ سرور زندگانی برداشت و دیگراں از آتش رشک لختِ جگر کباب کردند۔ در ایامے کہ نواب از شجے نگرینہ گوہد می آمد او ہم چوں جان در قالب ہم قرین بود۔ بہ مقام نور آباد کہ ما بین گوہد و گوالیار است، سواری بیگم پیشتر از سواری نواب رسید۔ بیگم از آبدار آب طلبید۔ از چاہے کہ بر سرِ راہ بود، آبدار قدرے آب از چاہ کشیدہ گذرانیدہ۔ خوردنش ہماں بود و ہماں خدا داند کہ چہ زہر ہلاہل در آں آب آمیختہ بودند کہ بہ مجردِ گذشتن از حلق جاں بہ حق تسلیم کرد۔ نواب کہ بر سرش رسید ازیں سانحہ خاک بر سر افشاندہ و سر بہ سنگ زد۔ آخر نعشِ او را دراں جا امانت بہ زمیں گذاشتہ بہ گوہد رسیدہ۔ بعد ازاں بہ دہلی ازاں جا نقل کردہ فرستاد۔ القصہ بیگم در سلیقۂ شعری زیب النسائے مجالسِ نکتہ دانے بود و در شیوۂ حاضر جوابی نور جہان ثانی۔ فکرش بامزہ و بہ غایت موزوں۔ در اوائل منت تخلص می کرد۔ چو ازیں تخلص قمرالدین منت شہرتے یافت، تابِ منت نہ آوردہ، ترک کرد:

تم جو کل مرے پاس سے یک بار اُٹھ گئے　　فرمائیے یہ آپ سدھارے کہاں کہاں

داغوں کے میرے سینے کے مت پوچھ کچھ شمار　　گنواؤں تجھ کو عرش کے تارے کہاں کہاں

ولہ

بسانِ شمع جلتی ہوں کہ جیوں جیوں صبح ہوتی ہے　　تجھے اٹھکھیلیاں سوجھی ہیں میری جان جاتی ہے

ولہ

ترے منھ کی تجلی دیکھ کر کل رات حسرت سے　　زمیں پر لوٹتی تھی چاندنی اور شمع جلتی تھی

ولہ

مقابل ہو اگر لب کے ترے مصری چبا جاؤں　　تری آنکھوں سے ہم چشمی کرے بادام کھا جاؤں

ولہ

ہماری خاک پہ جب یار نے گذار کیا　　دمِ مسیح نے سر سے آشکار کیا

لطف

لطف، مرزا علی۔ اصلش از استر آباد است۔ در دہلی نشو و نما یافتہ۔ نسبِ شاگردیِ میر تقی میر داشتہ، تذکرۂ ریختہ گویاں نوشتہ و مثنوی دارد بہ غایت دل چسپ۔ مردِ ذو فنون و عالی طبع بود:

نہیں سمندر و پروانہ، پر وہ آتش ہوں　　کہ جس کے نام سے آتش کو احتراز رہا
نہ پہنچی ضعف سے لب تک دعا بھی، ورنہ سدا　　درِ قبول تو اس آرزو میں باز رہا

ولہ

اپنا تو بدگمانی سے بس کام ہو گیا　　گو اس کی چولی اور طرح سے مسک گئی

مہر

مہر تخلص، نواب امین الدولہ خلف نواب معتمد الدولہ مرحوم۔ از لطافتِ طبع مضامینِ رنگیں و شعری بندد۔ طبعش رو کشِ فصلِ بہار است و ہر مضمونِ تازہ را بہ دل خرید۔ از فقیر بطورِ مشتے نمونہ از خروارے دو سہ اشعارِ او می آید:

دل میں مضمونِ کمر ٹھیرا ہے　　بال کا شیشے میں گھر ٹھیرا ہے
اور اندھیر ہوا چاہتا ہے　　سرمہ منظور نظر ٹھیرا ہے

ولہ

باغ میں اس غیرتِ گل کو ہنسایا چاہیئے — خرمنِ گل پر کوئی بجلی گرایا چاہیئے

مخزوں

مخزوں تخلص، میر ناصر جان خلف سید محمد نصیر:

جھوٹ ہے اور سے کب میں نے لڑائیں آنکھیں — تم نے بے فائدہ رو رو کے سجائیں آنکھیں

ولہ

شاید اس وقت گیا آپ کا دھیان اور کہیں — باتیں کرنے میں جو تم ربطِ سخن بھول گئے

محبّت

محبّت تخلص، نواب محبّت خاں خلف حافظ رحمت خاں مرحوم بودہ ۔ بہ فکرِ شعر طبعے درست داشت:

جس کو تری آنکھوں سے سروکار رہے گا — بالفرض جیا بھی تو وہ بیمار رہے گا

ولہ

عاشقوں میں مجھے لکھا تو نے — آج چہرہ مرا بحال ہوا

ولہ

بیٹھنے دیوے نہ وہ بزم میں اپنی تو مجھے — تو اٹھا لیجیو اے بارِ خدایا مجھ کو

محمود

محمود تخلص، محمود خاں، برادر زادۂ اعظم الدولہ میر محمد خاں سرور دہلوی است:

جو پائے زہر ہیں گراں جانیوں میں ہم — اعدا کے گھر گئے تری مہمانیوں میں ہم

ولہ

خانۂ کعبہ کی تعظیم تو سبحان اللہ — لیک فرصت بھی ہو اس در کی جبیں سائی سے

مسرور

مسرور تخلص، شیخ پیر بخش از سکنائے قصبہ کاکوری است ۔ اصلاحِ سخن از مصحفی گرفتہ ۔ ملازمِ سرکارِ سلیمان شکوہ بود:

اس کے گھر جا کے جو مچل جاتا ہوں — تو وہ کہتا ہے تو ہی رہ "میں نکل جاتا ہوں
ہے صفا بسکہ مرے پائے نگہہ کی دشمن — دیکھ ہر آئینہ رو کو جو پھسل جاتا ہوں

مفتوں

مفتوں تخلص، منشی اصغر علی۔ سررشتہ دارِ عدالتِ فوجداری ضلع میرٹھ است پیشتر بہ محکمۂ کمشنری بریلی بہ عہدۂ منشی گری ممتاز بودہ۔ از فقیر اتحاد بہ مرتبہ داشت۔ کمتر بہ فکرِ شعر می پردازد و آنچہ می گوید بہ مرتبہ کمال۔ خوش مذاق و خوش اختلاط واقع شدہ:

رچ گیا عشق بہ رگ رگ میں ترے گیسو کا — زلف سے بھی سیہ رنگ، میرے لہو کا
بسکہ آنکھوں میں تصور، نگہہ تیز کا ہے — ٹکڑے ہو جاتا ہے ہر قطرہ، مرے آنسو کا

مہر

مہر تخلص۔ از شاگردانِ ناسخ است۔ فکرش چوں مہرِ تاباں روشن و طبعش از جوشش مضامینِ بہاریں گلشن است۔ از فقیر بہ اکبر آباد ملاقی شد، خواندنِ اشعارِ تازۂ خویش بہ رنگِ آئینہ سراپا حسرت ساخت:

چال دکھلا کے یہ کیا حال کیے جاتے ہو — چلتے چلتے مجھے پامال کیے جاتے ہو
کون ہوگا خریدار ہمارے دل کا — تم تو بازار میں ہڑتال کیے جاتے ہو

مست

مست تخلص، مولوی فضل رسول صاحب خلف مولوی عبدالمجید صاحب" متوطن قصبہ بدایوں۔ خطہ بہ ایں نسبت کہ مولدش واقع شدہ برخود می بالد و منبع ہزار خیر و برکات است۔ عالم متبحر و طبیب حاذق و شاعر بے بدل است۔ پیشتر بہ مقتضائے صحبتِ اہلِ دنیا روزگار پیشہ بود۔ چوں نسبتِ معنوی بہ مراتب حقیقت داشت، سالہاست کہ بہ تعلقات دنیوی پشت بازدہ، مردانہ بہ فقر و غنا پرداختہ۔ گدازِ طبعش بہ عشقِ محبوبِ حقیقی بہ مرتبہ رساندہ کہ از سلسلہ جنبانیِ ذوقِ طبیعت ہر رگ و پے را جادۂ منازلِ شوق ساختہ، بہ کعبۃ اللہ و مدینہ منورہ از چشم و سر رفت۔ جناب والدش کہ بہ سنِ کہولت است و سراپا عالمِ نورد معرفت، بہ شوقِ او از خانہ تا بہ خانۂ کعبہ رسید۔ از آں جا پسر و پدر رہرو و بعد از ادائے

مناسکِ حج معاودت ساختند۔ اکنوں بہ مراتب اولیائے کامل در بدایوں رسیدہ، سرگرمِ استقاضہ است۔ بہ جیبِ تجلیٔ انوارش رنگ برائے مہر و ماہ شکستہ و از جودتِ طبعش نقابِ حجاب بر رخِ معنی آشنایاں بستہ:

حسنِ الفاظ ہے کس حورلقا کا صدقہ — ہے یہ اندازِ سخن کس کی ادا کا صدقہ
پانو پھسلا تو دیا اس نے مرے ہاتھ میں ہاتھ — یدِ بیضا ہے یہاں لغزشِ پا کا صدقہ
لب حنائی مرے دیکھے، تو کہا خواب سے اٹھ — ہے کہو کس کے یہ رنگِ کفِ پا کا صدقہ
زلف جھاڑی جو نہا کر، تو پڑی مجھ پہ چھینٹ — آبِ حیواں ہے یہاں، مارِ بلا کا صدقہ
بوسہ بے ساختہ سرگوشی کی حالت میں ملا — ہے اُسی حسنِ سر کی، یہ ادا کا صدقہ
خم ہیں پُر، مغبچے خوش، میکدے آباداں ہیں — منت یہ سب ہے تمہاری ہی کا صدقہ

ولہ

زندگانی سے ترے ہجر میں بیزار ہیں ہم — موت کو عمرِ ابد سمجھیں، وہ بیمار ہیں ہم
گر لکھیں نامۂ اعمال کو شنجرف سے ہم — پھر بھی ہوں حرف سیہ، کیا ہی سیہ کار ہیں ہم
آہ شبگیر سے اپنے شجرِ شب بو میں — پھول سوسن ہی کے پھولیں، وہ سیہ کار ہیں ہم

ولہ

کعبے کے در پہ بیٹھ رہیں، ہم سے یہ نہ ہو — ہوتا یہی تو کوچۂ جاناں نہ چھوڑتے

ولہ

آؤ جانی، حسرتیں تو لیں دلوں کی سب نکال — جو کہ ہونی تھیں وہ سب کچھ ہو چکیں رسوائیاں

ولہ

یوں بہانے بھی نہ آنے کے بنا سکتے ہو — پر جو آنے ہی پہ آ جاؤ تو، آ سکتے ہو

ولہ

دل میں ہمارے جلوہ گر، مہرِ ابوتراب ہے — شیشہ صاف، صاف مطلعِ آفتاب ہے

ملال

تخلص، نامش نا، حلوم۔ خوش گو است و از باشندگانِ لکھنؤ:

افراطِ مے سے آنکھ ہر اک اس کی بند ہے | ان آہوؤں کو نشۂ صہبا کمند ہے
ٹوٹا اُدھر تو یہاں دم نکل گیا | تارِ نفس مرا، تری انگیا کا بند ہے
کرتے ہیں گاچ کے، نہیں پوشیدہ نافِ یار | دریائے حسن نور کے کوزے میں بند ہے
ہر برگِ گل میں صورتِ جاناں ہے جلوہ گر | عکسِ عذار سے، چمن آئینہ بند ہے

ملتمس

ملتمسؔ تخلص، منشی مہدی نام۔ از مشہورانِ جہان ست و فکرش دل پذیرِ عالم

گلشنِ دہر میں بے برگ و نوائی اچھی | نغمہ سنجی سے یہاں نالہ سرائی اچھی
اپنے دل کو جو لگے خوب، وہی اچھی ہے | ورنہ دکنا، سے ہو ساری خدائی اچھی
ہووے وہ کیوں کہ نہ انگشت نما خوباں میں | انگلیاں اچھی ہیں، ہاتھ اچھے، کلائی اچھی
آپ کو سب سے بُرا سمجھے ہے اور اس کے سوا | ملتمسؔ میں تو کوئی بات نہ پائی اچھی

ممنون

ممنونؔ تخلص، سید نظام الدین نام، پورِ قمر الدین منتؔ است۔ زباں دراز، بہ زمرۂ شعرائے دہلی سرفراز بودہ:

غموں کی گر یہی بالیدگی ہے تو آخر | دل گرفتہ نہیں سینے میں سمائے گا

ولہ

ممنونؔ قضا نے ہم کو دیا کیا، بغیر دل | سو وہ بھی نذرِ کاہش و تشویش ہو گیا

ولہ

آہ خلوت میں جو تنہا کبھی پاؤں تجھ کو | جس لیے تجھ کو بنایا ہے، دکھاؤں تجھ کو

ولہ

بس حنا زور آزمائی ہو چکی | گل رخوں سے ہاتھا پائی ہو چکی
رات تھوڑی، حسرتیں دل میں بہت | صلح کیجے، اب لڑائی ہو چکی
بختِ بد، صیاد ظالم، دام سخت | ہم اسیروں کی رہائی ہو چکی
جرعۂ مے کے لیے یہ اضطراب | میر ممنوںؔ پارسائی ہو چکی

ولہ

شب ہم کو کشت و خون رہا فوجِ غم کے ساتھ — سو حسرتیں شہید ہوئیں اپنے دم کے ساتھ
کوئی آئے ہے کہ سینے میں، بیدار ہو گئیں — صد آرزوے خفتہ صدائے قدم کے ساتھ

ولہ

خون کی دھاریں یہ چھپٹیں دل سے، دلِ افگاروں کے — رونگٹے سن کے کھڑے ہو گئے فواروں کے

منتظر

منتظر تخلص، نور الاسلام نام۔ از برگزین تلامذۂ مصحفی بود و برق طبیعت۔ در عینِ جوانی ازیں جہاں رفت:

کل شبِ وصل جو تھی، کیسی مچائی تھی دھوم — بولتا آج نہیں، مرغِ سحر آخرِ شب

ولہ

ہوئی تھی جامۂ یوسف کی بو گُم — سو پائی تیرے پیراہن کے اندر

ولہ

چاہت مرے دل کی آزما دیکھ — ظالم کہیں تو بھی دل لگا دیکھ

منّت

منّت تخلص، میر قمرالدین۔ بہ شاہ جہاں آباد نشو و نما یافتہ۔ از قصبہ سونی پت است بہ کلکتہ رفتہ، قصاید بہ مدحِ نواب گورنر گفتہ، خطابِ ملک الشعرا یافتہ۔ در لکھنؤ بہ عہدِ راجہ ٹکیت رائے و بہ حیدر آباد بہ حضورِ نظام الملک قصاید گفتہ و بہ صلاتِ گراں مایہ سرفرازی ہا یافت۔ بہ زبانِ فارسی بہ مراتبِ نظم و نثر قدرتے داشتہ۔ کتاب "شکرستان" کہ بہ زعمِ خود پاسخِ "گلستانِ سعدی" تراشیدہ است، تصنیف کردہ است۔ گاہے بہ فکرِ ریختہ ہم می پرداخت:

مدعی اس سے سخن ساز بہ سالوسی ہے — پھر تمنّا کو یہاں مژدۂ مایوسی ہے

ولہ

بوسہ لینے سے خفا ہوتے ہو کیوں مشفقِ من — بوسہ وہ شے ہے کہ دونوں کو مزا دیتا ہے

مشتاق

مشتاق تخلص، عبداللہ خاں - ایرانی نژاد است۔

کی اک نگاہِ یاس جو مژگانِ یار پر | سو برچھیاں چلیں، دلِ امیدوار پر
جی بند ہو نکل بھی گیا، تو کھلی رہی | اے چشم آفریں ہے ترے انتظار پر

مومن

مومن تخلص، مومن خاں - امروز بہ شاہ جہاں آباد جملہ سخن سنجان از گل چینانِ بہارِ معنیٔ او بودہ صفحۂ منظمِ خویش بہ یمنِ آبیاریٔ لطافتِ طبعش رشکِ گلزار می کند۔ از گل افشانی ہائے جامۂ بہاریں رقمش مشامِ جانِ معنی آشنایاں عطر بیز است و توصیفِ سخن آفرینی ہائے لطافت زائیش مداحانِ سخن طراز گہر ریز۔ مردمِ دہلی بہ استادیش افتخار ہا دارند و در حقیقت مومن خاں باعثِ مباہاتِ شہر و شہریان است:

محو مجھ سا دمِ نظارۂ جاناں ہوگا | آئینہ آئینہ دیکھے گا تو حیراں ہوگا
خواہشِ مرگ ہو اتنا نہ ستا ورنہ | دل میں پھر تیرے سوا اور بھی ارماں ہوگا
کیوں کہ امید وفا سے ہو تسلی دل کو | فکر ہے یہ کہ وہ وعدوں سے پشیماں ہوگا

ولہ

یہاں تک نظر میں سوخت قرار و ثبات ہے[1] | اس کا نہ دیکھنا، نگہِ التفات ہے
پیغام بر رقیب سے ہوتے ہیں مشورے | سنتا نہیں کسی کی، یہ کہنے کی بات ہے

ولہ

دل لگانے کے تو اٹھائے مزے | جی بلا سے رہا رہا، نہ رہا

ولہ

دشنامِ یار طبعِ حزیں پہ گراں نہیں | اے ہم نفس نزاکتِ آواز دیکھنا

ولہ

بوسے دمِ غضب لیے، الٹی سمجھ تو دیکھ | بل جو پڑا جبیں پہ تمنا کو لب ہوا

ولہ

چشمۂ حیواں بنا اس کے لبوں کی شرم سے | پانی پانی بسکہ اعجازِ مسیحا ہوگیا

[1] دیوان میں: ع پامال اک نظر میں قرار و ثبات ہے

تو فلک ہیں، کیا کرے یہ نالۂ آتش فشاں ولہ ایک دشمن سر سے کھویا اور پیدا ہو گیا

ولہ

وہ ہنسے سن کے نالہ بلبل کا
مجھے رونا ہے خندۂ گل کا
جلوہ دکھلائے تا وہ پردہ نشیں
تم نے دعویٰ کیا تحمل کا

ولہ

یہ بے حجابی بری، گو مجھی کو جھانکو تم
کہ روز پردۂ حایل کے ٹکڑے ٹکڑے ہیں

ولہ

منظور ہو تو وصل سے بہتر ستم نہیں
اتنا رہا ہوں دور کہ ہجراں کا غم نہیں

ولہ

وہ ہے بغل میں تو بھی تو یاں نیند اڑ گئی
یہ سوچ ہے گیا نہ ہو اعدا کے خواب میں

ولہ

کیا کیجیے کہ طاقتِ نظارہ ہی نہیں
جب سے وہ بے حجاب ہیں ہم شرمسار ہیں
کیسے گِلے رقیب کے، کیا طعنِ اقربا
تیرا ہی جی نہ چاہے تو باتیں ہزار ہیں

ولہ

یاد دلوائی طپش نے، تیری شوخی وصل کی
مر گیے ہم دیکھ کر چیں ہائے بستر رات کو

ولہ

ہمارا غش تو کیا، مر جائیں تو بھی
نہ کھولے طرۂ عنبر فشاں کو

ولہ

مومن نہ سہی بوسۂ پا، سجدہ کریں گے
وہ بت ہے جو اوروں کا تو اپنا بھی خدا ہے

ولہ

خوشی نہ ہو مجھے کیوں کر قضا کے آنے کی
خبر ہے نعش پہ اس بے وفا کے آنے کی
ہے ایک خلق کا خوں سر پہ، اشکِ خوں کے مرے
سکھائی طرز اسے، دامن اٹھا کے آنے کی

فصد کی حاجت مجھے کیا چارہ گر ولہ بہہ گیا خونِ دیدۂ خوں بار سے

ولہ

مت کرو کنگھی، نہ یہ وزدِ حنا　　دل چرائے طرۂ طرار سے
کر علاجِ جوشِ وحشت چارہ گر　　لادے اک جنگل مجھے بازار سے
چھڑکے ہے کانِ ملاحت لون کیا　　خود لپٹ جا سینۂ افگار سے

ولہ

وہ دیکھیں بزم میں آکر کدھر کو دیکھتے ہیں　　محبت آج تیرے ہم اثر کو دیکھتے ہیں
نظر لگے نہ ترے دست و بازو کو　　یہ لوگ کیوں مرے زخمِ جگر کو دیکھتے ہیں

ولہ

تابِ نظارہ کہاں، آئینہ کیا دیکھنے دوں　　اور بن جائیں گے تصویر جو حیراں ہوں گے

ولہ

گر تصور سے ہوں ہم بزم، تو بے تاب لیے　　کس قدر وہ مرے ملنے سے حذر کرتا ہے
عیش میں بھی تو نہ جاگے کبھی تم نیا جانو　　کہ شبِ غم کوئی کس طور سحر کرتا ہے
بخت بدنے یہ ڈرایا ہے کہ کانپ اٹھتا ہوں　　تو کبھی لطف کی باتیں بھی اگر کرتا ہے

ولہ

میرے تغیرِ رنگ کو مت دیکھ　　تجھ کو اپنی نظر نہ ہو جائے
باتیں ناصح سے کرتے ڈرتا ہوں　　کہ فغاں بے اثر نہ ہو جائے

ولہ

ہو کے آزردہ، پشیماں ہوں کہ میں جس سے کہوں　　وہی کہوے کوئی ایسے سے خفا ہوتا ہے

ولہ

یارب ان کا بھی جنازہ اٹھے　　اس کے کوچے سے اٹھاتے ہیں مجھے
اب یہ صورت ہے کہ اے پردہ نشیں　　تجھ سے احباب چھپاتے ہیں مجھے

ولہ

یہ ناتواں ہوں، کہ ہوں، اور نظر نہیں آتا　　مرا بھی حال ہوا ہے تیری کمر کا سا

ولہ

ہر ایک سے اس بزم میں شب لوچھتے تھے نام　　تھا لطف جو کوئی مرا ہمنام نکلتا

مصحفی

مصحفیؔ تخلص، غلام ہمدانی نام۔ اصلش از امروہہ بود، نشو و نما بہ لکھنؤ یافتہ۔ جرأتؔ و انشاؔ و میر تقیؔ و سوداؔ ہمعصرِ وے بودند۔ پیشِ بلندیِ رتبۂ شاعریش اوجِ فلک بہ منزلہ پستیٔ زمین است و سلکِ نظمِ گہربارش رو کشِ عقدِ ثریا و خوشہ پروینِ کلیم طورِ سینائے سخندانی و ہنگامہ گرم کن و و دمانِ معانی بودہ۔ پرتوِ استفادۂ کمالِ او ہمچو خورشیدِ سراپا ضیا برہمہ کس تافتہ و چاشنیٔ کلامِ شکر ریزش بہ مذاقِ تلخ کامانِ کام قندِ مکرر ساختہ۔ فی زماننا استاداں بدولتِ تلمذش سر بہ فلک بر افراشتہ اند۔ ہفت دیوان ریختہ و دو تذکرہ و دیوانِ فارسی تمام کردہ، قوتِ فکرِ عالیٔ او ازیں جا می تواں دانست۔ اکثر با شعرائے عصرِ خویش مناظرت و مطارحات کردہ۔ فقیر چند اشعارش از دیوانِ ہفتم کہ خلاصہ فکرِ اوست، نقل برداشتہ صفحۂ کتاب را مرقعِ تصویرِ معنی می سازد :

بدگمانی جو ہوئی سیرِ چمن سے یار کو
عادتِ دامن کشی سکھلائی کس نے خار کو

حق اگر دیتا مجھے مسند نشینی کا دماغ
سامنے آنے نہ دیتا چرخِ ناہنجار کو

کچھ تو اس کے حسن میں باقی ہے آرائش ہنوز
روزِ محشر پر جو رکھا وعدۂ دیدار کو

دل اگر ٹوٹا تو وہ بھی کام آتا ہے کبھی
پھینک تو دیتے نہیں ہیں کاسۂ مردار کو

مشک بیز ایسی ہی ہے گر اس کی زلفوں کی شمیم
تختہ کر دے گی دکانِ کلبۂ عطار کو

تجھ کو کیا بسیار گوئی سے ہے کام اے نغز گو
مصحفیؔ موقوف کر اس کثرتِ اشعار کو

ولہ

قدی تو میری اسیری کا سنگ ہے بنیاد
میں کیوں نہ سر کو دھنوں، خانہ تنگ ہے صیاد

ولہ

ہچکیاں رونے میں گو دو دو پہر لیتا ہے
کون زندانیٔ الفت کی خبر لیتا ہے

بوسہ لب آبلے ہوتے ہیں اسی کے رخ پر
پشتِ پا کی مری جو خار خبر لیتا ہے

طائرِ دل کو نہ سینے سے نکالو یہ اسیر
ٹک ہوائے قفسِ زخمِ جگر لیتا ہے

سر کے بال ایسے ہیں نازک ترے اے رشکِ پری
جس سے اصلاح ترا موئے کمر لیتا ہے

ولہ

ہم کو صیاد نے دی رخصتِ پرواز اس دم — غنچہ و گل سے ہوا جب کہ گلستان خالی
ہیں پروں سے صفِ عشاق کے مژگاں خالی — کس کماں کش نے کیے ترکشِ مژگاں خالی

ولہ

جس کی شریاں میں فرو نشترِ مژگاں ہووے — اس کا ہر قطرۂ خوں کیوں کہ نہ رقصاں ہووے
اس پہ رکھ دوں جو ذرا دیدۂ خونبار اپنے — سنگِ دہلیز تر العلِ بدخشاں ہووے
زخم کھانے کی ہوس ہے مجھے اس قاتل کے — جوہرِ تیغ ہر یک جس کا نمک داں ہووے
ناتواں ایسے کو کیا فایدہ کرنا زنجیر — جس کا ہر نقشِ قدم خانۂ زنداں ہووے
ہوکے شبنم سے گل آزردہ، یہ کہتا تھا شعر — زخمِ دنداں نہ نصیبِ لب و دنداں ہووے
مصحفی کو ہو جو دُرریزیِ معنی کا خیال — رشتۂ بالِ قلم تک گہر افشاں ہووے

ولہ

خامشی دیتی رہی تعلیم لسانی مجھے — آہ کام آئی نہ کچھ اپنی زباں دانی مجھے
تا ذرا چاک قفس سے گل کو دیکھیں سر بگل — اتنی فرصت بھی نہیں دیتی پرافشانی مجھے
اہلِ جوہر کے تئیں پوشش کی کیا ہے احتیاج — تیغ ہوں میں سرخ رو کرتی ہے عریانی مجھے
مثلِ گردِ راہ ہوں میں راکبِ رخشِ نسیم — دوش پر اپنے لیے پھرتی ہے ویرانی مجھے

ولہ

تجھ کو زنجیر بنے ہیں دمِ رفتار کڑے — یاد آتے ہیں جب ان پانو کے خم دار کڑے
اپنی شوخی پہ جو آتے ہیں تو چپکے چپکے — فتنۂ خفتہ کو کر جاتے ہیں بیدار کڑے

ولہ

قطرہ قطرہ مری آنکھوں سے خوں جاری ہے — جائے شبنم سرِ ہر خار پہ چنگاری ہے
اس کے دامن کی طرف اس کا خیال آیا آہ — جو گریباں سے مرے ہاتھ کو بیزاری ہے
دردِ دل کا نہیں ہوتا ہے مسیحا سے علاج — مصحفی یہ بھی عجب طرح کی بیماری ہے

ولہ

ہم مثلِ موج صرف ہوں کیا عرضِ حال کے — لب ہی نہ ہوں جب اپنے سوال کے

وحشت شبِ فراق کی کس سے کروں بیاں — تارے بھی ہم کو ہو گئے دیدے غزال کے
ان سے بھی میرا عرصۂ وحشت نہ طے ہوا — رہ رہ گئے غزال زبانیں نکال کے

ولہ

دم اسیروں کا نہ کیوں کر دمِ وحشت ٹوٹے — ان کے آگے جو پرِ طایرِ گلشن ٹوٹے
مر رہے کیوں تری دیوار کے نیچے نہ کوئی — دل میں جب حسرتِ نظارۂ روزن ٹوٹے
ہائے رے لعلِ مسی زیب کے بوسے کی صدا — اس لطافت سے نہ شاخِ گلِ سوسن ٹوٹے

ولہ

فصلِ گل، فصلِ خزاں دونوں کٹیں اے صیّاد — مرغِ دل کون سے موسم میں رہا ہووے گا
چین کیوں کر میں سوؤں کہ شبِ وصل مجھے — ولہ — یاد آتا ہے وہ راتوں کو جگانا تیرا

ولہ

وہی وحشت، وہی گریباں چاک — جب تلک ہاتھ پاؤں چلتے ہیں

ولہ

کم ہوئی تری یاں تک تو شہرۂ آفاق — کہ سر کے بال ترے دیکھنے کمر کو چلے

ولہ

دل میں گر داغِ محبت، چمن آرا ہووے — نکہتِ گل، شررِ آہ سے پیدا ہووے
میں تو اک جزوِ محقر ہوں ولے شہرتِ مرگ — چاہتی ہے کہ مری لاش پہ غوغا ہووے
عشق چاہتا ہے میں رسوا ہی کروں عاشق کو — شرم کہتی ہے نہ اس بات کا چرچا ہووے
جوششِ خوں نے مجھے گلشن سے نکالا باہر — فصلِ گل میں نہ کسی شخص کو سودا ہووے
مصحفی میں تو تہی دست رہا دنیا میں — گو موے پر میرا دیوان مطلّا ہووے

ولہ

ٹھکرا کے چل نہ یار تو بتِ کنشت میں — کیوں مارتا ہے یار تو لاتیں بہشت میں

ولہ

ایسا بھی اتفاق زمانے میں کم ہوا — قاصد کو موت آئی جو نامہ رقم ہوا

رک رک گئی سیاہی جو کاغذ بہم ہوا — نامہ ہزار خونِ جگر سے رقم ہوا

ولہ

ہے قصد زخمِ دل کے اگر اندمال کا — مرہم لگا تو اس پہ پری کے اگال کا
اس زخمِ پیچ دار سے دل کیوں کر چھوٹ سکے — یہ ناتواں اسیر ہے ریشم کے جال کا
شاید تو رات رویا تھا، غم کھا کے مصحفی — چھپتا نہیں ہے صبح کو چہرہ ملال کا

ولہ

داغ دیکھے تھا کھڑا لالۂ صحرائی کا — زورِ عالم نظر آیا، ترے سودائی کا
عشق کرتا ہوں میں معشوق سے دانائی کا — دھیان رہتا ہے مجھے، اس کی بھی رسوائی کا
بھیج دیتا ہے عوض اپنے، خیال اپنا مدام — کس قدر یار کو غم ہے مری تنہائی کا
کوئی آئینے کو محفل میں نہ لاؤ میری — تا نہ مٹ جائے مزا، عالمِ تنہائی کا

ولہ

دو چار دن سے اپنا نہ ملنا، نہ دید ہے — وہ خوش رہیں، جنھوں کو وصل اس کا عید ہے
نامے کے پرزے پرزے دے کے مرے مجھ کو نامہ بر — کہنے لگا یہ خط کی تمھارے رسید ہے
واں روز چلتی ہیں خز و دیبا پہ قینچیاں — یاں جامۂ حیات کی قطع و برید ہے
کیسا جوابِ نامہ کہ ظالم کے پاس سے — قاصد کا جیتے پھرنا ہی خط کی رسید ہے
زلفوں کے راستے میں کجی کس طرح سے آئے — دونوں کے درمیان کلامِ مجید ہے
کھلتا ہے قفلِ عیش مرا اس سے مصحفی — جس کے ازار بند میں چھوٹی کلید ہے

ولہ

زباں کس نالہ کش کی آج ہے سرگرم شیون پر — گدازِ موم کا عالم نظر آتا ہے آہن پر
لگیں تلواریں چلنے اس ادا پر تیرے بانکوں میں — ذرا کج کھا کے بیٹھا تھا وہ کافر پشتِ توسن پر

ولہ

قدم اس وضع سے پڑتا ہے اس غارتگرِ جاں کا — کہ دل ہر ہر قدم پر لوٹ ہے گبر و مسلماں کا
سننے پائے نہ دہن اس کے دشنام تمام — جنبشِ لب ہی میں اپنا تو ہوا کام تمام

ولہ

واکس کے رخ پہ طرۂ پُرپیچ و خم ہوا
جوزا پچے میں رات بڑھی روز کم ہوا

ولہ

میں ہی جانوں ہوں جو کچھ مجھ سے ادائیں کی ہیں
تری آنکھوں نے حیائیں سی حیائیں کی ہیں

مصحفی کیوں کر ہو تقصیر بھلا تیری عفو
تو نے کمبخت خطائیں سی خطائیں کی ہیں

ولہ

آبداری تو کرے خنجرِ مژگاں پیدا
ہم بھی کرلیں گے ہر اک مو میں رگِ جاں پیدا

ڈھونڈے کوئی جو ہمیں جامۂ عریانی میں
ہوئے گردن نہ کبھی زیرِ گریباں پیدا

پھر احیائے غمِ مردہ دلاں کرتی ہے
فتنہ کیا کیا نہ تری جنبشِ مژگاں پیدا

کافری عام ہوئی ہے ترے عہد میں شوخ
ڈھونڈیں کعبے میں تو ہو دیں نہ مسلماں پیدا

ولہ

گریۂ مجنوں سے یہ طغیاں ہوا ہے آب کا
گردبادِ دشت میں عالم ہے اب گرداب کا

کیجیے ایسے بدن کی کیا لطافت کا بیاں
جس کے سائے کو زمیں پر حکم ہو مہتاب کا

اس کی بشاشی کی مجھ کو کھینچ دے مانی شبیہ
جس میں نکلے یک قلم نقشہ گلِ شاداب کا

ولہ

ساتھ غیروں کے ہے حرف و حکایات میں کیا
تم کو ملتا ہے مزا، غیر ہی کی بات میں کیا

سرخیٔ رنگِ بدن اتنی تو زیں پیش نہ تھی
آبِ یاقوت و طلا ہے تری گات میں کیا

ولہ

آکے اک شب جو کبھی گھر میں مرے یار رہا
مدعی رشک کے مارے پسِ دیوار رہا

مجھ کو اک شب جو خیالِ کمرِ یار رہا
صبح تک دامِ رگِ گل میں گرفتار رہا

کوئی تقصیر نہ ثابت ہوئی پر تادمِ مرگ
زیرِ شمشیرِ تغافل، یہ گنہ گار رہا

ولہ

زبس اپنا مونسِ بے کسی ترے غم میں رنج و محن رہا
نہ دماغ نکہتِ گل ہمیں نہ خیالِ سیرِ چمن رہا

کچھ اِدھر سے ہم ڈھلے عمر میں، کچھ اُدھر سے دخترِ رز کے دن — نہ وہ شوخ چشمیٔ جام ہے، نہ وہ شوقِ توبہ شکن رہا

ولہ

کس کے ہاتھوں میں دیکھی ہے حنا عید کے دن — سیلِ خوں جو مرے ہاتھوں سے بہا عید کے دن
اتنے ہم تنگِ ملاقاتِ عزیزاں تھے کہ آہ — اس کا خنجر بھی گلے سے نہ ملا عید کے دن

ولہ

شگفتہ گل کی طرح، گلشنِ وصال میں رکھ — اخیرِ عمر نہ یارب مجھے ملال میں رکھ
جو لاغری کا تجھے شوق ہے تو اے مہِ نو — ذرا نزاکتِ موئے کمر خیال میں رکھ

ولہ

کاش خود باندھے وہ شوخ آکے گنہ گار کے ہاتھ — ہاتھ میں اپنے کسی ڈھب سے لگیں یار کے ہاتھ
مجھ کو کیا کام خزاں سے کہ بہاراں ہیں نسیم — بک گیا ہوں میں ہوائے گل و گلزار کے ہاتھ

ولہ

تار سے پڑتے ہیں اس گل کے کمر تک پہنچے — رگِ گل بیچتے ہیں آپ کو زنار کے ہاتھ
قصد کرتا ہوں لپٹنے کا گر اس کے تو مجھے — موت بھی دور سے بتلاتی ہے تلوار کے ہاتھ

ولہ

پھولیں گل و سمن ہمیشہ — سرسبز رہے چمن ہمیشہ
ماہِ نو سے وہ تیغِ ابرو — کرتی رہے بانکپن ہمیشہ
چھوڑا نہ حجاب تم نے ہم سے — ڈھانپا کئے بدن ہمیشہ
صدقے ہوں سخن کے مصحفیؔ میں — صدقے ہیں سخن مرے ہمیشہ

ولہ

اجل بلبلِ گلزار لئے پھرتی ہے — موجِ گل ہاتھ میں تلوار لئے پھرتی ہے
کہہ دو اس پردہ نشیں کو، ترے دیوانے کو — بےقراری سرِ بازار لئے پھرتی ہے
بدگمانی مرے دل کی، ترے کوچے میں نسیم — سو طرف مجھ کو شبِ تار لئے پھرتی ہے
کیوں کر کہیئے کہ ادا بندی ہے — ولہ — شاعری کیا ہے ہوا بندی ہے

خمِ گیسو کو چھوا تھا کس کے شب سے گلشن میں حنا بندی ہے
در پہ بیٹھے ترے بے زنجیر یہ عجب طرح کی پابندی ہے
مژدہ اب حسرتِ نظارہ کہ وہاں گرد چلمن کے ردا بندی ہے

ولہ

بوسے کی گفتگو سے نہ باز آئے، گرچہ ہم ہاتھوں سے اُس کے منہ پہ بھی تلوار کھا چکے
ہم چھوٹ کے قفس سے ہوئے راہ میں اسیر اب چھوٹے بھی تو بس چمن آباد ہو چکے

مہر

مہر تخلص، مرزا حاتم علی بیگ، لکھنوی، شاگردِ رشیدِ ناسخ

کوئی مضموں نہ بندھے زلف اگر وا ہو جائے سو مہر کیا خاک جب آنکھوں میں اندھیرا ہو جائے
بوسۂ لب سے جو منہ نزع میں میٹھا ہو جائے خوابِ مرگ اپنا سیکڑوں سے اچھا ہو جائے
جو تو رخسار عنایت کرے اک اک بوسہ عاشقوں کے لئے سرکار سے چندا ہو جائے
پانْو کی انگلی پہ ترے، یدِ بیضا صدقے ہونٹ مل جائے تو اعجازِ مسیحا ہو جائے
دل یہی چاہتا ہے جان، تجھے لپٹا لوں گرم تپ سے ہو، کلیجہ مرا ٹھنڈا ہو جائے
شبِ ہجراں نہ ستا، او شبِ ہجراں نہ ستا مہر ہوں، مہر ہوں، ایسا نہ ہو تڑکا ہو جائے

معروف

معروف تخلص، الٰہی بخش نام، کوچک برادرِ فخر الدولہ نواب احمد بخش خاں دہلوی است.

بہ غایت موزوں طبع است:

کی وصیت یہ کچھ ارمان بھری رات کہ آہ سارے گھر کو ترے بیمار نے سونے نہ دیا

ولہ

تھا شبِ وعدہ یہ احوال کہ ہر اک کھٹکے پر چونک پڑتا تھا کہ اب کے تو مقرر آیا

ولہ

اٹھے جہان سے ہم آتے ہی اُن کے اے معروف غرض کہ ختم ہے بس اس سے اب سوا تعظیم
مے کے پینے سے تو ہاں ہم نے نباہی توبہ ولہ پیرِ مغاں سے یہ مجحل ہوں کہ الٰہی توبہ

ولہ

گریہ و آہ و فغاں سے ایک دم فرصت نہیں ہم یہ سمجھے تھے محبت کام بے کاروں کا ہے

ولہ

ہائے اس شوخ کا وہ روٹھ کے جانا بہ غرور اور کہنا یہ، ہمیں اب نہ منائے کوئی

ولہ

بعدِ مرنے کے ملی میری سیہ بختی کی داد نعش کے ساتھ تھا موئے سر کھولے ہوئے

ولہ

روٹھنے کو تو چلے روٹھ کے ہم واں سے ولے مڑ کے تکتے تھے کہ اب کوئی منا کر لے جائے

میر

میر تخلص، محمد تقی نام، از اہلِ اکبر آباد، خواہر زادۂ سراج الدین علی خاں آرزو[1] ہم دوشِ مہ وشانِ پری جلوۂ نکتہ دانی و ہم آغوشِ دوشیزگانِ شوخ ادائے معانی است۔ دیوانۂ طرزِ دلکش و دل آویز، آشفتۂ مضمونِ عاشقانہ و درد انگیز، مجنونِ بہارِ حسنِ لیلائے دل فریبی، فرہادِ تلخ کامِ شیریں ادایاں، مجنونِ برشتۂ جگرِ شمع رویاں، ہم بسترِ ناکامی و ہم پاس و حرماں بودہ۔ کلامِ شور انگیزش لختِ دل و پارۂ جگرِ تفتۂ دود مانِ معنیِ آشنا در آتش انداختہ و روزمرہ گفتگو بے ساختۂ او لطفِ حسنِ بندشِ دیگراں از دل ہا برداشتہ۔ مشہور است کہ بہ شہرِ خویش با پری تمثالے کہ از عزیزانش بود در پردۂ نقشِ طبع و میلِ خاطر داشتہ۔ آخر عشقِ او خاصۂ مشک پیدا کردہ می خواست کہ بخیہ بہ چار سوے رسوائی بہ شکند۔ و حسنِ بے پردہ بہ جلوہ گری در آید۔ از ننگِ افشائے راز و طعنِ اقربا بادلے بغل پروردۂ حسرت و حرماں و با خاطرِ ناشاد دست و گریبان قطعِ رشتۂ حبِ وطن ساختہ۔ از اکبر آباد بعد از خانہ بر اندازی ہا بہ شہرِ لکھنؤ رسید و سنگِ شکیبائی بہ رشتہ زدہ، از آوارہ گردی ہا آرمید و ہمیں جا بہ صد حسرتِ جاں کاہِ جلا وطنی و حرماں نصیبی از دیدارِ یار و دیارِ جان بہ جہاں آفریں داد۔ تا مقیدِ رشتۂ حیات بود طوقِ محبت بہ گردن و سلسلۂ دیوانگی بہ پا داشت۔ از کلامِ عاشقانہ و درد انگیزش (پیداست) کہ صد آرزو بہ خاک برد۔ چند مثنوی ہا و شش دیوانِ ریختہ دارد و بہ فارسی ہم سلیقہ داشتہ۔ القصہ تاثیر

[1] اصل میں میر خان آرزو کے سوتیلے بھانجے تھے۔

کلام قیامت زا آتش تاثیرے دارد کہ ہمچو خدنگِ خارا شگاف از سینہ بروں می جہد۔

فلک نے پیس کر سرمہ بنایا   نظر میں اس کی میں تو بھی نہ آیا

ولہ

دل عشق کا ہمیشہ حریفِ نبرد تھا   اب جس جگہ کہ داغ ہے یاں آگے درد تھا
اک گردِ باد تھا پئے محمل تمام راہ   کس کا غبار تھا کہ یہ دنبالہ گرد تھا

ولہ

سنا ہے حال ترے کشتگاں بچاروں کا   ہوا نہ گور گڑھا ان ستم کے ماروں کا
عرق فشانی اس زلف سے ہراساں ہوں   بھلا نہیں ہے بہت ٹوٹنا بھی تاروں کا

ولہ

ہوں نشانہ تیر خوباں کا   مجھ پہ تودہ بنا ہے طوفاں کا

ولہ

خواہ مجھ سے لڑ گیا اب خواہ مجھ سے مل گیا   کیا کہوں اے ہم نشیں میں تجھ سے حاصل دل گیا
دل سے آنکھوں میں لہو آتا ہے شاید رات کو   کشمکش میں بے قراری کی یہ پھوڑا چھل گیا

ولہ

تب میسّر مجھے اک بوسۂ جاناں نہ ہوا   جب کہ میں خاک ہوا، خاک سے پیمانہ ہوا
مے سے توبہ کی ستمگر نے غضب یہ دیکھو   جب کہ تیار مری خاک سے پیمانہ ہوا

ولہ

مر رہتے جو گل تجھ بن تو سارا یہ خلل جاتا   نکلا ہی نہ جی ورنہ، کانٹا سا نکل جاتا
بے تاب و تواں یوں میں کاہے کو تلف ہوتا   یا قوتی ترے لب کے ملتی تو سنبھل جاتا
مارا گیا تب گذرا بوسے سے ترے لب کے   کیا میرؔ بھی لڑکا تھا باتوں میں بہل جاتا

ولہ

جب گل کہے ہے اپنے تئیں یار کے رو سا   تو وہ میری آنکھوں میں اترتا تھا لہو سا
آرایشِ درویشی بھی اپنی نہیں بے لطف   ہے بوریے کا نقش مرے تن پہ اتو سا
تھوکے نہ کبھی قند کے شربت پہ وہ عاشق   تک جس نے ترے شربتی ان ہونٹوں کو چوسا

ولہ

گیا حسن خوبانِ بدراہ کا   ہمیشہ رہے نام اللہ کا

جگر کی سپر پھوٹ جانے لگی　　بلا توڑ ہے ناوک آہ کا

ولہ

صحرا میں سیلِ اشک مرا جابہ جا پھرا　　مجنوں بھی اس کی موج میں مدت بہا پھرا
طالع پھرے، سپہر پھرا، قلب پھر گئے　　چندے وہ رشکِ ماہ جو ہم سے جدا پھرا
طالع جو خوب تھے نہ ہوا جاہ کچھ نصیب　　سر پر مرے کروڑ برس تک ہما پھرا
دیر و حرم میں کیوں قدم رکھ سکے گا میرؔ　　ایدھر تو اس سے بت پھرے اودھر خدا پھرا

ولہ

یاد رہے یار رلایا اپنی تو یوں ہی گذری　　کیا ذکر ہم صفیراں یارانِ شادماں کا

ولہ

جو ایسی خوبی سے لاویں تجھے قیامت میں　　تو حرف کن نے کیا گوش دادخواہوں کا
دل جو تھا اک آبلہ پھوٹا گیا　　رات کو سینہ بہت کوٹا گیا

ولہ

آرام ہو چکا مرے جسم نزار کو　　رکھے خدا جہاں میں دلِ بے قرار کو
جیتے جی فکر خوب ہے ورنہ یہ مدبلا　　رکھے گا حشر تک تہ و بالا مزار کو
برسا تو میرے دیدۂ خوں بار کے حضور　　پر اب تک انفعال ہے ابرِ بہار کو
ہنستا ہی میں پھروں جو مرا کچھ ہو اختیار　　پر کیا کروں میں دیدۂ بے اختیار کو

ولہ

غم ایک پردہ نشیں کا جو پردہ دار رہا　　تو استخوانوں میں پنہاں مرے بخار رہا
میں خوف سے ترے بولا نہیں تھا کچھ شبِ وصل　　ستارۂ سحری گرچہ آنکھ مار رہا

ولہ

مہر کی تجھ سے توقع تھی ستمگر نکلا　　موم سمجھے تھے ترے دل کو سو پتھر نکلا
داغ ہوں رشکِ محبت سے کہ اتنا بے تاب　　کس کی تسکیں کے لیے گھر سے تو باہر نکلا
اشکِ تر قطرۂ خوں لختِ جگر پارۂ دل　　ایک سے ایک عدو آنکھ سے باہر نکلا

کیا میں بھی پریشانیٔ خاطر کے قریں تھا — آنکھیں تو کہیں تھیں، دلِ غم دیدہ کہیں تھا
اب کوفت سے ہجراں کی جہاں تن پہ رکھا ہاتھ — جو درد و الم تھا سو کہے تو کہ یہیں تھا

ولہ

حالِ دل میر کا رو رو کے شب اے ماہ سنا — شب کو القصّہ عجب قصّۂ جاں کاہ سنا

ولہ

میر کا ہجر میں وصال ہوا — لو جی قصّہ ہی انفصال ہوا

ولہ

حسن اس کا عدم تلک پہنچا — خط بھی اس کی رسید کا آیا

ولہ

مصحفِ رو کی تلاوت کے میں قابل نہ ہوا — ہاتھ میرا کسی گردن کے حمائل نہ ہوا

ولہ

بہ میرِ ستم کشتہ کسی وقت جواں تھا — اندازِ سخن کا سبب شور و فغاں تھا
کس مرتبہ تھی حسرتِ دیدار مرے پاس — جو پھول مری خاک سے نکلا نگراں تھا

ولہ

مجھے آمدِ میر کل بھا گئی — طرح اس میں مجنوں کی سب آ گئی
کمر تک جو زلفِ چلیپا گئی — میاں وہ کمر لاکھوں بل کھا گئی
تصور نہ تھا گر کسی سنگ دل کا — تو کیوں آنکھ کی (کذا) پتھرا گئی

ولہ

چشمِ بد دور، آنکھیں تیری میر — آنکھیں طوفان کو دکھاتی ہیں

ولہ

پھر طرح جو اُس گل نے (کذا) ڈالی ہے — کیا تازہ کسی گل نے اب شاخ نکالی ہے
سچ پوچھو تو کب ہے گا اس کا سا دہن غنچہ — تسکیں کے لیے میں نے اک بات بنالی ہے

ولہ

فصلِ گل آئی ہے، زنجیروں کی تیاری ہے — پھر جنوں سلسلہ جنبانِ گرفتاری ہے

قتل کرتا ہے کھلی آنکھوں کا سونا اس کا   خواب میں بھی اثرِ فتنۂ بیداری ہے

ولہ

شمع ساں شب کے آشنا ہیں ہم   صبح کے ہوتے پھر کہاں ہیں ہم
باغباں ٹک تو بیٹھنے دے ہمیں   آہ گم کردہ آشیاں ہیں ہم
ضعف ہے باعثِ حیات اپنا   کیا اجل کو خبر، کہاں ہیں ہم

ولہ

دل ہوا زخمی ہمارا نرگسِ مخمور سے   مے ٹپکتی ہے ہمارے زخم کے انگور سے

ولہ

گو دل کو یہ بے چینی، تجھ بن تو قیامت ہے   پر حیف کہ جیتے ہیں، یہ کیسی ندامت ہے

ولہ

سرد مہری کا تری دھیان جو یار آتا ہے   گور میں بھی مجھے لرزے سے بخار آتا ہے

ولہ

بارہا وعدوں کی راتیں آئیاں   طالعوں نے صبح کر دکھلائیاں
عشق نے ایذائیں ہیں دکھلائیاں   تھم رہے آنسو تو آنکھیں آئیاں
اس مژۂ برہم زدہ نے بارہا   عاشقوں میں برچھیاں چلوائیاں
رویت اپنی اس گلی میں کم نہیں   ہر جگہ سو بار ماریں کھائیاں

ولہ

گرمیٔ عشق مانعِ نشو و نما ہوئی   میں وہ نہال تھا کہ اُگا اور جل گیا
ہم خستہ دل ہیں تجھ سے بھی نازک مزاج تر   تیوری چڑھائی تو نے کہ یاں دم نکل گیا

ولہ

اُلٹی ہوگئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا   دیکھا اس بیماریٔ دل نے آخر کام تمام کیا
ساعد سیمیں دونوں اس کے ہاتھ میں لاکر چھوڑ دیئے   بھولے اس کے قول و قسم پر ہائے خیالِ خام کیا

ولہ

قتل کئے پر غصہ کیا ہے، نعش کو میری اٹھوانے دو   وہ تو جان سے جا ہی چکا ہے، تم بھی آؤ جانے دو

اب کے بہت ہے شورِ بہاراں ہم کو مت زنجیر کرو — دل کی ہوس ٹک ہم بھی نکالیں، دھومیں ہم کو مچانے دو
ضعف بہت ہے میر تمھیں، کوچے میں اس کے جائیو مت — صبر کرو ٹک، اور بھی صاحب طاقت جی میں آنے دو

ولہ

تجھے چھیڑ چھاڑ ہے کیا صبا، یہ مرے آہ مشتِ غبار سے — جو پھول کسی نے چڑھائے بھی تو اڑائے مرے مزار سے

ولہ

عشق میں جی کو صبر و تاب کہاں — اس سے آنکھیں لگیں تو خواب کہاں
شب کو رونے سے سرخ ہیں آنکھیں — مجھ بلانوش کو شراب کہاں
خط کے آنے سے کچھ کہے تو کہے — ابھی مکتوب کا جواب کہاں
عشق کا گھر ہے میر سے آباد — ایسے بھی خانماں خراب کہاں

ولہ

درد و اندوہ میں ٹھہرا جو رہا، میں ہی ہوں — رنگ رو جس کے کبھی منھ نہ چڑھا، میں ہی ہوں
آؤ مت پاس مرے، بس نہیں اب تابِ جفا — اتنا ہی عالم ہے، پھر آجاؤ گیا میں ہی ہوں
اپنے کوچے میں صدا جس کی سنو ہو دن رات — وہ جگر سوختہ و سینہ جلا، میں ہی ہوں

ولہ

دل جو اپنا ہوا تھا، زخمی چور — ضبطِ گریہ سے ہو گیا ناسور
صبح اُس سرد مہر کے آگے — قرصِ خورشید ہو گیا کافور
شکوۂ آبلہ ابھی سے میر — ہے پیارے ہنوز دلّی دور

ولہ

پشتِ پا ماری، ایسی دنیا پر — آبلے پڑ گئے کفِ پا پر
میر کیا بات، اس کے ہونٹوں کی — جینا دو بھر ہوا مسیحا پر

ولہ

نہیں یعقوب ہی تنہا الم میں — کنوئیں اندھے ہوئے یوسف کے غم میں

ولہ

میں صبح نالہ کش تھا جو یادِ حبیب میں — سوراخ پڑ گئے جگرِ عندلیب میں

ولہ

موئے سہتے سہتے جفا کاریاں — کوئی ہم سے سیکھے وفا داریاں
خط و کاکل و زلف و انداز و ناز — ہوئیں دام رہ صد گرفتاریاں
فرشتہ جہاں کام کرتا نہ تھا — تری آہ نے برچھیاں ماریاں

ولہ

نہ مری آہ یہ ہم دوشِ اثر ہوتی ہے — نے شبِ ہجر ہی کم بخت سحر ہوتی ہے
ہر شبِ ہجر میں فرطِ قلق کے مارے — دل کو دیتا ہوں تسلّی کہ سحر ہوتی ہے

ولہ

یادِ ایّام کہ یاں ترکِ شکیبائی تھا — ہر گلی شہر کی اک کوچۂ رسوائی تھا
اپنی گذری جو ترے ہجر میں تو اس کے سبب — صبر مرحوم عجب مونسِ تنہائی تھا
یہی زلفوں کی تری بات، یہی کاکل کی — میرؔ کو خوب کیا غور تو سودائی تھا

ولہ

تا بہ مقدور انتظار کیا — دل نے اب زور بے قرار کیا
سخت کافر تھا جس نے پہلے میرؔ — مذہبِ عشق اختیار کیا

ولہ

جیتے جی کوچۂ دلدار سے جایا نہ گیا — اس کی دیوار کا سر سے مرے سایہ نہ گیا
خاک تک کوچۂ دلدار کی چھانی ہم نے — جستجو کی، پہ دلِ گم شدہ پایا نہ گیا
زیرِ شمشیرِ ستم میرؔ تڑپنا کیسا — سر بھی تسلیمِ محبت سے ہلایا نہ گیا

ولہ

پھاڑا ہزار جا سے گریبانِ صبر میرؔ — کیا کہہ گئی نسیم سحر گل کے کان میں

ولہ

بیکسانہ جی گرفتاری سے شیون میں رہا — ایک ہم غم خوار رکھتے تھے، سو گلشن میں رہا
پنجۂ گل کی طرح دیوانگی میں ہاتھ کو — گر نکالا میں گریباں سے تو دامن میں رہا

ڈر سے اس شمشیر زن کے جوہرِ آئینہ ساں
سر سے لے کر پانو تک میں غرق آہن میں رہا

شمع ساں جلتے رہے لیکن نہ توڑا یار سے
رشتۂ الفت تمامی عمر گردن میں رہا

آہ کس انداز سے گذرا بیاباں سے کہ تیر
جی ہر اک نخچیر کا اس صید افگن میں رہا

ولہ

تابِ دل صبر جدائی ہو چکی
یعنی طاقت آزمائی ہو چکی

ولہ

شب گئے تھے باغ میں، ہم ظلم کے مارے ہوئے
جان کو اپنی گلِ مہتاب انگارے ہوئے

آستینیں رکھتے رکھتے دیدۂ خوں بار پر
حلقِ بسمل کی طرح لوہو کے فوارے ہوئے

پیار رکھنے کا جو خوباں ہم پہ رکھتے ہیں گناہ
ان سے بھی تو پوچھیے، تم اتنے کیوں پیارے ہوئے

لیتے کروٹ ہل گئے جو کان کے موتی ترے
شرم سے سر در گریباں صبح کے تارے ہوئے

ولہ

دست و پا مارے وقتِ بسمل تک
ہاتھ پہنچا نہ پائے قاتل تک

ولہ

مشہور چمن میں تری گل پیرہنی ہے
قرباں ترے ہر عضو پہ نازک بدنی ہے

سمجھے ہے نہ پروانہ، نہ تھامے ہے زبانِ شمع
یہ سوختنی ہے تو وہ گردن زنی ہے

ولہ

الم سے یاں تئیں میں مشقِ ناتوانی کی
کہ میری جان نے تن پر مرے گرانی کی

بہ تنگ ہوں میں ترے اختلاط سے پیری
قسم ہے اپنی مجھے اس گئی جوانی کی

ولہ

زباں رکھ غنچہ ساں، اپنے دہن میں
بندھی مٹھی چلا جا، اس چمن میں

نہ کھول اے جان میرا گور میں منھ
کہ حسرت ہے مری جا گہ کفن میں

خرد مندی ہوئی زنجیر ورنہ
گزرتی خوب تھی، دیوانہ پن میں

گدازِ عشق سے بہ بہ گیا میر
یوں ہی دھوکا سا ہے اب پیرہن میں

ولہ

تلوار غرقِ خوں ہے، آنکھیں گلابیاں ہیں دیکھیں تو تیری کب تک، یہ بد شرابیاں ہیں

ولہ

ہوتا نہیں باب اجابت کا وا ہنوز بسمل پڑی ہے چرخ پہ میری دُعا ہنوز

ولہ

اب تو نقاب منہ پہ لے ظالم کہ شب ہوئی شرمندہ سارے دن تو کیا آفتاب کو

ولہ

موا ہوں ہو کے دل افسردہ رنج و کلفت سے اُگے ہے سبزہ تو پژمردہ، میری تربت سے

ولہ

قفس میں برگِ گل رکھنے سے اے صیاد کیا حاصل اسیروں کو دلانی پھر چمن کی یاد کیا حاصل

ولہ

بیتاب ہوں میں تنگ ہم اپنی ہیں جان سے وقتِ شکیب خوش، کہ گیا درمیان سے
اب چھیڑ یہ رکھی ہے کہ عاشق ہی تو نہیں القصّہ خوش گزرتی ہے اس بدگمان سے

ولہ

کھلنا کم کم کلی نے سیکھا ہے اس کی آنکھوں کی نیم خوابی سے
برقع اٹھتے ہی چاند سا نکلا داغ ہوں اس کی بے حجابی سے

ولہ

دل جو زیرِ غبار اکثر تھا کچھ مزاج ان دنوں مکدر تھا
دل کی کچھ قدر کرتے رہیو تم یہ ہمارا بھی ناز پرور تھا

ولہ

کام پل میں مرا تمام کیا غرض اس شوخ نے بھی کام کیا
ترے کوچے کے رہنے والوں نے یہیں سے کعبے کو سلام کیا
حالِ بد میں مرے بہ تنگ آکر آپ کو سب میں نیک نام کیا

عشقِ خوباں نے میرؔ کو اپنا　　قبلہ و کعبہ و امام کیا

ولہ

فصلِ خزاں میں سیر جو کی ہم نے جائے گل　　چھانی چمن کی خاک، نہ تھا نقشِ پائے گل
اللہ رے عندلیب کی آوازِ دل خراش　　دم ہی نکل گیا جو کہا اس نے ہائے گل

ولہ

گرچہ آوارہ جوں صبا ہیں ہم　　لیک لگ چلنے کو بلا ہیں ہم
اے بتاں اس قدر جفا ہم پر　　عاقبت بندۂ خدا ہیں ہم
ہے نمک سودہ، سب تنِ مجروح　　تیرے کشتوں میں میرزا ہیں ہم
خوف ہم کو نہیں جنوں سے کچھ　　یوں تو مجنوں کے بھی چچا ہیں ہم

ولہ

آہ اور اشک ہی سدا ہے یہاں　　روز برسات کی ہوا ہے یہاں

ولہ

رونے سے میرے ابر کا ہنگامہ سرد ہے　　آنکھیں اگر یہی ہیں تو دریا بھی گرد ہے

ولہ

کم ہے کیا لذتِ ہم آغوشی　　سب مزے میرؔ در کنار رہے

ولہ

سر خاکِ آستاں پہ تمھارے رہا مدام　　اس پر بھی یہ نصیب کہ تم بے وفا کہو

ولہ

طوفِ مشہد کو کل جو جاؤں گا　　تیغِ قاتل کو سر چڑھاؤں گا
لوٹتا ہے بہارِ حسن کی خط　　میرؔ اس پر میں زہر کھاؤں گا

ولہ

منھ تکا ہی کرے ہے جس تس کا　　حیرتی ہے یہ آئینہ کس کا
شام سے کچھ بجھا سا رہتا ہے　　دل ہوا کیا چراغ مفلس کا

ولہ

میرؔ نہیں پیر تم، کاہلی اللہ رے — نامِ خدا، ہو جواں کچھ تو کیا چاہیئے

ولہ

اب کے بھی سیرِ باغ کی جی میں ہوس رہی — اپنی جگہ بہار میں کنجِ قفس رہی

میں پاشکستہ جا نہ سکا، قافلے تلک — آتی اگرچہ دیر، صدائے جرس رہی

ولہ

دن رات میرؔ آنکھوں سے آنسو چلے گئے — برسات اب کے شہر میں سارے برس رہی

ولہ

جم کیا خوں کفِ قاتل پہ زبس تیرا میرؔ — اس نے رو رو دیا کل ہاتھ کو دھوتے دھوتے

ولہ

کیسا رخصت کیا جوانی کو — کوسوں کس منہ سے ناتوانی کو

ولہ

اک آن اس زمانے میں یہ دل نہ وا ہوا — کیا جانیئے کہ میرؔ زمانے کو کیا ہوا

یوں پھر اٹھا نہ جائے گا، اے ابرِ دشت سے — گر کوئی رونے بیٹھ گیا، دل جلا ہوا

لے کر جواب نامہ، نہ قاصد پھرا کبھی — کیا جانے سرنوشت میں کیا ہے لکھا ہوا

ولہ

نہ تو نامہ ہے، نہ قاصد، نہ خبر آتی ہے — بات بگڑی ہوئی کچھ ہم کو نظر آتی ہے

چوٹ جو دل میں لگی تھی میرے — موسمِ گل میں وہ ہر سال ابھر آتی ہے

ولہ

کیا کیا ہوائیں دیدۂ تر سے نظر پڑیں — جب رونے بیٹھ جاتے تھے تب برشگال تھا

ولہ

نسیمِ مصر کب آئی، سوادِ شہرِ کنعاں کو — کہ بھر جھولی نہ یاں سے لے گئی گل ہائے حرماں کو

ہوائے ابر میں گرمی نہیں گر تو نہ ہو ساقی — دمِ افسردہ کر دے منجمد رشحاتِ باراں کو

گئے ناواقفِ شادی اگر ہم بزمِ عشرت میں — دہانِ زخمِ دل سمجھے، جو دیکھا روئے خنداں کو

ولہ

غرورِ ناز نے آنکھیں نہ کھولیں اس جفا جو کی　　ملا پاؤں تلے نہ جب تک نعرہ چشمِ غزالاں کو (کذا)

زبانِ نوحہ گر ہیں، قضا نے کیا ملایا تھا　　مری طینت میں یارب سودۂ دل کوچہ نالاں کو

صدائے آہ جی کے پار ہوئی تیر سی، شاید　　کسی بے درد نے کھینچا، کسی کے دل کے پیکاں کو

کوئی کا تماشا سر رہ کا ہماری خاک پر بس ہے　　گل و گلزار کیا درکار ہے، گورِ غریباں کو

کیا سیر اس خرابے کا بہت، اب چل کے سو رہیئے　　کسی دیوار کے سائے میں، منہ پر لے کے داماں کو

ولہ

چمن کا نام سنا تھا ولے نہ دیکھا ہائے　　جہاں میں ہم نے قفس میں ہی زندگانی کی

ولہ

مجھ سا بے تاب ہووے جب کوئی　　بے قراری کو جانے تب کوئی

بعد میرے ہو گیا سنسان　　سو نے پایا تھا ورنہ کب کوئی

ولہ

ایسے محروم گئے ہم تو گرفتارِ چمن　　کہ موئے قید میں دیوار بہ دیوارِ چمن

سینہ پر داغ کا احوال میں پوچھوں ہوں نسیم　　یہ بھی تختہ کبھی ہووے گا سزاوارِ چمن

وہ گنہ گار ہیں ہیں کہ جسے کہتے ہیں　　عاشقِ زارِ چمن، مرغِ گرفتارِ چمن

باغباں ہم سے خشونت سے نہ پیش آیا کر　　عاقبت نالہ کشاں بھی تو ہیں درکارِ چمن

ولہ

نہ پوچھ خوابِ زلیخا نے کیا خیال کیا　　کہ کاروان کا کنعاں کے جی نکال لیا

رہِ طلب میں گرے ہوتے سر کے بل ہم بھی　　شکستہ پائی نے اپنی ہمیں سنبھال لیا

ولہ

بے کلی مارے ڈالتی ہے نسیم　　دیکھیے اب کے سال کیا ہووے

نہیں وسواس جی کے جانے کے　　ہائے رے ذوق دل لگانے کے

اس کدورت کو ہم سمجھتے ہیں　　ڈھب ہیں یہ خاک میں ملانے کے

دم آخر ہی کیا نہ آنا تھا — اور بھی وقت تھے بہانے کے
چشمِ انجم سپہر جھپکی ہے — صدقے اس انکھڑیاں لڑانے کے

ولہ

نرگسی آنکھیں شرم آلودہ خاک میں ہم کو ملائیں گی — کیا یہ نگاہیں نیچی نیچی، اوپر اوپر جائیں گی

ولہ

میں بندہ ہوں تیرا، خدا جانتا ہے — خدا جانے تو مجھ کو کیا جانتا ہے
بتوں کے تئیں اس قدر مانتا ہے — یہ کافر مرا دل، خدا جانتا ہے

رُباعی

دیکھی نہیں بھر بھری طبیعت ایسی — واللہ و لا بُری طبیعت ایسی
چٹ پٹ گئی جس کی اچھی صورت دیکھی — اور کیا کہوں بس طبیعت ایسی

از "ساقی نامہ"

ساقی جو کروں میں کج ادائی — معذور رکھ اب بہار آئی
گل بادِ صبا کے تا کمر ہے — دامان بلند ابر تر ہے
غنچے کی گلابیاں بھری ہیں — تکلیف کی منتظر دھری ہیں
اطرافِ چمن کھلے ہے لالہ — ہے پھول شراب کا پیالہ
ہے گل کی ہوا سبُو کشی میں — بُلبل کا دماغ بُو کشی میں
ہے ننگ ہوا کا آفتابی — جھومیں ہیں نہال جوں شرابی

ولہ

دور بہت بھاگو ہو ہم سے، سیکھا طور غزالوں کا — وحشت کرنا شیوہ ہے کچھ اچھی آنکھوں والوں کا

ولہ

تیز یونہی نہ تھی شب آتشِ شوق — تھی خبر گرم اس کے آنے کی

ولہ

وہ کہاں دھوم جو دیکھی گئی چشمِ تر سے — ابر کیا کیا اُٹھے ہنگامے سے، کیا کیا برسے

ولہ

پھرتے ہیں میر خوار، کوئی پوچھتا نہیں — اس عاشقی میں عزتِ سادات بھی گئی

ولہ

چمکنا برق کا کرتا ہے کارِ تیغ ہجراں میں — برسنا مینھ کا داخل ہے اس بن، تیرِ باراں میں

ناسخ

ناسخ تخلص، شیخ امام بخش، طرۂ سرپیچِ سخنوری و گوہرِ بناگوش معنی پروری، لطافت آفرینِ کلام بلیغ و فصیح ملاحت افزاے چہرۂ شاہدِ مضمونِ دل فریب۔ تلمیذ مصحفی سحر بیان استادِ نزاکت بندانِ زماں بودہ۔ در بیت السلطنۃ لکھنؤ کوسِ استادی نواختہ و غلغلۂ شاعری در اکنافِ عالم و عالمیان انداختہ۔ مضمونِ تازہ ہر قدر کہ نصیبِ او گشتہ، دیگر شعرا را بہ خواب ہم پرتوے نہ انداختہ باشد۔ دل فریبیٔ معنیٔ جاد و طرازش دل ہا را محوِ تماشا کردہ، و دچارِ حیرت ساختہ است و بہ مداحیٔ ہر شعر تازہ اش معنی فہمانِ صافی طبع را سرمہ در گلو کردہ، بلندیٔ فکرِ منظومش بہ مرتبہ رسیدہ کہ سلکِ عقدِ ثریا از ہم گسستہ مشاہدہ شود و بہ مقابلِ خم و پیچ طرۂ مشک نابِ الفاظِ شوخ و بندشِ چستِ او گیسوے فتنہ پرداناں اداہم بستہ و شکستہ بہ نظر می آید۔ چند سال است کہ داعیِ اجل را لبیک گفتہ، آتشِ شعلہ افروزِ شاعریٔ لکھنؤ را سرد کردہ۔ فقیر از زبانِ سحر بیان و از دیوانِ پریشانش انچہ شنیدہ و دیدہ، مختصر ازاں، داخلِ این تذکرہ می سازد:

خط کیا کہ خال بھی رخِ محبوب پر نہیں — ایسا بدن ہے صاف، کہ کوئی کمر نہیں

ولہ

یوں خیالِ روئے جاناں ہے دلِ بیتاب میں — جس طرح سے عکس ہو مہتاب کا گرداب میں

کھپ گئی رنگت سنہری یوں دلِ بیتاب میں — جس طرح سے ڈوب جاتا ہے طلا سیماب میں

رات بھر تڑپے، فراقِ یار میں ہم، اس قدر — پڑ گئے جھنتے ہزاروں چادرِ مہتاب میں

ولہ

ہے صاف آئینہ، یہ تمہارا بدن نہیں — گویا غلافِ آئینہ ہے پیرہن نہیں

ولہ

ہے گلِ رخسارِ جاناں، نرگسِ جادو سیاہ　　ہو گئے ہیں تابشِ خورشید سے آہو سیاہ

ولہ

کردئے خط نے ترے عارضِ پرنور سیاہ　　ہوگیا مشک کے مانند، یہ کافور سیاہ

ولہ

ہاتھ میں گر نہ سرِ زلف گرہ گیر رہے　　پانو میں تو ترے دروازے کی زنجیر رہے
نامۂ یار کے مضموں رہیں ازبر مجھ کو　　جس طرح یاد کوئی نسخۂ اکسیر رہے

ولہ

پنجۂ پرنور سے زلفوں میں شانہ کیجئے　　شمعوں سے روشن کبھی زنجیر خانہ کیجئے
عندلیبیں کہتی ہیں، وہ دستِ رنگیں دیکھ کر　　شاخِ مرجاں میں اب اپنا آشیانہ کیجئے

ولہ

کیوں نہ خاموشی خوش آوے، بلبلِ تصویر کی　　لطف کیا میری طرح گر آہ بے تاثیر کی
عاشقوں سے ہے کڑی ہر بات اس بے پیر کی　　کاکلِ پیچاں سے آتی ہے صدا زنجیر کی

ولہ

صحرا میں دیکھتا ہوں جو شوخی غزال کی　　آتی ہے یاد اک صنم خورد و سال کی
گل گونِ یار کی ہیں یہ رنگین خرامیاں　　پائی غبارِ راہ نے رنگت گلال کی

ولہ

کیا کہیئے تیغِ ابروئے قاتل کے آب کی　　عکسِ مژہ سے کٹتی ہے بوتل شراب کی

ولہ

جس نے آنکھ آپ سے لڑائی ہے　　اس سے اک خلق سے لڑائی ہے
لے چلی ہے وطن سے وحشت دور　　بارے نزدیک موت آئی ہے

ولہ

خیال میں بھی اگر خواب سے دوچار ہوا　　شبِ فراق سے میں کیا ہی شرمسار ہوا

جو وصف زلف کے لکھے تو قلم بنا افعی ۔۔۔ دہن دوات کا مثلِ دہانِ مار ہوا

ولہ

ہے تصور مجھے ہر دم تری یکتائی کا ۔۔۔ مشغلہ آٹھ پہر ہے یہی بینائی کا

ولہ

وحشیوں کا کیا ہی مجھ وحشی سے یارانہ ہوا ۔۔۔ شیر کا پنجہ برائے موئے سر شانہ ہوا
تیرے آگے باغباں نے نوچ ڈالے سب چمن ۔۔۔ باغ میں ہر گل بہ رنگِ سبزۂ بیگانہ ہوا
آتشِ رنگِ حنا سے شمع ہیں سب انگلیاں ۔۔۔ دستِ جاناں میں مرا مکتوب پروانہ ہوا

ولہ

کس قدر صاف ہے تمھارا پیٹ ۔۔۔ صاف آئینے کا ہے سارا پیٹ
پہنے کرتی اگر وہ جالی کی ۔۔۔ کرے ہر حلقے کو ستارا پیٹ
آپ کی ناف، مشک نافہ ہے ۔۔۔ اور کافور کا ہے سارا پیٹ

ولہ

چشمِ عاشق میں برابر ہے لگا گھر باہر ۔۔۔ ایک سا جلوۂ معشوق ہے اندر باہر
یہ تمنا ہے صنم، ہو جو قیامت برپا ۔۔۔ قبر سے مجھ کو نکالے تری ٹھوکر باہر
رات بھر تم تو کرو بادہ کشی، محفل میں ۔۔۔ مثلِ ساغر ہمیں تا صبح ہو چکر باہر
بعد مرنے کے بھی ہے ساتھ یہاں فصلِ بہار ۔۔۔ قبر میں داغِ جنوں، پھولوں کی چادر باہر
خانۂ چشم میں بے یار جو نیند آنے لگی ۔۔۔ مردمِ دیدہ یہ چلائے کہ باہر باہر
ناز حوروں کے اٹھائیں، یہ کہاں ہم کو دماغ ۔۔۔ ہو ہمارا درِ فردوس سے بستر باہر

ولہ

پردۂ گوش ہوا، مثلِ کتاں سو ٹکڑے ۔۔۔ جب سے آتی نہیں اس رشکِ قمر کی آواز
پنبۂ شیشۂ مے کان میں رکھ دے ساقی ۔۔۔ کہ شبِ عیش میں آئے نہ گجر کی آواز

ولہ

مُردوں کو جِلاتی ہے تری نازکی آواز ۔۔۔ اعجاز کا اعجاز ہے، آواز کی آواز

وله

یاد آئی جو مجھے تیری کمر کی بندش — کھل گئی ٹوٹنے سے زخمِ جگر کی بندش

ہے کہاں اس کی کمر اور کمر بند کہاں — یہ تو ہے واہمۂ اہلِ نظر کی بندش

وله

خوش ہوا بھولے سے جب دل، غم وہیں یاد آگیا — قہقہہ ہونٹوں تلک پہنچا کہ نالا ہو گیا

اس پری کی سرد مہری نے رلایا جب مجھے — اشک جو ٹپکا مری آنکھوں سے ژالہ ہو گیا

وله

پھاہا ہو ہمارے زخمِ دل کا — ٹوپی جو تمھاری ملگجی ہے

وله

ناسخ شراب پی، شبِ تاریک ہے تو کیا — محتاج آفتاب نہیں ماہتاب کا

وله

بزم میں پاتا نہیں جو ساقیِ گل فام کو — جانتا ہوں میں ہتھیلی کا پھپولا جام کو

وله

مثلِ سبزہ خط کا ہوا نشو و نما — خالِ روئے یار گویا تخمِ سنبل ہو گیا

وله

دشتِ وحشت میں مجھے، فکرِ تنِ عریاں نہیں — خار ہوں لیکن خیالِ گوشۂ داماں نہیں

وله

آفتابِ حشر بھی تارا ہے اس کی شام کا — گردشِ ایام میں صبحِ شبِ ہجراں نہیں

وصل کی شب ہو چکی، صبحِ قیامت ہے عیاں — صور کی آواز ہے، مرغِ سحر نالاں نہیں

ایک شقِ آفتاب، اس میں نمایاں دو ہلال — ہیں عیاں دو معجزے، خنداں لبِ جاناں نہیں

جائے گا نورِ سحر بھی مشک افشاں ہے فلک — سایۂ زلفِ صنم ہے یہ، شبِ ہجراں نہیں

چشمِ تر کو کیوں نہ ہو دستِ حنائی کا خیال — کب سمندر ہے کہ جس میں پنجۂ مرجاں نہیں

بت پرستی کیا بری ہے، گر نہیں ملتا خدا — کفر میں کامل ہو ناسخ گر تجھے ایماں نہیں

وله

موسیٰ کو دی خدا نے جو تنویر ہاتھ میں — یاں سنگ ریزے کرتے ہیں تقریر ہاتھ میں

دل ہے اگر بہ یار تو ہے دست بھی بکار — دل میں تصور اس کا ہے تصویر ہاتھ میں

اترا ابخار جو تو نے بدن چھوا — تعویذ کی لکیریں ہیں تحریر ہاتھ میں

ولہ

مسخر وہ پری رو ہے، کمند جذبۂ دل کا — ہر اک داغ جنوں گویا کہ ہے تعویذ عامل کا

سبب یہ ہے جو پیراہن ہے گلگوں میرے قاتل کا — نہ ہونے پائے ظاہر داغ ہرگز خون بسمل کا

کروں نالہ تو کہتا ہے وہ کافر کس نزاکت سے — وہ گل ہیں زمزمہ آتا ہے خوش جن کو عنادل کا

ولہ

تڑپ کر ایک دم آرام آجاتا ہے کیا اس کو — مجھے کرتا ہے بسمل سرد ہونا مرغ بسمل کا

ولہ

حضور گردن ساقی ہر اک شیشے کی گردن میں — نظر آنے لگا عالم گلوئے مرغ بسمل کا

جہاں میں جو حسیں ہے تجھ سے کسب نور کرتا ہے — چراغ آگے ترے اے مہ جبیں کاسہ ہے سائل کا

ہوا ہر گل چمن میں تیرے آنے سے یہ دیوانہ — کہ آوازہ شکست رنگ ہے نالہ سلاسل کا

لب ساقی کے بوسوں کی گزک ہو گر نہ اے ناسخ — شراب زندگی میں ہے مزا زہر ہلاہل کا

ولہ

دھوپ بہتر، پر شب فرقت کی بدتر چاندنی — صاعقے کے طور سے پڑتی ہے مجھ پر چاندنی

ایک ہفتے سے بہم، ساتوں میسر ہیں مجھے — دشت، دریا، سبزہ، ساقی، شیشہ، ساغر، چاندنی

نقرئی موباف، اس کافر کی چوٹی میں نہیں — یہ وہ شب ہے جس نے کرلی ہے مسخر چاندنی

ولہ

صاف قاصد کو واں جواب ملا — میرے خط کا یہی جواب ملا

نقطۂ لایتجزا ہے، دہن سے پیدا — بوئے مختم ہے اندازِ سخن سے پیدا

ولہ

اس پری رو کے کف پا میں ہے عالم نور کا — سنگ پا کے واسطے منگوائیں پتھر طور کا

ولہ

ہم نے جو بٹی بنائی ہے ترے موباف کی — نافۂ مشکیں ہوا ہے منہ، ہر اک ناسور کا

ولہ

اپنے صنم کو لے کے شب وصل باغ میں — بھاگا میں آشیانۂ مرغ سحر سے دور

ولہ

ہوش اڑتے ہیں جو سنتا ہوں تری آواز کو — کیا ترے پردے سے نسبت پردہ ہائے ساز کو

ولہ

گوری گوری انگلیاں ہیں مثلِ شمع ۔۔۔ ہے بجا تمثیل ناخن گیر کو گلگیر سے

ولہ

کیا سیاہی اور سرخی لالہ وار آنکھوں میں ہے ۔۔۔ چشمِ بد دُور، آج اے ساقی بہار آنکھوں میں ہے

ولہ

فرقت قبول، رشک کے صدمے نہیں قبول ۔۔۔ کیا آئیں ہم، رقیب تری انجمن میں ہے

ولہ

جب کبھی پہنا جڑاؤ اس نے زیور کان میں ۔۔۔ نازکی بولی کہ کیوں لٹکائے پتھر کان میں

ولہ

لگ چلے گلشن میں گر، اس سروِ سیم اندام سے ۔۔۔ ہو جھپک موجِ ہوا میں نقرئی زنجیر کی
دانت تیرے دیکھتے ہی، ہو گیا ناسخ شہید ۔۔۔ ہائے کیا ان موتیوں میں آب ہے شمشیر کی

ولہ

نیچے ہیں شعر، وصفِ ابروئے خمدار کے ۔۔۔ حرف لکھتے ہی جوہر بن گیے تلوار کے
کیا خزاں پاس آسکے تیرے گلِ رخسار کے ۔۔۔ پھول کمھلاتے نہیں ہرگز گلے کے ہار کے
مار ڈالا جان سے جب سے لڑائی تو نے آنکھ ۔۔۔ ساقیا ڈورے تری آنکھوں میں ہیں تلوار کے

ولہ

جیب میں چاکِ درِ یار نظر آتا ہے ۔۔۔ سینے میں روزنِ دیوار نظر آتا ہے

ولہ

ہوں وہ مے کش جب بنا پتلا تو میں نے تب، عرض کی ۔۔۔ کاسۂ سرجام کا، شیشے کی گردن چاہیے

ولہ

بامِ جاناں پر رسائی آج ہے ۔۔۔ وصل کی شب بھی شبِ معراج ہے
زرد ہے کیا تیرے آگے یاسمین ۔۔۔ تھا جو ہیرا ان دنوں پکھراج ہے

ولہ

اے جنوں ہجر میں کیا نالہ دمساز نہیں ۔۔۔ ضعف ایسا ہے کہ زنجیر میں آواز نہیں

ہوگیا کام ادا، ایسی بھلا کیا ہے ادا قتل کرتے ہو یہ کچھ ناز کا انداز نہیں

ولہ

گل کو جب دیکھا، تری تصویر کا دھوکہ ہوا بولی جب بلبل، تری تقریر کا دھوکہ ہوا
ہوں وہ بے خود، خونِ پا سے جب ہوئی زنجیر سرخ خاکِ صحرا پر مجھے اکسیر کا دھوکہ ہوا
جا بہ جا دیکھیں جو نہریں اشکِ ناسخ کی رواں کوچۂ محبوب پر کشمیر کا دھوکہ ہوا

ولہ

بنتے ہیں چاندی کے چھلے، حلقۂ زرہاتھ میں ملتے ہیں جا سے حنا اکسیر دلبر ہاتھ میں

ولہ

ہو گیا بے تاب سن کر آہ، مجھ بے تاب کی میرے بسیم اندام میں حالت ہوئی سیماب کی
ہونٹ دونوں صورتِ عناب آتے ہیں نظر آپ کی مسواک گویا، شاخ ہے عناب کی
ہوں وہ سرگشتہ جو دیکھا میں نے منہ اپنا کبھی آئینے میں صاف صورت ہو گئی گرداب کی
وادیِ غربت میں ہے ناسخ، وطن میرے حضور خود فراموشی میں بھی ہے مجھ کو یاد احباب کی

ولہ

دل کی صورت سے گریباں پارہ پارہ کیجیے رازِ پنہاں جی میں ہے، اب آشکارا کیجیے
شاعری سے فایدہ، پڑھیے کوئی ایسا عمل جس سے گھر میں تخت پریوں کے اتارا کیجیے

ولہ

باغ میں اک بار اگر وہ لالہ رو ہو جائے گا رنگِ گل غیرت سے پنہاں مثلِ بو ہو جائے گا
آبِ جو میں او سہی قامت نہ اپنا عکس ڈال شرم سے سروِ لبِ جو، آبِ جو ہو جائے گا

ولہ

مل گیا ہے جب شبِ تیرہ میں عریاں تو مجھے نور کا تڑکا نظر آیا ہے او مہ رو مجھے
راکھ پرلیٹوں جلا کر بوریے کو، جی میں ہے خوش نہیں آتا قبائے فقر پر اتو مجھے

ولہ

جنوں پسند مجھے چھانو ہے ببولوں کی عجب بہار ہے ان زرد زرد پھولوں کی
امیدِ وصل میں ہم جھولتے ہیں برسوں سے وہاں رتیوں میں، طیاریاں ہیں جھولوں کی

ولہ

جو اس پری سے شبِ وصل میں رکاوٹ ہو — مجھے بھی ایک جنازہ ہو یا چھپرکھٹ ہو
میں جاں بہ لب ہوں، گلا کاٹو یا گلے سے لگو — جو اس میں آپ کو منظور ہو وہ جھٹ پٹ ہو
لپٹ کے یار سے سوتا ہوں، مانگتا ہوں دعا — تمام عمر بسر یارب ایک کروٹ ہو
جلاؤ غیروں کو مجھ سے جو گرمیاں کر کے — تمھارے کوچے میں تیار ایک مرگھٹ ہو

ولہ

ہر پھول ترے رشک سے جب آب ہوگیا — صحنِ چمن بھی نظروں میں تالاب ہو گیا
تیرے حضور زہرۂ مہ آب ہوگیا — شب چاندنی میں عالمِ سیلاب ہوگیا
پھاڑا جو اس نے دستِ حنائی سے خط مرا — ہر پرزہ برگِ لالہ شاداب ہوگیا
آنا ترا وہ راتوں کا یاد آ گیا جو ہائے — مہتاب کو میں دیکھ کے بےتاب ہوگیا
چادر کے بدلے چاندنی اس کی جو ڈال دی — میری لحد میں جلوۂ مہتاب ہوگیا
مضمون جو اپنے رونے کا میں نے رقم کیا — ناسخ دہن دوات کا گرداب ہوگیا

ولہ

پاس جس دن سے دلا وہ ستم ایجاد نہیں — کوئی بھی اس کے سوا اس کا ستم یاد نہیں
میرے مرنے سے ہے بس خانۂ زنجیر خراب — ورنہ گھر کون ہے دنیا میں جو آباد نہیں
ہائے جو کرتے ہیں سب اہلِ زمیں ہیں کرتے ہیں — اے فلک تجھ سے مجھے شکوۂ بےداد نہیں
اب تو جی کھول کے دن رات کرو ظلم و ستم — ناتوانی سے مجھے طاقتِ فریاد نہیں
مر کے بھی چھٹتے نہیں آپ کی زلفوں کے اسیر — یہ عجب قید ہے جس کی کوئی میعاد نہیں
رنج دیتا ہے جنوں جن کی طرح اے ناسخ — جب سے پہلو میں وہ محبوب پری زاد نہیں

ولہ

مرغِ دل کو بچۂ سفاک کو بسمل سمجھا — تیغ کو طایرِ جاں شاخِ نشیمن سمجھا
آئی صحرا میں جو اس گرم عناں کی ہم یاد — چشمِ آہو کو میں نقشِ سمِ توسن سمجھا
خوب دھوکا مجھے مستی کی ادا ہٹ نے دیا — دہنِ یار کو میں غنچۂ سوسن سمجھا

کس نے انگشت رکھی فاتحہ کو فندق بند		شمع معکوس لحد پر جو میں روشن سمجھا
خاک برباد رہی دشتِ جنوں میں میری		بس بگولے ہی کو میں گنبدِ مدفن سمجھا
کاٹے کھاتی ہے مجھے فکرِ سخن اے ناسخ		دو زبانیِ قلم اپنے کو ناگن سمجھا

ولہ

ہے کیا ہی اثر خوبیٔ ابرو کے بیاں کا		تلوار سے کم کاٹ نہیں میری زباں کا
محروم ہو رکھنا اُسے منظور ہے میرا		کہتا ہے ظرافت سے کہ لے بوسہ ہاں کا

ولہ

دل ایک بت پہ شیدا ہوا چاہتا ہے		خدا جانے اب کیا ہوا چاہتا ہے
پڑا کان میں سروِ بالا کے بالا		جنوں یاں دو بالا ہوا چاہتا ہے

ولہ

غمِ افلاس کہاں دل ہے تونگر اپنا		زرد چہرہ نہیں فاقوں سے یہ ہے زر اپنا
خاک پر لوٹتے ہیں فرقتِ محبوب میں ہم		چاندنی ہے شبِ مہتاب میں بستر اپنا
اپنے طالع میں ہے اے رشکِ قمر پامالی		ہے ستارہ تری پاپوش کا اختر اپنا
اتنی مدت سے ہوں میں وادیٔ غربت میں اسیر		کہ وطن جاؤں تو پاؤں نہ کبھی گھر اپنا

ولہ

کر کے چشمک جو، خیاباں سے تو اے یار چلے		ساتھ ہی تھامے عصا نرگسِ بیمار چلے
ہم ہوے قتل، جو تم ناز سے اے یار چلے		ہو قیامت اگر اس چال سے تلوار چلے
میری تصویر اگر پیرِ مغاں چپکا دے		ساتھ پھر مست کے مے خانے کو دیوار چلے

ولہ

سینکڑوں آہیں بھروں پر دخل کیا آواز کا		تیر جو آواز دے ہے نقص تیر انداز کا

ولہ

قیامتِ یار کو ہم یاد کیا کرتے ہیں		سرو کو صدقے میں آزاد کیا کرتے ہیں
انتقام اس کا کہیں لے نہ فلک ڈرتا ہوں		جھوٹے وعدوں سے جو وہ شاد کیا کرتے ہیں

ولہ

نخلِ وادیِ ایمن کر دے بیدِ مجنوں کو تیرے رنگ میں لیلی بانگِ لن ترانی ہے

ولہ

شوخیاں ہر ناخنِ پا میں ہیں چشمِ حور سی تیرے تلووں میں صفائی ہے پری کے گال کی

ولہ

کس کو فرقت میں خواہش مُل ہے پانی پینے میں یاں تامل ہے
شبِ فرقت میں شمع کا کیا ذکر زندگی کا چراغ بھی گل ہے
گلِ گلزار میں ثبات کہاں پا بیدار اس کی کفش کا گل ہے

ولہ

گورے بدن پہ اس کے نہیں پیرہن سفید یہ نسترن سفید ہے، وہ یاسمن سفید
اُڑ جائے رنگ ترے لبِ لعل کے حضور بلور کی طرح ہو عقیقِ یمن سفید
آئی بہار، ہر بُنِ مو سے ہے جوشِ خوں ہو جائے سرخ پہنوں اگر پیرہن سفید

ولہ

رنگ میں شوخ ہے ایسا، بدنِ سرخ ترا دکھنا، یہ سرسبز نہیں پیرہنِ سرخ ترا
ہو ہمیشہ ترے کوچے میں شہیدوں کی بہار رہے سرسبز الٰہی چمنِ سرخ ترا
ایک بوسے کے تصور میں یہ ہوتا ہے کبود نہیں محتاج مسّی کا دہنِ سرخ ترا

ولہ

آسماں پر نظر آتے نہیں تارے دن کو تری جوتی کے چمکتے ہیں ستارے دن کو
کون ایسا ہے جو چڑھاوے جو مری تربت پر رات کے پھول جو محبوب اتارے دن کو
رات ہو جائے یقیناً مجھے اٹھتے اٹھتے حالتِ ضعف میں کوئی جو پکارے دن کو
یہ دُعا آٹھ پہر وردِ زباں ہے ناسخ رات کو وصل میسّر ہو نظارے دن کو

ولہ

کیا سیاہی و سُرخی لالہ وار آنکھوں میں ہے چشمِ بد دور آج اے ساقی بہار آنکھوں میں ہے

ولہ

سر سبز سبزہ ہو جو ترا پائمال ہو — ٹھہرے تو جس شجر کے تلے وہ نہال ہو

ولہ

مہندی ہے شعلہ قدم، اس رشک پری کا — پاپوش نے سیکھا ہے چلن، کبک دری کا
دیواں میں شادیٔ کتخدائے جگہ چھوڑ دی میں نے — مضمون یہ باندھا تری نازک کمری کا

ولہ

یہ آدمی ہے کہ برسوں جمال رہتا ہے — وگرنہ ماہ کو یک شب کمال رہتا ہے
یہ پھنک رہا ہے مرا جسم، آتشِ غم سے — کہ طوق بھی مری گردن میں لال رہتا ہے

ولہ

مرتبہ کم حصِ رفعت سے ہمارا ہو گیا — آفتاب اتنا ہوا اونچا کہ تارا ہو گیا
یہ صفائی، یہ لطافت، آدمی میں ہے کہاں — تم نے جو دل میں چھپایا، آشکارا ہو گیا

ولہ

بھلا ہوا کہ نہ خواہانِ عزوشان ہوئے — جگر چھدا جو صدف کا تو اپنے کان ہوئے

ولہ

جل اٹھا باغ اس کے برقِ حسن کی تاثیر سے — پھول جو گل چیں اٹھاتے ہیں سو آتش گیر سے

ولہ

نہیں کہہ سکتا ہوں جو کچھ کہ مرا مطلب ہے — عاشقِ تازہ ہوں اور وصل کی پہلی شب ہے
گم ہوا ہوں جب سے تیرا رو نظر آیا مجھے — آئینہ جب میں نے دیکھا، تو نظر آیا مجھے
جب رہ پہلا، چوٹی میں موباف ڈالا یار نے — سنبلستاں میں گلِ شبو نظر آیا مجھے
شمع ہے فانوس میں، یا جو میں عکس شاخِ گل — آستیں سے یا ترا بازو نظر آیا مجھے
یار کے دروازے سے کیوں کر میں اٹھوں ناتواں — بازو اس کا قوتِ بازو نظر آیا مجھے
عکس ہونٹوں پر جو دونوں ابروؤں کا پڑ گیا — وہ صنم طفلی میں چار ابرو نظر آیا مجھے
شاید آنکلے وہ خوش قد، اشک کر ناسخ رواں — سروِ باغ اکثر کنارِ جو نظر آیا مجھے

ولہ

خواب میں منہ سے جو اس مہ کے دوپٹہ اترا — نظر آنے لگا منہ چاند کا اترا اترا

ولہ

دم ہے بند آگے تیرے، تیغِ صفاہانی کا　　قاتلِ خلق ہے عالم تری عریانی کا

ولہ

دیکھ لے جوڑا بسنتی جب وہ جسمِ یار میں　　پھولے کیوں سرسوں نہ، چشمِ نرگسِ بیمار میں

ولہ

بنتا جو جامِ بادہ تو ہوتا میں رند شاد　　سبحہ بنا کے کیوں مری مٹی خراب کی

ولہ

بلبلیں گل ہنسیں تو کیوں نہ رکوں　　کہ ہنسی کا مرا مزاج نہیں

ولہ

جب سے ہے مدِنظر، جوڑا بسنتی یار کو　　تب سے یرقاں ہو گیا ہے، نرگسِ بیمار کو

ولہ

طفلی سے اور قہر ہوا وہ، شباب میں　　تابش ہو دوپہر کو فزوں آفتاب میں

ولہ

مرا سینہ ہے مشرق، آفتابِ داغِ ہجراں کا　　طلوعِ صبحِ محشر چاک ہے، اپنے گریباں کا

کفن کی جب سفیدی دیکھتا ہوں کنجِ مرقد میں　　تو عالم یاد آتا ہے، شبِ مہتابِ ہجراں کا

ولہ

بجائے داغ ملے، دیدۂ غزال مجھے　　کمال جوششِ وحشت ہے اب کے سال مجھے

ولہ

ترے جاتے ہوا، رنگِ چمن ہو جائے گا　　برگِ گل جو ہے وہ، رنگِ یاسمن ہو جائے گا

بام پر نکلے نہ تم آؤ شبِ مہتاب میں　　چاندنی پڑ جائے گی، میلا بدن ہو جائے گا

مے کدے تک محتسب کرمے کشو آنے تو دو　　دیکھ کر پیمانے کو، پیماں شکن ہو جائے گا

ولہ

چبھنے دو خارِ کوچۂ دلدار پاؤں میں — پاپوش کچھ نہیں مجھے درکار پاؤں میں
سر ننگے بے سبب نہیں، دشتِ جنوں میں ہم — باندھی ہے پھاڑ پھاڑ کے، دستار پاؤں میں
سب جانتے ہیں کہ کوچۂ گیسو میں ہوں اسیر — زنجیر چاہیے سرِ بازار پاؤں میں

ولہ

چھوٹے گی نہ راہ اس گلی کی — مرنے سے ڈرے تو عاشقی کی

ولہ

پھر بہار آئی، کفِ ہر شاخ پر پیمانہ ہے — ہر روش میں جلوۂ بادِ صبا مستانہ ہے

ولہ

جنبشِ مژگاں سے دل اس رشکِ نرگس میں رہا — قینچیوں سے باغ کی بلبل کا شہپر اڑ گیا

ولہ

قدح لیے ہوئے گل، مثلِ بادہ خوار آیا — خزاں چمن سے گئی، موسمِ بہار آیا
جو گوشِ گل نہ سنے، باغ میں تو کیا چارہ — قفس سے نالۂ بلبل، ہزار بار آیا
یہ نازکی کے ہیں معنی کہ باغ میں وہ شوخ — قریبِ آتشِ گل جب گیا، بخار آیا

ولہ

ترے جور و ستم، اے عہد شکن بھول گیے — رنج غربت یہ اٹھائے کہ وطن بھول گیے
جان کیا مفت گئی، صید گہِ عالم میں — نیم جاں کر کے مجھے، صید فگن بھول گیے
ہائے کیا ہوش رُبا ہیں تری آنکھیں صیّاد — چوکڑی کیا کہ ہرن، راہِ ختن بھول گیے
تنکے چنتے ہیں تری راہ میں گل چیں، اے گل — تیرے کوچے میں ہزاروں کو چمن بھول گیے
قتل گہ میں جو ہمیں یاد کیا قاتل نے — سر بہ کف ایسے چلے ہم کہ کفن بھول گیے
آج تک یاد نہ جنت میں کیا، ناسخ کو — اپنے مداح کو کیا شاہِ زمن بھول گیے

نزاکت

نزاکت تخلص، پری رو، مشکینہ مو، نرگسی چشم لالہ عذار است، شب و روز سرگرمِ طرزِ

وفاپروری و بے رحمی و عاشق کشی و دلنوازی ست۔ اصلش از بلدۂ نارنول و بہ شاہ جہان آباد جلوہ آراست:

بسکہ رہتا ہے یار آنکھوں میں — ہے نظر بے قرار آنکھوں میں
سرمۂ خاکِ پا عنایت ہو — آگیا ہے غبار آنکھوں میں

نسیم

نسیم تخلص، گلزار علی نام۔ بہ رعایتِ نامِ خویش تخلصِ خوشے پیدا کردہ:

غیروں کے ساتھ اس کے تو سارے تپاک ہیں — ایک ہم ہی اے نسیم اڑانے کو خاک ہیں

نصیر

نصیر تخلص، شاہ نصیر الدین، سجادہ نشینِ یکے از خلفاے شاہ محمد جہان است۔ از مشاقی و سخن طرازی بہ استادی نام بر آوردہ۔ کلامش معروف و مشہور است:

خود بہ خود طاق سے شیشہ جو گرا اے ساقی — روح تھی یہ کس قبا مئے ناب میں بند

ولہ

شوقِ نظارہ ترا کھینچ کے لایا اس کو — گرچہ تھے قیس کے پاؤں میں سلاسل بھاری
دیکھ لیتی جو اٹھا کر نہ ترے ٹوٹتے ہاتھ — لیلیٰ! ایسا تو نہ تھا پردۂ محمل بھاری

ولہ

لب پہ قیامت ہے کہ جی اٹھے ہم — آج اک بات میں تم رشکِ مسیحا ٹھہرے

ولہ

خیالِ زلف میں سر اے نصیر پیٹا کر — گیا ہے سانپ نکل اب لکیر پیٹا کر

نظیر

نظیر تخلص، شیخ ولی محمد اکبر آبادی، شاعرِ معنی یاب بودہ۔ چند سال است کہ ازیں خاکدان بہ روضۂ رضوان شتافت۔ اشعار بسیار دارد:

سبھوں کو مے، ہمیں خون ناب دل پلانا تھا — فلک ہمیں پہ تجھے کیا زہر کھانا تھا

ولہ

ہم نے چاہا تھا کہ حاکم سے کریں گے فریاد — وہ بھی کم بخت ترا چاہنے والا نکلا

ہوش

ہوش تخلّص، غلام مرتضیٰ - از شاہ جہاں آباد است :

زاہد کا دل نہ خاطرِ مے خوار توڑیئے　　سو بار توبہ کیجیے، سو بار توڑیئے

یار ہنستا ہے چشمِ تر کو دیکھ　　گریہ ٹک اپنے تو اثر کو دیکھ

ہوس

ہوس تخلّص، مرزا محمد تقی خاں - از عمائد و اراکین سلطنتِ لکھنؤ بودہ - گفتارش از نظر مصحفی مقبولِ خاطرہا گردید - در بحرِ طویل اکثر طبع آزمائی می کند :

جانا ہوس کی بزم میں تجھ کو روا نہیں　　بدنام ہے تو (کہتا) گل سے اے صبا

رنجش کا انھوں نے بھی کیا وقت نکالا ہے　　مجھ سے وہ بگڑتے ہیں، جب خوب سنورتے ہیں

یاس

یاس تخلّص، خیرالدین، ساکنِ دہلی است :

اس طرف کو دیکھتا بھی ہے تو شرماتا ہوا　　اب تلک ہے آنکھ میں شب کا سماں چھایا ہوا

ولہ

کاش میں پردے کا شکوہ ہی نہ کرتا ان سے　　بے حجابی نے کیا اور بھی بے تاب مجھے

ولہ

یہ نزاکت ہے کہ ڈوبے ہے پسینے میں وہ گل　　اس کی رنگت کا اگر ہوتا ہے چرچا دھوپ میں

اپنی آہِ سرد کا ان کو اثر معلوم تھا　　عنقریب مہر جا بیٹھے مسیحا دھوپ میں

فصل در خاتمہ

فصل در خاتمہ مشتمل بر اشعارِ شعرا کہ ترتیبِ نام و تخلصِ ایشاں بلا رعایتِ حروفِ تہجی است :

عاصی

عاصی تخلص، نواب غلام حسین خاں، نبیرۂ نواب افراسیاب خاں شاہ جہاں آبادی الاصل

دوا تو درد کی کرتے، پہ اس کو کیا کیجے　　　کہ تو ہی پہلو سے اٹھا ہے درد کے بدلے

مذاقؔ

مذاقؔ تخلص، محمد دلدار علی نام۔ از قاضی زادہ ہاے بدایوں و عزیزانِ ظہور اللہ خاں نواؔست۔ تلاشِ معنی ہائے تازہ‌اش او نمونۂ قدرتِ مبداءِ فیاض می تواں گفت۔ مذاقِ سخن طرازیش بہ دل مطبوعِ طبعِ شیفتہ سرانِ معنی است۔ صفحۂ کاغذ کہنہ مشق و نظرانداختۂ فکرِ رنگینش دل خون کردۂ فصلِ بہاریں و آب و تابِ جوہرِ نظمِ ہوش ربایش رونقِ عقدِ پرویں ... دفترِ خود فروشی و خودستائی ہاے سخن طرازانِ یوسفستانِ معنی بہ حضورِ ادنیٰ توجۂ او بہ جوے نہ می خرند و کہنہ مشقانِ مذاقِ سخن پیشِ یک شعرِ تازہ اشں بہ لپشیزے نہ می گیرند۔ طرزِ شعراے فی زماننا از کلیم بیانیٔ خویش جلوہ دادہ و گلزارِ ہمیشہ بہارِ نظمِ آبدار را آب و رنگِ تازہ بخشیدہ۔ با فقیر سررشتۂ اتحادش مستحکم است۔ از صحبتِ ناآشنایانِ مذاقِ شوریدہ کہ مس دارم زندہ کردہ بودم۔ اکنوں ہمدمی و سخن طرازی ملے او بہ لیے چارہ گریِ درد دل کارِ اعجازِ مسیحائی می کند۔ پیشتر عیاؔر تخلص می کرد و در اکثر افکار و غزلیاتِ او کہ شہرتے پیدا کردند ہمیں تخلص است۔ عرصۂ چند سال است کہ عیاؔر را بدل کردہ، بہ ایں تخلصِ با مذاق مشہور است و در اصنافِ سخن دستگاہِ لایق دارد۔ دیوانش بہ ترتیب رسیدہ و شاگردِ رشیدِ خاقانیٔ ہند محمد ابراہیم ذوقؔ دہلوی است۔ چند اشعارِ تازہ اش کہ دمِ تحریر نزدم بودند، رقم زدۂ کلکِ معنی طراز است۔ مطلعِ دیوانش ایں است:

ہوا جب حسن ظاہر، یا محمد مصطفیٰ تیرا　　　علی کے بھیس میں آکر ہوا عاشق خدا تیرا

قلم جبریل کے پر کا، ادب سے سر بہ سجدہ ہے　　　شہا نقشہ لکھے کیا، خامۂ بالِ ہما تیرا

مجسم تجھ میں ہے شانِ ہو الاول، ہو الآخر　　　ہوا معلوم حالِ ابتدا و انتہا تیرا

عبث ہے فکر خیاطِ ازل کو جامہ دوزی کی　　　نہ ہوگا، اطلسِ نہ چرخ میں بندِ قبا تیرا

زمیں کو تیرے کوچے کی نہ پائیں آسماں ہرگز　　　کہ شانِ عرش ہے تفسیر میں ہر اک نقشِ پا تیرا

صلواتیں لحنِ داؤدی میں ہوں گل بانگ بلبل　　　گلوں کے منہ سے جب شجرہ پڑھے، بادِ صبا تیرا

بڑائی اور بزرگی تجھ کو دی خالق نے اس درجہ　　　کہ چھوٹا بھائی ہے شیرِ خدا مشکل کشا تیرا

نہیں ہے کہکشاں اور چادرِ انجم یہ تعظیماً
فلک نے سر پہ رکھی ہے، ردا تیری، عصا تیرا

قدر کو خدمتِ افتا ہے دار الشرع میں تیری
عدالت گاہ میں قاضی ہے اک حکمِ قضا تیرا

اجابت دست بستہ سر کے بل خدمت میں آپہنچی
کہ تا ہونے پائے وا کھلے دستِ دعا تیرا

تو ہی وارث ہے ہم بے وارثوں کا دین و دنیا میں
یہاں بھی آسرا تیرا وہاں بھی آسرا تیرا

شہنشاہِ عرب اور عین رب جو کچھ کہ ہے تو ہے
مقولہ ہے الست بربکم قالو بلا تیرا

خدا کا اور بندوں کا ہے محبوب وہ بندہ
محب ہووے جو تیری آل کا اصحاب کا تیرا

مرے اشعار میں پڑ جائے جاں رنگِ تبسم سے
کہے گر مرحبا ہنس کر لبِ معجز نما تیرا

مذاق اللہ نے تجھ کو کیا مدّاح احمدؐ کا
نہ کیوں ہر شعر ہووے قابلِ صلِّ علیٰ تیرا

ولہ

جو حسن ہے گرم اس حسیں کا، نہ وہ پری کا، نہ حورِ عیں کا
نقاب اٹھے روئے آتشیں کا تو چاند جل جائے چودھویں کا

رقم نہ یاقوت پر ہے طغرا، نہ برگِ گل پر ہوا ہے
وہ دیکھ کر پشتِ لب پہ گماں ہے لعلِ زمردیں کا

تو میری آنکھوں سے ابرِ نیساں، دو چار ہرگز نہ ہو دُر افشاں
اُٹھا لوں آبِ گہر کا طوفان، نچوڑ دوں گر تار آستیں کا

قلم کو زہرہ کہاں رقم کا کہ دل ہے دفتر، غم و الم کا
ورق ہے جو اس کتابِ غم کا، وہ ایک دیوان ہے حزیں کا

میں چھپ کے روتا ہوں چپکے چپکے، نہ تاکوئی غمگسار دیکھے
بندھے ہے جس وقت بیٹھے بیٹھے تصوّر اس چشمِ نرگسیں کا

ولہ

پھر اس بت کا جلوہ ہوا چاہتا ہے
ہر اک سنگ موسیٰ ہوا چاہتا ہے

ترے وصل کی لہر آئی ہے دل میں
مگر قطرہ دریا ہوا چاہتا ہے

ہوئی میری صحبت سے وحشت کو وحشت
جنوں کو بھی سودا ہوا چاہتا ہے

مرا مان کہنا، مذاقؔ اس سے مت مل — ارے تو بھی مجھ سا ہوا چاہتا ہے

ولہ

کوئی رہبر نہ تری منزلِ در کا نکلا — خضر بھی نابلد اس راہ گذر کا نکلا

آسمانوں کے دھوئیں اڑ گئے، اک آہ میں رات — تب بھی ارماں نہ مرے دودِ جگر کا نکلا

ہائے سودائی رخ و زلف کی آوارگیاں — گھر یہ میں شام کو جاتا ہوں، سحر کا نکلا

ہر شبِ وصل میں تکرار ہے آتے جاتے — خوب جھگڑا یہ ترا شام و سحر کا نکلا

ولہ

آنکھوں میں نہ آئیں دلِ دلگیر سے آنسو — پی جاؤں چرا کر کسی تدبیر سے آنسو

آیا ہے عرق ابروئے قاتل پہ دمِ قتل — نکلے ہیں مجھے رونے کو شمشیر سے آنسو

دل کاوشِ مژگاں سے مرا کٹ کے بہا ہے — چشموں سے مری ہیں جو رواں تیر سے آنسو

ہیں طفلِ سرشک اب مری بدنامی کا باعث — بدتر ہیں تری نظروں میں تشہیر سے آنسو

سفاک دمِ ذبح نہیں آنکھ ملاتا — کیوں کر نہ بہیں دیدۂ نخچیر سے آنسو

سودے میں کسی زلف کے رونے کی جو لہر آئی — ہم چشمی کریں موج کی زنجیر سے آنسو

جس طرح کہ مینھ برسے ہے تاثیرِ ہوا سے — برسیں ہیں مری آہ کی تاثیر سے آنسو

وہ روتے ہوئے سخت ہیں موتی جو ہاتھ آئیں — ہو جائیں یقیناً مری تقدیر سے آنسو

باندھوں جو میں رونے کا سماں بزمِ غنا میں — آواز کی جا نکلیں مزامیر سے آنسو

کچھ غیر مذاقؔ اب نظر آتی نہیں دل کی — آتا ہے مری آنکھوں میں تاخیر سے آنسو

ولہ

(کذا) آسمانی پہن کر نالے کے خاکی نیر کو — ایک دم میں گرد کر دوں عرشِ پُر تنویر کو

گر لکھوں کاغذ پہ اس خوش لحن کی تقریر کو — وجد میں لاؤں سریرِ کلک سے تحریر کو

ذبح اپنے ہاتھ سے ہوں، پھیر کر شمشیر کو — ہاتھ اٹھا (کذا) لاشے پر اگر تکبیر کو

عکسِ روئے آفتابی کی دکھا تاثیر کو — شکلِ جامِ مے بنا، مرآتِ پُر تنویر کو

ہو کے تو بے خود، خدا کہتا، بتِ بے پیر کو — زاہدا کچھ بھی سمجھتا گر مری تقریر کو

تیرہ باطن خاک دیکھے، جلوۂ تنویر کو
ہو رسائی کیوں کر شمع طور تک گل گیر کو

پھاڑ کر پھینک اے مصوّر، کاغذِ شمشیر کو
پردۂ دل کا ورق ہو، یار کی تصویر کو

زخم کے منھ کو ہے لپکا، بوسۂ سوفار کا
چاک سینے میں لبِ معشوق کھینچے تیر کو

ہو گیا کشتہ جو اس تلوار سے، وہ جی گیا
کہیئے روح اللہ قاتل کے دمِ شمشیر کو

ہنستے ہیں بے پیر عبث، حور و ملک جن و پری
تیرِ گریہ، پر لگاتا کب ہے اس کے تیر کو

وہ صدا کھڑکوں کی ہو جو، لامکاں میں غل مچے
اے جنوں زنداں میں کھڑکاؤں اگر زنجیر کو

ولہ

جز غبارِ حسرتِ جاناں نہ پائی خاک بھی
جب کہ پہلو چیر کر ڈھونڈا، دلِ دلگیر کو

صیدگہ سے تیری اڑ جائے نہ اے ناوک فگن
پر کتر کر طایرِ دل کے، لگا دے تیر کو

باتیں کرتے ہیں تصوّر میں، عجب صورت سے ہم
رُو بہ رُو آنکھوں کے لا کر یار کی تصویر کو

ناک میں دم آ کے نکلا، تیرے سودائی کے ہاتھ
نزع کے دم ہم نے دیکھا پھوٹتے نکسیر کو

کہہ گیا ہے کان میں اک عاشقِ رسوا یہ بات
کہتے ہیں عزت، زبانِ عشق میں تحقیر کو

خانۂ تن میں مکینِ لامکاں آئے نظر
محو کر دیں دل سے گر، دارین کی تعمیر کو

اس بتِ بے پیر کو بس عمر بھر دیکھا کریں
ہے یہی منظور ہر طفل و جوان و پیر کو

لوحِ پیشانی پہ عشقِ خالِ خوباں لکھ دیا
خوب ہاتھ آیا یہ نکتہ، کاتبِ تقدیر کو

کانٹے پڑ جائیں ہزاروں کی زباں میں غنچہ لب
لا کے گرمی پر اگر گلشن میں تو تقریر کو

ہے بہارِ گل میں بھی کھٹکا، خزاں کے خار کا
لوٹتے کانٹوں پہ دیکھا، بلبلِ دلگیر کو

سر میں سودا ہے جو اس کے ابروے خمدار کا
جانتا ہوں نیمچہ، ہر حلقۂ زنجیر کو

ہوں زمین و آسماں چکّر میں شکلِ گرد باد
اک ذرا گردش اگر دوں، آہِ پُر تاثیر کو

بلبلِ دیوانہ ہے اے باغباں، نازک مزاج
موجِ بوئے گل ہے زیبا، پاؤں کی زنجیر کو

قالبِ مردہ ہو زندہ، سن کے اے عیسیٰ نفس
ایسے پہلو میں ادا کرتا ہے تو تقریر کو

کھول کر زلفیں مرا دل پھانسنے، تب ابرو چڑھا
چاہیئے تیغیں لگانا باندھ کر نخچیر کو

اشکِ خونیں نے جنوں زنداں میں دکھلائی بہار
کر دیا گلزار دم میں خانۂ زنجیر کو

اس کے چشمِ سرمگیں کے عشق میں بدنام ہوں / لے چلو شہرِ صفاہاں میں مجھے تشہیر کو

نافِ غنچہ میں اگر اپنا بنائے آشیاں / کچھ خوشی کی جا نہیں ہے، بلبلِ دلگیر کو

پھر وہی تنکے چنیں گے، جب گیا غنچہ چٹک / دم میں کر دے گی صبا برباد اس تعمیر کو

بے جدائی ابرو و مژگاں کے دل زخمی ہوا / چھوٹتے دیکھا نہ آغوشِ کماں سے تیر کو

وہ معلم تھا مَلک کا، تو ہے انساں کا ادیب / جانتا ہوں شیخ تجھ کو اور تیرے پیر کو

محتسب پائے اگر، سرحدِ شرعِ مے کشاں / ملتجی مستوں سے ہووے اپنی ہی تعزیر کو

جب صواب اپنی سمجھ میں ہو تو پھر کس کی خطا / واعظا سمجھے ہوئے ہیں عفو ہم تقصیر کو

عکسِ ابرو کے ترے چہرے کے ہیں یہ جوہر نہیں / ہو گیا آئینہ بسمل دیکھ کر شمشیر کو

پھاڑ کر سینے کا پردہ، دل ہم آغوشی کرے / سوئیں گر چھاتی سے لپٹا کر تری تصویر کو

اس کے ابرو کے برابر خال کب بے وجہ ہے / ایک جا رکھا ہے خالق نے سپر شمشیر کو

گر سناؤں مرثیہ سوزِ دلِ مرحوم کا / اشکِ گلناری رلا دوں بلبلِ دلگیر کو

دیکھ کر تلوار کے جوہر کو حیراں ہو گئے / تیرے بسمل صاف سمجھے آئینہ شمشیر کو

آرہے ہے سوتے میں اپنے جسم پر طوفاں نظر / نوح سا انساں ہو میرے خواب کی تعبیر کو

ہے دلِ خونیں میں ابرو کا تصوّر دم کی شکل / ہیں نے رکھا ہے میانِ سرخ میں شمشیر کو

لکھ نہ تیزی سے مصوّر نقشۂ ابروئے یار / ہاتھ ہووے گا قلم، کھینچا جو اس تحریر کو

گوشت کیا اک وار میں سب ہڈیاں تک کھا گئی / چاہیے کہنا ہما سفّاک کی شمشیر کو

ماہِ نو کو ہاتھ پر رکھ کر دکھاوے لاکھ یار / چرخ پہنچے گا نہ تیرے گرزِ ناخن گیر کو

ہم موئے ہے قاتلِ بے درد کتنا سنگ دل / تیز پتھر سے کیا آ گئے مرے شمشیر کو

وصل تو یک سو رہا، یاں اس سے فرقت ہو گئی / آیۂ فرقان جب ہم نے پڑھی تسخیر کو

وہ بلا سوزِ محبت، تن میں ہے قاتل بھرا / ایک دم میں خاک کر دے خوں مرا شمشیر کو

اس کے خادم کے سگِ در سے جو ہووے یارِ غار / عار ہو صحبت سے صحبِ کہف کے قطمیر کو

قتل کرنا سخت جانوں کا، ہے قاتل سخت کام / کیوں لگا کر توڑتا ہے تو عبث شمشیر کو

جو سنے، جی جلے، یہ اعجاز ہے میرا سخن / شاعرو زندہ کیا ہے میں نے طرزِ میر کو

مقتلِ عشاق میں رہوں میں ہمیشہ سرخرو
خون میرا ہو مبارک، یار کی شمشیر کو

کر دیا ہے کارِ قاتل کی نگاہِ تیز نے
دشنہ و تیر و سناں و خنجر و شمشیر کو

کیا خدا کی شان ہے، عارض سے ابرو ہے بلند
مرتبہ مصحف سے بھی عالی ملا شمشیر کو

بال و پر ایسے لگائے مجھ کو شوقِ قتل نے
اڑ گئے پرزے بدن کے دیکھ کر شمشیر کو

آب کب ہے دھار پر، وہ تیغ ابرو دیکھ کر
آگیا ہے مارے غیرت کے عرق شمشیر کو

دے نہیں سکتے شہادت، بے دہانی کے سبب
ہے مرا حالِ شہادت، بر زباں شمشیر کو

دھار ہے اس کی بعینہ موجۂ آبِ حیات
خضر کہنا چاہیئے اس سبزۂ شمشیر کو

زخمیٔ تیغ نگہ، مستانہ رہتے ہیں مدام
موجِ جام سے لکھوں میں، یار کی شمشیر کو

کہکشاں کب ہے بتِ شیریں ادا کے واسطے
کھودا چرخِ بے ستوں میں حق نے جوئے شیر کو

گورے گورے منھ کو، ان شیریں لبوں کو کیا کہوں
ہو گیا ہے رابطہ گویا، شکر سے شیر کو

چشمِ ساقی سرمئی ہے اور گلابی نرگسی
یا ملایا جام میں، مشک و شراب و شیر کو

میں ہوں وہ فرہاد پیشہ، اے بتِ شیریں دہن
صاف جاری کر دوں ہر پتھر سے جوئے شیر کو

خاک کو اس پارۂ دل کی جلا دوں اشک سے
صورتِ سیماب پھر زندہ کروں اکسیر کو

میں ہوا جوگی کسی سیمیں بدن کے عشق میں
جسمِ خاکی پر، ملا کر کے بھبھوت اکسیر کو

کوبہ کو کیوں خاک چھانیں، مل گیا وہ سنگِ در
پا کے پارس، کیوں عبث ڈھونڈا کریں اکسیر کو

سیمیا گر تجھ کو رمزِ خاکساری گر ملے
پھینک دے زر کو، ملا دے خاک میں اکسیر کو

مصحفِ روئے صنم پر خال ہے اور خط نہیں
ایک جزو میں لکھ دیا، خالق نے کل تفسیر کو

صاف طوطے اڑ گئے طوطے کے، اے شیریں سخن
دیکھ کر مرآتِ رخ پر، سبزے کی تحریر کو

مذہبِ عاشق میں رقصِ بسملانہ ہے نماز
کیا شہیدِ ناز جانے نیت و تکبیر کو

شمعِ محفل کی جو ہو، پروانے کو پروانگی
خاک کر دے اک شرارے سے گلگیر کو

دستِ کافوری کا اس کے ہے یہ روشن معجزہ
شمع کی گردن کیا چھو کر سرِ گلگیر کو

من سمجھ کر روشنی کو شمع کی ڈرتے رہے
ہجر کی شب، سانپ کا پھن سمجھے ہم گلگیر کو

سوزِ بلبل سے ہیں روشن گل کی شاخیں مثلِ شمع
دستِ گلچیں سے چمن سے ربط ہے گلگیر کو

گر حنا بھی ہاتھ سے چھو لے ذرا، وہ شمع رو — رنگ میں کندن بنا دے، آہنِ گلگیر کو

تیرہ دل کو فیضِ روشن دل کی صحبت سے نہیں — شمع ساں جلتے نہ دیکھا، شمع سے گلگیر کو

بزم میں گر کچھ گدازِ دل کہوں، اے شمع رو — موم سا پگھلا کے کر دوں، آہنِ گلگیر کو

گل کو بلبل صاف اڑا کر چونچ میں لے جائیگی — شمعِ محفل سے تری کیا کام ہے گلگیر کو

ایسی لکنت ہے صنم تیری زبانِ تیز میں — سن کے کٹتے ہیں کلیم اللہ بھی تقریر کو

زخمِ کاری دل کے دھونا، ہے بڑے اچھوں کا کام — صاف پی جاتے ہیں ہم، آبِ دمِ شمشیر کو

اس تجاہل کا میں اس قاتل کے کشتہ ہوں مذاق — ذبح کے دم مجھ سے پوچھا جان کر تکبیر کو

ولہ

ماہ رخوں کی کاہشِ غم میں آنکھوں سے چھپ جاتے ہیں — شکلِ ہلال نظر ہم بھی اب گاہے ماہے آتے ہیں

جھوٹ کہا اے جان کسی نے، کون ہے عاشق، کس کا عشق — سچ تو یہ ہے تجھ سے مل کر جی کو ہم بہلاتے ہیں

آپ نے جب سے پاس ہمارے آنا جانا چھوڑ دیا — آپ میں ہم گہہ آتے ہیں گہہ آپ سے باہر جاتے ہیں

ولہ

چمن جا کے جو ابرو کا ڈال دو سایہ — تو ہو ویں گل کی روش، یک قلم شجر زخمی

یہ چشم داشت ہے مژگان و چشم و ابرو سے — کبھی ہو جان، کبھی دل، کبھی جگر زخمی

ولہ

عشقِ خالِ بتاں سے ہوگی نجات — کیوں کہ نکتہ نواز ہے اللہ

اپنے زہدِ ریا پہ ناز نہ کر — زاہدا بے نیاز ہے اللہ

ولہ

زہر کھائیں اس شکر لب پر نہ کیوں کر، سبزہ رنگ — آج طوطی بولتا ہے اس کے خطِ سبز کا

ولہ

اس مسیحا کی جو آنکھوں سے کبھی دوں تشبیہ — ہے یقیں نرگسِ بیمار بھی اچھی ہو جائے

ولہ

یوں دیدہ و دانستہ دکھا جاتے ہو آنکھیں — دیکھے کوئی تو صاف چرا جاتے ہو آنکھیں

کاٹی نگہ تیز سے ان آنکھوں کی جالی بگڑی ہوئی نظروں سے بنا جاتے ہو آنکھیں

ولہ

میری اس کی نہ کھنچیں مانی سے تصویریں دو ہو گئیں ایک جو کیں، نقشے کی تحریریں دو

لب عیسیٰ کو ملا معجزہ، موسیٰ کو کلام اس کے منھ کی کہیں سن لی تھیں جو تقریریں دو

کب مسی تیرے لبوں پر ہے یہ ربّ کعبہ سنگ اسود کی ہیں یہ لعل پہ تحریریں دو

رُو بہ رُو تیرے یوسف مصری کی نہ بات ہیں مجھے قند مکرّر تری تقریریں دو

اے جنوں قید سے ہم چھوٹ گئے نہ جیتے نہ مرے ہے کڑا قبریں، زنداں میں تھیں زنجیریں دو

ولہ

لب و دنداں مرے آپس میں کٹے مرتے ہیں یاد آتا ہے زباں کا جو لڑانا تیرا

میں جو رویا تو کہا، تھوک کے آنسو نہ لگا ہم نے بس دیکھا، یہ اشکوں کا بہانا تیرا

ولہ

اس نے نہ چاہا، میں چاہا کیا نہ اس سے نبھی، میں نباہا کیا

نکل جائیں بے کھٹکے، دل اور جگر اب آنکھوں کو ہم نے دوراہا کیا

مرے نالے پر، قہقہے سے ہنسا مری آہ پر اس نے، آہا کیا

رہا جی پہ کیا جانے صدمہ آہ مرا رات بھر دل کراہا کیا

صنم مجھ سے حق ناحق آزردہ ہے گنہ میں نے کیا، بار الٰہا کیا

خوشی سے ہو راضی، رضا پر مذاق تجھے کیا، جو کچھ اس نے چاہا کیا

ولہ

مجھے وصل میں بھی کئی روز گذرے شب ہجر کا ماجرا کہتے کہتے

میں اس گل کو پیغام کہتا ہزاروں ہوا ہو گئی پر صبا کہتے کہتے

ولہ

راہ غربت میں غذا تو ہم غریبوں کی نہ پوچھ جاتے ہیں منزل بہ منزل ٹھوکریں کھاتے ہوئے

گوشۂ دل سے ابھی نکلا نہیں ہے تیر آہ فرش پر عرشی چلے آتے ہیں چلاتے ہوئے

غش ہوں اور مرتا ہوں حالِ ہول ناک اپنے پہ میں
غش کو غش آتے ہیں مجھ بیمار تک آتے ہوئے

اپنے مرنے پہ مجھے افسوس آتا ہے مذاقؔ
جب وہ آتے ہیں مری تربت پہ پچھتاتے ہوئے

ولہ

زخمِ دل سے نیند ہم مستوں کو آتی ہی نہیں
ہاں کبھی آتی ہے تو انگور کے سائے تلے

دل جلوں کا ہے ہر اک پتھر کے نیچے جھونپڑا
سینکڑوں موسیٰ ہیں نخلِ طور کے سائے تلے

یاد کرکے انکھڑیاں ساقی کی گلشن میں مذاقؔ
لوٹتا ہوں نرگسِ مخمور کے سائے تلے

ولہ

نیک و بد سارے جہاں میں خوب ہیں
اپنی نظروں میں سبھی محبوب ہیں

ہم ہیں حسن و عشق اپنے آپ ہی
آپ یوسف آپ ہی یعقوب ہیں

شکر کرتے ہیں خوشی سے جائے صبر
ہم بلاکش خوش تر از ایوب ہیں

چھوڑ دی ہے جب سے مطلب کی طلب
خود بہ خود طالب مرے مطلوب ہیں

مجھ سے رہتے ہیں کشیدہ بے سبب
حضرتِ دل بھی عجب مجذوب ہیں

ہم نے چھوڑے سب عملِ حُب کے مذاقؔ
پڑھتے یا مجبوب یا محبوب ہیں

ولہ

دوا نہیں یہ مے سرخ خام شیشے میں
بھرا ہے شیشۂ جاں کا قوام شیشے میں

ہوئے حساب سے برپا خیام شیشے میں
کہ دخترِ رز رہی پنہاں مدام شیشے میں

جوں دوں شراب کو آبِ حیات سے تشبیہ
تو اتریں خضر علیہ السلام شیشے میں

خیال دل میں ہے ساقی کی چشمِ مے گوں کا
شراب جام ہے اور جام شیشے میں

کھلا جو بزم میں مینا تو چاندنی چھٹکی
یہ دخترِ رز ہے کہ ماہِ تمام شیشے میں

خبر کروں دلِ پُرشوق کی حقیقت سے
میں لکھ کے ساقی کو بھیجوں پیام شیشے میں

بہار آئی ہے اور جشنِ دخترِ رز ہے
شگونِ مے کی ہے کیا دھوم دھام شیشے میں

قطعہ

شگافِ دل میں بھرا مرہمِ مئے انگور
کیا ہے کیا ہی کرامت کا کام شیشے میں

میں خرقِ عادتِ پیرِ مغاں کا قایل ہوں | کہ بعدِ خرق کیا التیام شیشے میں
مذاقؔ ملتی ہے ان روز ول وقتِ شام شراب | رکھی ہے دخترِ رز کیا خیام شیشے میں

ولہ

آشیاں چھوڑے نہ ہرگز آب و دانے کے لیے | لیں ہے پر طایرِ دل تیر کھانے کے لئے
کوئے جاناں سے اجازت دے مجھے اے بیخودی | بعدِ مدت آپ میں آیا ہوں جانے کے لئے
ناخدائی کی وہیں موجِ تبسم نے تری | گریہ جب آیا مری کشتی ڈوبانے کے لئے
جی ہی جی میں کچھ تڑپنے کا مزا ہے اے مذاقؔ | دل کی بے تابی ہوئی پیدا چھپانے کے لئے

ولہ

جان اے جاں کس کے تن میں ہے | تو ہی در پردہ پیرہن میں ہے
کہوں کس منہ سے جی ہی جانے دل | کچھ عجب بات اس دہن میں ہے
جسم مردہ ہے اپنا خاک کا ڈھیر | زندہ درگور روح تن میں ہے
سب توجہ سے ذوق کی ہے مذاقؔ | یہ مزا جو مرے سخن میں ہے

نفیسؔ

نفیسؔ تخلص، مولوی اشرف علی بدایونی - از رؤساے عظامِ بدایوں است- آباد اجدادش به عظمت و اقتدار بر جملہ اقرانِ خویش شرفِ امتیاز داشتہ- او خود هم به عهدۂ تحصیلداری و پیش کاری ملازمِ سرکارِ کمپنی بوده- روزے چند است که ترک و تجرید پسندیده طبعش از حسن پرستی ہاے پری رویاں به دیوانگی میلے دارد- جنوں ساختۂ او خنده بر دیوانگی بے ساختہ می زند- فکرِ نقادش به فارسی و اردو برقِ درخشاں ست که به مجردِ تصورِ تلاشِ معنیِ دل پذیر صد گوہرِ آبدار از صدفِ سینہ اش می غلطد- به قیاسِ ناقصِ فقیر ہیچو عالی طبع نقادِ معانی دریں قرب و جوار پیدا نہ گردیده- از عزیزانِ ظہور اللہ خاں نواؔ ست- مثنوی ہا و دیوان ہا دارد و دریں زماں تذکرۂ مبسوطِ زبان دانانِ اردو به تکلفے که می باید و به لطافتے که می شاید به وضعِ تاریخ تالیف کرده و به تلاشِ اصنافِ کلامِ شعرا بلا قیدِ رطب و یابس دردسری برداشتہ- از ہر یکے از انتخاب خودش به ایں تذکره می نگارم:

جگر بھی خون ہوا، اے دل، پر خوب رو نہ سکا
تو بہتے نالے میں بھی اپنے ہاتھ دھو نہ سکا

تمام عمر تصوّر رہا جو آنکھوں میں
فراقِ یار میں جی کھول، میں رو نہ سکا

نہ بت پرست ہی ٹھہرا، نہ حق پرست بنا
نفیسؔ تجھ سے تو کوئی بھی کام ہو نہ سکا

ولہ

سلسلہ وحشت کا باقی ترے دیوانوں میں ہے
اب تلک الجھاؤ ناخن کا گریبانوں میں ہے

ولہ

نیند آ گئی گھر اس کے جو مجھ کو تو وہ بولا
اُف رے نرالوں بے محل آرام سے سونا

سحر

سحرؔ تخلص، امان علی نام۔ از شاگردانِ محمّد رضا برقؔ است۔ جوشِ طبعش معانی لطیف پیدا می کند و فکرِ رنگینش خاطرہائے پریشان خاطراں شگفتہ و خنداں، چند اشعارش کہ سامعہ نوازِ راقم گردیدہ، زیبائے تذکرہ صفحۂ کاغذ را رشکِ صفحۂ گلستان می سازم:

کہاں سے لائیں اب اس کو جو، ہم کنار کریں
تسلّی کیا تری اے جانِ بےقرار کریں

ستم شعار و جفا پیشہ، بے مروّت ہو
سراہیئے جگراں کا جو تجھ کو پیار کریں

ولہ

مہندی تلووں سے مَلو تم تو تماشا ہو جائے
جس جگہ پاؤں رکھو سونے کا چھاپا ہو جائے

پرتو افگن ہو جو سرکار کی یہ زلفِ دراز
پٹ پٹہ تن پرنور کا لچکہ ہو جائے

ولہ

بد دماغی سے بلائیں نہیں لینے دیتے
انگلی چٹخی تو کہا سر پہ تپنچہ چھوٹا

دریں طرح انوار حسین تسلیمؔ کہ ذکرش بالا گزشت غزلے ترتیب دادہ، شعرے گفتہ کہ نظیرش نہ می بود:

آسماں پر جو گئی، آہِ شرر بار مری
وہ شرارت سے یہ بولے کہ غبارا چھوٹا

تاریخ تذکرہ از کفایت علی کافیؔ تخلص:

جب ہوا یہ تذکرہ تالیف، رشکِ گلستاں
یادگارِ شاعرانِ کشورِ ہندوستاں

فکرِ کافیؔ سے ہوئی تاریخ اس کی آشکار
یہ عجب گلزارِ زیبا ہے "بہارِ بے خزاں"

سنہ ۱۲۶۱ ہجری

ضیاء الدین ڈیسائی

بارھویں صدی ہجری کی ایک دکنی نظم

قاضی عبد النبی بن عبد الرسول احمد نگری ہندوستان کے ان علما میں سے ہیں جن کے علمی کارنامے اس سے کہیں زیادہ قابل توجہ ہیں، جتنی ان پر مبذول کی گئی ہے۔

تذکرۂ علماے ہند[1] کے علاوہ ان کے حالات اور کہیں دستیاب نہیں ہوتے۔ زیادہ تر علوم عقلی و نقلی ان کی تصنیفات کا موضوع رہے، اور ان کے مطالب کے بیان اور اپنے خیالات اور معلومات کے اظہار کے لیے انھوں نے فارسی کے علاوہ عربی بھی استعمال کی۔ دکن کے مشہور شہر احمد نگر کے دار القضاء کے منصرم ہونے کے علاوہ ان کا شمار اپنے زمانے کے نامی گرامی استادوں میں ہوتا تھا، اور دور دراز سے طلبہ ان کی خدمت میں آتے تھے۔ اور جیسا کہ ان کے اپنے بیان سے مترشح ہوتا ہے، ان کا گھر بھی طلبہ کے لیے دار الاقامہ کا کام دیتا تھا۔ ان کی مشہور و معروف جامع العلوم و الفنون تصنیف دستور العلماء حیدر آباد کے دائرۃ المعارف العثمانیہ نے نصف صدی سے زیادہ عرصہ ہوا، شائع کی تھی۔

دستور العلماء کی حیثیت انسائیکلو پیڈیا کی سی ہے۔ اس میں فقہ، حدیث، تصوف، منطق، نجوم، طب، شعر وغیرہ علوم و فنون کی مصطلحات کی تشریح و توضیح کی گئی ہے۔ بنیادی طور پر یہ کتاب عربی زبان میں ہے، لیکن بعض مقامات پر بقول مصنف عوام کے افادے کے لیے انھوں نے

۱۔ تذکرۂ علماے ہند

مطالب کو فارسی میں بھی بیان کیا ہے۔ اس کے موضوعات کا احصاء یہاں مقصود نہیں ہے، صرف اتنا کہنا کافی ہے کہ یہ اپنی نوعیت کی نہایت ہی جامع کتاب ہے۔ اپنے اصلی مطالب کے ضمن میں مصنف نے جگہ جگہ کچھ ایسی باتیں بھی بیان کی ہیں، جو تاریخی اور ادبی دلچسپی سے خالی نہیں۔ یہ حصے بجائے خود ایک جداگانہ مقالے کے مستحق ہیں۔ ان میں شہر احمد نگر کی تاریخ اور خطۂ برار کے قصبۂ بالاپور کے مشہور نقشبندی خاندان کے افرادِ گرامی کے بارے میں معلومات اور خود مصنف کے تاثرات جن کا اظہار فارسی اشعار میں ہوا ہے، اور اسی قسم کی دوسری چیزیں خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

مصنف نے ایک جگہ ضمناً ایک مختصر دکنی نظم نقل کی ہے جس کا تعارف یہاں مقصود ہے۔ نظم کی زبان کی نوعیت کے پیشِ نظر یہ اطلاع غالباً دلچسپی سے خالی نہ ہوگی کہ قاضی صاحب کے آباواجداد کا وطن صوبہ گجرات کے ضلع کھیڑہ کا مشہور قصبہ کپڑ بنج ہے، جو احمد آباد سے تقریباً پچاس کیلومیٹر دور مشرق میں واقع ہے۔ اس قصبے کے قاضی اور خطیب کے فرائض اسی خاندان کے سپرد تھے۔ مصنف کے والد قاضی عبدالرسول نے احمد آباد میں شاہ نصیرالدین بن شاہ عبدالماجد[۲] اور ملا احمد بن سلیمان[۳] سے تعلیم حاصل کی۔ پیر شاہ عبدالماجد کے حلقۂ ارادت میں بھی شامل ہوتے۔ علمِ تجوید میں شیخ فرید سے استفادہ کیا۔ وہ بھی اپنے زمانے کے مشہور استاد تھے اور بقول مصنف انھوں نے متعدد درسی کتب پر حاشیے لکھے۔ قاضی عبدالرسول نے کچھ وقت نہروالہ پٹن میں ایک فاضل عارف کی خدمت میں بھی گذارا۔ اس کے بعد وہ دلّی گئے، جہاں سے انھیں قصبہ دھولقہ[۴] کی قضا پر مامور کیا گیا۔ پانچ سال تک یہ فرائض انجام دینے کے بعد وہ احمد آباد واپس آتے اور اب اپنے

۲۔ شاہ عبدالماجد گجرات کے مشہور و معروف عالم اور بزرگ حضرت شاہ وجیہ الدین علوی (م ۹۹۸) کے پوتے تھے۔

۳۔ اپنے زمانے کے مشہور علماء اور اساتذہ میں سے تھے۔ مرآۃ احمدی کے خاتمے میں ان کے حالات ملتے ہیں (طبع بڑودہ ۱۹۳۰ء: ص ۱۴۲)

۴۔ احمد آباد سے تقریباً ۸۰ کیلومیٹر کے فاصلے پر جانب جنوب واقع ہے۔

مرشد کی خدمت میں مصروف ہو گئے۔ جب شاہ عبد الماجد کو اورنگ زیب کے لشکر میں جو اس وقت مکلگہ[5] میں پڑا تھا، جانے کا اتفاق ہوا تو یہ بھی ان کے ساتھ تھے۔ وہاں سے یہ خود کسی سلسلے میں، جس کی نوعیت انھوں نے نہیں بتائی، احمد نگر گئے۔ یہاں ان دنوں لنگر دوازدہ امام کے مدرسے میں ایک مجذوب شاہ عسکری نامی اقامت فرما تھے۔ ان کی شہرت اور کمالات کا چرچا سن کر یہ ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان کے کشف و کرامات اور قوت باطن سے مستفیض ہوئے۔ لشکر گاہ واپس آئے، تو احمد نگر کی قضا کی خدمت پر مامور کر دیے گئے۔ اور پھر تا دم مرگ (۱۱۲۰ھ) یہ خدمت انجام دیتے رہے۔[6]

قاضی عبد الرسول کا سلسلۂ نسب حضرت مولانا حسام الدین ثانی کے واسطے سے خلیفۂ ثالث حضرت عثمان ذی النورین تک پہنچتا ہے۔ ان کے آباء اجداد میں مشہور و معروف اہل اللہ ہوتے ہیں۔ ان کی بیوی کا سلسلۂ نسب ایک اور خدا رسیدہ بزرگ حضرت مخدوم شیخو سے ملتا ہے، جو حضرت شاہ وجیہ الدین علوی کے مرید تھے، اور کڑہ بنج ہی میں سکونت پذیر تھے۔

ان مختصر خاندانی حالات کے علاوہ قاضی عبد النبی[7] کے اپنے بارے میں دستور العلماء میں جو اشارے ملتے ہیں، ان سے ان کے علمی انہماک اور درس و تدریس سے شغف کا پتا چلتا ہے۔ ان کے اپنے بیان کے مطابق وہ احمد نگر میں پیدا ہوئے، اور وہیں پرورش پائی۔ احمد نگر ہی میں انھوں نے حافظ محمد عبد اللہ اور سید بخش کرمانی خیر آبادی سے استفادہ کیا۔ یہ بھی قرین قیاس ہے کہ انھوں نے تحصیل علم کے لیے اپنے آبائی وطن گجرات کا سفر کیا کیونکہ اپنے جن اساتذہ کا انھوں نے ذکر کیا ہے، ان کا اسی صوبے سے تعلق

۵۔ مکلگہ جو مغلوں کے زمانے میں اپنے عرف قطب آباد سے مشہور تھا، بیجاپور سے جنوب مغرب میں تقریباً ۵۰ کیلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ اورنگ زیب اپنی دکنی مہمات کے سلسلے میں یہاں ۱۹ شعبان ۱۱۰۱ھ/۸ مئی ۱۶۹۰ء کو پہنچا اور ۴ جمادی الآخر ۱۱۰۲ھ/۴ جنوری ۱۶۹۱ء کو یہاں سے بیجاپور کی طرف روانہ ہوا، وہ دوبارہ ۴ شعبان ۱۱۰۳ھ/۱۱ اپریل ۱۶۹۲ء کو یہاں آیا، اور شعبان ۱۱۰۶ھ/مارچ ۱۶۹۵ء تک مقیم رہا۔ (مآثر عالمگیری کلکتہ: ۳۲۵، ۳۳۲، ۳۲۵، ۳۳۸/۳۳۸، ۳۴۴)

۶۔ الفن الثانی من کتاب جامع العلوم الملقب بہ دستور العلماء (حیدرآباد ۱۳۲۱ھ): ۴۳-۴۵

۷۔ یہ وہی قاضی عبد النبی ہیں جن کے طریقۂ درس کی مولانا مناظر احسن گیلانی نے اپنی کتاب "ہندوستان کے مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت" میں بہت تعریف کی ہے۔

ظاہر ہوتا ہے۔ ان میں قطب الدین عثمانی احمد آبادی، مولانا محمد محسن بن شیخ عبد الرحمن صدیقی احمد آبادی وغیرہم کے نام ملتے ہیں۔ دستور العلماء کے علاوہ مصنف کی حسب ذیل دو کتابوں۔ (۱) الحاشیہ علے شرح التہذیب للیزدی اور الحاشیہ علے الفرائض السراجیہ[۹] کا ذکر ڈاکٹر محمد زبیر صدیقی نے اپنی قابل قدر تالیف (ہندستان کا عربی ادب میں حصہ) میں کیا ہے۔ دستور العلماء میں انھوں نے اپنی ایک اور شرح کا جو کافیہ کی ہے ذکر کیا ہے: اس کا نام جامع الغموض ہے اور یہ فارسی میں ہے[۸]۔

یہاں ایک غلط فہمی کا ازالہ ضروری معلوم ہوتا ہے۔ مشہور ہے کہ قاضی عبد النبی حضرت شاہ وجیہ الدین صاحب کے شاگرد اور مرید تھے، جیسا کہ کتب خانۂ خدا بخش کے فہرست نگار اور ان کے تتبع میں ڈاکٹر محمد زبیر صدیقی نے بھی تحریر کیا ہے[۱۰]۔ جہاں تک مریدی کا تعلق ہے، ان کا شاہ وجیہ الدینؒ کے سلسلے میں بیعت ہونا قرائن سے ثابت ہے، لیکن وہ کسی علم یا فن میں شاہ صاحب کے شاگرد نہیں تھے۔ یہ ممکن ہی نہیں تھا، قاضی عبد النبی کی ولادت شاہ وجیہ الدین کے انتقال سے کم از کم ایک سو سال بعد ہوئی ہے۔

دستور العلماء میں جن علوم کی اصطلاحات کی تشریح کی گئی ہے، اس سے مصنف کی علمی استعداد اور وسعتِ معلومات کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ جگہ جگہ انھوں نے حسب موقع و محل فارسی اشعار سے بھی کام لیا ہے، جن میں کچھ یقیناً خود ان کے اپنے کہے ہوئے ہیں؛ اس سے ان کی شعر سے دلچسپی اور موزونی طبع کا پتا چلتا ہے۔ لیکن جو چیز ہمارے لیے خاص دلچسپی کا باعث ہے، وہ اس عربی اور فارسی کی تصنیف میں کچھ قدیم اردو کے اشعار ہیں۔ ان میں ایک تو مختصر نظم ہے، جو قدیم دکنی زبان میں ہے۔ اس کے علاوہ ایک اور شعر ہے جو روشنائی (مداد) کی ترکیب کے سلسلے میں انھوں نے درج کیا ہے۔ ان کے علاوہ اور کئی مقامات پر خصوصاً طبی نسخوں کی تفصیلات کے ضمن میں مختلف اشیاء کے لیے مقامی مرادف الفاظ استعمال کیے ہیں۔ نظم (شعر) اور ان

۸۔ فہرست مخطوطات عربی، بانکی پور، ۲۱: ۶۵

۹۔ عربی ادب میں ہندستان کا حصہ: ۲۸۶؛ فہرست مخطوطاتِ عربی بانکی پور پٹنہ، ۲۱: ۶۵

الفاظ کو وہ ہر جگہ "ہندی" بتاتے ہیں، اور الفاظ کو "باللسان الہندیہ" یا "بالہندیہ" سے منسوب کیا ہے۔[10]
بارھویں صدی ہجری کے وسط میں احمد نگر کے علاقے میں اس زبان کو "ہندی" کے نام سے موسوم کرنا قدیم اردو کے نام کی تاریخ کے سلسلے میں بہت اہم بات ہے۔
ساخت اور ہیئت کے اعتبار سے اس نظم کی زبان دکنی ہے۔ یہ نو شعروں پر مشتمل ایک مثنوی ہے، جو خود قاضی عبدالنبی کی طبع موزوں کا نتیجہ ہے۔ اس کے برعکس ترکیبی نسخے والے شعر کے بارے میں مصنف نے کوئی صراحت نہیں کی کہ یہ کس کا ہے، سوائے اس کے کہ "بزرگے بزبان ہندی فرماید"۔ ہوسکتا ہے کہ فنِ کتابت سے متعلق یہ شعر علمی حلقوں میں مشہور ہو اور خود قاضی صاحب کو بھی شاعر کا نام معلوم نہ ہو۔ مثنوی کی شانِ نزول کے بارے میں مصنف نے نہ صرف اسے اپنی طرف منسوب کیا ہے، بلکہ پہلے ہی شعر میں ان کا نام عبدالنبی موجود ہے۔
دستور العلماء کے فنِ دوم پر مشتمل جلد حیدرآباد سے ۱۳۳۱ھ کے اواخر میں شائع ہوئی تھی۔ یہ اشعار اسی مطبوعہ نسخے سے لیے گئے ہیں۔ کتاب کے سالِ تالیف کا ذکر بھی خود مصنف نے کیا ہے۔ اس کے مطابق کتاب پانچ سال کی محنت کے بعد[11] ۱۱۷۳ھ میں پایۂ تکمیل کو پہنچی تھی۔[12] اس سے کتاب کی ابتدا ۱۱۶۸ھ قرار پاتی ہے۔ تصوف کی ایک اصطلاح "قاب قوسین" کی شرح و تفصیل لکھتے وقت قاضی صاحب نے یہ شعر موزوں کیے تھے۔ موصوف کا بیان ہے:

> ولہذا الکلام مقام عظیم لا یعلو معارجہ ولا یسمو مدارجہ الا من ھداہ اللہ تعالیٰ باسرارہ واتاہ بقلب سلیم۔ آنچہ بمقتضاے حال ہندی مقال بر زبانِ خاکسار گذشت عرض می دارد۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ نظم کا زمانہ بھی سالِ تالیف کے مطابق ہے اور چونکہ اصطلاحِ قاب قوسین، کتاب کے اواخر میں آتی ہے، اس لیے یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ نظم ۱۱۶۸ھ کے مقابلے میں

۱۰۔ دستور العلماء: ۱۹۷، ۲۰۲، ۱۸۹
۱۱۔ دستور العلماء: ۲۲۰ (حاشیہ)
۱۲۔ ایضاً: ۲۷۱۔

جب کہ کتاب شروع ہوئی، ۱۱۰۳ھ کے جو کتاب کا سالِ اختتام ہے، قریب تر زمانے میں کہی گئی ہوگی۔ اس لحاظ سے یہ نظم ۱۱۰۲ھ یا ۱۱۰۳ھ میں کہی گئی ہوگی۔
نظم درج ذیل ہے۔ (رسم الخط اصل کے مطابق دیا گیا ہے)[13] :

زباں اپنی عبد النبی بند کر — پس[14] دل میں آپس کوں خورسند کر
بروں[15] کوں بری[16] بات ھی[17] سازوار[18] — بود خاموشی شیوۂ خاکسار
نہنی موں[19] تی مت لی نوالی بری[20] — کہ قاضی پرارا[21] دری[22] سر پھری[23]
بہت ڈر[24] کے چلنا تو اس گھاٹ[25] میں — مگر[26] جا پریگا[27] توار[28] باٹ[29] میں
وجیہ[30] خداہی[31] ترا دستگیر — ولایت کی[32] افلاک پر بی نظیر
سچا چاند ہی[33] چودھویں رات کا — اندھارا[34] کیا دور مجرات کا
دکھایا تزشی[35] جد کو[36] آئی خدا — تجھی[37] تجھی دکھا دی تو ہیگار روا

۱۳۔ ایضاً: ۱۷۲-۱۷۲
۱۴۔ کذا۔ پس ہونا چاہیئے طباعت یا کتابت کی غلطی ہو سکتی ہے۔
۱۵۔ بر ڈول
۱۶۔ بری
۱۷۔ ہے
۱۸۔ سزاوار
۱۹۔ ننھے منہ سے
۲۰۔ بے نوالے برے
۲۱۔ اس لفظ کی قرأت اور معنی واضح نہیں
۲۲۔ درتے
۲۳۔ بڑی اور یہ مصرع صاف نہیں ہے اگرچہ الکل سے معنی نکل سکتے ہیں)
۲۴۔ ڈر
۲۵۔ گھاٹ
۲۶۔ بمعنی ورگرنہ
۲۷۔ پڑیگا
۲۸۔ اور (یعنی دوسرا)
۲۹۔ باٹ (یعنی رستہ)
۳۰۔ حضرت شاہ وجیہ الدین العلوی احمد آبادی مراد ہیں
۳۱۔ ہے
۳۲۔ کے
۳۳۔ ہے
۳۴۔ اندھیرا
۳۵۔ تر سے
۳۶۔ ان نے (یعنی انھوں نے)
۳۷۔ تجھے۔

خدایا بعونِ وجیہ زماں — تجھی[38] دائم دنیا سوں دینا اماں
محمد کی امت میں دائم توں[39] رکھ — شریعت کی کو منے[40] میں قائم توں رکھ

واضح رہے کہ مندرجہ بالا متن کتاب کے مطبوعہ نسخے سے لیا گیا ہے۔ مصنف کے متن سے مطبوعہ متن تک کتنی تحریف ہوئی، کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ مثلاً لفظ "تو" کا املا "تو" اور "توں" دونوں طرح ملتا ہے؛ یہ فرق طباعت کا ہے یا مصنف ہی نے اسے دونوں طرح لکھا تھا، کچھ کہنا مشکل ہے۔ تاہم قیاس ہے کہ مطبوعہ متن بڑی حد تک اصل کے مطابق ہوگا۔

نظم کی کتابت کی خصوصیات ظاہر ہیں۔ یائے مجہول و معروف میں تفاوت ملحوظ نہیں رکھا گیا۔ ٹ کی جگہ ت ہے۔ اور ڑ، کو ر، لکھا ہے۔ ایک اور دلچسپ شکل "اندھارا" بجائے اندھیرا ہے، شمال میں اس جگہ "اندھیارا" بھی لکھا گیا ہے۔

نظم کے تیسرے شعر کے دوسرے مصرع کو چھوڑ کر (جس کا لفظ پرا تصحیح طلب ہے) تمام اشعار صاف اور شستہ ہیں۔ ان کے معانی اور روانی سے قاضی صاحب کی موزونیِ طبع اور زبان پر قدرت کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ نیز اس نظم سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ احمد نگر میں بھی اس زبان کا عام رواج تھا۔ دکنی ادب کے سلسلے میں ہمارے ذہن میں بالعموم بیجاپور، حیدر آباد، گولکنڈہ اور اورنگ آباد وغیرہ کے نام آتے ہیں۔ حالانکہ دکن کے دوسرے مقامات کی طرح احمد نگر نے بھی دکنی زبان اور ادب کی ترویج اور اشاعت میں کچھ کم حصہ نہیں لیا ہے۔ چونکہ آج تک احمد نگر کی علمی اور ادبی تاریخ کی کماحقہ نشاندہی نہیں ہوتی ہے، اس نقطۂ نظر سے بھی یہ نظم اہمیت سے خالی نہیں۔

ساتویں شعر میں جد سے مراد ظاہراً جدِ مادری ہے۔ ابتدائی سطور میں ذکر ہو چکا ہے کہ حضرت مخدوم جیو مصنف کے جدِ مادری اپنے زمانے کے عارف باللہ اور شاہ وجیہ الدین سے بیعت تھے۔ ان کے

۳۸۔ تجھے۔

۳۹۔ اس لفظ کا املا سابقہ دو مقامات پر "تو" پایا جاتا ہے اور اسی شعر میں دو جگہ ملتا ہے۔

۴۰۔ کے کوچے۔

حالات میں گجرات کے کسی شاعر نے فارسی میں ۱۸۲ اشعار پر مشتمل ایک مثنوی تصنیف کی تھی، جو دستور العلماء میں نقل کی گئی ہے[41]۔ اس میں مخدوم شیخو کے شاہ وجیہ الدین سے اکتساب فیض کرنے اور سید الکونین کے دیدار سے مشرف ہونے کا حال مذکور ہے۔ افسوس کہ مصنف نے اس مثنوی کے شاعر کا نام نہیں بتایا؟ بہر حال گجرات کے فارسی ادب کے سلسلے کی اہم کڑی کی حیثیت رکھتی ہے۔

مادر روشنائی کی ترکیب کا جو نسخہ ہندی زبان کے ایک شعر میں بیان ہوا ہے وہ یہ ہے:

جیتا کا جل تول تیتا گوند تسلا تیں

تس کا ادھا بول د ؟ بھی بانہ رسانہ ؟ مسلا تیں

دوسرے مصرع کے معنی واضح نہیں۔ لفظ بول غالباً طباعت یا کتابت کی غلطی ہے۔ ظاہراً یہ لفظ روشنائی کے ترکیبی اجزاء میں سے کسی شے کے لیے استعمال ہوا ہے۔ "بانہ" غالباً "مانہ" ہے، بمعنی "میں"۔ زبان سے شعر کی قدامت ظاہر ہے، البتہ اسے دکنی کی بہ نسبت ہندی یا گوجری کا شعر کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ نیز یہ بھی لازمی نہیں کہ یہ احمد نگر یا دکن ہی کے شاعر کا ہو۔ ہو سکتا ہے کہ قائل شمالی ہند کا کوئی شخص ہو اور علمی روایات کے ساتھ ساتھ یہ شعر دکن پہنچا ہو۔

۱

۲

۳

۴

۴۱۔ دستور العلماء۔ ۶۴۰۹۴